زیر نظر آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

ترجمہ
سید صفدر حسین نجفی

اثر نگارش
اہل علم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

زیرِ نظر، اُستادِ محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

۱۸

ترجمہ
سیّد صفدر حسین نجفی
پرنسپل جامعۃ المنتظر لاہور

اثرِ نگارش،
اہلِ قلم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

Marfat.com

پیشکش ، حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب ——— تفسیر نمونہ جلد ۱۸
زیرِ نظر ——— استاد محقق آقائے ناصر مکارم شیرازی
مترجم ——— سید صفدر حسین نجفی، پرنسپل جامعۃ المنتظر۔ لاہور
کتابت ——— حافظ منظور احمد سندھو آف بارموسیٰ ضلع گجرات
ناشر ——— مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰ گنگا رام مینشن
شاہراہِ قائدِ اعظم۔ لاہور
مطبع ——— معراج دین پرنٹرز
تاریخ اشاعت ——— رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ
ایڈیشن ——— اوّل
ہدیہ ——— ۷۵ روپے

—— ملنے کا پتہ ——

قرآن سنٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور ۲

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

Marfat.com

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

محترم قارئین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

تفسیرِ نمونہ کی اٹھارھویں جلد آپ کے پیشِ نظر ہے، اس کی اشاعت رمضان المبارک کے مقدس اور باکرامت مہینے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی کہ جس کو قرآن کریم کے ساتھ ایک خاص نسبت ہے ــ ارشادِ الٰہی ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ

رمضان کا مہینہ وہ ہے کہ جس میں قرآن نازل ہوا ــ وہی قرآن کہ جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے، ہدایت کی روشنیوں کا حامل ہے اور حق و باطل کے مابین امتیاز عطا کرنے والا ہے۔ (سورۂ بقرہ - آیت ۱۸۵)

یہ امر یقیناً آپ کے علم میں ہے کہ سالِ گزشتہ میں ہم نے طالبانِ قرآن و قرآنیات کی خدمت میں تفسیرِ نمونہ کی تیرھویں سے سترھویں تک پانچ جلدیں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ سالِ رواں میں بھی اپنے بعض مخلص بندوں کے ہاتھوں ہمیں اتنے مالی وسائل فراہم کر دے کہ اس کے بعد ہم انیسویں سے بائیسویں تک مزید چار جلدیں شائع کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

تفسیرِ قرآن کی اشاعت میں اب تک ہمیں جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ خدائے بزرگ و برتر کے فضل و کرم، سرکار معصومینؑ کی نظرِ عنایت اور آپ حضرات کی توجہ فرمائی کے بغیر ممکن نہ تھیں۔ اس ضمن میں ہم نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے تفسیر موضوعی اور تفسیر نور الثقلین کی اشاعت کے لیے بھی اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا ہے۔

ہم بجا طور پر توقع رکھتے ہیں کہ آپ پہلے کی طرح ہماری حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے ــ چنانچہ ہمیں آپ کی قیمتی آراء اور مفید مشوروں کا انتظار رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ امید بھی رکھتے ہیں کہ آپ اس تفسیر کی توسیع اشاعت میں حصہ لیتے ہوئے قرآن کا

Marfat.com

پیغامِ ہدایت گھر گھر پہنچانے کی کوششیں جاری رکھیں گے۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ لاہور کے ایک مخلص اور مخیّر مردِ مومن نے اپنے مرحوم عزیز و اقارب کے ایصالِ ثواب کے لیے اس جلد کی اشاعت میں ادارہ ہذا سے خصوصی مالی تعاون فرمایا اور اپنے نام نامی کا اظہار کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی — تاہم ان کا اسم گرامی ناصرانِ قرآن و اہلبیتؑ کی فہرست میں ابد الآباد تک شامل رہے گا۔ ہم دعاگو ہیں کہ رب کریم ان کے مرحوم اعزہ کو سدا اپنے جوارِ رحمت میں رکھے۔ آمین یارب العالمین!

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

Marfat.com

اِھدَاء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

Marfat.com

یہ تفسیر

حسب ذیل علمائے مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

۱۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
۲۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
۳۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبدالرسول حسنی
۴۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے حسن شجاعی
۵۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبداللهی
۶۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
۷۔ حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

Marfat.com

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ یا تنقید کی گئی ہے

۱۔ تفسیر مجمع البیان	تالیف	مفسّر معروف مرحوم طبرسی
۲۔ تفسیر تبیان	تالیف	دانشمند و عالم فقید شیخ طوسی
۳۔ تفسیر المیزان	تالیف	علامہ طباطبائی
۴۔ تفسیر صافی	تالیف	ملامحسن فیض کاشانی
۵۔ تفسیر نور الثقلین	تالیف	عبد علی بن جمعہ الحویزی
۶۔ تفسیر برہان	تالیف	سید ہاشم بحرانی
۷۔ تفسیر روح المعانی	تالیف	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸۔ تفسیر المنار	تالیف	محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ
۹۔ تفسیر فی ظلال القرآن	تالیف	سید قطب
۱۰۔ تفسیر قرطبی	تالیف	محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱۔ اسباب النزول واحدی	تالیف	واحدی (ابو الحسن علی بن منویہ نیشاپوری)
۱۲۔ تفسیر مراغی	تالیف	احمد مصطفےٰ مراغی
۱۳۔ تفسیر مفاتیح الغیب	تالیف	فخر رازی
۱۴۔ تفسیر روح الجنان	تالیف	ابو الفتوح رازی
۱۵۔ تفسیر کشاف	تالیف	زمخشری
۱۶۔ الدر المنثور	تالیف	سیوطی

Marfat.com

اس تفسیر میں مدِ نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان بھی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

باالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کر کے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بُوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

Marfat.com

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا مَیں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی سترہ جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی اٹھاروہیں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا مَیں ازحد شکرگزار ہوں۔

یہاں یہ بات مَیں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی[۱]۔

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرضِ خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی[۲] کے مقام پر، حتیٰ کہ بسترِ بیماری پر بھی مَیں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

[۱] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)
[۲] سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

Marfat.com

اس میں ہم آہنگی نہیں ہوگی ۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے مَیں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں ۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں ۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث ، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو ۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہوسکیں ۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے) ۔

خداوندا !

ہماری آنکھوں کو بینا ، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب ، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کرسکیں ۔

خداوندا !

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے ، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں ۔

بارالٰہا !

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کرسکیں ۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کرسکیں ۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (تُو ہر چیز پر قادر ہے) ۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم ۔ ایران

Marfat.com

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
آیت ۱ تا ۲	۳۱	آیت ۱۸ تا ۱۹	۸۲
وہی ہر چیز کا مالک اور ہر چیز کا عالم ہے	۳۱	ہم نے انہیں اس طرح منتشر کیا کہ وہ دوسروں کے لیے ضرب المثل بن گئے	۸۳
آیت ۳ تا ۵	۳۶	چند نکات	۸۶
پروردگار کی قسم قیامت آ کے رہے گی	۳۷	۱۔ قوم سبا کا عجیب و غریب ماجرا	۸۶
آیت ۶ تا ۹	۴۲	۲۔ قرآن کا ایک تاریخی معجزہ	۸۸
علماء تیری دعوت کو حق سمجھتے ہیں	۴۳	۳۔ ایک مختصر سے واقعہ میں عبرت کے اہم نکات	۸۹
چند قابلِ توجہ نکات	۴۸	آیت ۲۰ تا ۲۱	۹۱
آیت ۱۰ تا ۱۱	۵۰	کوئی شخص شیطانی وسوسوں کی پیروی پر مجبور نہیں ہے	۹۱
داوٴدؑ پر خدا کے عظیم انعامات	۵۰	آیت ۲۲ تا ۲۷	۹۴
آیت ۱۲ تا ۱۴	۵۶	مجھے بتاؤ کہ کیوں؟	۹۶
سلیمانؑ کا جاہ و جلال اور ان کی عبرت انگیز موت	۵۷	نکتہ	۱۰۴
چند نکات	۶۵	دلوں کو تسخیر کرنے کا طریقہ	۱۰۴
۱۔ سلیمانؑ کی عبرت انگیز زندگی کا منظر	۶۵	آیت ۲۸ تا ۳۰	۱۰۷
۲۔ سلیمانؑ کی موت ایک مدت تک کیوں پوشیدہ رہی؟	۶۷	تم تمام جہانوں کے لیے مبعوث کیے گئے ہو	۱۰۷
۳۔ قرآن اور موجودہ تورات میں سلیمانؑ کی تصویر	۶۹	آیت ۳۱ تا ۳۳	۱۱۲
۴۔ حقیقی شکرگزار بہت کم ہیں	۷۲	آیت ۳۴ تا ۳۸	۱۱۸
آیت ۱۵ تا ۱۷	۷۶	مال و اولاد قرب خدا کی دلیل نہیں ہیں	۱۱۹
ایک درخشاں تمدن جو کفرانِ نعمت کی وجہ سے برباد ہوگیا	۷۷	چند نکات	۱۲۵

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
قدروں کا تعین	۱۲۵
آیت ۹ ؛ تا ۴۲	۱۲۸
معبودوں کی عبادت کرنے والوں سے بیزاری	۱۲۹
چند نکات	۱۳۳
۱۔ انفاق زیادتی کا باعث ہے نہ کہ کمی کا	۱۳۳
۲۔ اموال کا خدائی بیمہ	۱۳۶
۳۔ "انفاق" کے مفہوم کی وسعت	۱۳۷
آیت ۴۳ تا ۴۵	۱۳۹
کس دلیل کے ساتھ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں	۱۴۰
آیت ۴۶	۱۴۵
انقلاب فکری ہر اصل انقلاب کی بنیاد ہے	۱۴۵
چند نکات	۱۴۸
۱۔ تمام انقلابات کی جڑ بنیاد	۱۴۸
۲۔ غور و فکر کے سلسلے میں روایات اسلامی	۱۵۱
الف۔ غور و فکر کرنا عظیم ترین عبادت ہے	۱۵۱
ب۔ ایک ساعت غور و فکر کرنا ایک رات کی عبادت سے بہتر ہے	۱۵۲
ج۔ غور و فکر سرچشمۂ عمل ہے	۱۵۲
آیت ۴۷ تا ۵۰	۱۵۳
باطل سے کوئی کام نہیں ہوتا	۱۵۴
سوال	۱۵۷
جواب	۱۵۸
آیت ۵۱ تا ۵۴	۱۶۰
ان کے لیے راہ فرار نہ ہوگی	۱۶۱
سورۂ فاطر	۱۶۹
سورۂ فاطر کے مضامین	۱۷۱
اس سورہ کی فضیلت	۱۷۲
آیت ۱ تا ۳	۱۷۳
بند دروازوں کا کھولنے والا وہی ہے	۱۷۴
چند توجہ طلب امور	۱۷۹
نکتہ	۱۸۱
ملائکہ قرآن مجید میں	۱۸۱
آیت ۴ تا ۷	۱۸۶
دنیا اور شیطان تمہیں فریب نہ دے	۱۸۷
آیت ۸ تا ۱۰	۱۹۳
پاک اور صالح گفتار و کردار خدا کی طرف لے جاتے ہیں	۱۹۴
چند نکات	۲۰۲
۱۔ تمام "عزت" خدا کے لیے ہے	۲۰۲
۲۔ "کلام طیب" اور "عمل صالح" میں فرق	۲۰۳
آیت ۱۱ تا ۱۲	۲۰۴
شیریں اور شور پانی والے دریا یکساں نہیں ہیں	۲۰۵
چند قابل غور نکات	۲۰۹
طویل عمر اور کم عمر کے روحانی عوامل	۲۱۱
اس کی وضاحت	۲۱۲
آیت ۱۳ تا ۱۴	۲۱۴
یہ جھوٹے معبود تو ہماری آواز تک نہیں سنتے	۲۱۵

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
آیات میں سُوئے استفادہ اور انحرافی تفاسیر	۲۱۸
آیت ۱۵ تا ۱۸	۲۲۱
کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا	۲۲۲
برہان امکان و وجوب (فقر و غنیٰ) کی وضاحت	۲۲۳
آیت ۱۹ تا ۲۳	۲۲۹
نور و ظلمت یکساں نہیں	۲۲۹
چند اہم نکات	۲۳۲
۱۔ ایمان و کفر کے آثار	۲۳۲
۲۔ کیا مُردے کسی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے؟	۲۳۳
۳۔ تعبیرات کا تنوع فصاحت کا ایک حصہ ہے	۲۳۵
آیت ۲۴ تا ۲۶	۲۳۷
دل کے اندھے ایمان نہ لائیں تو تعجب نہیں	۲۳۷
آیت ۲۷ تا ۲۸	۲۴۱
وجود کے در و دیوار پر عجیب نقش و نگار	۲۴۱
آیت ۲۹ تا ۳۰	۲۴۷
پروردگار کے ساتھ نفع بخش تجارت	۲۴۷
اس تجارت کی عجیب شرائط	۲۵۱
آیت ۳۱ تا ۳۲	۲۵۳
میراثِ انبیاء کے حقیقی وارث	۲۵۳
کتابِ الٰہی کے پاسدار کون ہیں؟	۲۶۰
آیت ۳۳ تا ۳۵	۲۶۱
جہاں غم ہے نہ تھکان	۲۶۱
آیت ۳۶ تا ۳۸	۲۶۵
ہمیں لوٹا دو تاکہ ہم اچھے عمل کریں	۲۶۶
چند اہم نکات	۲۷۰
۱۔ "ذات الصدور" سے کیا مراد ہے؟	۲۷۰
۲۔ واپسی کی کوئی راہ نہیں	۲۷۱
آیت ۳۹ تا ۴۱	۲۷۳
آسمان و زمین اس کی قدرت سے قائم ہیں	۲۷۴
اس کی قدرت کے سامنے چھوٹا بڑا سب برابر ہیں	۲۷۹
آیت ۴۲ تا ۴۴	۲۸۱
شانِ نزول	۲۸۲
استکبار اور سازشیں - ان کی بدبختی کا سبب	۲۸۲
آیت ۴۵	۲۸۹
اس کا لطف نہ ہوتا تو کوئی جاندار زمین پر باقی نہ رہتا	۲۸۹
سورۂ یٰسٓ	۲۹۳
سورہ یٰسٓ کے مضامین	۲۹۵

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
سورہ یٰسٓ کی فضیلت	۲۹۵
آیت ۱ تا ۱۰	۲۹۹
قلب قرآن کا آغاز	۳۰۰
چند اہم نکات	۳۰۸
۱۔ آلاتِ شناخت کا بیکار ہو جانا	۳۰۸
۲۔ آگے اور پیچھے حائل دیواریں	۳۱۰
۳۔ انفس و آفاق کی دنیا میں سیر سے محرومی	۳۱۰
آیت ۱۱ تا ۱۲	۳۱۲
کس قسم کے لوگ تیری تنبیہ کو قبول کرتے ہیں	۳۱۲
چند قابلِ توجہ نکات	۳۱۳
چند اہم نکات	۳۱۶
۱۔ ثبتِ اعمال کی مختلف کتابیں	۳۱۶
۲۔ ہر چیز ثبت ہوتی ہے	۳۱۷
آیت ۱۳ تا ۱۹	۳۲۰
بستی والوں کی سرگزشت ایک عبرت ہے	۳۲۱
آیت ۲۰ تا ۳۰	۳۲۷
ایک جان بکف مجاہد	۳۲۹
چند اہم نکات	۳۳۷
۱۔ انطاکیہ کے رسولوں کی داستان	۳۳۷
۲۔ اس داستان کے تربیتی اور اصلاحی نکات	۳۴۱
۳۔ برزخ کی سزا و جزا	۳۴۲
۴۔ امتوں میں سب سے سبقت کرنے والے	۳۴۳

مضمون	صفحہ نمبر
آیت ۳۱ تا ۳۲	۳۴۴
دائمی غفلت	۳۴۴
آیت ۳۳ تا ۳۶	۳۴۷
کچھ اور نشانیاں	۳۴۸
آیت ۳۷ تا ۴۰	۳۵۴
سورج اور چاند بھی آیتِ الٰہی ہے	۳۵۵
چند اہم نکات	۳۶۱
۱۔ سورج کی "دورانی" اور جریانی حرکت	۳۶۱
۲۔ "تدرک" اور "سابق" کی تعبیر	۳۶۲
۳۔ انسانی زندگی میں نور و ظلمت کا نظام	۳۶۳
آیت ۴۱ تا ۴۴	۳۶۵
کشتیوں کا دریاؤں میں چلنا بھی آیتِ الٰہی ہے	۳۶۵
آیت ۴۵ تا ۴۷	۳۶۹
وہ تمام آیاتِ الٰہی کو نظر انداز کر دیتے ہیں	۳۷۰
آیت ۴۸ تا ۵۳	۳۷۴
قیامت کی چیخ	۳۷۵
آیت ۵۴ تا ۵۸	۳۸۱
اہلِ بہشت مادی و روحانی نعمتوں سے سرشار ہوں گے	۳۸۲
سلام کہ جو اہلِ بہشت پر نچھاور ہوں گے	۳۸۶
آیت ۵۹ تا ۶۲	۳۸۷
شیطان کی پرستش کیوں کرتے ہو	۳۸۷
آیت ۶۳ تا ۶۸	۳۹۴
جب زبان چپ ہو گی اعضا گواہی دیں گے	۳۹۵

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
آیت ۶۹ تا ۷۰	۴۰۲	چند نکات	۴۲۴
رسول شاعر نہیں بلکہ وہ زندوں کو ڈرانے والا ہے	۴۰۲	۱۔ سبز درخت ہی کیوں ؟	۴۲۴
دلوں کی موت اور زندگی	۴۰۵	۲۔ آتش زنہ اور آتش گیر میں فرق	۴۲۵
آیت ۷۱ تا ۷۶	۴۰۹	آیت ۸۱ تا ۸۳	۴۲۶
چوپایوں کے عظیم فائدے	۴۱۰	وہ ہر چیز کا مالک و حاکم ہے	۴۲۶
چند قابلِ توجہ نکات	۴۱۱	چند نکات	۴۳۰
ایک اہم نکتہ	۴۱۵	۱۔ معاد کا اعتقاد ایک فطری امر ہے	۴۳۱
آیت ۷۷ تا ۷۹	۴۱۶	۲۔ ایمان بالقیامت کا اثر انسانی زندگی پر	۴۳۲
شانِ نزول	۴۱۶	۳۔ معاد کے عقلی دلائل	۴۳۵
خلقتِ اوّل معاد پر ایک دلیل قاطع ہے	۴۱۷	۴۔ قرآن اور مسئلہ معاد	۴۴۰
آیت ۸۰	۴۲۱	۵۔ معاد جسمانی	۴۴۲
توانائیوں کی بازگشت	۴۲۱	۶۔ بہشت و دوزخ	۴۴۴

Marfat.com

جلد ۱۸

تفسیر نمونہ

جزء ۲۲ قرآن مجید

سورۂ سبا و فاطر و یٰسٓ

جلد ۱۸ کا آغاز
۴ ربیع الثانی ۱۴۰۴
۱۳۶۲/۱۰/۱۸
کو ہوا

Marfat.com

سورۂ سبـــاء

سورۂ سبأ مکّہ میں
نازل ہوئی
اور
اس کی ۵۴ آیات ہیں

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ سبا کے مطالب و مضامین

یہ سورہ جو قوم "سبا" کی سرگزشت کی مناسبت سے "سبا" کے نام سے موسوم ہوئی ہے "مکی" سورتوں میں سے ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ مکی سورتوں کے مطالب و مضامین عام طور پر معارفِ اسلامی اور اصول ہائے اعتقادی خصوصاً "مبدأ" و "معاد" اور "نبوت" ہوتے ہیں۔

اور اس سورہ کی زیادہ تر بحث بھی انہی امور کے گرد گھومتی ہے، کیونکہ مکہ کے زمانہ میں مسلمانوں کی عقائد کے لحاظ سے تعمیر کی جا رہی تھی اور فروع پر عمل کرنے اور حکومت اسلامی کے قیام اور تمام اسلامی پروگراموں کو عملی شکل دینے کے لیے انہیں آمادہ اور تیار کیا جا رہا تھا۔

کلی طور پر یہ کہنا چاہیئے کہ اس سورہ میں پانچ مطالب کو مدِنظر رکھا گیا ہے:

۱۔ "مسئلہ توحید" اور عالم ہستی میں خدا کی چند نشانیاں اور اس کی پاک صفات، منجملہ ان کے "توحید" "ربوبیت" اور "الوہیت"۔

۲۔ "مسئلہ معاد" جو اس سورہ میں دوسرے مسائل کی نسبت زیادہ بیان ہوا ہے۔ اس پر مختلف طریقوں سے طرح طرح کی بحثیں عنوان کی گئی ہیں۔

۳۔ "گزشتہ انبیاء اور خصوصاً پیغمبرِ اسلام کی نبوت کا مسئلہ" اور اس کے بارے میں دشمنوں کی بہانہ سازیوں کا جواب اور گزشتہ انبیاء کے کچھ معجزات کا بیان۔

۴۔ حضرت سلیمان اور قوم سبا کی زندگی کے ایک گوشہ کے بیان کے ضمن میں خدا کی عظیم نعمتوں کے ایک حصّہ اور شکر گزاروں اور کفرانِ نعمت کرنے والوں کے انجام کا ذکر۔

۵۔ "غور و فکر کی دعوت" ایمان و عمل صالح کی ترغیب اور ان عوامل کی نوعِ بشر کی سعادت و نیک بختی میں تاثیر اور مجموعی طور پر حق کی جستجو کرنے والوں کی تربیت کے لیے ایک جامع پروگرام۔

اس سورہ کی فضیلت

اسلامی روایات میں اس سورہ کی اہمیت اور اس کی تلاوت کے سلسلے میں عمدہ اور جاذبِ نظر قسم کی تعبیریں نظر آتی ہیں۔

منجملہ اُن کے پیغمبرِ اسلامؐ سے ایک حدیث میں اس طرح منقول ہوا ہے کہ:

Marfat.com

من قرأ سورة سبا لم يبق نبي ولا رسول الا كان له يوم القيامة رفيقاً و مصافحاً۔
جو شخص سورہ سبا کو پڑھے گا، قیامت میں تمام انبیاء مرسلین اس کے رفیق و ہمنشین ہوں گے اور سب کے سب اس سے مصافحہ کریں گے۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ:

من قرأ الحمدين جميعاً، سبا و فاطر، في ليلة لم يزل ليلته في حفظ الله تعالىٰ و كلائه، فان قرأهما في نهاره لم يصبه في نهاره مكروه، واعطي من خير الدنيا وخير الاٰخرة مالم يخطر على قلبه ولم يبلغ مناه۔

جو شخص ان دو سورتوں کو کہ جن کی الحمد کے ساتھ ابتداء ہوتی ہے (سورہ سبا اور فاطر) کو کسی رات میں پڑھے گا تو وہ ساری رات خدا کی حفاظت و نگرانی میں رہے گا اور اگر ان دونوں کو دن میں پڑھے گا تو (اس دن) کوئی مکروہ اور ناپسندیدہ بات اسے پیش نہیں آئے گی، اور اسے اس قدر خیر دنیا و آخرت عطا کیا جائے گا کہ اس کے دل میں کبھی اس کا گمان بھی نہ گزرا ہوگا اور نہ اس نے اس کے بارے میں کبھی سوچا ہوگا اور نہ آرزو کی ہوگی۔[2]

جیسا کہ ہم نے ہر سورہ کے آغاز میں اس بات کی یاد دہانی کرائی ہے کہ مسلمہ طور پر یہ عظیم ثواب ان لوگوں کو نہیں ملے گا کہ جو صرف ان کو زبان سے پڑھنے ہی کو کافی سمجھیں گے، بلکہ یہ پڑھنا غور و فکر کرنے کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہونا چاہیئے کہ جو انسان کو عمل کرنے پر آمادہ و تیار کرے۔

مثلاً جو شخص اس سورہ کو پڑھتا ہے وہ اس نکتہ سے باخبر ہو جاتا ہے کہ خدا کی بے حساب نعمتوں کا کفران کرنے کے نتیجہ میں، قوم سبا کی زندگی ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ وہ سب کے لیے عبرت بن گئے اور ان کا انجام دنیا والوں کے لیے ایک ضرب المثل بن گیا، اس قسم کے انسان نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں ایسا شکر کہ جو عملی پہلو لیے ہوئے ہو۔ مشغول ہو جاتے ہیں، اور خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے اس کی حفظ و امان میں رہیں گے۔

اس سلسلے میں ہم سورہ نور کی ابتداء میں زیادہ تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

✣ ✣ ✣

---

[1] و [2] "مجمع البیان" سورہ "سبا" کا آغاز جلد ۸ ص ۳۷۵۔

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ
الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ○

(۲) یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا
یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ
الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ ○

ترجمہ

مہربان اور رحم کرنے والے خدا کے نام سے

(۱) حمد و (ستائش) اس خدا کے لیے مخصوص ہے کہ جو اُن تمام چیزوں کا مالک ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور آخرت میں بھی وہی حمد کے لائق ہے اور وہ حکیم اور ہر چیز سے باخبر ہے۔

(۲) جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے وہ اُسے بھی جانتا، اور جو کچھ اس سے باہر نکلتا ہے (اس کا علم بھی رکھتا ہے)، اور (اسی طرح) جو کچھ آسمانوں سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ اس میں اوپر جاتا ہے (سب سے باخبر ہے) اور وہ مہربان اور بخشنے والا ہے۔

تفسیر

وہی ہر چیز کا مالک اور ہر چیز کا عالم ہے

قرآن مجید کی پانچ سورتیں پروردگار کی حمد سے شروع ہوتی ہیں، جن میں سے تین سورتوں میں

Marfat.com

خدا کی حمد و تعریف آسمان و زمین اور دوسرے موجودات کی خلقت کی بناء پر ہے (سورہ سبا، سورہ فاطر اور سورہ انعام) اور ایک سورہ (سورۂ کہف) میں یہ حمد و ثنا پیغمبر کے قلب پاک پر قرآن کے نزول کی بنا پر ہے۔

جبکہ سورۂ حمد میں ایک جامع تعبیر ہے کہ جو ان تمام امور کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے: (الحمد للہ رب العالمین)

بہر حال سورۂ سبا کے ابتداء میں خدا کی حمد و ثنا کے ساتھ گفتگو دنیا و آخرت میں اس کی مالکیت و حاکیت کی بنا پر ہے، فرماتا ہے:

"حمد مخصوص ہے اس خدا کے لیے کہ جو آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کا مالک ہے" (الحمد للہ الذی لہ ما فی السّماوات وما فی الارض)۔

"اور آخرت میں بھی حمد اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے" (ولہ الحمد فی الآخرۃ)۔

اسی طرح سے دونوں جہانوں کی حاکیت و مالکیت اسی کے لیے ہے۔ ہر نعمت، ہر موہبت، ہر فائدہ و برکت اور ہر موزوں و عجیب و غریب خلقت اسی کی ذات پاک کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، اور اسی بنا پر "حمد" کہ جس کی حقیقت "اچھے اور اختیاری کاموں" پر تعریف و ستائش ہے، سب کی سب اسی کی طرف لوٹتی ہیں۔

اور اگر مخلوقات میں بھی کوئی لائق حمد و ستائش ہے تو وہ بھی اسی کے وجود کا پرتو اور اس کے افعال و صفات کی ایک شعاع ہے۔

اس بنا پر اس دنیا میں جو بھی کسی چیز کی حمد و ستائش کرتا ہے تو یہ حمد و ستائش آخرکار اسی کی پاک ذات کی طرف لوٹ جاتی ہے اور بقول شاعر:

به جہاں خرم از آنم کہ جہاں خرم از اوست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از اوست

"میں اس جہان سے اس وجہ سے خوش ہوں کیونکہ یہ جہان اسی کی وجہ سے خوش ہے
میں سارے عالم پر اس وجہ سے عاشق ہوں کیونکہ سارا عالم اس کی طرف سے ہے۔"

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "وہ حکیم اور خبیر ہے" (وھو الحکیم الخبیر)۔

اس کی حکمت بالغہ کی بنیاد پر ہی یہ عجیب و غریب نظام جہان پر حکومت کر رہا ہے اور اس کے علم و آگاہی کی بنیاد پر ہی ہر چیز اپنی جگہ پر برقرار ہے اور ہر موجود کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ اس کے اختیار میں ہے۔

اس بارے میں کہ خدا کی آخرت کے بارے میں حمد سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس پر

Marfat.com

بہت بحث کی ہے۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اگرچہ دارِ آخرت دارِ تکلیف نہیں ہے لیکن خدا کے بندے وہاں پر اس کی عاشقانہ انداز میں حمد و ستائش کریں گے اور اس کی حمد و ستائش سے لذت حاصل کریں گے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ بہشتی تو اس کے فضل و کرم کی وجہ سے اس کی حمد کریں گے اور دوزخی اس کے عدل و انصاف کی وجہ سے۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے، کہ وہ انسان کہ جو اس دنیا میں نہیں وہ اپنے قلب و فکر پر پڑے ہوئے حجابوں کی وجہ سے غالباً اُس کی خالص حمد و ثنا نہیں کرتے لیکن قیامت میں تمام حجاب ہٹ جائیں گے اور: "الملك یومئذ للہ" کے مصداق تمام عالم ہستی پر خدا کی مالکیت سب پر واضح و آشکار ہو جائے گی، اور سب کے سب کامل خلوص نیت کے ساتھ اُس کی حمد و ثنا میں مشغول ہو جائیں گے۔

علاوہ ازیں اس جہان میں تو یہ بات ممکن ہے کہ انسان غافل ہو جائیں اور کچھ موجودات کو ذاتِ خدا سے مستقل خیال کرلیں اور ان کی تعریف و توصیف کرنے لگیں، لیکن وہاں تو سب کا اس کی پاک ذات کے ساتھ تعلق اس طرح سے واضح و آشکار ہو جائے گا جس طرح اس دنیا میں سورج کی شعاعوں کا سورج کے ساتھ رابطہ واضح و آشکار ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر قرآن مجید میں بھی بارہا آیا ہے کہ جنتی وہاں خدا کی حمد کریں گے:

"و اٰخر دعواھم ان الحمد للہ رب العالمین" (یونس، آیہ ۱۰)

جنتیوں کی آخری بات یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ حمد و تعریف اس خدا کے لیے ہے کہ جو عالمین کا پروردگار ہے۔

دوسری جگہ ہم یہ پڑھتے ہیں کہ جس وقت مومنین بہشت جاودانی میں وارد ہوں گے تو وہ یہ کہیں گے: "حمد و شکر ہے اس خدا کے لیے کہ جس نے ہم سے غم و اندوہ کو برطرف کیا۔"

(وقالوا الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن) (فاطر۔ ۳۴)

یہ حمد و ثنا صرف انسانوں اور فرشتوں کی زبان سے ہی نہیں، بلکہ عالم ہستی کے تمام ذرات سے بھی اس کی حمد و تسبیح کا زمزمہ باہوش کان میں پہنچ رہا ہے، کوئی موجود بھی ایسا نہیں ہے کہ جو اس کی حمد و تسبیح نہ کرتا ہو۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت، گزشتہ آیت میں خدا کی "حکیم" و "خبیر" کے ساتھ توصیف کی مناسبت سے پروردگار کے بے پایاں علم کے ایک گوشہ کی تشریح کر رہی ہے اور اس طرح کہتی ہے: "جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اس سے باہر نکلتا ہے وہ اس سے بھی آگاہ ہے" (یعلم ما

Marfat.com

یلج فی الارض وما یخرج منھا)۔

ہاں! وہ جانتا ہے بارش کے تمام قطرات اور سیلاب کی موجوں کو جو زمین کی گہرائیوں میں داخل ہوتی ہیں اور نفوذ ناپذیر طبقہ تک پہنچتی ہیں اور وہاں مجتمع ہو جاتی ہیں، اور انسانوں کے لیے ذخیرہ بن جاتی ہیں۔

وہ باخبر ہے گیاہ اور سبزہ زاروں کے دانوں سے کہ جو ہَوا یا حشرات الارض کی مدد سے وسیع و عریض زمین میں بکھر جاتے ہیں، اور زمین کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور ایک دن سرسبز درخت یا ہرے بھرے گیاہ اور سبزے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

وہ باخبر ہے درختوں کی جڑوں سے، کہ جس وقت وہ پانی اور غذا کی تلاش میں زمین کی گہرائیوں میں چلتی ہیں۔

برقی لہروں سے، مختلف گیسوں اور ہَوا کے ذرات سے، کہ جو زمین کے اندر نفوذ کرتے ہیں، ان جانداروں سے کہ جو زمین کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور اسے زندگی بخشتے ہیں، نیز خزانوں، دفینوں اور مُردہ چیزوں کے بدنوں سے، خواہ وہ انسان ہوں یا غیر انسان، کہ جو اس زمین میں دفن ہیں، ہاں! وہ ان سب سے باخبر ہے۔

اسی طرح ان گیاہوں اور سبزوں سے کہ جو زمین سے نکلتے ہیں، ان انسانوں سے کہ جو اس سے اٹھے (پیدا ہوئے) ہیں، ان چشموں سے جو اس سے ابلتے ہیں، ان گیسوں سے جو اس سے اٹھتی ہیں، ان آتش فشاں پہاڑوں سے کہ جو اس سے بھڑکتے ہیں اور ان حشرات سے کہ جو زمین کے اندر بل رکھتے ہیں اور اس سے سر باہر نکالتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ان تمام موجودات سے، کہ جو زمین کی گہرائیوں سے باہر نکلتے ہیں، خواہ ہم ان میں سے کسی کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، وہ ان تمام پر مطلع اور سب سے آگاہ ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ ان تمام چیزوں سے کہ جو آسمان سے نازل ہوتی ہیں یا آسمان کی طرف اوپر جاتی ہیں، باخبر ہے" (وما ینزل من السماء وما یعرج فیھا)۔

بارش کے قطروں سے، سورج کی حیات بخش شعاعوں سے، وحی اور آسمانی شریعتوں کی طاقتور موجوں سے، ان فرشتوں سے جو تبلیغ رسالت یا دوسرے کاموں کی انجام دہی کے لیے زمین پر نازل ہوتے ہیں، ان کبریائی شعاعوں سے کہ جو فضا کے باہر سے زمین پر نازل ہوتی ہیں، ان شہابوں اور فضا میں گھومنے والے سنگریزوں سے کہ جو زمین کی طرف (آتے ہوئے فضا میں) جذب ہو جاتے ہیں، وہ ان سب سے آگاہ ہے۔

نیز بندوں کے اعمال سے کہ جو آسمان کی طرف عروج کرتے ہیں، ان فرشتوں سے کہ جو اپنی رسالت کی ادائیگی کے بعد آسمانوں کی طرف لوٹتے ہیں، ان شیاطین سے کہ جو (استراق سمع) باتیں چرانے کے لیے آسمانوں کی طرف جاتے ہیں، اونچے اونچے درختوں کی شاخوں سے جو آسمان کی طرف سر اٹھائے بڑھی چلی جا

Marfat.com

رہی ہیں، اُن بخارات سے کہ جو سمندروں سے اٹھتے ہیں اور آسمان کی بلندی پر جاکر بادل بناتے ہیں، اُس آہ و فریاد سے کہ جو کسی مظلوم کے دل سے اٹھتی ہے اور آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے، ہاں! وہ ان تمام چیزوں سے آگاہ ہے۔

کیا اس کے سوا اور بھی کوئی ان امور سے آگاہ ہے؟ کیا نوع بشر کے تمام دانشمند اور علماٗ کا علم ان معلومات کے کسی ایک گوشہ پر احاطہ رکھتا ہے؟

آخر میں مزید کہتا ہے: "وہ رحیم ہے اور غفور، مہربان اور بخشنے والا" (وھو الرحیم الغفور)۔

اس مقام پر خدا کی ان دو صفات کے ساتھ توصیف، یا تو اس بنا پر ہے کہ ان امور میں سے کہ جو آسمان کی طرف اوپر چڑھتے ہیں، وہ بندوں کے اعمال اور ان کی ارواح ہیں، تو وہی ان کے اوپر اپنی رحمت و مغفرت کا سایہ ڈالنے والا ہے۔

یا اس بنا پر ہے کہ آسمانی برکات و مواہب کا نزول اس کی رحمت کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ اعمالِ صالح کہ جو بندوں کی طرف سے "والعمل الصالح یرفعہ" کے مطابق اوپر جاتے ہیں، اس کی مغفرت کو پا لیتے ہیں۔

یا یہ کہ وہ لوگ کہ جو ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں، تو رحمت ان کے شاملِ حال ہوتی ہے اور وہ لوگ کہ جو قصوروار اور گنہگار ہیں، اگر حد سے نہ بڑھ جائیں تو مغفرت ان کے شاملِ حال ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اوپر والی آیت اپنے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے ایک وسیع و عریض معنی رکھتی ہے اور اس کو ایک ہی جہت میں محدود نہیں کرنا چاہیئے۔

Marfat.com

(۳) وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَ
رَبِّىْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ
فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ وَلَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرُ
اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۙ ○
(۴) لِّيَجْزِىَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ
مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ○
(۵) وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِىْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ○

ترجمہ

(۳) کافروں نے کہا: قیامت ہرگز ہمارے پاس نہیں آئے گی، تم کہہ دو، ہاں! مجھے اپنے پروردگار کی قسم وہ ضرور ضرور تمہارے پاس آئے گی، وہ خدا کہ جو غیب سے آگاہ ہے، آسمانوں اور زمین میں نہ تو ایک ذرہ کے وزن کے برابر کوئی چیز اس سے مخفی رہے گی، نہ اس سے کچھ چھوٹی نہ اس سے زیادہ بڑی، مگر یہ کہ وہ کتاب مبین میں ثبت ہے۔

(۴) اس سے اصل مقصد یہ ہے، تاکہ وہ اُن لوگوں کو کہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل انجام دیئے، جزا و ثواب دے، ان کے لیے بخشش اور باعزت روزی ہے۔

Marfat.com

۵ وہ لوگ کہ جو ہماری آیات (کی تکذیب) کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اور انہوں نے یہ گمان کرلیا ہے کہ وہ ہماری قدرت کے احاطہ سے باہر نکل جائیں گے اُن کے لیے بُرا اور دردناک عذاب ہوگا۔

تفسیر

پروردگار کی قسم قیامت آکے رہے گی

گزشتہ آیات اس حالت کے باوجود، کہ وہ توحید اور خدا کی صفات کا بیان کرتی تھیں، وہ مسئلہ معاد کے لیے بھی زمین کو ہموار کر رہی تھیں، کیونکہ ۔۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے ۔۔ معاد کی بحث کی مشکلات خدا کے لیے بے پایاں علم کے طریق کے سوا حل نہیں ہوتیں۔

اس لیے زیر بحث آیت میں پہلے کہتا ہے: "کافروں نے کہا: "یہ جھوٹ ہے کہ کوئی قیامت ہیں پیش آنے والی ہے، ہرگز قیامت ہمارے پاس نہیں آئے گی" (و قال الذین کفروا لا تأتینا الساعة)۔ نہ صرف ہمارے، بلکہ انسانوں میں سے کسی کے لیے بھی قیامت نہیں ہے!

وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ آزادی کے ساتھ جو کام ان کا دل چاہے کرتے رہیں، اور اس امید پر کہ حساب وکتاب اور عدل و انصاف تو کچھ ہوگا ہی نہیں، لہٰذا جو کام بھی ان سے ہوسکے کرلیں۔

لیکن چونکہ قیامت کے دلائل واضح و روشن ہیں، لہٰذا قرآن ایک قاطع اور دوٹوک جملہ کے ساتھ یہاں نتیجہ کی صورت میں پیغمبر سے کہتا ہے کہ: "کہہ دو کہ ہاں! میرے پروردگار کی قسم کہ قیامت تم سب کے پاس ضرور آئے گی" (قل بلی و ربی لتأتینکم)۔

لفظ "رب" پر انحصار اس سبب سے ہے، کیونکہ قیامت ربوبیت کے افعال میں سے ایک فعل اور ایک شان ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا انسان کا مالک و مربی تو ہو، اور انہیں ارتقائی منازل میں آگے بھی بڑھائے لیکن انہیں بیچ میں ادھورا چھوڑ دے، اور ان کے مرتے ہی تمام چیزیں ختم ہوجائیں اور اس کی زندگی بے مقصد اور اس کی پیدائش بیہودہ اور فضول ہوکر رہ جائے۔

سورہ تغابن کی آیہ ۷ میں بھی اسی صفت کا سہارا لیا ہے، چنانچہ فرماتا ہے: "زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ" (کافروں نے یہ گمان کرلیا ہے، کہ وہ ہرگز (زندہ کرکے) اٹھائے نہیں جائیں گے، تم کہہ دو: ہاں! میرے پروردگار کی قسم تم سب کے سب قیامت میں ضرور بالضرور (زندہ کرکے) اٹھائے جاؤ گے، پھر تم سب اپنے اعمال اور ان

Marfat.com

کے نتائج سے آگاہ ہو گئے)۔

چونکہ معاد کی مخالفت کرنے والوں کے اعتراضات میں سے ایک یہ تھا کہ جب انسان کا بدن مٹی ہو جائے گا اور اس کے اجزائے بدن اطراف زمین میں بکھر جائیں گے، تو کون انہیں پہچان سکے گا اور کون انہیں اکٹھا کر سکے گا، اور نئی زندگی کیطرف پلٹا سکے گا؟ دوسری طرف کون ایسا ہے کہ جو بندوں کے تمام پنہاں و آشکار اور اندرونی و بیرونی اعمال کو محفوظ رکھ سکے اور بر موقع ان کا حساب کر سکے؟ لہٰذا اس آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے کہ، "وہ تمام پوشیدہ امور سے باخبر ہے، اور نہ تو تمام آسمانوں میں اور نہ ہی زمین میں، ایک ذرہ کی مقدار کے برابر بھی، اس کے بے پایاں علم کے سامنے چھپا ہوا نہیں رہے گا" (عالم الغیب لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ فی السماوات ولا فی الارض)[1]

"اور نہ تو کوئی چیز ذرّہ سے چھوٹی، اور نہ ہی اُس سے بڑی ایسی ہے، کہ جو سب کی سب کتاب مبین میں ثبت وضبط نہ ہو" (ولا اصغر من ذٰلک ولا اکبر الا فی کتاب مبین)۔ اس طرح سے نہ تو انسان کے بدن کے ذرّوں کا زمین میں بکھر جانا اور نہ ہی ان کا دوسرے موجودات میں مل جانا یہاں تک کہ ان اجزاء کا تمام انسانوں کے بدن میں غذائی مادوں کی صورت میں داخل ہو جانا بھی، ان کو واپس اپنے بدن میں لوٹانے کے لیے کسی قسم کی کوئی مشکل پیدا نہیں کرے گا۔

ان کے اعمال بھی اس جہان میں باقی رہتے ہیں چاہے وہ اپنی شکل کو کتنا ہی بدل لے، وہ ان تمام سے اچھی طرح آگاہ ہے۔

اس تعبیر کی نظیر سورہ "ق" کی آیہ ۳، ۴ میں بھی آئی ہے' ارشاد ہوتا ہے کہ: (ء اذا متنا و کنا ترابا ذٰلک رجع بعید قد علمنا ما تنقص الارض منھم وعندنا کتاب حفیظ) "کیا ہم مر جائیں گے اور (خاک میں مل کر) خاک ہو جائیں گے، تو کیا ہم دوبارہ پلٹ کر آئیں گے؟ یہ بات تو بہت بعید (ناممکن) ہے لیکن انہیں جان لینا چاہیئے کہ ہمیں اس بات کا علم ہے' کہ زمین ان کے اجزاء کو کس طرح سے کم کر رہی ہے' اور اپنے اندر ملاتی جا رہی ہے' اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے کہ جس میں یہ تمام امور محفوظ ہیں"

اس بارے میں کہ "کتاب مبین" سے کیا مراد ہے، بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے: کہ اس سے مراد وہی "لوح محفوظ" ہے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "لوح محفوظ" کیا ہے؟

---

[1] "یعزب"، "عزب" کے مادہ سے اصل میں چراگاہ حاصل کرنے کے لیے گھر والوں سے دور ہونے کے معنی میں ہے، اس کے بعد ہر قسم کے غائب ہونے اور پنہاں ہونے کے معنی میں اطلاق ہوا اور اسی مناسبت سے ان مردوں یا عورتوں کو جو اپنی بیوی یا شوہر سے دُور رہ گئے ہوں "عزب" یا "عزبہ" کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، کہ "لوح محفوظ" کی نزدیک ترین تفسیر جو بیان کی جا سکتی ہے وہی "پروردگار کے علم بے پایاں" کی لوح ہے۔ ہاں! اس لوح میں ہر چیز ثبت وضبط ہے اور اس میں کسی قسم کے تغیر اور دگرگونی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

وسیع وعریض عالم ہستی بھی اسی لوح محفوظ کا انعکاس ہے۔ کیونکہ ہمارے وجود کے تمام ذرات بھی، اور ہمارے تمام اقوال واعمال بھی اس میں محفوظ رہتے ہیں، چاہے ظاہری طور پر صورت کتنی ہی بدل جائے لیکن وہ ختم ہرگز نہیں ہوتے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد دو آیات میں قیامت کے قیام کا مقصد بیان کرتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں منکرین کے لیے موجودہ جہان کے بعد اس قسم کے ایک عالم کے ضروری اور لازمی ہونے کی دلیل کو بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے: "اس سے مقصد یہ ہے کہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل انجام دیئے ہیں، انہیں جزا دے" (لیجزی الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات)۔

ہاں! "اُن کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے" (اولٰئک لھم مغفرۃ و رزق کریم)۔

اگر مومنین کو ان کے نیک عمل کی جزا نہ ملے، تو کیا اصل عدالت کہ جو خلقت کا انتہائی بنیادی اصول ہے معطل نہیں ہو جائے گی؟ کیا پروردگار کی عدالت بغیر کسی مفہوم کے برقرار رہ سکتی ہے؟ جبکہ ہم اس جہان میں بہت سے ایسے افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہرگز اپنے نیک اعمال کی جزا اس دنیا میں نہیں پاتے، اس بناء پر کوئی ایسا جہان ضرور ہونا چاہیئے، تاکہ یہ اصل وہاں پر حقیقت بن سکے۔

"مغفرت" کو "رزق کریم" پر مقدم رکھنا ممکن ہے اس وجہ سے ہو تاکہ مومنوں کو زیادہ تر پریشانی ان لغزشوں کی وجہ سے ہوتی ہے جن کے ہونے کا انہیں احتمال ہوتا ہے، لہٰذا سب سے پہلے ان کی بخشش کو بیان کرکے، انہیں دلی سکون بخشتا ہے، علاوہ ازیں جب تک وہ خدا کی مغفرت کے پانی کے ساتھ (ہر قسم کے گناہ کی گندگی سے) پاک صاف نہ ہو جائیں اس وقت تک وہ "رزقِ کریم" اور "مقام کریم" کے لائق نہیں ہوں گے۔

"رزقِ کریم" ہر قدر وقیمت رکھنے والی روزی کے معنی میں ہے، اور اس کے مفہوم کی وسعت اس حد تک ہے، کہ اس میں تمام مواہب وانعاماتِ خداوندی شامل ہیں، یہاں تک کہ وہ نعمتیں بھی کہ جنہیں نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی شخص کے وہم وگمان میں کبھی آئیں، دوسرے لفظوں میں بہشت اپنی تمام مادی ومعنوی نعمتوں کے ساتھ اس لفظ میں جمع ہے۔

Marfat.com

اگرچہ بعض مفسرین نے "کریم" کی دو چیزوں ۱۔ خوب ۲۔ بغیر دردِ سر کے عنوان سے تفسیر کی ہے؎ لیکن نظر یہ آتا ہے کہ اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

☆ ☆ ☆

چونکہ عدالت کا دوسرا حصّہ گنہگاروں اور مجرموں کو سزا دینے سے متعلق ہے اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے : "وہ لوگ کہ جو ہماری آیات کی تکذیب اور ان کے ابطال وانکار کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، اور یہ تصور کرتے تھے کہ وہ ہماری قدرت کے احاطہ سے باہر نکل سکتے ہیں تو ان کے لیے بد ترین اور دردناک ترین عذاب ہوگا" (والذین سعوا فی اٰیاتنا معاجزین اولٰئك لهم عذاب من رجز الیم)۔

وہاں گفتگو "رزق کریم" کے بارے میں تھی، اور یہاں "رجز الیم" کے بارے میں ہے۔

"رجز" (بروزن کذب) اصل میں "اضطراب" اور "اعتدال کو برقرار رکھنے کی طاقت نہ ہونے کے" معنی میں ہے، لہٰذا جس وقت اونٹ بیمار و ناتواں ہوجاتا ہے، اور وہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ چلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے، تاکہ کچھ نہ کچھ اپنے اعتدال کو برقرار رکھ سکے تو عرب اس حالت کو "رجز" کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہر قسم کے گناہ اور پلیدگی پر اطلاق ہونے لگا۔

لفظ "رجز" (بروزن مرض) کا اطلاق مخصوص جنگی اشعار پر بھی اسی بنا پر ہوتا ہے کہ اس کے مقطع مختصر اور ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔

بہرحال یہاں "رجز" سے مراد بدترین قسم کا عذاب ہے، جس کی لفظ "الیم" کے ذکر کے ساتھ بھی تاکید ہوئی ہے، اور وہ دردناک جسمانی و روحانی عذابوں کی تمام اقسام کو شامل ہے۔

بعض نے اس نکتہ کی طرف بھی توجہ کی ہے، کہ یہاں قرآن نے بہشتیوں کی نعمتوں کو بیان کرتے ہوئے لفظ "من" کو بیان نہیں کیا، تاکہ یہ بات ان کی وسعت کی دلیل ہو لیکن یہ لفظ "من" عذاب کے بارے میں آیا ہے تاکہ نسبتی محدودیت اور رحمت کے بیان کی نشانی ہو۔

"سعوا" "سعی" کے مادہ سے ہر قسم کی سعی و کوشش کے معنی میں آیا ہے اور

؎ "آلوسی" "روح البیان" زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

Marfat.com

یہاں پر آیاتِ حق کی تکذیب و انکار، اور لوگوں کو پروردگار کے دین و آئین کی طرف جھکاؤ سے روکنے کی کوشش کرنا مراد ہے۔

"معاجزین" "معاجزہ" کے مادہ سے عاجز کرنے کے معنی میں ہے، اور اس قسم کے مواقع پر ایسے لوگوں پر اطلاق ہوتا ہے کہ جو کسی کے ہاتھ سے اس طرح فرار کر جائیں کہ وہ ان پر تسلط حاصل نہ کر سکے، یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے، کہ مجرمین کی یہ توصیف اس سوچ کی بنا پر ہے کہ جو ان کے عمل سے نمایاں تھی، ان کے اعمال ایسے لوگوں سے مشابہ تھے کہ جو یہ تصور کرتے تھے کہ وہ جس قسم کا جرم کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور پھر وہ خدا کی قدرت کے احاطہ سے فرار کر جائیں گے۔

Marfat.com

(۶) وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ
هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ○
(۷) وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ
كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ○
(۸) اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ فِى الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ○
(۹) اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ ۭ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ
كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ
عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ○

ترجمہ

(۶) اور وہ لوگ کہ جو علم رکھتے ہیں، وہ تو اس چیز کو، کہ جو تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے، حق سمجھتے ہیں اور۔ یہ کہ ۔ وہ عزیز وحمید خدا کے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

(۷) اور کافروں نے یہ کہا کہ: کیا ہم تمہیں ایسا آدمی دکھائیں کہ جو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ جس وقت تم (مر جاؤ گے اور مٹی ہو جاؤ گے اور) بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے (تو دوبارہ) نئے سرے سے پیدا کیے جاؤ گے۔

Marfat.com

(۸) کیا اُس نے خدا پر جھوٹ بہتان باندھا ہے؟ یا اُسے کسی قسم کا جنون ہے؟ (ایسا نہیں ہے) بلکہ وہ لوگ کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ عذاب اور بہت بڑی گمراہی میں ہیں (اور ان کی گمراہی کی نشانی یہی ان کا شدید انکار ہے)۔

(۹) کیا انہوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان و زمین سے متعلق چیزوں پر نظر نہیں کی' (تاکہ وہ ہر چیز پر خدا کی قدرت سے واقف ہوں) اگر ہم چاہیں تو انہیں (زمین کے ایک زلزلہ کے ساتھ) زمین میں دھنسا دیں، یا آسمان سے (پتھر کا) کوئی ٹکڑا ان پر گرا دیتے، اس میں ہر توبہ کرنے والے بندے کے لیے (خدا کی قدرت کی) واضح نشانی موجود ہے۔

تفسیر

علماٗ تیری دعوت کو حق سمجھتے ہیں

گزشتہ آیات میں ایسے جاہل دل کے اندھوں کے بارے میں گفتگو تھی، کہ جو ان تمام دلائل کے باوجود قطعی طور پر معاد کا انکار کرتے تھے، اور آیاتِ الٰہی کو جھٹلانے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

اسی مناسبت سے زیر بحث آیات میں ان علماء اور صاحبانِ فکر ونظر کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، کہ جو آیاتِ الٰہی کی تصدیق اور دوسروں کو انہیں قبول کرنے کا شوق دلاتے ہیں، فرماتا ہے: "وہ لوگ کہ جو علم رکھتے ہیں، وہ تو اس کو، کہ جو تیرے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے' حق سمجھتے ہیں اور عزیز و حمید پروردگار کے راستہ کی طرف ہدایت کرنے والا جانتے ہیں" (و یری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک من ربک ھو الحق و یھدی الی صراط العزیز الحمید)۔

بعض مفسرین نے " الذین اوتوا العلم" کی اس آیت میں علماٗ اہل کتاب کے اس گروہ

Marfat.com

کے ساتھ تفسیر کی ہے کہ جو قرآن مجید کی حقانیت کے آثار کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس کی بارگاہ میں سرِ تسلیم خم کردیتے ہیں اور اس کے حق ہونے کا اعتراف کرلیتے ہیں۔

اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اس آیت کے مصادیق میں سے ایک مصداق اہلِ کتاب بھی ہوں لیکن صرف انہیں کے لیے محدود کر دینے پر کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ "یری" کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے (وہ دیکھتے ہیں) کہ جو فعل مضارع ہے' اور "الذین اوتوا العلم" کے مفہوم کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ہر عصر و زمانہ اور ہر مکان کے تمام علماء اور صاحبانِ فکر و نظر، اس میں شامل ہیں۔

اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تفسیر علی بن ابراہیم میں یہ تعبیر امیر المومنین علیؑ سے تفسیر ہوئی ہے تو حقیقت میں یہ اس کے اتم و اکمل مصداق کا بیان ہے۔

ہاں! جو بھی غیر متعصب عالم، اس کتاب کے مطالب و مضامین میں غور و فکر کرے گا، تو وہ اس کے پُر مغز معارف، پختہ احکام، حکیمانہ نصیحتوں اور ہلا دینے والے مواعظ سے لے کر اس کے عبرت انگیز تاریخی واقعات اور اعجاز آمیز علمی مباحث تک (دیکھ کر) یہ جان لے گا کہ یہ سب کے سب ان آیات کی حقانیت پر گواہ ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مغربی اور مشرقی علماء اور دانشمندوں کی طرف سے اسلام اور قرآن کے بارے میں مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں کہ جن میں اسلام کی عظمت اور اوپر والی آیت کی صداقت پر بہت ہی بلیغ، واضح اور روشن اعترافات نظر آتے ہیں۔

"ھو الحق" کی تعبیر ایک جامع تعبیر ہے کہ جو قرآن کے تمام مطالب و مشمولات و مضامین پر منطبق ہوتی ہے، چونکہ "حق" واقعیتِ عینی اور اس کے وجودِ خارجی کا نام ہے، یعنی قرآن کے مطالب' عالمِ ہستی اور جہانِ انسانیت کی آفرینش کے قوانین اور واقعیتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

اور چونکہ یہ ایسا ہے لہٰذا راہِ خدا کی طرف ہدایت کرتا ہے، ایسا خدا کہ جو "عزیز" بھی ہے اور "حمید" بھی، یعنی توانائی اور شکست ناپذیر ہونے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی تعریف و ستائش کے لائق ہے، نوعِ بشر کے صاحبانِ اقتدار کی طرح نہیں کہ وہ جس وقت اقتدار اور طاقت کے تخت پر بیٹھتے ہیں تو وہ دھونس، زبردستی، تجاوز، ستم گری اور خود خواہی اور خود غرضی کی راہ اختیار کرلیتے ہیں۔

اس تعبیر کی نظیر سورۂ ابراہیم آیہ ۱ میں بھی بیان ہوئی ہے' جہاں پر وہ کہتا ہے:

" كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ"، "وہ کتاب ہے کہ جو ہم نے تم پر اس لیے نازل کی ہے تاکہ لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے (گمراہی کی) تاریکیوں سے (علم و ایمان کی) روشنی کی طرف خدائے

Marfat.com

عزیز و حمید کے راستہ پر نکال لے جاؤ۔"

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ جو ہستی صاحب قدرت بھی ہے اور لائق حمد وستائش بھی، عالم وآگاہ بھی ہے اور رحیم ومہربان بھی، صرف اس کا راستہ مطمئن ترین راستہ اور مستقیم ترین طریقہ ہے، اور جو لوگ اس کے راستہ پر چلتے ہیں تو وہ خود کو سرچشمہ قدرت اور ہر قسم کے اوصاف حمیدہ سے قریب اور نزدیک کر لیتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں دوبارہ قیامت اور معاد کے مسئلہ کی طرف پلٹتا ہے اور گزشتہ بحثوں کی ایک دوسری شکل میں تکمیل کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کافروں نے کہا، کیا ہم تمہیں ایسا آدمی دکھائیں کہ جو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ جس وقت تم سب کے سب مٹی ہو جاؤ گے اور تمہارے بدن کے ذرات ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے اور ہر ذرہ کسی گوشہ میں ٹھکانا بنالے گا (یا شاید کسی حیوان یا کسی دوسرے انسان کے بدن کا جزو ہو جائے گا) تو تم دوبارہ ایک نئی خلقت وآفرینش میں پلٹ آؤ گے" (وقال الذین کفروا ھل ندلکم علیٰ رجل ینبئکم اذا مزّقتم کل ممزّق انکم لفی خلق جدید)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ معاد پر ان کے انکار کے اصرار کی دو باتیں تھیں، پہلی بات یہ تھی کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ معاد کہ جسے پیغمبر اسلام بیان کر رہے ہیں (معاد جسمانی) ایک ایسا مطلب ہے کہ جس کو آسانی کے ساتھ رد کیا جا سکتا ہے اور جس کے بارے میں وہ عامۃ الناس کو بدظن کر سکتے ہیں اور آسانی کے ساتھ اس کی نفی کر سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ معاد کا اعتقاد یا احتمالی طور پر اسے قبول کر لینا بہرحال انسان میں مسئولیت اور ذمہ داری پیدا کرتا ہے اور اسے حق کی سوچ اور جستجو کے لیے آمادہ کرتا ہے اور یہ ایک ایسا مطلب تھا کہ جو کفر کے سرغنوں کے لیے سخت خطرناک شمار ہوتا تھا، لہٰذا انہیں اس بات پر اصرار تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے معاد کی فکر اور اعمال کے بدلے میں جزا یا سزا کا خیال لوگوں کے دماغ سے باہر نکال دیں۔

وہ کہتے تھے کہ کیا یہ بات ممکن ہے کہ یہ بوسیدہ ہڈیاں، یہ بکھری ہوئی مٹی کہ جس کے ذرات کو تیز ہواؤں کے جھکڑ ہر طرف لے جاتے ہیں، ایک دن جمع ہو کر اسے زندگی کا لباس پہنا دیں گے؟

اور یا یہ کہ وہ پیغمبرؐ کو "رجل" کے ساتھ تعبیر کرتے تھے، وہ بھی نکرہ کی صورت میں، تو یہ تحقیر کی بنا پر تھا۔

لیکن انہوں نے اس حقیقت کو بھلا دیا تھا کہ ہم ابتدا میں بھی تو پراگندہ اجزا ہی تھے، ہمارے

Marfat.com

بدن میں موجود پانی کا ہر قطرہ کسی سمندر یا چشمہ کے کسی گوشہ میں تھا اور ہمارے جسم کے آبی اور معدنی مادہ کا ہر ذرہ زمین کے کسی کونے میں پڑا ہوا تھا، تو جس طرح ابتدا میں خدا نے انہیں جمع کیا تھا، اسی طرح آخر میں بھی وہ اس امر پر قدرت رکھتا ہے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ اسی بات کو اس کے کہنے والے کی دروغ گوئی یا جنون کی دلیل قرار دیتے تھے اور وہ یہ کہتے تھے: "کیا اس نے خدا پر جھوٹ بہتان باندھا ہے، یا اسے کسی قسم کا جنون ہے" (افترٰی علی اللہ کذبًا ام بہ جنۃ)۔

ورنہ ایک سچے اور عقلمند انسان کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ اس قسم کی بات کرے؟!

لیکن قرآن قطعی اور دو ٹوک طریقہ سے انہیں اس طرح جواب دیتا ہے: "یہ بات نہیں ہے، نہ تو وہ دیوانہ ہے اور نہ ہی جھوٹا، بلکہ وہ لوگ کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ عذاب اور انتہائی گمراہی میں ہیں" (بل الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ فی العذاب والضلال البعید)۔

اس سے زیادہ واضح اور آشکار گمراہی اور کیا ہوگی، کہ انسان معاد کا منکر ہو جائے، وہ معاد کہ جس کا نمونہ وہ ہر سال اپنی آنکھوں کے سامنے، عالم طبیعت میں اور مُردہ زمینوں کے زندہ ہونے میں، دیکھتے ہیں۔

وہ معاد کہ اگر وہ نہ ہو تو اس جہان کی زندگی بغیر کسی مفہوم اور مطلب کے ہے۔

اور بالآخر وہ معاد کہ جس کا انکار کرنا، پروردگار کی قدرت، عدل و حکمت کے انکار کرنے کے برابر ہے۔

لیکن وہ یہ کیوں کہتا ہے کہ وہ اسی وقت عذاب و گمراہی میں ہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں بہت سی مشکلیں اور حادثات پیش آتے ہیں کہ جنہیں انسان آخرت پر ایمان کے بغیر برداشت نہیں کر سکتا۔

واقعاً اگر زندگی دنیا کی عمر کے انہیں چند دنوں میں محدود ہوتی تو موت کا تصور ہی ہر شخص کے لیے ایک وحشتناک عذاب بن جاتا، اسی وجہ سے منکرینِ معاد ہمیشہ ایک قسم کی جانکاہ پریشانی اور دردناک عذاب کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں، جبکہ معاد پر ایمان رکھنے والے موت کو عالم بقا کے لیے ایک دریچہ اور قفس دنیا کے ٹوٹنے اور اس قید خانے سے آزاد ہونے کا ایک وسیلہ اور ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ہاں! معاد پر ایمان، انسان کو آرام و سکون بخشتا ہے، مشکلات کو قابلِ برداشت بناتا ہے اور ایثار و فداکاری اور جانبازی کو انسان کے لیے آسان بنا دیتا ہے۔

اصولی طور پر وہ لوگ کہ جو معاد و قیامت کو دروغ گوئی یا جنون کی دلیل شمار کرتے تھے، وہ اپنے

Marfat.com

کفر و جہالت کی وجہ سے تاریک بینی کے عذاب اور دور دراز کی گمراہی میں گرفتار تھے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس عذاب کو عذابِ آخرت کی طرف اشارہ کہا ہے لیکن آیت کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ابھی اسی وقت اسی جہان میں عذاب و گمراہی میں مبتلا ہیں۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد معاد کے بارے میں ایک اور دلیل — ایسی دلیل کہ جو ہٹ دھرم غافلوں کو جھنجھوڑنے والی ہے — پیش کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے کہ: "کیا انہوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان و زمین سے متعلق چیزوں پر نظر نہیں کی"؟ (افلم یروا الی ما بین ایدیھم وما خلفھم من السماء والارض)۔

یہ باعظمت آسمان، ان تمام عجائبات کے ساتھ، ان تمام ثابت و سیار ستاروں کے ساتھ، اور ان نظاموں کے ساتھ کہ جو اس پر حاکم ہیں، اسی طرح یہ زمین، اپنی تمام عجیب و غریب اور انواع و اقسام کے زندہ موجودات و برکات اور اس کے مواہب کے ساتھ، آفریدگار کی قدرت کی واضح ترین بولتی ہوئی دلیلیں ہیں۔

وہ ہستی کہ جو ان تمام امور پر قدرت رکھتی ہے، کیا وہ انسان کو موت کے بعد دوبارہ عالمِ حیات کی طرف لوٹانے سے عاجز ہے؟!

یہ وہی "برہانِ قدرت" ہے کہ جس کے ساتھ قرآن کی دوسری آیات میں منکرینِ معاد کے مقابلہ میں استدلال ہوا ہے، منجملہ اُن کے سورہ یٰسین کے آخر آیہ ۸۲ میں اور سورہ اسراء آیہ ۹۹ اور سورہ ق کی آیہ ۶، ۷ میں بھی استدلال ہوا ہے۔

ضمنی طور پر یہ جملہ، ان متعصب دل کے اندھوں کی تہدید کے لیے، کہ جو اس بات پر مصر ہیں کہ تمام حقائق سے آنکھیں بند کرلیں، ایک مقدمہ اور تمہید ہے، لہٰذا اس کے بعد فرماتا ہے کہ: "اگر ہم چاہیں تو زمین کو یہ حکم دے دیں کہ وہ ان کے جسم کو نگل لے"، ایک ایسا زلزلہ آئے کہ جس سے زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں دفن ہو جائیں۔ (ان نشأ نخسف بھم الارض)۔

"اور اگر ہم چاہیں تو یہ حکم دے دیں کہ آسمانی پتھروں کے ٹکڑے ان پر برسنے لگیں" اور خود انہیں بھی اور ان کے گھر بار اور ان کی زندگی کو بھی درہم برہم کر دیں! (او نسقط علیھم کسفاً من السماء)۔

ہاں! اس بات میں خدا کی قدرت اور ہر چیز پر اس کی توانائی کی واضح اور روشن نشانی موجود ہے" لیکن (یہ نشانی) "ہر اُس بندے کے لیے ہے کہ جو خدا کی طرف رجوع کرے اور اس میں غور و فکر کرے" (ان فی ذالک لآیة لکل عبد منیب)۔

ہر شخص نے اپنی زندگی میں زلزلوں، زمین کے پھٹنے اور اُس میں (لوگوں کے) دھنس جانے کو دیکھا

Marfat.com

یا سنا ہوگا، علاوہ ازیں فضا سے آسمانی پتھروں (شہابوں) کے گرنے یا بجلیوں کے گرنے یا آتش فشانیوں کے نتیجہ میں پہاڑوں کو ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے دیکھا یا سُنا ہے، ہر عقلمند انسان یہ جانتا ہے کہ ان امور کا واقع ہونا ہر لحہ اور ہر جگہ ممکن ہے، اگر زمین آرام و سکون میں ہے اور آسمان ہمارے لیے امن و امان بنا ہوا ہے تو یہ کسی دوسری ہستی کی قدرت و فرمان کی وجہ سے ہے، ہم جو ہر طرف سے اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، معاد کے سلسلے میں اس کی توانائی و قدرت کا کس طرح انکار کر سکتے ہیں! یا اس کی حکومت کی حدود سے کیسے فرار کر سکتے ہیں۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ باوجود اس کے کہ آسمان سر کے اوپر اور زمین پاؤں کے نیچے ہے' اوپر والی آیت میں "ما بین ایدیھم" (جو ان کے آگے ہے) "وماخلفھم" (اور جو ان کے پیچھے ہے) سے تعبیر ہوئی ہے اور قرآن میں صرف یہی ایک ایسا موقع ہے کہ جس میں یہ تعبیر نظر آتی ہے، یہ تعبیر ممکن ہے کہ اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ آسمان کا منظر سورج، چاند اور ستاروں کے طلوع و غروب کے وقت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت اس لحہ زیادہ واضح ہوتی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ انسان جب افق کی طرف رخ کیے کھڑا ہوتا ہے تو یہ منظر اس کے سامنے ہوتا ہے اور زمین کہ جو اہمیت میں اس کے بعد قرار پاتی ہے اس کے پیچھے کہلائے گی۔

علاوہ ازیں اگر یہ مغرور غافل اپنے آپ کو اتنی بھی اجازت نہیں دیتے کہ اپنے سر کے اوپر دیکھ لیں تو کم از کم اپنے سامنے ہی جو کچھ افق کے قریب دکھائی دیتا ہے' اسے کیوں نہیں دیکھتے۔

۲۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کرۂ ارض کے اندر پگھلنے اور جلانے والے مادے موجود ہیں، کہ جو ہر وقت جوش میں ہوتے ہیں' اور درحقیقت تمام انسانوں کی زندگی بالقوہ آتش فشانوں کے ایک مجموعہ پر برقرار ہے، بس! اللہ کا ایک چھوٹا سا فرمان ہی کافی ہے کہ ان آتش فشانوں میں سے کوئی سا ایک آتش فشاں پھٹ پڑے اور ایک عظیم علاقے کو لرزا کے رکھ دے اور پتھر، پگھلا ہوا مواد اور جلانے والے مادے وہاں پھینک دے۔

اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر رات اور دن میں لاکھوں چھوٹے بڑے سرگرداں پتھر زمین کی فضا میں گھوم رہے ہیں اور اسی میں جذب ہو جاتے ہیں، اگر وہ زمین کے گرداگرد پھیلی ہوئی فضا کے قشر سے نہ ٹکراتے، کہ جو اُن کے بھڑک کر جل جانے کا سبب بنتی ہے — تو زمین پر رہنے والوں پر ہمیشہ آسمان کی طرف سے پتھروں کی بارش ہوتی رہتی، اب بھی ان کی طاقت اور شدت اس قدر ہے کہ وہ بعض اوقات ان رکاوٹوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے زمین پر آگرتے ہیں، اور یہ خدا کی طرف سے ایک تنبیہ ہے۔

Marfat.com

اس بنا پر اگر ہم سارے کے سارے انسان خطرے کے ان دونوں منبعوں کے درمیان خدا کے حکم سے انتہائی آرام وسکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں تو کیا یہی بات اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم اس کی عظیم قدرت کو معلوم کر کے اس کے آستانہ پر سرِ نیاز جھکائیں ؟!

٭ ٭ ٭

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آخری آیت کے آخر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان چیزوں میں خدا کی عظمت وقدرت کی واضح وروشن آیت اور نشانی موجود ہے لیکن یہ نشانی ہر "اس بندے کے لیے ہے کہ جو اس کی طرف رجوع کرے"۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ وہ باغی اور سرکش لوگ کہ جنہوں نے عبودیت کا طوق اپنی گردن سے نکال دیا ہے اور اسی طرح سے وہ غافل بندے کہ جو اپنے غلط اور گناہ آلود راستے پر مسلسل طور پر چلے جا رہے ہیں اور اپنے کاموں سے توبہ کر کے خدا کی طرف رجوع نہیں کرتے، ان واضح وروشن آیات سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔

کیونکہ صرف آفتاب کا موجود رہنا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ (دیکھنے کے لیے) دیکھنے والی آنکھ اور آنکھوں کے سامنے سے پردوں کا ہٹانا بھی ضروری ہے۔

٭ ٭ ٭

Marfat.com

۱۰ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ
وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۙ ○
۱۱ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۖ
اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○

ترجمہ

۱۰ ہم نے داؤد کو اپنے فضل سے ایک عظیم نعمت بخشی (ہم نے پہاڑوں اور پرندوں سے کہا) اے پہاڑو! اور اے پرندو تم اس کے ساتھ ہم آواز ہوجاؤ (اور اس کے ساتھ خدا کی تسبیح کہو) اور ہم نے لوہے کو اُس کے لیے نرم کر دیا۔

۱۱ (اور ہم نے انہیں حکم دیا کہ تم) کامل اور فراخ زرہیں بناؤ، اور حلقوں کو مناسب اندازے سے بناؤ، اور صالح اور نیک عمل بجالاؤ، یقیناً میں تمہارے عمل کو دیکھ رہا ہوں۔

تفسیر

داؤدؑ پر خدا کے عظیم انعامات

چونکہ گزشتہ بحث کی آخری آیت میں گفتگو "عبد منیب" اور توبہ کرنے والے بندے کے بارے میں تھی، اور ہم جانتے ہیں کہ یہ توصیف بعض آیات میں (سورہ ص آیہ ۲۴) داؤد پیغمبر کے لیے جس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ بیان ہوگی۔ ذکر ہوئی ہے، اس بناء پر بہتر معلوم ہوتا ہے، کہ اس عظیم پیغمبر اور ان کے فرزند حضرت سلیمانؑ کے حالات کا ایک گوشہ نمونہ کے طور پر بیان کیا جائے

Marfat.com

اور گزشتہ بحث مکمل ہو جائے، اور ضمنی طور پر یہ بات اُن تمام افراد کے لیے ایک تنبیہ ہو کہ جو خدا کی نعمتوں کو فراموش کر دیتے ہیں، اور جس وقت تختِ اقتدار پر بیٹھتے ہیں تو پھر وہ خدا کے بندے ہی نہیں رہتے۔

پہلی آیت میں کہتا ہے: "ہم نے داؤد کو اپنے فضل سے ایک نعمت بخشی تھی" (ولقد اٰتینا داؤد منا فضلاً)۔

لفظ "فضل" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جو اُن تمام مواہب اور نعمتوں کو کہ جو خدا نے داؤدؑ کو عطا کی تھیں، شامل ہے، اور "نکرہ" کی صورت میں اس کا ذکر اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

حضرت داؤدؑ کو پروردگار کی طرف سے بہت سی نعمتیں۔ چاہے وہ معنوی پہلو رکھتی ہوں یا مادی حاصل تھیں کہ جن کو قرآنی آیات نے بیان کیا ہے۔

ایک مقام پر کہتا ہے کہ: "ہم نے اُسے اور اس کے بیٹے کو بہت سا علم دیا اور انہوں نے کہا، خدا کا شکر ہے کہ جس نے ہمیں اپنے بہت سے بندوں پر فضل و برتری بخشی" "ولقد اٰتینا داؤد و سلیمان علمًا و قالا الحمد للہ الذی فضلنا علیٰ کثیر من عبادہ المؤمنین" (نمل۔۱۵)

دوسری جگہ خصوصیت کے ساتھ حیوانات سے باتیں کرنے کا علم رکھنے پر انحصار کیا ہے، اور اسے ایک عظیم نعمت کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے: "یا ایھا الناس علمنا منطق الطیر واوتینا من کل شیءٍ ان ھٰذا لھو الفضل المبین" (اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر چیز سے بہرہ مند کیا گیا ہے اور یہ ایک واضح و آشکار فضیلت ہے پروردگار کی طرف سے)۔ (نمل۔۱۶)

وہ مختلف معجزات، کہ جن کے متعلق زیرِ بحث آیت کے ذیل میں گفتگو ہوگی، ان فضائل کا ایک حصّہ ہے، علاوہ ازیں بہت ہی عمدہ لحن اور آواز، اور عادلانہ قضاوت پر قدرت کہ جس کی طرف سورہ "ص" میں اشارہ ہوا ہے، اس فضلِ الٰہی کا ایک دوسرا حصہ شمار ہوتا ہے، اور سب سے زیادہ اہم فضیلت نبوت و رسالت کی فضیلت ہے جو خدا نے داؤدؑ کو عطا فرمائی تھی۔

بہرحال اس اجمالی اشارہ کے بعد اس کی تفصیل شروع ہوتی ہے اور ان کے کچھ معنوی فضائل اور چند مادی فضائل اس طرح بیان کرتا ہے: "ہم نے پہاڑوں سے کہا کہ تم داؤد کے ساتھ ہم آواز ہو جاؤ، اور اسی طرح اے پرندو! تم بھی اس کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملاؤ، اور جس وقت وہ خدا کا ذکر اور تسبیح کرے تو تم بھی زمزمہ سرائی کرو" (یٰجبال اوبی معہ والطیر)۔

لفظ "اوبی" اصل میں "تاویب" سے آواز کو گلے میں گھمانے اور پھیرنے کے معنی میں ہے، یہ مادہ کبھی توبہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ اس کی حقیقت خدا کی طرف بازگشت ہے۔

Marfat.com

اگرچہ عالم کے تمام ذرات خدا کا ذکر تسبیح اور حمد کرتے ہیں، خواہ کوئی داؤد ان کے ساتھ ہم صدا ہو یا نہ ہو، لیکن داؤدؑ کا امتیاز یہ تھا کہ اُن کے صدا بلند کرنے اور تسبیح کی نغمہ سرائی کے وقت ان موجودات کے اندر جو کچھ پوشیدہ تھا وہ آشکار و ظاہر ہو جاتا تھا اور اندرونی زمزمہ بیرونی نغمہ کے ساتھ تبدیل ہو جاتا تھا، جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ کے ہاتھ پر "سنگریزہ" کی تسبیح کے بارے میں بھی روایات آئی ہیں۔

ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

"انہ خرج یقرأ الزبور وکان اذا قرأ الزبور لا یبقی جبل ولا حجر ولا طائر الّا اجابہ!"

"داؤدؑ، دشت و بیابان کی طرف نکلے اور جس وقت آپ زبور کی تلاوت کرتے تو کوئی پہاڑ اور پتھر اور پرندہ ایسا نہ تھا کہ جو اُن کے ساتھ ہم آواز نہ ہوتا ہو" [۱]

اس معنوی فضیلت کا ذکر کرنے کے بعد ایک مادی فضیلت کا بیان شروع کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا" (والنالہ الحدید)۔

ہوسکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ خدا نے داؤدؑ کو معجزانہ طور پر لوہے کو نرم کرنے کا طریقہ سکھایا تھا، اس طرح سے کہ وہ اس سے زرہ بنانے کے لیے مضبوط و محکم اور پتلی پتلی نازک قسم کی کڑیاں بنا سکیں، یا یہ کہا جائے کہ داؤدؑ سے پہلے بھی جنگوں میں دفاع کے لیے لوہے کی سلیٹوں سے استفادہ ہوتا تھا، کہ جو بھاری بھی ہوتی تھیں، اور اگر انہیں پہنا جاتا تو وہ اتنی خشک اور بے لچک بھی ہوتی تھیں کہ جو جنگجو غازیوں کے لیے انتہائی پریشان کن ہوتی تھیں، کوئی بھی شخص اس زمانہ تک لوہے کی باریک اور مضبوط کڑیوں سے زرہ کی مانند کوئی ایسی چیز نہ بنا سکا تھا کہ جو لباس کی مانند آسانی کے ساتھ بدن پر آسکے اور بدن کی حرکات کے ساتھ نرم اور رواں رہے۔

لیکن آیت کا ظاہر یہ ہے کہ لوہے کا داؤدؑ کے ہاتھ میں نرم ہونا، خدا کے حکم سے اور معجزانہ صورت میں انجام پذیر ہوتا تھا۔ اس بات میں کیا چیز مانع ہے کہ وہی ذات کہ جو بھٹی کو لوہا نرم کرنے کی خاصیت بخشتی ہے، اسی خاصیت کو ایک دوسری شکل میں داؤدؑ کے پنجوں میں قرار دے دے۔ بعض اسلامی روایات میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے [۲]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے داؤدؑ کی طرف وحی بھیجی کہ:

"نعم العبد انت الا انک تأکل من بیت المال فبکی داؤد اربعین

---

[۱] کمال الدین صدوق، (المیزان، جلد ۱۶، ص ۳۹۰ کے مطابق)۔

[۲] تفسیر برہان جلد ۳، ص ۳۴۳ و تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۱۵۔

Marfat.com

صباحاً فالان الله له الحديد وكان يعمل كل يوم درعاً ... فاستغنى عن بيت المال "

"تم ایک اچھے آدمی ہو مگر تم بیت المال سے اپنی روزی حاصل کرتے ہو، داؤدؑ چالیس دن تک روتے رہے، (اور خدا سے اس کے حل کی درخواست کی) تو خدا نے لوہے کو ان کے لیے نرم کر دیا اور ہر روز ایک زِرہ بنا لیتے تھے.... اور اس طرح سے وہ بیت المال سے بے نیاز ہو گئے "[1]

یہ ٹھیک ہے کہ بیت المال ایسے لوگوں پر خرچ کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ جو معاشرے کی بغیر عوض کے خدمت کرتے ہیں' اور ایسے اہم بوجھ اٹھاتے ہیں کہ جو پسماندہ ہوں لیکن یہ بات زیادہ بہتر ہے کہ انسان اس خدمت کو بھی انجام دے اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے ۔ توانائی کی صورت میں ۔ گذر اوقات کرے اور داؤدؑ یہ چاہتے تھے کہ وہ اسی قسم کے ممتاز بندے بنیں ۔

بہرحال داؤدؑ اس توانائی کے ذریعہ ۔ کہ جو خدا نے انہیں دی تھی، بہترین طریق یعنی جہاد کا وسیلہ بنانے سے، ایسا وسیلہ جو دشمن سے حفاظت کرے ۔ استفادہ کرتے تھے، اور اس سے زندگی کے عام وسائل میں ہرگز فائدہ نہ اٹھایا، اور عجب یہ کہ اس کی آمدنی سے ۔ بعض روایات کے مطابق ۔ اپنی سادہ زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے علاوہ کچھ نہ کچھ حاجت مندوں پر بھی خرچ کیا کرتے تھے[2]
ان تمام باتوں کے علاوہ اس کام کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وہ ان کا ایک بولتا ہوا معجزہ شمار ہوتا تھا ۔

بعض مفسرین نے اس طرح نقل کیا ہے کہ "لقمان" داؤدؑ کے پاس اس وقت پہنچے، جبکہ وہ پہلی زِرہ بنا رہے تھے، وہ لوہے کو بٹ بٹ کر کڑیوں اور حلقوں کی صورت میں بنا رہے تھے، اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ آپس میں جوڑ رہے تھے ۔ اس عجیب وغریب منظر کو دیکھ کر لقمان حیران رہ گئے اور وہ سوچنے لگے (کہ یہ کیا ہو رہا ہے) اُسے دیکھتے رہے، لیکن کوئی سوال نہ کیا، یہاں تک کہ داؤدؑ نے زِرہ بنا کر تیار کر لی، اور کھڑے ہو کر اسے پہن لیا، اور کہا کہ جنگ میں دفاع کے لیے یہ کیسا اچھا ذریعہ ہے، لقمان نے جو اس کا اصل مقصد سمجھ چکے تھے کہا کہ: الصمت حكمة وقليل فاعله!
"خاموشی حکمت ہے مگر بہت کم لوگ اسے انجام دیتے ہیں "[3]

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

[2] تفسیر ابو الفتوح رازی، جلد ۹ صفحہ ۱۹۲ ۔

[3] مجمع البیان' زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

Marfat.com

بعد والی آیت داؤدؑ کے زرہ بنانے اور اس سلسلے میں پروردگار کے بہت ہی پُر معنی فرمان کی شرح ہے، کہتا ہے: "ہم نے اس سے کہا کہ مکمل زرہیں بناؤ اور اس کے حلقوں کو اندازے کے ساتھ اور مناسب رکھو" (ان اعمل سابغات و قدر فی السرد)۔

"سابغات" "سابغ کی جمع" کامل اور فراخ زرہ کے معنی میں ہے، اور "اسباغ نعمت" بھی نعمت کی فراخی کے معنی میں ہے۔

"سرد" اصل میں زرہ جیسی سخت چیزوں کو بُننے کے معنی میں ہے، اور "قدر فی السرد" کے جملہ کا مفہوم وہی زرہ کے حلقوں میں مناسب اندازوں کا خیال رکھنا، اور اس کے بُننے کی طرز ہے۔

درحقیقت خدا داؤدؑ کو ایسا حکم دے رہا ہے کہ جو ساری دنیا جہان کے باایمان صنعت کاروں کاریگروں کے لیے ایک نمونہ ہو، یہ مصنوعات میں پختہ کاری و مضبوطی اور ان کی کیفیت وکمیت میں انتہائی احتیاط برتنے کا حکم ہے، تاکہ انہیں استعمال کرنے والے اچھی طرح اور راحت وسکون کے ساتھ اس سے استفادہ کرسکیں اور کامل استحکام سے فائدہ اٹھائیں۔

داؤدؑ سے کہتا ہے: زرہ کو کشادہ اور آرام دہ بناؤ، تاکہ جنگ کرنے والے اسے پہنتے وقت قید خانہ میں ہی گرفتار نہ ہو جائے، نہ تو اس کے حلقوں کو اندازہ سے زیادہ چھوٹا اور باریک بناؤ کہ اُس میں لڑنے کی حالت ہی باقی نہ رہے، اور نہ ہی زیادہ سخت اور کناروں کے بغیر کہ کبھی تلوار وخنجر و نیزہ و تیر کی نوک ہی اس کے اندر چلی جائے، بلکہ اس کی ہر چیز اندازے کے مطابق اور مناسب ہو۔

خلاصہ یہ کہ خدا نے اس کے اصلی "مادہ" کو بھی "النا لہ الحدید" کے مطابق داؤدؑ کے اختیار میں دے دیا، اور اس کی شکل وصورت بنانے کی طرز اور زرہ بنانے کا طریقہ بھی داؤدؑ کو سکھا دیا، تاکہ اس "مادہ" اور "صورت" سے ایک کامل و مکمل نتیجہ برآمد ہو۔

آیت کے آخر میں داؤدؑ اور ان کے خاندان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے، کہ: "عمل صالح بجالاؤ، کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو میں اُسے دیکھ رہا ہوں" (واعملوا صالحاً انی بما تعملون بصیر)۔

آیت کی ابتداء میں صرف داؤدؑ مخاطب ہیں اور آخر میں وہ اور ان کا خاندان یا وہ اور اُن کی قوم (مخاطب) ہیں، کیونکہ یہ تمام مسائل عمل صالح کے لیے ایک مقدمہ

Marfat.com

اور تمہید ہیں، زرہ بنانے کا مقصد آمدنی کا حصول نہیں ہے، اصل مقصد عمل صالح ہے' اور یہ چیزیں اس راہ میں ایک وسیلہ اور ذریعہ ہیں، کہ جن سے داؤدؑ بھی فائدہ اٹھاتے تھے اور ان کا خاندان بھی۔

اور عمل صالح کے شئون وحالات میں سے ایک یہ ہے کہ مصنوعات میں ہر طرح سے کافی و وافی احتیاط کو ملحوظ رکھیں، اور ایک مفید اور کامل پیدا وار تیار کر کے دکھائیں' اور ہر طرح کی برائی اور کمی رکھنے سے پرہیز کریں۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس خطاب کے مخاطب داؤدؑ اور وہ تمام لوگ ہیں کہ جو ان کے ہاتھ سے بنی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھاتے تھے، اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دفاعی وسیلہ اور ذریعہ کو عمل صالح کی راہ میں استعمال کریں، نہ کہ ظلم وجور اور گناہ کی راہ میں۔

Marfat.com

(۱۲) وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ
وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ
يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ
مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

(۱۳) يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَاۗءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ
كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ۭ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَ
قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝

(۱۴) فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰي مَوْتِهٖٓ اِلَّا
دَاۗبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ
اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝

ترجمہ

(۱۲) اور ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تھا کہ وہ صبح کے وقت بھی ایک مہینہ کی راہ طے کیا کرتی، اور شام کے وقت بھی ایک مہینے کی راہ طے کرتی تھی، اور ہم نے ان کے لیے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا تھا، اور خدا کے حکم سے جنوں کا ایک گروہ، ان کی خدمت میں کام سرانجام دیا کرتا تھا، اور ان میں سے جو کوئی ہمارے حکم سے روگردانی کرتا تھا، تو ہم اُسے جلانے والی آگ کا مزہ چکھاتے تھے۔

Marfat.com

(۱۳) جو کچھ سلیمان چاہتے تھے وہ ان کے لیے بناتے رہتے تھے، عبادت خانے، تصویریں (یا مورتیاں) کھانے کے لیے بڑے بڑے حوض جیسے برتن اور ایک ہی جگہ جمی ہوئی دیگیں (جو بڑی بڑی ہونے کی وجہ سے نقل وحمل کے قابل نہ تھیں، اور ہم نے ان سے کہا): "اے آلِ داؤد! تم (ان نعمتوں کا) شکر بجا لاؤ، لیکن میرے بندوں میں سے بہت کم لوگ شکر کرنے والے ہیں۔

(۱۴) (سلیمان کی اس شان وشوکت اور جاہ وجلال کے باوجود) جب ہم نے ان کے لیے موت کا حکم جاری کر دیا، تو کسی نے بھی اس کے مرنے کی انہیں خبر نہ دی، سوائے زمین پر چلنے والی (دیمک) کے کہ جو اُس کے عصا کو کھا رہی تھی، (یہاں تک کہ وہ عصا ٹوٹ گیا اور سلیمان کا جسم زمین پر آگرا) جب وہ زمین پر گرے تو اُس وقت جنوں نے سمجھا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو وہ اس ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔

تفسیر

سلیمان کا جاہ وجلال اور ان کی عبرت انگیز موت

ان مواہب کی بحث کے بعد کہ جو خدا نے داؤدؑ کو دیئے تھے، ان کے بیٹے سلیمانؑ کا ذکر شروع کیا ہے۔ داؤدؑ کے بارے میں تو دو نعمتوں کا بیان کیا تھا، لیکن ان کے بیٹے سلیمانؑ کے بارے میں تین عظیم نعمتوں کے متعلق بحث کرتا ہے، فرماتا ہے: "ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، جو صبح کے وقت بھی ایک ماہ کی راہ طے کرتی تھی اور عصر کے وقت بھی ایک ماہ کی راہ چلتی تھی" (ولسلیمان الریح غدوھا شھر و

Marfat.com

رواحھا شھر) لہ

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ باپ کے لیے تو سخت اور حد سے زیادہ محکم جسم یعنی لوہے کو مسخر کرتا ہے اور بیٹے کے لیے بہت ہی لطیف موجود کو مسخر کیا ہے، لیکن دونوں کام اصلاحی اور معجزہ نما ہیں' اور مفید ہیں، سخت جسم کو تو داوٗدؑ کے لیے نرم کرتا ہےٗ اور ہَوا کی لطیف و نرم امواج کو سلیمانؑ کے لیے فعال اور محکم۔

ہَوا کی لطافت ہرگز اس سے مانع نہیں ہے کہ وہ اہم افعال کو انجام دے، یہ ہَوائیں ہی تو ہوتی ہیں کہ جو بڑے بڑے بحری جہازوں کو سمندروں کی سطح پر چلاتی ہیں' اور چکی کے بھاری اور سنگین پتھروں کو چکر دیتی ہیں اور بڑے بڑے پیکروں کو آسمان کی بلندی پر ہوائی جہازوں کی شکل میں چلاتی ہیں۔

ہاں! خدا نے اس لطیف جسم کو اس حیران کن قدرت و طاقت کے ساتھ حضرت سلیمانؑ کے اختیار میں دے دیا تھا۔

یہ بات کہ ہَوا سلیمانؑ کی دستگاہ (اس کے تخت یا فرش کو) کس طرح چلاتی تھی، ہمارے لیے واضح نہیں ہے، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ کوئی چیز خدا کی قدرت کے مقابلہ میں مشکل اور پیچیدہ نہیں ہے، جہاں انسان اپنی ناچیز قدرت کے ساتھ غباروں (یعنی ان حفاظتی چیزوں کو کہ جن میں ہلکی گیس بھر دیا کرتے تھے اور وہ آسمان کی طرف پرواز کر جاتے تھے اور بعض اوقات کچھ آدمیوں کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے) اور موجودہ زمانے میں دیوہیکل بڑے بڑے ہَوائی جہاز سینکڑوں مسافروں اور زیادہ سے زیادہ وسائل اور سازوسامان کے ر[illegible] آسمان، کی بلندیوں میں پرواز کرتے ہیں' تو خدا کے لیے سلیمانؑ [illegible] بساط کو ہَوا کے ذریعہ چلانا کیسے مشکل ہو سکتا ہے؟

وہ کون سے عوامل تھے کہ جو سلیمانؑ اور ان کی بساط و مسند کو گرنے، ہَوا کے دباوٗ اور آسمانی حرکت سے پیدا ہونے والی دوسری مشکلات سے حفاظت کرتے تھے؟! یہ بات بھی ایسے مسائل میں سے ہے کہ جن کی جزئیات ہمارے لیے واضح نہیں ہیں، لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ انبیاء کی تاریخ میں اس قسم کی خارقِ عادت چیزیں بہت تھیں، اگرچہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کچھ نادان لوگوں یا دانا دشمنوں نے ان میں خرافات کی آمیزش کر دی ہے، جس کے باعث ان مسائل کا اصلی چہرہ دگرگوں اور بدنما ہو گیا ہےٗ اور ہم اس سلسلہ میں صرف اتنی ہی مقدار پر' کہ جتنا قرآن

لہ "لسلیمان" میں جار و مجرور ایک مقدر فعل سے متعلق ہے، یعنی "سخرنا"، کہ جو گزشتہ آیات کے قرینہ سے سمجھا جاتا ہےٗ اور سورہ ص کی آیہ ۳۶ میں اس کی تصریح ہوئی ہے، جہاں کہتا ہے "فسخرنا لہ الریح"۔ بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "لسلیمان" میں "لام" اختصاص کے لیے ہےٗ جو اس طرف اشارہ ہے کہ یہ معجزہ اس پیغمبر کے ساتھ مخصوص تھاٗ اور کوئی دوسرا پیغمبر ان کے ساتھ اس امر میں شریک نہیں تھا۔

Marfat.com

نے اشارہ کیا ہے، قناعت کرتے ہیں۔[1]

"غدو" (بروزن علو) طرف صبح کے معنی میں ہے "رواح" کے مقابلہ میں کہ جو غروب کی طرف کو کہتے ہیں، کہ جس وقت جانور آرام کرنے کے لیے اپنی جگہ کی طرف لوٹتے ہیں، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں "غدو" دن کے پہلے آدھے حصّے کے معنی میں ہے اور "رواح" دن کے دوسرے آدھے حصہ کے معنی میں اور آیہ کا مفہوم یہ ہے کہ سلیمانؑ صبح سے ظہر تک اس راہوار مرکب پر اس زمانہ کے مسافروں کے ایک مہینہ کے سفر کی مقدار کے برابر سفر کرتے تھے اور دن کے دوسرے آدھے حصہ میں بھی اسی مقدار میں راستہ چلتے تھے۔

اس کے بعد سلیمانؑ کے لیے خدا کی دوسری نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "اور ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ جاری کیا" (واسلنا له عین القطر)۔

"اسلنا" "سیلان" کے مادہ سے جاری کرنے کے معنی میں ہے، اور "قطر" تانبے کے معنی میں ہے، اور مراد یہ ہے کہ ہم نے اس دھات کو اس کے لیے پگھلا دیا تھا اور وہ پانی کے چشمہ کی طرح بہنے لگا۔

بعض "قطر" کو دھاتوں کی مختلف اقسام کے معنی میں، یا کانسی کے معنی میں سمجھتے ہیں تو اس طرح باپ کے لیے تو لوہا نرم ہوا، اور بیٹے کے لیے دھاتیں پگھلا دی گئیں، (لیکن مشہور وہی پہلا معنی ہی ہے)۔

پگھلے ہوئے تانبہ کا چشمہ یا دوسری دھاتوں کو سلیمانؑ کے اختیار میں کس طرح دیا گیا؟ کیا خدا نے اعجاز والہام کے ذریعہ اس پیغمبر کو ان دھاتوں کو پگھلانے کا طریقہ انتہائی وسیع اندازوں کے ساتھ سکھایا تھا؟

یا اس بہنے والی دھات کا چشمہ، انہیں چشموں کی مانند کہ جو آتش فشاں پہاڑوں کے فعال ہونے کے موقع پر ان کے دامن سے نیچے کی طرف بہتے ہیں، اعجاز آمیز طریقہ سے ان کے اختیار میں قرار پایا؟ یا کسی اور طریقہ سے؟ یہ بات صحیح طور پر ہمارے لیے واضح نہیں ہے، ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اس عظیم پیغمبر کے بارے میں خدا کے الطاف میں سے ایک یہ تھا۔

آخر میں سلیمانؑ کے لیے پروردگار کی تیسری موہبت ونعمت جنوں میں سے ایک بہت بڑے گروہ کے مسخر کیے جانے کو بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "اور خدا کے حکم سے جنوں کے گروہ اس کے سامنے اس کے لیے کام کیا کرتا تھا" (ومن الجن من یعمل بین یدیه باذن ربه)۔

---

[1] اس سلسلے میں ہم نے جلد ۱۳ — (سورہ انبیاء کی آیہ ۸۱ کے ذیل) میں بھی بحث کی ہے۔

Marfat.com

"اور جب ان میں سے کوئی ہمارے حکم سے سرتابی کرتا تھا تو ہم اسے جلانے والی آگ کے ساتھ سزا دیتے تھے" (ومن یزغ منھم عن امرنا نذقہ من عذاب السعیر)۔

"جن" جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، ایک ایسا وجود ہے کہ جو حس سے پوشیدہ اور عقل و قدرت کا حامل ہے، اور جیسا کہ قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے وہ واجبات و فرائض خداوندی کا مکلف بھی ہے۔

"جنوں" کے بارے میں لوگوں نے بہت سے بیہودہ افسانے اور داستانیں گھڑ رکھی ہیں، لیکن اگر ہم ان خرافات کو ترک کر دیں، تو ان کا اصل وجود اور مخصوص صفات، جو قرآن میں جنوں کے لیے بیان ہوئی ہیں' ایک ایسے مطلب کا حامل ہے جو علم و عقل سے قطعاً بعید نہیں ہے' اور ہم انشاء اللہ سورہ جن کی تفسیر میں اس موضوع کو مزید تشریح و تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

بہرحال اوپر والی آیت کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم طاقت کی تسخیر بھی پروردگار کے فرمان سے ہی تھی' اور جس وقت وہ اپنے وظائف اور ذمہ داریوں سے سرتابی کرتے تھے تو انہیں سزا دی جاتی تھی۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ یہاں "عذاب السعیر" سے مراد قیامت کے دن کی سزا ہے، جبکہ آیت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخالفت کرنے والوں کے لیے دنیا میں سزا ہے، سورہ ص کی آیات سے بھی یہ بات اچھی طرح ثابت ہے کہ خدا نے شیاطین کا ایک گروہ سلیمانؑ کے قبضہ میں دے رکھا تھا، جو ان کے۔ لیے اہم قسم کے تعمیراتی کام سرانجام دیا کرتے تھے' اور جس وقت وہ خلاف ورزی کرتے تھے تو انہیں زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا تھا! "والشیاطین کل بناء وغواص و اٰخرین مقرنین فی الاصفاد" (ص آیات ۳۷، ۳۸)۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ سلیمانؑ کے ملک اور سلطنت ایسی، ایک وسیع و عریض سلطنت اور ملک کے نظام کو چلانے کے لیے بہت ہی زیادہ عوامل کی ضرورت ہے لیکن سب سے زیادہ اہم وہی تین عوامل ہیں جن کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

پہلا ایک مستقل اور حاوی تیز رفتار نقل و حمل کا وسیلہ ہے کہ جس کے ذریعہ رئیس حکومت و مملکت اپنے ملک کے تمام اطراف و جوانب سے آگاہ ہو سکے۔

دوسرے خام مال، جو لوگوں کی زندگی کے لیے ضروری آلات و اسباب بنانے اور مختلف صنعتوں کے لیے کام آ سکے۔

اور آخری کام کرنے کی فعال قوت، کہ جو اس خام مال سے کافی مقدار میں فائدہ اٹھا سکے، اور انہیں حسب ضرورت اپنے کام میں لا سکے، اور اس لحاظ سے ملک کی مختلف ضرورتوں

Marfat.com

کو پورا کرسکے۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے یہ تینوں باتیں سلیمانؑ کے اختیار میں دے دی تھیں، اور وہ بھی رفاہِ عامہ، عام آبادی اور امن وامان کے لیے ان سے احسن طریقے سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

یہ موضوع صرف سلیمانؑ کے زمانہ اور ان کی حکومت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے اور اس کی طرف توجہ کرنا، آج بھی اور کل بھی، یہاں بھی اور ہر جگہ، تمام ملکوں کا صحیح طور پر انتظام چلانے کے لیے ضروری ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

بعد والی آیت میں جنوں کے اہم تولیدی کاموں کے ایک حصہ کی طرف ۔جو وہ سلیمانؑ کے حکم سے انجام دیتے تھے۔ اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"سلیمان جو کچھ بھی چاہتے تھے وہ ان کے لیے ۔عبادت خانوں، تمثالوں، حوض کے مانند بڑے بڑے کھانوں کے برتنوں اور زمین پر ثابت (جمی ہوئی یا گڑی ہوئی) دیگوں سے۔ تیار کر کے دیتے تھے" (یعملون له مایشاء من محاریب و تماثیل وجفان کالجواب وقدور راسیات)۔

ان میں سے ایک حصہ تو معنوی اور عبادت کے مسائل سے مربوط تھا، اور ایک حصہ انسانوں کی جسمانی ضروریات اور ان کے عظیم لشکریوں اور کارکنوں کی جمعیت کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔

"محاریب" جمع ہے "محراب" کی کہ جو لغت میں "عبادت گاہ" یا "محلات" اور "بڑی بڑی عمارتوں" کے معنی میں ہے، کہ جو عبادت کی خاطر بنائی جاتی ہیں۔

بعض اوقات صدر مجلس یا صدر مسجد و معبد کے حصّہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، وہ چیز جس کو آج محراب کہتے ہیں وہ امام جماعت کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے، درحقیقت ایک نئی تعبیر اور ایک نیا معنی ہے جو اصل مادہ سے حاصل کیا گیا ہے۔

بہرحال چونکہ یہ لفظ "حرب" کے مادہ سے جنگ کے معنی میں ہے، لہٰذا عبادت خانوں کو "محراب" کا نام دینے کا سبب یہ سمجھا ہے، کہ یہ شیطان اور ہوائے نفس کے ساتھ "محاربہ" یعنی جنگ کرنے کی جگہ ہے[1]

یا "حرب" اُس لباس کے معنی میں ہے کہ جو میدانِ جنگ میں دشمن کے بدن سے اتارا جاتا ہے، چونکہ انسان کو چاہیئے کہ وہ عبادت خانوں میں دنیوی افکار اور دل کی پراگندگی کی پوشاک

---

[1] مفردات راغب مادہ "حرب"۔

Marfat.com

کو اپنے اوپر سے اتار دے[1]

بہرحال سلیمانؑ کے یہ فعال اور چابک دست کارندے، بڑے بڑے باشکوہ عبادت خانے، کہ جو حکومت الٰہیہ اور اس کی مذہبی سلطنت کے لائق تھے، اس کے لیے بناتے تھے تاکہ لوگ راحت و آرام کے ساتھ اپنے عبادت کے فرائض کو انجام دے سکیں۔

"تماثیل" جمع ہے "تمثال" کی جو بیل بوٹوں اور تصویر کے معنی میں آیا ہے اور مجسمہ کے معنی میں بھی، اس بارے میں کہ یہ مجسمے یا نقوش، کون سے موجودات کی صورتیں تھیں اور سلیمانؑ نے ان کی تیاری کا حکم کیوں دیا تھا، مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ زیب و زینت اور سجاوٹ کا پہلو رکھتے ہوں، جیسا کہ ہماری اہم قدیمی بلکہ جدید عمارتوں میں بھی نظر آتا ہے۔

یا یہ ان عمارتوں کا رعب اور دبدبہ بڑھانے کے لیے ہو، کیونکہ کچھ حیوانات مثلاً شیر کی تصویر، بہت سے لوگوں کے افکار میں رعب و دبدبہ پیدا کرنے والی ہے۔

کیا سلیمانؑ کی شریعت میں ذی روح موجودات کا مجسمہ بنانا جائز تھا، جبکہ یہ اسلام میں ممنوع ہے؟ یا جو مجسمے وہ سلیمانؑ کے لیے بناتے تھے، غیر ذی روح کی جنس سے تھے، مثلاً درختوں، پہاڑوں، سورج، چاند اور ستاروں کی تصویریں۔

یا اُن کے لیے صرف دیواروں پر نقش و نگار کیا کرتے تھے جیسا کہ قدیمی تاریخی آثار میں اکثر گلکاریوں کی صورت میں نظر آتی ہیں، اور ہم یہ جانتے ہیں کہ نقش و نگار چاہے جیسے بھی ہوں — مجسمہ کے برخلاف — حرام نہیں ہیں۔

یہ سب احتمالات ہیں، چونکہ اسلام میں مجسمہ سازی کو حرام قرار دیا جاتا ہے ممکن ہے کہ بت پرستی کے مسئلہ کے ساتھ شدید مبارزہ کرنے اور اس کی بیخ کنی کی خاطر ہو، اور سلیمانؑ کے زمانہ میں اس بات کی اتنی ضرورت نہ ہو، اور یہ حکم ان کی شریعت میں نہ ہو۔

لیکن ایک روایت میں جو امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہے یہ بیان کیا گیا ہے:

"واللہ ما ھی تماثیل الرجال والنساء ولکنھا الشجر و شبھہ"

خدا کی قسم سلیمانؑ کے حکم سے بنائی جانے والی تمثال مردوں اور عورتوں کے مجسمے نہ تھے، بلکہ درخت وغیرہ کی تصویریں تھیں[2]

---

[1] مفردات راغب مادہ "حرب"۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۲، ابواب مایکتسب بہ حدیث ۱۔

Marfat.com

"جفان" جمع "جفنه" (بروزن وزنہ) کھانا کھانے کے برتنوں کے معنی میں ہے، اور "جواب" جمع "جابیہ" کی، پانی کے حوض کے معنی میں ہے، اور اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلیمانؑ کے لیے بہت بڑے بڑے برتن، کہ جو حوض کی طرح ہوتے تھے، تیار کیا کرتے تھے، تاکہ ایک کثیر گروہ ان کے گرد بیٹھ کر کھانا کھا سکیں، اور اگر ہم نے اس بات کو بھلا نہ دیا ہو تو تھوڑے ہی سے پہلے زمانہ کی بات ہے ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر بڑے بڑے (غذا کے) مجموعوں سے اکٹھے مل کر کھایا کرتے تھے، اور حقیقت میں ان کا دسترخوان، وہی بڑا برتن ہوا کرتا تھا، اور موجودہ زمانہ کی طرح ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ مستقل طور پر برتنوں کا رواج نہیں تھا۔

"قدور" جمع "قدر" (بروزن قشر) اُس برتن کے معنی میں ہے کہ جس میں کھانا پکایا جاتا ہے (دیگ) اور "راسیات" جمع "راسیہ" کی ہے، جو ایک ہی جگہ پر گڑی ہوئی یا ثابت وجمی ہوئی کے معنی میں ہے، اور یہاں وہ دیگیں مراد ہیں کہ جنہیں ان کے بڑے ہونے کی وجہ سے ان کی اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جاتا تھا۔

آیت کے آخر میں ان نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد داؤدؑ کی اولاد سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اے آلِ داؤد! شکر گزاری کرو" (اعملوا آل داؤد شکرًا)۔

"لیکن میرے بندوں میں سے بہت ہی تھوڑے لوگ شکر کرنے والے ہیں" (وقلیل من عبادی الشکور)۔

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ اگر شکر گزاری سے مراد صرف زبان کے ساتھ شکر، شکر، کہنا ہو تو پھر تو کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے، کہ اس پر عمل کرنے والے کم ہوں، بلکہ اس سے مراد "عملی طور پر شکر" ادا کرنا ہے یعنی نعمتوں کو انہیں مقاصد میں استعمال کرنا جن کے لیے وہ پیدا کی گئیں اور عطا کی گئیں ہیں، اور یہ بات مسلّم ہے، کہ وہ لوگ کہ جو خدا کی نعمتوں کو عام طور پر ان کی اپنی جگہ پر استعمال کریں، بہت ہی تھوڑے ہیں۔

بعض بزرگ شکر کے لیے تین مراحل کے قائل ہوئے ہیں:

اوّل: دل کے ساتھ شکر کرنا، یعنی نعمت کا تصور کرنا، اور اس پر راضی ہونا اور خوشی کا اظہار کرنا۔

دوسرے: زبان کے ساتھ شکر کرنا یعنی نعمت دینے والے کی حمد و ثنا بیان کرنا۔

تیسرے: تمام اعضاء وجوارح کے ساتھ شکر کرنا، اور وہ اعمال کو اس نعمت کے ساتھ ہم آہنگ بنانا ہے۔

"شکور" مبالغہ کا صیغہ ہے اور بہت زیادہ شکر ادا کرنے کو ظاہر کرتا ہے، جو کہ دل، زبان اور اعضاء

Marfat.com

جوارح کے ساتھ متواتر و مسلسل شکر کو دہراتے رہنا ہے۔

البتہ بعض اوقات یہ صفت خدا کے لیے بھی لائی گئی ہے، جیسا کہ سورہ تغابن کی آیہ ۱۷ میں بیان ہوا ہے: "واللہ شکور حلیم" خدا کی شکر گزاری سے مراد یہ ہے کہ بندے جتنا اس کی اطاعت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں، اتنا ہی وہ انہیں اپنے الطاف و انعامات سے نوازتا ہے اور ان کی قدردانی کرتے ہوئے انہیں اپنے فضل و کرم سے اس سے کہیں زیادہ عطا فرماتا ہے کہ جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ تعبیر کہ میرے بندوں میں سے کم لوگ شکر گزار ہیں، ممکن ہے کہ یہ اس گروہ کے مقام کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے ہو کہ جو ایک نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں، یا مراد یہ ہو کہ تم بھی کوشش کرو اور ان کے زمرہ میں داخل ہو جاؤ تاکہ شکر کرنے والوں کی جماعت میں اضافہ ہو۔

⁂ ⁂ ⁂

آخری زیر بحث آیت، اس حال میں کہ وہ سلیمانؑ کے بارے میں بھی، آخری گفتگو ہے، خدا کے اس عظیم پیغمبر کی عجیب و غریب اور عبرت انگیز موت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور اس حقیقت کو روشن کر رہی ہے، کہ اتنے باعظمت پیغمبر اور اتنی قدرت، رعب اور دبدبہ رکھنے والے حکمران نے اپنی جان کس طرح آسانی کے ساتھ جان آفرین کے سپرد کر دی، یہاں تک کہ بستر پر لیٹنے سے پہلے ہی موت کے چنگل نے ان کے گریبان کو پکڑ لیا۔

فرماتا ہے: "جب ہم نے سلیمان کے لیے موت کا حکم نافذ کر دیا تو کسی نے بھی لوگوں کو اس کی موت سے آگاہ نہ کیا مگر زمین پر رینگنے والے نے کہ جس نے اس کے عصا کو کھا لیا یہاں تک کہ اس کا عصا ٹوٹ گیا اور سلیمان کا پیکر نیچے گر پڑا" (فلما قضینا علیه الموت ما دلّهم علیٰ موته الّا دابة الارض تأکل منسأته)[1]

اوپر والی آیت کی تعبیر اور اسی طرح متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سلیمانؑ کی موت کا وقت آن پہنچا تو وہ اس وقت کھڑے ہوئے تھے اور اپنے عصا پر تکیہ کیے ہوئے تھے کہ اچانک موت نے ان کو آ پکڑا، اور ان کی روح بدن سے پرواز کر گئی، وہ ایک مدت تک اسی حالت میں کھڑے

---

[1] "منسأته" مادہ نساء (بر وزن نسخ) اور نسیئ (بر وزن نصیب) سے تاخیر کے معنی میں ہے اور چونکہ عصا سے چیزوں کو پیچھے کی طرف دھکیلتے ہیں اور دور کرتے ہیں لہٰذا لفظ "منسأته" اس پر بولا گیا ہے (یعنی پیچھے دھکیلنے کا ذریعہ) بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ لفظ اہلِ یمن کے الفاظ میں سے تھا اور چونکہ سلیمان اس علاقے پر حکومت رکھتے تھے لہٰذا قرآن نے ان کے بارے میں اسے استعمال کیا ہے۔ (مفردات راغب۔ تفسیر قرطبی اور روح البیان کی طرف رجوع کریں)۔

Marfat.com

رہے یہاں تک کہ دیمک نے کہ قرآن جسے "دابّة الارض" (زمین پر رینگنے والی چیز) سے تعبیر کرتا ہے ان کے عصا کو کھا لیا، جس سے ان کا اعتدال برقرار نہ رہ سکا اور زمین پر گر پڑے تب لوگ ان کی موت سے آگاہ ہوئے۔

لہٰذا اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ: "جب سلیمانؑ گرے تو اس وقت جنات سمجھے کہ اگر وہ غیب سے آگاہ ہوتے تو ذلیل کرنے والے عذاب میں گرفتار نہ رہتے" (فلما خرّ تبينت الجن ان لو كانوا يعلمون الغيب ما لبثوا فى العذاب المهين)۔

"تبینت" کا جملہ "تبیین" کے مادہ سے عام طور پر آشکار و واضح ہونے کے معنی میں (فعل لازم) ہے اور بعض اوقات کسی چیز کو جاننے اور اُس سے آگاہ ہونے کے معنی میں (فعل متعدی کے طور پر) بھی آتا ہے اور یہاں دوسرے ہی معنی کے ساتھ مناسب ہے، یعنی اس وقت تک گروہ جن سلیمانؑ کی موت سے آگاہ نہیں تھا، اور انہوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ اگر وہ غیب کے اسرار سے آگاہ ہوتے تو اس مدت میں ایسے سخت کاموں کی زحمت و تکلیف میں باقی نہ رہتے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس جملہ کو پہلے معنی میں لیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ سلیمانؑ کے گر جانے کے بعد جنّوں کی حالت انسانوں کے لیے واضح و آشکار ہو گئی کہ وہ غیب کے اسرار سے آگاہ نہیں ہیں، اور کچھ لوگ بلا جواز ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں [1]

"عذاب مہین" کی تعبیر ممکن ہے کہ اُن سنگین و سخت کاموں کی طرف اشارہ ہو کہ جو سلیمانؑ جرمانہ اور سزا کے عنوان سے جنّوں کے ذمہ ڈالتے تھے، ورنہ خدا کا پیغمبر کسی شخص کو بلا وجہ کسی سختی اور عذاب وہ بھی "ذلیل و خوار کرنے والے عذاب" میں ہرگز نہیں ڈالتا۔

چند نکات

۱۔ سلیمانؑ کی عبرت انگیز زندگی کا منظر

قرآن مجید — موجودہ تورات کے برخلاف کہ جو سلیمانؑ کو ایک جبار، بت خانہ ساز اور عورتوں کی ہوس میں مبتلا بادشاہ کے طور پر متعارف کراتی ہے [2] — سلیمانؑ کو خدا کا ایک عظیم پیغمبر شمار کرتا ہے

---

[1] پہلی صورت میں آیت کی ترتیب اس طرح ہوتی، تبینت فعل جن فاعل (یہاں معنی جمع کا ہے) اور ان لو کانوا.... اس کے مفعول کی جگہ پر ہے اور دوسری صورت میں تبینت فعل اور "امر الجن" فاعل پھر مضاف حذف ہو گیا ہے اور مضاف الیہ اس کا قائم مقام بنا ہے، وان لو کانوا.... اس کا بیان و وضاحت ہے۔

[2] تورات کتاب اوّل ملوک و پادشاہان۔

Marfat.com

اور انہیں قدرت اور بے نظیر حکومت کے نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہے' اور سلیمانؑ سے مربوط مباحث کے دوران بہت ہی عظیم درس انسانوں کو دیتا ہے' کہ ان داستانوں کے ذکر کرنے کا اصل مقصد وہی ہیں ۔

ہم نے اوپر والی آیات میں پڑھا ہے کہ خدا نے اس بزرگ پیغمبر کو بہت ہی عظیم نعمتیں عطا فرمائی تھیں ۔

بہت ہی سریع اور تیز رو سواری کہ جس کے ذریعے وہ مختصر سی مدت میں اپنے سارے ملک کی سیر کر سکتے تھے ۔

مختلف صنعتوں کے لیے فراواں معدنی مواد ۔

اس معدنی مواد کو استعمال کرنے کے لیے کافی فعال قوت ۔

انہوں نے ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے بڑے عبادت خانے بنائے اور لوگوں کو عبادت کی طرف ترغیب دی' علاوہ ازیں حکومت کی فوجوں ، کارکنوں اور کمزور لوگوں کے طبقات کی پذیرائی کے لیے وسیع و عریض پروگرام منظم کیا، کہ جس کے برتنوں کے نمونہ سے ۔ کہ جو اوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے ۔ باقی چیزوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

ان تمام نعمتوں کے مقابلہ میں انہیں شکر گزاری کا حکم دیا، اس مطلب پر تاکید کرتے ہوئے کہ خدا کی نعمتوں کے شکر کا حق بہت ہی کم لوگ ادا کر سکتے ہیں ۔

اس کے بعد یہ واضح و روشن کیا کہ ایک شخص اس قدرت و عظمت کے باوجود موت کے مقابلہ میں کتنا کمزور اور ناتواں تھا، کہ وہ ایک ہی لحہ میں ناگہانی موت کے ذریعہ دنیا سے چل بسا، اس طرح سے کہ اجل نے اسے بیٹھنے یا بستر پر لیٹنے تک کی مہلت بھی نہ دی' تاکہ مغرور سرکشی کرنے والے یہ گمان نہ کریں کہ اگر وہ کسی مقام پر پہنچ جائیں اور قدرت و قوت حاصل کر لیں تو واقعی طور پر وہ توانا ہو گئے ہیں، وہ جس کے سامنے جنّ اور انسان، شیطان و پری خدمت میں لگے ہوئے تھے' اور زمین و آسمان جس کی جولانگاہ تھے' اور جس کی حشمت اور شان و شوکت میں جو بھی شک کرے اس کی عقل و فکر پر مرغ و ماہی قہقہہ لگائیں، ایک مختصر سے لحہ میں سمندر کی موجوں پر ابھرنے والے بلبلے کی طرح محو و نابود ہو گیا ۔

اور یہ بھی واضح و روشن کر دے کہ ایک ناچیز عصا اُسے ایک مدت تک کس طرح اٹھائے رہا اور "جن" اُسے کھڑا ہوئے یا بیٹھے ہوئے دیکھتے رہنے کی وجہ سے کیسے سرگرمی کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہے ؟

اور یہ بھی (دکھا دے) کہ دیمک نے انہیں کس طرح زمین پر گرایا اور ان کے ملک کے تمام

Marfat.com

رشتوں کو توڑ کے رکھ دیا۔ ہاں ! ایک عصا ہی اُس وسیع و عریض ملک کی فعال قوت کو بروئے کار لائے ہوئے تھا اور ایک چھوٹی سی دیمک نے اس کو حرکت سے روک دیا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس دن سلیمانؑ نے دیکھا کہ ایک خوبصورت اور خوش پوش جوان قصر کے ایک کونہ سے باہر آیا اور ان کی طرف بڑھا، سلیمانؑ نے تعجب کیا، کہا: تُو کون ہے؟ اور کس کی اجازت سے یہاں آیا ہے؟ مَیں نے تو یہ حکم دیا ہوا تھا کہ آج کوئی شخص یہاں نہ آنے پائے۔

اس نے جواب دیا: مَیں وہ ہوں کہ نہ بادشاہوں سے ڈرتا ہوں اور نہ کسی سے رشوت لیتا ہوں سلیمانؑ نے بہت ہی تعجب کیا۔ لیکن اُس نے مہلت نہ دی اور کہا مَیں موت کا فرشتہ ہوں، مَیں اس لیے آیا ہوں تاکہ مَیں آپ کی روح قبض کروں! یہ کہتے ہی فوراً ان کی روح قبض کر لی[۱]

اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بہت سے انبیاء کی داستانوں کی طرح حضرت سلیمانؑ کی داستان میں بھی افسوسناک حد تک گھڑی ہوئی روایات شامل کر دی گئی ہیں اور ان کے ساتھ بہت سی خرافات منسوب کر دی گئی ہیں کہ جنہوں نے اس عظیم پیغمبر کے چہرے کو بدل دیا ہے، اور ان خرافات کا زیادہ تر حصہ موجودہ تورات سے لیا گیا ہے اور اگر ہم صرف اسی پر قناعت کر لیں کہ جو قرآن نے کہا ہے تو پھر کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

۲۔ سلیمانؑ کی موت ایک مدت تک کیوں پوشیدہ رہی؟

یہ بات کہ حضرت سلیمانؑ کی موت ان کے کارکنانِ حکومت پر کتنی مدت تک مخفی رہی، صحیح طور پر واضح نہیں ہے، ایک سال؟ ایک ماہ؟ یا چند روز۔

مفسرین کا اس سلسلہ میں ایک نظریہ نہیں ہے۔

کیا یہ اخفا اور کتمان ان کے اصحاب اور ارکان سلطنت کی جانب سے صورت پذیر ہوا تھا؟ کیا انہوں نے جانتے بوجھتے اس غرض سے کہ کہیں امورِ سلطنت کا رشتہ وقتی طور پر بکھر نہ جائے، ان کی موت کو پوشیدہ رکھا؟

یا یہ کہ اصحاب و ارکانِ سلطنت بھی اس امر سے آگاہی نہیں رکھتے تھے۔

یہ بات بہت ہی بعید نظر آتی ہے کہ ایک طولانی مدت تک یہاں تک کہ ایک دن سے زیادہ ہی سہی، ان کے اطرافیان (گرد و پیش رہنے والے اصحاب و ارکانِ سلطنت) بھی آگاہ نہ ہوں، کیونکہ

---

[۱] تفسیر برہان جلد ۳ ص ۳۴۵ علل الشرائع مطابق نقل المیزان جلد ۱۶ ص ۳۹۱۔

Marfat.com

یہ بات تو مسلّم ہے کہ کچھ لوگ ان کا کھانا لے جانے پر مامور تھے اور ان تک دوسری ضروریات پہنچاتے تھے، تو وہ تو اس واقعہ سے ضرور آگاہ ہو جاتے اس بنا پر بعید نہیں ہے ۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے ۔ کہ وہ اس امر سے آگاہ تھے لیکن اسے کچھ مصلحتوں کی بنا پر مخفی رکھا، اسی لیے بعض روایات میں آیا ہے کہ اس مدت میں "آصف بن برخیا" ان کے وزیر خاص ملک کے امور کی تدبیر کرتے اور نظم ونسق چلاتے رہے ۔

کیا سلیمانؑ کھڑے ہوئے عصا کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے یا بیٹھے ہوئے اپنے ہاتھ عصا پر رکھے ہوئے تھے، اور سر کو ہاتھوں پر ٹکائے ہوئے تھے اور اسی حالت میں ان کی روح قبض ہوگئی اور وہ ایک مدت تک اسی طرح رہے؟ اس سلسلے میں مختلف احتمالات ہیں، اگرچہ آخری احتمال زیادہ نزدیک نظر آتا ہے ۔

اگر یہ مدت طولانی تھی تو کیا غذا کا نہ کھانا اور پانی کا نہ پینا دیکھنے والوں کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا تھا ۔

چونکہ سلیمانؑ کے تمام کام عجیب وغریب تھے لہٰذا وہ شاید اس مسئلہ کو بھی عجیب وغریب شمار کرتے تھے، یہاں تک کہ ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آہستہ آہستہ ایک گروہ کے درمیان یہ زمزمہ پیدا ہوا کہ سلیمانؑ کی پرستش کرنا چاہیئے، کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ ایک عرصہ سے ایک ہی جگہ پر ثابت و برقرار ہے؟ نہ تو وہ سوتا ہے، نہ کھانا کھاتا ہے اور نہ پانی پیتا ہے [1]

لیکن جس وقت عصا ٹوٹا اور سلیمانؑ نیچے گرے، تو یہ تمام رشتے ایک دوسرے سے ٹوٹ گئے، اور ان کے خیالات نقش برآب ہو گئے ۔

لیکن بہرحال جو کچھ بھی تھا سلیمانؑ کی موت کے اظہار میں اس تاخیر نے بہت سی چیزوں کو فاش کر دیا :

۱۔ سب پر واضح وروشن ہو گیا کہ اگر انسان قدرت وطاقت کی بلندی تک بھی پہنچ جائے تو پھر بھی حادثات کے مقابلہ میں ایک ضعیف وکمزور وجود ہے، اور ایک پرکاہ کی مانند ہے کہ جو طوفان کے راستہ میں ہر طرف اُڑتا رہتا ہے ۔

امیرالمؤمنین علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں :

فلو ان احدًا یجد الی البقاء سلمًا او لدفع الموت سبیلاً لکان ذالک سلیمان ابن داؤد (ع) الذی سخر له ملك الجن والانس مع النبوة وعظیم الزلفة ۔

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۳ ص ۳۴۵ ۔

Marfat.com

اگر کوئی شخص اس جہان میں عالم بقا کی طرف کوئی سیڑھی پاتا، یا اپنے آپ سے موت کو دُور کر سکتا، تو وہ سلیمانؑ تھے کہ جن کے لیے نبوّت و مقام بلند کے ساتھ ساتھ جنّوں اور انسانوں پر حکومت بھی فراہم تھی۔[1]

۲۔ سب لوگوں پر یہ حقیقت واضح و روشن ہوگئی کہ جنّوں کو غیب کا علم نہیں ہے اور نادان و بے خبر انسان کہ جو ان کی پرستش کرتے تھے انتہائی خطا اور غلطی پر تھے۔

۳۔ تمام لوگوں کے سامنے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ کس طرح کسی ملک کا نظام اور شیرازہ ایک چھوٹے سے موضوع کے ساتھ وابستگی پیدا کرلے تو اس کے وجود کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے اور اس کے گر جانے سے گر جاتا ہے اور ان امور کے پیچھے پروردگار کی بے انتہا قدرت جلوہ گر ہے۔

۳۔ قرآن اور موجودہ تورات میں سلیمانؑ کی تصویر

اس حال میں کہ قرآن سلیمانؑ کو ایک عظیم پیغمبر کہتا ہے، ایسا پیغمبر کہ جو علم سے سرشار اور بہت زیادہ تقویٰ شعار تھا، ایسا پیغمبر کہ جو عظیم حکومت و سلطنت کا حکمران ہونے کے باوجود ہرگز مقام و مال کا اسیر نہ ہوا اور ان لوگوں سے کہ اسے فریب دینے کے لیے بہت سے گراں بہا ہدایا لائے تھے یہ کہا کہ: "اتمدونن بمال فما اٰتانی الله خیر مما اٰتاکم" "کیا تم میری مال کے ذریعہ مدد کرنا چاہتے ہو، حالانکہ جو کچھ خدا نے مجھے دیا ہے وہ اُس سے برتر ہے کہ جو تمہیں دیا ہے" (نمل۔ ۳۶)۔

ایسا پیغمبر کہ جس کی ساری آرزوئیں اور تمنائیں یہ تھیں کہ وہ پروردگار کی نعمتوں کا شکر ادا کرسکے "قال رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علیّ وعلی والدیّ" "اس نے کہا: پروردگارا میری مدد کر اور توفیق عطا فرما کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کرسکوں کہ جو تُو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہیں"۔ (نمل۔ ۱۹)

ایسا رہبر کہ جو یہ تک بھی اجازت نہ دیتا تھا کہ کوئی شخص جان بوجھ کر ایک چیونٹی پر بھی ظلم کرے اسی لیے وادیٔ نمل میں ایک چیونٹے نے یہ صدا بلند کی تھی کہ: "یا ایھا النمل ادخلوا مساکنکم لا یحطمنکم سلیمان وجنودہ وھم لا یشعرون" "اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان اور اس کا لشکر تمہیں بے خبری میں روند نہ ڈالے"۔ (نمل۔ ۱۸)

وہ ایسا عبادت گزار تھا کہ اگر کبھی ایک لحہ کے لیے بھی دنیا میں مشغول ہو کر ذکرِ خدا سے غافل ہو جاتا تو فوراً اس کی تلافی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا اور کہتا کہ: "انی احببت حب الخیر عن ذکر ربی"

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۲۔

Marfat.com

" افسوس کہ اچھی چیزوں سے تعلق نے مجھے ایک لمحہ کے لیے خدا کی یاد سے اپنی طرف مشغول رکھا۔" (ص - ۳۲)

وہ ایسا حکیم و دانا تھا کہ جو قدرت رکھنے کے باوجود منطق و دلیل کے سوا بات نہیں کرتا تھا، یہاں تک کہ ایک پرندے کے ساتھ بھی — جیسا کہ ہُدہُد کے ساتھ بات کرنے میں — حق و عدالت کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔

وہ ایسا حاکم تھا کہ جس کا معاون و وزیر بھی " علم کتاب " سے اتنا سرشار تھا کہ وہ ایک ہی لمحہ میں بلقیس کے تخت کو حاضر کر سکتا تھا۔

اور قرآن اس کی " اواب " (خدا کی طرف سے زیادہ سے زیادہ بازگشت کرنے والا) — اور " نعم العبد " (بہت ہی اچھا بندہ) جیسے اوصاف کے ساتھ توصیف کرتا ہے۔

وہ شخص کہ خدا نے " حکومت " اور " علم " جس کے اختیار میں دے دیا تھا اور اسے اپنی ہدایت کے ساتھ نوازا تھا، اور جس نے اپنی ساری عمر میں ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کے ساتھ شرک نہ کیا تھا۔

لیکن ان سب چیزوں کے باوجود، آیئے دیکھیں! کہ موجودہ تحریف شدہ تورات اس بزرگ پیغمبر کے پاک دامن کو کس طرح شرک اور دوسری آلائشوں کے ساتھ آلودہ کر رہی ہے۔

تورات نے بتکدے بنانے، بُت پرستی کو رواج دینے، عورتوں سے بے حساب عشق رکھنے اور ان کے عشق و عاشقی کی بہت ہی بدنام کرنے والی داستانوں میں ملوث کرنے کے سلسلے میں بہت ہی بدترین نسبتیں ان کے لیے بیان کی ہیں، ان کو نقل کرنے سے شرم آتی ہے، ہم ایک حصّہ کو جو نسبتاً ملائم اور نرم نظر آتا ہے اس جگہ بیان کرنے پر قناعت کرتے ہیں۔

کتاب اوّل ملوک و پادشاہان میں اس طرح لکھا ہے :

اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ " موآبیوں "، " عمونیوں "، " ادومیوں "، " صیدونیوں " اور " حتیوں " میں سے بہت سی بیگانہ، اجنبی اور غیر عورتوں سے محبت کیا کرتا تھا، (یہ عورتیں) ان امتوں سے تعلق رکھتی تھیں کہ جن کے بارے میں خدا کا بنی اسرائیل کو یہ حکم تھا کہ تم ان میں داخل نہ ہونا (اور ان سے شادی بیاہ نہ کرنا) اور وہ تم میں داخل نہ ہوں، کیونکہ وہ تمہارے دلوں کو اپنے خداؤں کی طرف مائل کر دیں گی اور سلیمان ان سے عشق و محبت کرتے ہوئے چمٹ گیا۔

اور اس کے لیے سات سو بیویاں (عقد دائمی والی) اور تین سو متعہ والی (موقت) تھیں، اور انہوں نے سلیمان کے دل کو پھیر لیا تھا، اور یہ سلیمان کے بڑھاپے کے وقت واقع ہوا، کہ اس کی بیویوں نے ان کا دل اپنے عجیب و غریب خداؤں کی طرف موڑ لیا، اور اس کا دل اس کے باپ داؤد کی طرح اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ تھا، اور سلیمان " صیدونیوں " کے خدا " عشتروں اور عمونیوں " کے

Marfat.com

مکروہ "ملکوم" (عمونیوں کے بت) کے پیچھے لگ گیا، اور سلیمان نے خدا کی نگاہ میں بدی کی اور اپنے باپ داؤد کی طرح مکمل طور پر خدا کی راہ پر نہ چلا۔

اس وقت سلیمان نے اس پہاڑ پر کہ جو "یروشلم" کے سامنے تھا، عمون کی مکروہ اولاد "کموش" کے لیے خصوصیت کے ساتھ ایک بلند مقام بنایا، پس خدا سلیمان پر غضبناک ہوا، کیونکہ اس نے اسرائیل کے خدا سے کہ جو اس کو دو مرتبہ دکھائی دیا تھا، اپنا دل پھیر لیا تھا.... اور خدا نے سلیمان سے کہا کہ چونکہ تجھ سے یہ عمل صادر ہو گیا ہے اور میرے عہد اور ان فرائض کی جن کے بجا لانے کا میں نے تجھے حکم دیا تھا، تو نے تعمیل نہیں کی، اس لیے میں تیری سلطنت تجھ سے چھین کر تیرے غلام کو دے دوں گا، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ میں تیری زندگی میں ایسا نہ کروں گا، تیرے باپ داؤد کے سبب سے' اور تیرے بیٹے کے ہاتھ سے اُسے لوں گا.... البتہ اس کے ہاتھ (سلیمان) سے تمام سلطنت نہیں لوں گا' بلکہ اپنے بندے داؤد کا لحاظ کرتے ہوئے' کہ جسے میں نے اس لیے برگزیدہ بنایا تھا کہ اس نے میرے اوامر و فرائض کی حفاظت کی تھی، اس کو اس کی زندگی کے تمام دنوں میں بادشاہ رہنے دوں گا[1]

تورات کی اس ساری جھوٹی داستان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ :

۱۔ سلیمانؑ بُت پرست قبیلوں کی عورتوں سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتے تھے، اور خدا کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے ان میں سے بہت زیادہ تعداد میں (عورتیں) رکھی ہوئی تھیں، اور وہ آہستہ آہستہ انہی کے مذہب کی طرف مائل ہو گیا تھا، اور باوجود اس کے کہ "وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ جس نے عورت کو نہ دیکھا ہو" بلکہ ۷۰۰ عورتیں عقد دائم والی اور ۳۰۰ عورتیں متعہ والی اس کے پاس تھیں' عورتوں کے ساتھ شدید لگاؤ نے انہیں راہِ خدا سے باہر نکال دیا تھا۔ (نعوذ باللہ)

۲۔ سلیمانؑ نے کھلم کھلا بت خانہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور اس پہاڑ کے اوپر کہ جو اسرائیل کے مقدس مرکز "یروشلم" کے سامنے واقع تھا، ایک بت کدہ۔ قبیلۂ "موآبیان" کے معروف بت "کموش" کے لیے اور قبیلہ "بنی عمون" کے خاص بت "مولک" کے لیے۔ تعمیر کرایا، اور "صیدونیوں" کے بت عشترون کے ساتھ بھی خاص لگاؤ پیدا کر لیا تھا، اور یہ سب باتیں بڑھاپے کی حالت میں واقع ہوئیں۔

۳۔ خدا نے اس انحراف اور بڑے گناہ کی وجہ سے اس کے لیے ایک سزا تجویز کی، اور وہ سزا یہ تھی کہ اس کا ملک اس سے چھین لے گا، لیکن خود اس کے ہاتھ سے نہیں' بلکہ اس کے بیٹے "رحبعام" کے ہاتھ سے (چھینے گا) اور خود اس کو مہلت دے گا' وہ جتنا چاہے، حکومت کرے، اور یہ بات بھی

[1] تورات کتاب اول، ملوک و پادشاہان، فصل یازدہم جملہ ۱ تا ۱۳۔

Marfat.com

خدا کے خاص بندے داؤد — سلیمان کے باپ — کی وجہ سے تھی، خدا کا وہی خاص بندہ کہ جو تورات کی تصریح کے مطابق (العیاذ باللہ) قتل نفس اور زنائے محصنہ اور اپنے رشید اور خدمت گزار افسر کی بیوی کے ساتھ صحبت کرنے کا مرتکب ہوا تھا، کیا کوئی بھی شخص اس قسم کی ناروا تہمتیں سلیمان جیسے آدمی کی مقدس ذات پر لگا سکتا ہے۔

اگر ہم سلیمانؑ کو — جیسا کہ قرآن کہتا ہے — پیغمبر سمجھیں، تو پھر تو بات بالکل صاف اور واضح ہے اور اگر ہم انہیں بنی اسرائیل کے بادشاہوں کے سلسلے میں سے جانیں، تو پھر بھی اس قسم کی تہمتیں اور نسبتیں ان کے بارے میں صادق نہیں آسکتیں۔

کیونکہ اگر ہم اس کو پیغمبر نہ بھی سمجھیں تو پھر بھی مسلمہ طور پر وہ پیغمبر کے بعد ان کا قائمقام نائب و جانشین تو تھا، کیونکہ عہدِ قدیم کی کتب میں سے دو کتابیں ایک "مواعظ سلیمان" یا "حکمتہائے سلیمانؑ" اور دوسری "سرودِ سلیمان" کے نام سے اس بزرگ مردِ خدا کے اقوال و فرامین پر مشتمل ہیں۔

واقعاً یہودی اور عیسائی کہ جو موجودہ تورات پر ایمان رکھتے ہیں، ان سوالات کا کیا جواب رکھتے ہیں؟ اور ان رسوائیوں کو کیسے قبول کرتے ہیں۔

۴۔ حقیقی شکر گزار بہت کم ہیں

اس سلسلے میں سب سے پہلے "شکر" کے لغوی بنیادی معنی کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔

"راغب" "مفردات" میں کہتا ہے، "شکر" نعمت کا تصور کرنا اور اس کا اظہار کرنا ہی ہے، بعض نے یہ کہا ہے کہ اصل میں "کشر" بمعنی "کشف" (اور اسی کے وزن پر) تھا، اس کے بعد مقلوب ہو کر شکر ہو گیا، اور اس کا نقطۂ مقابل کفر ہے کہ جو نعمت کو بھول جانا، اور اس پر پردہ ڈالنا ہے۔

اس کے بعد شکر کو تین شعبوں میں تقسیم کیا ہے، ۱: "دل کا شکر" یعنی نعمت کے بارے میں غور و فکر کرنا، ۲: "زبان سے شکر" یعنی منعم کی حمد و ثنا کرنا، ۳: "تمام اعضا کے ساتھ شکر" یعنی نعمت کے لیے قدر دانی کرنا اور اس کا جواب دینا۔

اوپر والی آیات میں "اعملوا اٰل داؤد شکرًا" کے جملہ کے ساتھ قرآن کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ شکر کا تعلق زیادہ تر "عمل" کے ساتھ ہے اور اس کو انسان کے اعمال کے اندر دکھائی دینا چاہیئے۔ اور شاید اسی بنا پر قرآن نے واقعی اور حقیقی شکر گزاروں کی تعداد تھوڑی شمار کی ہے۔

اوپر والی آیات کے علاوہ سورۂ ملک کی آیہ ۲۳ میں بڑی بڑی نعمتوں مثلاً: کان، آنکھ اور دل کی پیدائش کا ذکر کرنے کے بعد مزید کہتا ہے کہ: "قلیلاً ما تشکرون" (تم اس کا بہت ہی کم

Marfat.com

شکر ادا کرتے ہو) اور سورہ نمل کی آیہ ۷۳ میں یہ بیان ہوا ہے: " ولکن اکثرھم لا یشکرون" (ان میں سے اکثر شکر گزاری نہیں کرتے) - ایک طرف تو یہ ہے۔

اور دوسری طرف اس نکتہ پر توجہ کرتے ہوئے - کہ خدا کی وہ نعمتیں کہ جنہوں نے انسان کے وجود کو سر سے پاؤں تک گھیر رکھا ہے، اس قدر زیادہ ہیں کہ جنہیں شمار ہی نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "وان تعدوا نعمة الله لا تحصوھا" (ابراہیم - ۳۴) - یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ: تمام نعمتوں کے لیے شکر، اس کے واقعی مفہوم میں، اس طور پر کہ تمام نعمتوں کو انہیں کاموں کے لیے کہ جن کے لیے وہ پیدا ہوتی ہیں، بلا استثناء خدا کی بندگی کی راہ میں استعمال کرے - کیوں کم پایا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، اور بعض بزرگ مفسرین کے قول کے مطابق "شکر مطلق" یہ ہے کہ انسان کسی قسم کی فراموشی کے بغیر ہمیشہ خدا کی یاد میں لگا رہے، اور کسی قسم کی معصیت اور نافرمانی کیے بغیر اسی کی راہ میں قدم اٹھائے، اور ہر قسم کی روگردانی کے بغیر اس کے فرمان کی اطاعت کرے اور مسلمہ طور پر یہ اوصاف بہت کم لوگوں میں جمع ہو سکتے ہیں، اور یہ جو بعض نے اصولی طور پر انہیں محال خیال کیا ہے، بے بنیاد ہے، اور ان مفاہیم اور عبودیت کے ان مراحل سے ان کی عدم آشنائی کی دلیل ہے[1]

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ: پروردگار کے شکر کا حق ادا کرنا ایک لحاظ سے تو بہت ہی مشکل ہے کیونکہ جونہی انسان مقام شکر میں داخل ہوتا ہے اور یہ توفیق اسے نصیب ہوتی ہے، اور شکر گزاری کے وسائل اس کے اختیار میں قرار پاتے ہیں، تو یہ خود ایک نئی نعمت ہے، کہ جو ایک نئے شکر کی محتاج ہے، اور یہ موضوع تسلسل کی صورت اختیار کرلے گا، اور انسان جتنا زیادہ سے زیادہ اس کے شکر کے راستے میں سعی و کوشش کرے گا، تو اور زیادہ نعمتوں کا مشمول ہوتا چلا جائے گا کہ جن کا شکر ادا کرنے کی اس میں قدرت نہیں ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ شکر الٰہی کا حق ادا کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ اس کے شکر کو ادا کرنے سے عجز کا اظہار ہے۔ واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کے بہت ہی تھوڑے بندے - جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے - حقیقتاً اس راستہ میں قرار پاتے ہیں۔

مندرجہ ذیل احادیث پر توجہ کرنے سے اس بحث میں کافی روشنی پڑ سکتی ہے:

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے: "کیا پروردگار کے شکر کی کوئی حد

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۴ ص ۳۸۔

Marfat.com

ہے، کہ اگر انسان اس حد تک پہنچ جائے تو وہ شاکر محسوب ہو جائے گا"؟ آپؑ نے فرمایا: ہاں!
اس نے سوال کیا: کس طرح؟ آپؑ نے فرمایا:

یحمد اللّٰہ علیٰ کل نعمۃ علیہ فی اھل و مال، وان کان فیما انعم علیہ فی مالہ حق اداہ۔

"خدا کی تمام نعمتوں پر، چاہے وہ گھر والوں سے متعلق ہوں یا مال سے تعلق رکھتی ہوں، حمد و ثنا کرے، اور اس مال میں کہ جو اسے دیا گیا ہے کوئی حق ہو تو اسے ادا کرے"۔[1]

ایک اور حدیث میں انہی امام سے منقول ہے کہ:

شکر النعمۃ اجتناب المحارم

"نعمت کا شکر گناہ سے پرہیز کرنا ہے"۔[2]

نیز ایک دوسری حدیث میں انہیں حضرت سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

فیما اوحی اللّٰہ عزوجل الی موسیٰ: یا موسیٰ! اشکرنی حق شکری، فقال یا رب! وکیف اشکرک حق شکرک ولیس من شکر اشکرک بہ الا و انت انعمت بہ علی؟ قال یا موسیٰ! الان شکرتنی حین علمت ان ذالک منی!

"خداوند تعالیٰ نے موسیٰ کو وحی کی۔ اے موسیٰ! میرے شکر کا حق ادا کر، موسیٰ نے عرض کیا: مَیں تیرے شکر کا حق کیسے بجا لاؤں جبکہ حال یہ ہے کہ مَیں جو شکر بھی تیرا ادا کرتا ہوں، اس کی وجہ سے تو نے ایک اور نئی نعمت عطا کی ہے فرمایا: اے موسیٰ! اب تو نے میرا شکر ادا کر دیا ہے، چونکہ تو نے یہ جان لیا ہے کہ شکر ادا کرنے کی یہ توفیق بھی میری ہی طرف سے ہے"۔[3]

اس نکتہ پر توجہ بھی ضروری ہے کہ اُن لوگوں کا شکر ادا کرنا اور قدر دانی کرنا بھی کہ جو انسان کے لیے کسی نعمت کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، شکر خدا کے شعبوں میں سے ایک ہے، جیسا کہ امام سجاد علی بن الحسین علیہما السلام فرماتے ہیں:

"جب قیامت کا دن ہو گا تو خدا اپنے بعض بندوں سے کہے گا، کیا تُو نے فلاں

---

[1] و [2] "اصول کافی" جلد ۲ "باب الشکر" حدیث ۱۲ و حدیث ۱۰۔

[3] "اصول کافی" "باب الشکر" حدیث ۲۷۔

Marfat.com

شخص کا شکریہ ادا کیا ہے، تو وہ عرض کرے گا، مَیں تیرا شکر بجا لایا ہوں، خدا فرمائے گا، چونکہ تُو نے اس کا شکریہ ادا نہیں کیا ہے، لہٰذا تُو میرا شکر بھی بجا نہیں لایا،

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ:

"اشکرکم للّٰہ اشکرکم للناس"

"تم میں سے خدا کی بارگاہ میں زیادہ شکر گزار وہ ہے کہ جو لوگوں کے احسانات اور زحمتوں کا زیادہ شکر اور قدر دانی کرتا ہے"

"شکر" کی حقیقت کے بارے میں، اور شکر کس طرح نعمت کی زیادتی اور کفرانِ نعمت کس طرح اس کے فنا ہونے کا سبب بنتا ہے، ہم نے دسویں جلد سورۂ ابراہیم کی آیہ ۷ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے۔

Marfat.com

(۱۵) لَقَدۡ كَانَ لِسَبَاٍ فِیۡ مَسۡكَنِهِمۡ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنۡ يَّمِيۡنٍ
وَّشِمَالٍ ۬ؕ كُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ ؕ
بَلۡدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوۡرٌ ○
(۱۶) فَاَعۡرَضُوۡا فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ سَيۡلَ الۡعَرِمِ وَبَدَّلۡنٰهُمۡ
بِجَنَّتَيۡهِمۡ جَنَّتَيۡنِ ذَوَاتَىۡ اُكُلٍ خَمۡطٍ وَّاَثۡلٍ وَّشَیۡءٍ
مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِيۡلٍ ○
(۱۷) ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِمَا كَفَرُوۡا ؕ وَهَلۡ نُجٰزِىۡۤ
اِلَّا الۡكَفُوۡرَ ○

ترجمہ

(۱۵) قومِ سبا کے لیے ان کی سکونت کی جگہ میں (قدرتِ الٰہی کی) ایک نشانی تھی، دو (عظیم اور وسیع) باغ دائیں اور بائیں (فراواں پھلوں کے ساتھ، ہم نے اُن سے کہا) اپنے پروردگار کی روزی میں سے کھاؤ اور اس کا شکر بجالاؤ (تمہارے لیے) پاک و پاکیزہ شہر ہے اور بخشنے والا (اور مہربان) پروردگار۔

(۱۶) لیکن وہ (خدا سے) روگرداں ہو گئے، تو ہم نے بھی ویران کرنے والا سیلاب ان کی طرف بھیج دیا، اور ان کے دو (پُر برکت) باغوں کو ایسے دو (گھٹیا قسم کے) باغوں کے ساتھ بدل دیا کہ جن کے پھل کڑوے تھے، کچھ جھاؤ تھے، اور تھوڑے سے بیری کے درخت (باقی رہ گئے تھے)۔

Marfat.com

(۱۷) یہ ہم نے اُن کے کفر کی وجہ سے انہیں سزا دی تھی اور کیا کفرانِ نعمت کرنے والوں کے سوا ہم کسی اور کو ایسی سزا دیتے ہیں ؟

تفسیر

ایک درخشاں تمدن جو کفرانِ نعمت کی وجہ سے برباد ہو گیا

خدا نے داؤد و سلیمان کو جو اہم نعمتیں عطا کی تھیں، اور ان دونوں پیغمبروں نے جس طرح سے ان کا شکر ادا کیا تھا، ان کا بیان کرنے کے بعد، ایک اور قوم کے بارے میں کہ جو ان کے نقطۂ مقابل میں قرار پائی تھی، گفتگو کر رہا ہے، اور شاید وہ اسی زمانہ میں یا تھوڑا سا ان کے بعد زندگی بسر کرتے تھے، وہ بھی ایک ایسی قوم تھی کہ خدا نے انہیں انواع و اقسام کی نعمتیں عطا فرمائی تھیں، لیکن انہوں نے کفرانِ نعمت کی راہ اختیار کر لی لہٰذا خدا نے اپنی نعمتیں اُن سے سلب کر لیں، اور وہ اس طرح سے پریشان اور دربدر ہوئے کہ ان کی زندگی کا ماجرا سارے جہان کے لوگوں کے لیے ایک درسِ عبرت قرار پایا، اور وہ "قومِ سبا" تھی۔

قرآن مجید نے ان کی عبرت انگیز سرگزشت پانچ آیتوں کے ضمن میں بیان کی ہے، اور ان کی زندگی کے جزئیات و خصوصیات کے اہم حصہ کی طرف انہیں پانچ مختصر آیات میں اشارہ کیا ہے۔

پہلے کہتا ہے: "قوم سبا کے لیے ان کے محل سکونت میں خدائی قدرت کی ایک نشانی تھی" (لقد کان لسبأٍ فی مسکنهم اٰیة)۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے، خدا کی اس بزرگ آیت کا سرچشمہ یہ تھا، کہ قوم سبا۔ اس علاقے کے اطراف میں واقع پہاڑوں کے محل وقوع اور ان کے خاص حالات و شرائط، اور اپنی خداداد ذہانت اور ہوشمندی سے استفادہ کرتے ہوئے ۔ ان سیلابوں کو کہ جو سوائے ویرانی و تباہی کے کوئی نتیجہ نہ دیتے تھے، ایک قوی اور مستحکم بند کے پیچھے روک دینے پر قادر ہو گئے تھے اور اس کے ذریعہ انہوں نے بہت ہی آباد ملک تعمیر کر لیا تھا۔ یہ کتنی عظیم آیت ہے کہ ایک ویران اور برباد کرنے والا عامل، عمران و آبادی کے اہم ترین عوامل میں بدل جائے۔

اس بارے میں کہ "سبأ" (بروزن سبد) کس کا نام ہے؟ اور یہ کیا چیز ہے؟ مورخین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن مشہور یہ ہے کہ "سبا"، "یمن" کے اعراب کے باپ کا نام ہے اور اس روایت کے مطابق کہ جو پیغمبرِ اسلامؐ سے نقل ہوئی ہے، وہ ایک آدمی تھا اور اس کا نام "سبأ" تھا،

Marfat.com

اور اس کے دس بیٹے تھے، اور ان میں سے ہر ایک سے وہاں کے قبائل میں سے ایک قبیلہ وجود میں آیا۔[1]

بعض "سبأ" کو سرزمینِ یمن یا اس کے کسی علاقے کا نام سمجھتے ہیں، سورہ نمل میں سلیمان و ہُدہُد کے قصّہ میں قرآن مجید کا ظاہر بھی یہی نشاندہی کرتا ہے کہ "سبأ" کسی جگہ، علاقے یا مقام کا نام ہے، جہاں پر وہ کہتا ہے کہ (وجئتك من سبأ بنبإ یقین) "میں سرزمینِ سبا سے تیرے پاس ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں" (نمل - ۲۲)

جبکہ زیرِ بحث آیت کا ظاہر یہ ہے کہ سبا ایک قوم تھی کہ جو اس علاقے میں رہتی تھی، کیونکہ ضمیر جمع مذکر (ھم) ان کی طرف لوٹ رہی ہے۔

لیکن ان دونوں تفسیروں میں کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ ابتدا میں سبا کسی شخص کا نام ہو، پھر اس کے تمام بیٹے اور قوم اس نام سے موسوم ہوئے ہوں اور اس کے بعد یہ نام اس سرزمین کی طرف بھی منتقل ہو گیا ہو۔

اس کے بعد قرآن اس خدائی آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہ جو قوم سبا کے اختیار میں قرار پائی تھی، اس طرح کہتا ہے: "دو بڑے باغ تھے دائیں اور بائیں طرف" (جنّتان عن یمین و شمال)۔

یہ ماجرا اس طرح تھا کہ قوم سبا اس عظیم بند کے ذریعہ — جو انہوں نے اس علاقہ کے اہم پہاڑوں کے درمیان بنایا تھا — اس بات پر قادر ہو گئی تھی کہ ان فراواں سیلابوں کو — جو ویرانی کا سبب بنتے تھے یا کم از کم بیابانوں میں بے کار و فضول طور سے ضائع اور تلف ہو جاتے تھے — اس بند کے پیچھے ذخیرہ کرلیں اور اس کے اندر کھڑکیاں بنا کر پانی کے اس عظیم مخزن سے استفادہ کرنے کے لیے اپنے کنٹرول میں کرلیں اور اس طرح سے وسیع و عریض زمینوں کو زیرِ کاشت لائیں۔

وہ اشکال جو فخر رازی نے یہاں نقل کیا ہے، کہ دو باغوں کا ہونا کوئی عجیب یا اہم چیز نہیں ہے کہ جنہیں آیت اور نشانی کے طور پر ذکر کیا جائے، اس کے بعد اس اشکال کا جواب دیا ہے، کہ جو ہماری نظر میں اس قابل نہیں ہے کہ اسے بیان کیا جائے، کیونکہ وہ کوئی معمولی اور سادہ قسم کے باغ نہیں تھے، بلکہ یہ ایک عظیم نہر کے دونوں طرف باغوں کا مسلسل اور ملا ہوا سلسلہ تھا، جو اس عظیم سد کے ذریعہ سیراب ہوتے تھے اور وہ اتنے برکت والے تھے کہ تاریخوں میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ٹوکری اپنے سر پر رکھ کر پھلوں کی فصل میں درختوں کے نیچے سے عبور کرتا تھا تو اس قدر پھل اس میں

---

[1] مجمع البیان زیرِ بحث آیہ کے ذیل میں۔

Marfat.com

گرتے تھے کہ تھوڑی سی دیر میں وہ ٹوکری بھر جاتی تھی ۔

وہی سیلاب کہ جو خرابی و بربادی کا باعث بنیں، وہ اس طرح سے آبادی کا باعث بن جائیں، کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟ کیا یہ خدا کی عظیم آیت اور نشانی شمار نہیں ہوتی ۔

ان تمام باتوں کے علاوہ اُس سرزمین پر حد سے زیادہ امن وامان سایہ فگن تھا کہ وہ خود بھی حق تعالیٰ کی ایک آیت شمار ہوتا تھا کہ جس کی طرف قرآن بعد میں اشارہ کرے گا ۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "ہم نے اُن سے کہا کہ اپنے پروردگار کی اس فراواں روزی میں سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو" (کلوا من رزق ربکم واشکروا لہ) ۔

"ایک پاک و پاکیزہ شہر ہے اور پروردگار بخشنے والا اور مہربان" (بلدة طيبة ورب غفور) ۔[۱] و[۲]

اس چھوٹے سے جملے نے تمام مادی و معنوی نعمتوں کے مجموعہ کو زیبا ترین شکل میں منعکس کر دیا ہے، مادی نعمتوں کے لحاظ سے تو وہ پاک و پاکیزہ زمین رکھتے تھے کہ جو چوروں، ظالموں، آفات و بلیات، خشک سالی و قحط اور بدامنی و وحشت جیسی طرح طرح کے مصائب سے پاک تھی، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ وہ زمین موذی حشرات سے بھی پاک و پاکیزہ تھی، پاک و پاکیزہ ہوائیں چلتی تھیں اور فرحت بخش نسیم رواں دواں تھی، زمین زرخیز تھی اور درخت پُربار تھے ۔

اور معنوی نعمت کے لحاظ سے خدا کی بخشش و غفران ان کے شاملِ حال تھی، وہ ان کی تقصیر و کوتاہی سے صرف نظر کرتا تھا اور انہیں مشمولِ عذاب اور ان کی سرزمین کو بلا و مصیبت میں گرفتار نہیں کرتا تھا ۔

٭ ٭ ٭

لیکن ان ناشکرے لوگوں نے ان تمام نعمتوں کی قدر دانی نہیں کی اور آزمائش کی کٹھالی سے صحیح وسالم باہر نہ آسکے ۔ انہوں نے کفرانِ نعمت اور روگردانی کی راہ اختیار کر لی لٰہذا خدا نے بھی ان کی سختی کے ساتھ گوشمالی کی ۔

اسی لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "وہ خدا سے روگرداں ہو گئے" (فاعرضوا) ۔

۱۔ "بلدة" خبر ہے مبتدائے محذوف کی، اور تقدیر میں اس طرح تھا "هذه بلدة طيبة وهذا رب غفور" یہ پاکیزہ شہر ہے اور یہ بخشنے والا خدا ہے ۔

۲۔ کیا یہ خدائی پیغام ان پیغمبروں کے ذریعہ جو ان کے درمیان مبعوث ہوتے تھے، بھیجا گیا تھا ۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے ۔ یا حالات و شرائط زبان حال سے اور ادراک عقلی سے اس قسم کا پیغام انہیں دیتے تھے، دونوں چیزیں ممکن ہیں ۔

Marfat.com

انہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناقدری کی، عمران و آبادی اور امن و امان کو عام سی چیز خیال کیا۔ حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو گئے، نعمت میں مست ہو گئے، مالدار لوگ، فقراء و مساکین اور غرباء کو حقیر خیال کرتے اور خود پر ناز کرتے اور ان غریبوں کو اپنے لیے رکاوٹ خیال کرتے کہ جس کی تفصیل بعد والی آیات میں آئے گی۔

یہ وہ موقع تھا کہ عذاب کا کوڑا ان کے پیکر پر آکر پڑا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "ہم نے بنیادوں کو اکھاڑ کر پھینک دینے والا وحشتناک سیلاب ان کے پاس بھیجا" اور ان کی آباد سرزمین ایک ویرانے میں بدل گئی (فارسلنا علیهم سیل العرم)۔

"عرم" اصل میں "عرامه" (بروزن علامہ) ہے، خشونت وسختی، کج خلقی اور سخت گیری کے معنی میں ہے اور سیلاب کی اس سے توصیف کرنا اس کی شدت وخشونت اور ویران گری کی طرف اشارہ ہے اور سیل العرم کی تعبیر۔ اصطلاح کے مطابق ۔ موصوف کی صفت کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے۔

بعض نے "عرم" کو جنگلی چوہوں کے معنی میں لیا ہے کہ جو اس سد میں سوراخ کرنے کی وجہ سے اس کی ویرانی کا سبب بنتے تھے (چوہوں کا سد میں نفوذ کرنے کا مسئلہ اگرچہ قابل قبول ہے اس طور سے کہ جس کی ہم بعد میں تشریح کریں گے، لیکن آیت کی تعبیر اس معنی سے چنداں مناسبت نہیں رکھتی)۔

"لسان العرب" میں مادہ "عرم" کے مختلف معنی آئے ہیں، منجملہ ان کے، طاقت فرسا سیلاب، وہ رکاوٹیں جو درّوں کے درمیان پانی کو روکنے کے لیے بناتے ہیں اسی طرح بڑے صحرائی چوہے[1]

لیکن سب سے زیادہ مناسب وہی پہلا معنی ہے اور تفسیر علی بن ابراہیم میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

اس کے بعد قرآن اس سرزمین کی باقی ماندہ حالت وکیفیت کی اس طرح سے توصیف کرتا ہے: "ہم نے ان کے دو وسیع اور پُر نعمت باغوں کو، دو بے قدر وقیمت کڑوے پھلوں والے اور جھاؤ کے بے مصرف درختوں اور تھوڑے سے بیری کے درختوں میں بدل دیا" (و بدلنا هم بجنتيهم جنتين ذواتی اكل خمط واثل وشیء من سدر قلیل)۔

"اکل" ہر قسم کے غذائی مادہ کے معنی میں ہے۔

"خمط" (بروزن عمد) کڑوی گھاس کے معنی میں ہے۔

"اثل" (بروزن اصل) جھاؤ کے درخت کے معنی میں ہے۔

---

[1] لسان العرب، مادہ عرم۔

Marfat.com

اور اس طرح سے ان تمام سرسبز و شاداب درختوں کے بجائے بہت ہی کم قدر و قیمت والے بیابانی اور جنگلی قسم کے چند ایک درخت، کہ شاید ان میں سے سب زیادہ اہم درخت وہی بیری کے درخت تھے، کہ وہ بھی تھوڑی سی ہی مقدار میں تھے، باقی رہ گئے تھے (اب تم اس کی اس مجمل داستان کو پڑھنے کے بعد خود ہی ان کی مفصل داستان کا اندازہ لگا لو، کہ خود ان کے اوپر اور ان کی آباد سرزمین پر کیا گزری)۔

ممکن ہے کہ ان تین قسم کے درختوں کا بیان کہ جو اس سرزمین میں باقی رہ گئے تھے (درختوں کے) تین مختلف گروہوں کی طرف اشارہ ہو، کہ ان درختوں میں سے ایک حصہ نقصان دہ تھا، بعض بے مصرف تھے، اور بعض بہت ہی کم نفع دینے والے تھے۔

* * *

بعد میں آنے والی آیت سے نتیجہ نکالتے ہوئے صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ: "یہ ہماری طرف سے ان کے کفران نعمت کی سزا تھی"۔ (ذالک جزیناھم بما کفروا)۔

لیکن اس غرض سے کہ کہیں یہ تصور نہ کر لیا جائے کہ یہ انجام صرف اسی گروہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے کہ جو ان ہی جیسے اعمال کے مرتکب ہوں گے، اس کی عمومیت مسلّم ہے۔ اس طرح اضافہ کرتا ہے: "کیا ہم کفرانِ نعمت کرنے والوں کے سوا کسی اور کو اس قسم کی سزا دیتے ہیں" (وھل نجازی الا الکفور)۔ یہ تھا خلاصہ سبا کی سرگزشت کا، کہ جو بعد والی آیات میں زیادہ تشریح کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

* * *

Marfat.com

(۱۸) وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بٰرَكْنَا فِيْهَا
قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ
وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ○
(۱۹) فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ○

ترجمہ

(۱۸) اُن کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان کہ جنہیں ہم نے برکت دے رکھی تھی، ہم نے کچھ ایسی اور آبادیاں بھی رکھی تھیں، جن میں ایسے مناسب اور نزدیک نزدیک فاصلے تھے (کہ ایک سے دوسری دکھائی دیتی تھی،) (اور اُن کے درمیان چلنے پھرنے کو آسان بنا دیا تھا ، اور ہم نے ان سے کہا کہ) تم مکمل امن و امان کے ساتھ راتوں میں بھی اور دنوں میں بھی ان آبادیوں کے درمیان سفر کرو۔

(۱۹) لیکن (ان ناشکرے لوگوں نے) کہا، پروردگارا! ہمارے سفروں کے درمیان دُوری ڈال دے' (تاکہ غریب و نادار لوگ مالدار لوگوں کے دوش بدوش سفر نہ کرسکیں! اور اس طرح سے) انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، اور ہم نے انہیں (دوسروں کے لیے) قصہ اور افسانہ بنا دیا، اور ہم نے ان کی جمعیت کو منتشر اور

Marfat.com

تتر بتر کر دیا، اس ماجرا میں ہر صابر اور شکر کرنے والے کے لیے عبرت کی کئی اور نشانیاں ہیں۔

تفسیر

ہم نے انہیں اسطرح منتشر کیا کہ وہ دوسروں کیلئے ضرب المثل بن گئے

ان آیات میں قرآن دوبارہ قوم سبا کی داستان کی طرف لوٹتا ہے اور ان کے بارے میں مزید تشریح و تفصیل بیان کرتا ہے، اور ان کی سزا اور عذاب کو بھی زیادہ شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتا ہے، اس طرح سے کہ یہ ہر سننے والے کے لیے ایک ایسا درس ہے جو بہت اہم، سبق آموز اور تربیت کنندہ ہے، فرماتا ہے کہ: "ہم نے ان کی سرزمین کو اس حد تک آباد کیا تھا کہ نہ صرف ہم نے شہروں کو غرق نعمت کیا ہوا تھا بلکہ ان کے اور ان کی اُن زمینوں کے درمیان کہ جنہیں ہم نے برکت دے رکھی تھی، ظاہر (ایک سے دوسرے کو دکھائی دینے والے) اور آشکار شہر اور آبادیاں قرار دیا تھا" (وجعلنا بینھم و بین القری التی بارکنا فیھا قرًی ظاھرۃ)۔

درحقیقت ان کے اور ان کی مبارک سرزمین کے درمیان متصل اور زنجیر کی کڑیوں کی طرح آبادیاں تھیں، اور ان آبادیوں کے درمیان اتنا کم فاصلہ تھا کہ وہ ہر ایک میں سے دوسری کو دیکھتے تھے (اور یہ ہے "قری ظاھرۃ" — واضح و آشکار آبادیوں کا معنی)۔

بعض مفسرین نے "قری ظاھرہ" کی دوسری طرح تفسیر کی ہے، اور کہا ہے کہ یہ ان آبادیوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو ٹھیک راستہ کے درمیان واضح طور پر واقع تھیں اور مسافرین ان میں اچھی طرح توقف کر سکتے تھے، یا یہ کہ یہ آبادیاں بلندی کے اوپر واقع تھیں، اور ہر عبور کرنے والے کو صاف طور پر دکھائی دیتی تھیں۔

باقی رہا یہ کہ مبارک زمینوں سے کونسا علاقہ مراد ہے، اکثر مفسرین نے اسے سرزمین شامات (شام، فلسطین اور اُردن) سے تفسیر کی ہے، کیونکہ یہ تعبیر اسی سرزمین کے لیے سورہ اسراء کی پہلی آیت اور سورہ انبیاء کی آیت ۸۱ میں آئی ہے لیکن بعض مفسرین نے احتمال دیا ہے، کہ اس سے مراد "صنعاء" یا "مآرب" کی آبادیاں ہیں کہ یہ دونوں ہی یمن کے علاقہ میں واقع ہیں، اور یہ تفسیر بعید نہیں ہے، کیونکہ "یمن کا" — جو جزیرہ عرب کا جنوبی ترین نقطہ ہے — "شامات" سے فاصلہ — کہ جو شمالی ترین نقطہ میں واقع ہے — اس قدر زیادہ ہے، اور خشک اور جلے ہوئے بیابانوں سے اٹا ہوا ہے، کہ اس کے ساتھ آیت کی تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے، اور تواریخ میں بھی نقل نہیں ہوا ہے، بعض نے یہ احتمال

Marfat.com

بھی دیا ہے کہ سرزمین ہائے مبارک سے مراد "مکہ" کی سرزمین ہے کہ وہ بھی بعید ہے۔
یہ بات تو آبادی کے لحاظ سے ہے، لیکن چونکہ لوگوں کی آبادی کافی نہیں ہے بلکہ اہم اور بنیادی شرط امن و امان ہوتا ہے، لہٰذا مزید کہتا ہے: "ہم نے ان آبادیوں کے درمیان مناسب اور نزدیک نزدیک فاصلے رکھے" (تاکہ وہ آسانی اور امن و امان کے ساتھ ایک دوسری میں آجاسکیں) (وقدرنا فیھا السیر)۔
اور ہم نے ان سے کہا: "تم ان بستیوں کے درمیان راتوں میں اور دنوں میں پورے امن و امان کے ساتھ سفر کرو اور ان آبادیوں میں چلو پھرو" (سیروا فیھا لیالی وایامًا اٰمنین)۔
اس طرح یہ آبادیاں مناسب اور جچا تُلا فاصلہ رکھتی تھیں اور وحوش اور بیابانی درندوں، یا چوروں اور ڈاکوؤں کے حملہ کے لحاظ سے بھی انتہائی امن و امان میں تھیں، اس طرح سے کہ لوگ زادِ راہ، سفر خرچ اور سواری کے بغیر ہی ــ اس صورت میں کہ نہ تو اکٹھے قافلوں میں چلنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی مسلح افراد ساتھ لینے کی کوئی احتیاج تھی ــ راستے کی بے امنی کی جہت سے، یا پانی اور غذا کی کمی کی وجہ سے کسی ڈر اور خوف کے بغیر اپنے سفر کو جاری رکھ سکتے تھے۔
اس بارے میں کہ "سیروا فیھا ...." (ان آبادیوں میں چلو پھرو) کا جملہ کس شخص کے ذریعہ انہیں پہنچایا گیا، دو احتمال موجود ہیں، ایک تو یہ ہے کہ یہ انہیں ان کے پیغمبروں کے ذریعہ پہنچایا گیا اور دوسرے یہ کہ اس آباد سرزمین اور امن و امان والی سڑکوں کی زبانِ حال یہی تھی۔
"لیالی" (راتوں) کو "ایام" (دنوں) پر مقدم رکھنا، ممکن ہے اس وجہ سے ہو، کہ راتوں میں امن و امان کا ہونا زیادہ اہم ہے، راستے کے چوروں سے امنیت کے لحاظ سے بھی اور جنگل کے وحشی درندوں کے لحاظ سے بھی، ورنہ دن کے امن و امان کو قائم رکھنا زیادہ آسان ہے۔
لیکن یہ ناشکرے لوگ، خدا کی ان عظیم نعمتوں کے مقابلہ میں کہ جنہوں نے ان کی زندگی کو مکمل طور پر گھیر رکھا تھا، بہت سی دوسری متنعم قوموں کی طرح، غرور و غفلت میں گرفتار ہو گئے، نعمت کی مستی اور کم ظرفی نے انہیں اس بات پر ابھارا، کہ ناشکری کا راستہ اختیار کریں، حق کے راستے سے منحرف ہو جائیں، اور خدا کے احکام کی طرف سے بے پروا ہو جائیں۔
ان کے مجنونانہ تقاضوں میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے خدا سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کے سفروں کے درمیان فاصلہ ڈال دے، "انہوں نے کہا: پروردگارا! ہمارے سفروں کے درمیان فاصلہ ڈال دے" تاکہ بے سہارا فقیر لوگ امراء کے دوش بدوش سفر نہ کرسکیں! (فقالوا ربنا باعد بین اسفارنا)۔
ان کی مراد یہ تھی کہ ان آباد بستیوں کے درمیان فاصلہ ہو جائے اور کچھ خشک بیابان پیدا ہو

Marfat.com

جائیں۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ اغنیاء اور ثروت مند لوگ اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ تھوڑی آمدنی والے لوگ بھی انہی کی طرح سفر کریں، اور جہاں چاہیں بغیر کسی زادِ راہ اور توشہ وسواری کے چلے جائیں، گویا سفر ان کے لیے ایک اعزاز وافتخار اور ان کی قدرت و ثروت کی نشانی تھا، اور یہ امتیاز و برتری ہمیشہ انہی کے لیے مخصوص رہنی چاہیئے۔

اور یا یہ بات بھی کہ راحت و آرام نے انہیں بے چین کر رکھا تھا، جیسا کہ بنی اسرائیل "من" و "سلوی" (دو آسمانی غذاؤں) سے تنگ آگئے تھے اور خدا سے پیاز، لہسن اور مسور کی دال کا تقاضا کرنے لگے تھے۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "باعد بین اسفارنا" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس قدر آرام طلب ہو گئے تھے کہ وہ اب چراگاہوں سے استفادہ کرنے، یا تجارت و زراعت کے لیے سفر کرنے پر تیار نہیں تھے، لہٰذا انہوں نے خدا سے یہ مطالبہ اور تقاضا کیا کہ ہمیشہ وہ اپنے وطن میں ہی رہیں، اور ان کے سفروں میں زمانہ کے اعتبار سے بہت زیادہ فاصلہ ہو جائے۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ بہتر نظر آتی ہے۔

بہرحال "انہوں نے اپنے اس عمل سے اپنے اوپر ظلم کیا" (وظلموا انفسھم)۔

ہاں! اگر وہ سوچ رہے تھے، کہ وہ دوسروں پر ظلم کر رہے تھے تو وہ غلطی پر تھے۔ انہوں نے تو ایک ایسا خنجر اٹھایا ہوا تھا کہ جس سے وہ اپنے ہی سینہ کو زخمی کر رہے تھے اور اس ساری آگ کا دھواں خود انہیں کی آنکھ میں گیا۔

کس قدر عمدہ تعبیر ہے، قرآن اس جملہ کے بعد، کہ جو ان کے دردناک انجام کے بارے میں بیان کیا ہے، کہتا ہے: "ہم نے انہیں ایسی سزا دی اور ان کی زندگی کو لپیٹ کر رکھ دیا، کہ: "انہیں ہم نے دوسروں کے لیے داستان اور افسانہ بنا دیا" (فجعلنا ھم احادیث)۔

ہاں! ان کی تمام تر بارونق زندگی اور درخشاں و وسیع تمدن میں سے زبانی قصوں، دلوں کی یادوں اور تاریخوں کے صفحات پر چند سطروں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا: "اور ہم نے انہیں بُری طرح سے حیران و پریشان کر دیا" (ومزقناھم کل ممزق)۔

ان کی سرزمین ایسی ویران ہوئی کہ اُن میں وہاں قیام کرنے کی طاقت نہ رہی، اور زندگی کو باقی رکھنے کے لیے وہ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ ان میں سے ہر گروہ کسی طرف کا رُخ کرے اور خزاں کے پتوں کی طرح، کہ جو تند و تیز ہواؤں کے اندر اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں ہر ایک کسی گوشہ میں جا گرے، اس طرح سے کہ ان کی پریشانی ضرب المثل بن گئی، کہ جب کبھی لوگ یہ کہنا

Marfat.com

چاہتے کہ فلاں جمعیت سخت پراگندہ اور تتر بتر ہوگئی تو وہ یہ کہا کرتے تھے کہ: "تفرقوا ایادی سبا"! (وہ قوم سبا اور ان کی نعمتوں کی طرح پراگندہ ہوگئے ہیں) [1]

بعض مفسرین کے قول کے مطابق قبیلۂ "غسان" شام کی طرف گیا اور "اسد" عمان کی طرف، "خزاعہ" تہامہ کی طرف، اور قبیلۂ "انمار" یثرب کی طرف [2]

اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "یقیناً اس سرگزشت میں صبر اور شکر کرنے والوں کے لیے عبرت کی آیات اور نشانیاں ہیں" (ان فی ذٰلک لاٰیات لکل صبار شکور)۔

"صابرین" اور "شاکرین" ہی ان قصوں سے، کیوں درس عبرت لے سکتے ہیں؟ (خاص طور پر اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ صبار اور شکور دونوں ہی مبالغہ کے صیغے ہیں اور تکرار اور تاکید کو بیان کرتے ہیں)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے صبر و استقامت کی بنا پر ہوا و ہوس کی سرکش سواری کو لگام دیتے ہیں اور گناہوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہتے ہیں، اور اپنی شکر گزاری کی وجہ سے خدا کی اطاعت کے راستہ میں آمادہ اور بیدار ہوتے ہیں، اور اسی بنا پر اچھی طرح سے عبرت حاصل کرتے ہیں، لیکن وہ لوگ کہ جو ہوا و ہوس کے مرکب پر سوار ہوتے ہیں، اور خدائی مواہب اور نعمتوں سے بے اعتنا ہوتے ہیں، وہ ان ماجروں سے کیسے عبرت حاصل کرسکتے ہیں؟

چند نکات

۱۔ قوم سبا کا عجیب و غریب ماجرا

جس طرح قرآن اور اسلامی روایات اور اسی طرح تواریخ سے معلوم ہوتا ہے، وہ ایک ایسی جمعیت اور قوم تھی کہ جو جزیرہ عرب کے جنوب میں رہتی تھی، اور ایک اعلیٰ حکومت اور درخشاں تمدن کی مالک تھی۔

یمن کا علاقہ وسیع اور زرخیز تھا لیکن زرخیز علاقہ ہونے کے باوجود چونکہ وہاں کوئی اہم دریا نہیں تھا، لہٰذا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا تھا، سیلاب اور بارشیں پہاڑوں پر برستی تھیں

---

[1] یہ ضرب المثل دو صورتوں میں نقل ہوئی ہے: "تفرقوا ایدی سبا" و "ایادی سبا"، پہلی صورت میں لشکر اور ان کے افراد کی پراگندگی کی طرف اشارہ ہے، اور دوسری صورت میں ان کے اموال و مکانات و مواہب کی پراگندگی مراد ہے، کیونکہ ایادی عام طور پر نعمتوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

[2] "تفسیر قرطبی" و "تفسیر ابوالفتوح رازی"، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

اور ان کا پانی بیابانوں میں بے کار اور بے فائدہ ضائع ہو جاتا تھا، اس سرزمین کے سمجھدار لوگ ان پانیوں سے استفادہ کرنے کی فکر میں لگ گئے اور اہم علاقوں میں بہت سے بند باندھے، کہ جن میں سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ پانی کا ذخیرہ رکھنے والا بند "مآرب" تھا۔

"مآرب" (بروزن مغرب) ایک شہر تھا کہ جو ان درّوں میں سے ایک کے آخر میں واقع تھا، اور "صراۃ" کے کوہستانوں کے بڑے بڑے سیلاب اس کے قریب سے گزرتے تھے، اس درّہ کے دہانہ پر اور "بلق" نامی دو پہاڑوں کے دامن میں انہوں نے ایک مضبوط بند باندھا تھا اور اس میں سے پانی کی کئی نہریں نکالی تھیں، اس بند کے اندر پانی کا اس قدر ذخیرہ جمع ہو گیا تھا کہ جس سے استفادہ کرتے ہوئے وہ اس بات پر قادر ہو گئے تھے کہ اس نہر کے دونوں طرف ۔ کہ جو بند تک جاتی تھی ۔ بہت ہی خوبصورت و زیبا باغات لگائیں اور پُر برکت کھیت تیار کریں ۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اس سرزمین کی آباد بستیاں ایک دوسری سے متصل تھیں اور درختوں کے وسیع سائے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور اُن کی شاخوں پر اتنے پھل لگا کرتے تھے کہ کہتے ہیں کہ جب کوئی آدمی اپنے سر پر ایک ٹوکری رکھ کر ان کے نیچے سے گزرتا تھا، تو یکے بعد دیگرے اتنے پھل اس میں آکر گرتے تھے کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹوکری پُر ہو جاتی تھی ۔

امن وامان کے ساتھ نعمت کے وفور نے پاک وصاف زندگی کے لیے بہت ہی عمدہ اور مرفہ ماحول پیدا کر رکھا تھا، ایک ایسا ماحول جو خدا کی اطاعت اور معنوی پہلوؤں کے ارتقاء وتکامل کے لیے مہیا تھا ۔

لیکن انہوں نے ان تمام نعمتوں کی قدر کو نہ پہچانا اور خدا کو بھول گئے اور کفران نعمت میں مشغول ہو گئے، اور فخر ومباہات کرنے لگے، اور طبقاتی اختلافات پیدا کر دیئے ۔

بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ صحرائی چوہوں نے مغرور و مست لوگوں کی آنکھوں سے دُور، مٹی کے اس بند کی دیوار کا رُخ کیا اور اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا، اچانک ایسی شدید بارشیں برسیں اور ایسا عظیم سیلاب آیا کہ جس سے بند کی وہ دیواریں کہ جو سیلاب کے دباؤ کو برداشت کرنے کے قابل نہ رہی تھیں، دھڑام سے گر پڑیں اور بہت ہی زیادہ پانی کہ جو بند کے اندر جمع ہو رہا تھا اچانک باہر نکل پڑا اور تمام آبادیوں، باغات، کھیتوں، فصلوں اور چوپایوں کو تباہ کر کے رکھ دیا اور خوبصورت سجے سجائے قصور و محلات اور مکانات کو ویران کر دیا اور اس آباد سرزمین کو خشک اور بے آب و گیاہ صحرا میں بدل دیا اور ان تمام سرسبز و شاداب باغوں اور پھلدار درختوں میں سے صرف چند "اراک" کے کڑوے شجر، کچھ جھاؤ اور کچھ بیری کے درخت باقی رہ گئے، غزل خوانی کرنے والے پرندے

Marfat.com

وہاں سے کوچ کر گئے اور اُلووں اور کوّوں نے ان کی جگہ لے لی [1]

ہاں! جب خدا اپنی قدرت دکھانا چاہتا ہے تو چند چوہوں کے ذریعہ ایک عظیم تمدن کو برباد کردیتا ہے، تاکہ بندے اپنے ضعف اور کمزوری سے آگاہ ہو جائیں، اور قدرت اور اقتدار کے وقت مغرور نہ ہوں۔

۲۔ قرآن کا ایک تاریخی معجزہ

قرآن مجید نے اوپر والی آیات میں قوم سبا کی داستان بیان کی ہے' اور مدتیں گزرچکی تھیں کہ دنیا جہان کے مؤرخین اس قسم کی قوم اور اس طرح کے تمدن سے بے خبری کا اظہار کرتے تھے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مؤرخین جدید انکشافات سے پہلے ملوک سبا کے سلسلہ اور ان کے عظیم تمدن کا نام تک نہیں لیتے تھے اور "سبا" کو صرف ایک فرضی شخص سمجھتے تھے، کہ جو حکومت "حمیر" کے بانی کا باپ تھا، جبکہ قرآن میں ایک پوری سورت اسی قوم کے نام کی ہے' اور ان کے تمدن کے مظاہر میں سے ایک مظہر کی طرف جو مآرب کے تاریخی بند کی تعمیر ہے' اشارہ کر رہی ہے لیکن یمن میں اس قوم کے تاریخی انکشافات کے بعد ماہر دانشمندوں کا عقیدہ دگرگوں ہو گیا ہے۔

اس بات کا سبب' کہ اب تک قوم "سبا" کے تمدن کے آثار معلوم نہ ہوئے، دو باتیں تھیں' ایک تو راستہ کی سختیاں اور آب و ہوا کی شدید گرمی' اور دوسرے اس علاقے کے لوگوں کی بیگانوں اور اجنبی لوگوں کے بارے میں بدگمانی' جسے بے خبر اور ناآگاہ یورپ والے کبھی کبھی وحشت سے تعبیر کرتے تھے، یہاں تک کہ چند ماہرین آثارِ قدیمہ، کہ جو سبا کے اسرار کھولنے کی طرف شدید لگاؤ رکھتے تھے، "شہر" مآرب" کے قلب اور اس کے نواح میں وارد ہونے میں کامیاب ہو گئے، اور پتھروں پر ثبت شدہ آثار، خطوط اور نقوش کے نمونے اٹھا کر لے گئے، اور اس کے بعد انیسویں صدی عیسوی میں کئی گروہ نے یکے بعد دیگرے وہاں تک راہ نکال لی' اور وہاں سے گراں بہا آثار اپنے ساتھ یورپ لے گئے اور ان نقوش و خطوط اور دوسرے آثار کے مجموعہ سے کہ جو ایک ہزار نقوش تک پہنچے ہوئے تھے' اس قوم کے تمدن کی جزئیات بلکہ سدِ مآرب کی بنا کی تاریخ اور دوسرے خصوصیات تک معلوم کر لیے' اور اہلِ مغرب پر ثابت ہو گیا کہ قرآن نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا تھا، وہ کوئی افسانہ نہیں تھا، بلکہ وہ ایک تاریخی واقعیت اور حقیقت ہے، کہ جس سے وہ بے خبر تھے' اس طور پر کہ اب تو انہوں نے اس عظیم سد، اور پانی کے گزرنے کے مقامات اور دائیں بائیں باغوں کی

---

[1] "تفسیر مجمع البیان" و قصص قرآن اور دیگر تفاسیر سے اقتباس۔

Marfat.com

درمیانی نہروں اور اس کی دوسری خصوصیات کے بارے میں نقشے بھی تیار کر لیے ہیں [1]

۳۔ ایک مختصر سے واقعہ میں عبرت کے اہم نکات

"سلیمانؑ" کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد، قرآن مجید میں قوم سبا کی داستان کا بیان کرنا ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔

۱۔ داؤدؑ و سلیمانؑ بہت ہی عظیم پیغمبر تھے کہ جنہوں نے ایک عظیم حکومت تشکیل دی تھی اور وہ ایک درخشاں تمدن کو وجود میں لائے تھے، لیکن داؤدؑ و سلیمانؑ کی وفات کے ساتھ ہی یہ تمدن ختم ہو گیا۔ قوم سبا نے بھی ایک عظیم تمدن قائم کیا تھا، کہ جو سدِ "مآرب" کے ٹوٹ جانے سے برباد ہو گیا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ۔ روایات کے مطابق۔ سلیمانؑ کے عصا کو تو دیمک نے کھایا تھا، اور "مآرب" کے عظیم بند میں صحرائی چوہوں نے سوراخ کیا تھا تاکہ یہ مغرور انسان سمجھ لے کہ مادی نعمتیں چاہے جتنی بھی عظیم کیوں نہ ہوں، ایک ہوا کے جھونکے سے ختم ہو جاتی ہیں، ایک کیڑا یا ایک چھوٹا سا جانور انہیں زیر و زبر کر سکتا ہے، تاکہ باخبر لوگوں کے لیے عبرت ہو کہ وہ اس کے ساتھ دل نہ لگائیں اور مومن اس کے اسیر اور قیدی نہ بنیں، اور مغرور لوگ غرور کی مستی سے ہوش میں آجائیں اور تکبّر اور ظلم و ستم کی راہ اختیار نہ کریں۔

۲۔ اس سے قطع نظر یہاں پر باشکوہ تمدن کے دو چہرے نظر آتے ہیں کہ جن میں سے ایک رحمانی ہے اور دوسرا شیطانی، لیکن نہ وہ باقی رہا اور نہ یہ، اور دونوں کے دونوں ہی فنا کی گود میں چلے گئے۔

۳۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قوم سبا کے مغرور لوگ جو عامۃ الناس کو اپنے قریب نہیں دیکھ سکتے تھے، اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ بڑے بڑے لوگوں کی اقلیت اور کم آمدنی والے لوگوں کی اکثریت کے درمیان کوئی بہت بڑا بند اور ایک عظیم سرحد ہونی چاہیئے تاکہ وہ ہرگز آپس میں نہ ملیں جُلیں، لہٰذا انہوں نے خدا سے آبادیوں کے دور دور واقع ہونے اور سفروں کے لمبا اور دور دراز ہونے کا تقاضا کیا۔ خدا نے بھی ان کی دعا قبول کرلی، اور وہ اس طرح سے بکھرے اور پراگندہ ہوئے کہ اُن میں سے ہر ایک گروہ کسی ایک طرف چلا گیا اور وہ ایک دوسرے سے اس طرح سے دور ہوئے کہ اگر وہ ایک دوسرے کو دیکھنا اور ملاقات کرنا چاہتے بھی تو اُس کے لیے ایک طویل عمر تک سفر درکار ہوتا۔

۴۔ جس وقت کوئی شخص سیل عرم کے آنے سے پہلے اور اس کے آنے کے بعد کی اس سرزمین کی وضع و کیفیت پر نظر کرتا، تو وہ اس بات کا یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی سرزمین ہے کہ جو ایک دن سرسبز و

---

[1] فرہنگ قصص القرآن۔ مادہ "سبا"۔ (ملخص)۔

Marfat.com

شاداب اور میوہ دار درختوں سے پُرتھی، کہ جو آج ایک وحشتناک بیابان کی شکل میں ۔ کہ جس میں کہیں کہیں جھاؤ کے درخت، پیلو اور بیریاں' ایسے مسافروں کی طرح کہ جو راستہ بھول گئے ہوں اور ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہوں ۔ نظر آتا ہے ۔

یہ منظر زبانِ حال سے کہتا ہے کہ: انسان کے وجود کی سرزمین بھی اسی طرح ہے' کہ اگر اس کی تعمیری قوتوں کو کنٹرول کیا جائے' اور اس کی صلاحیتوں کا صحیح مصرف ہو، تو علم و عمل اور فضائل اخلاقی کے سرسبز و شاداب باغات بار آور ہوں گے، لیکن اگر تقویٰ کا بند ٹوٹ جائے' اور خواہشات ایک ویران کرنے والے سیلاب کی شکل میں انسانی زندگی کی سرزمین کو ڈھانپ لیں ۔

تو بے قدر و قیمت ویرانی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے گا، اور کبھی بھی ایک ایسا عامل جو ظاہری طور پر چھوٹا سا ہوتا ہے' آہستہ آہستہ بنیاد کو کاٹنا شروع کر دیتا ہے' اور ہر چیز کو درہم برہم کر دیتا ہے' لہٰذا ایسے چھوٹے چھوٹے عوامل تک سے ڈرتے رہنا چاہیئے ۔

۵۔ آخری بات، کہ جس کی طرف اشارہ کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب ماجرا ایک دفعہ پھر اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ انسان کی موت اس کی زندگی کے اندر ہی چھپی ہوتی ہے' اور وہی چیز کہ جو ایک دن اس کی حیات و آبادی کا باعث ہوتی ہے، دوسرے دن ممکن ہے اس کی موت اور ویرانی کا عامل بن جائے ۔

Marfat.com

(۲۰) وَلَقَدۡ صَدَّقَ عَلَيۡهِمۡ اِبۡلِيۡسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوۡهُ اِلَّا فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ○

(۲۱) وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِالۡاٰخِرَةِ مِمَّنۡ هُوَ مِنۡهَا فِىۡ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ حَفِيۡظٌ ○

ترجمہ

(۲۰) ہاں ! یقیناً ابلیس نے ان کے بارے میں اپنا گمان سچا پایا، کہ سوائے مومنین کے ایک تھوڑے سے گروہ کے سب ہی نے اس کی پیروی کی ۔

(۲۱) اس کا ان کے اوپر کوئی قابو تو نہیں تھا (اور نہ ہی اس نے انہیں اپنی پیروی پر مجبور کیا) اور شیطان کو اس کے وسوسوں میں آزاد چھوڑنے کا مقصد یہ تھا کہ آخرت پر ایمان رکھنے والے ان لوگوں سے کہ جو اس کے بارے میں شک میں ہیں الگ پہچانے جائیں ، اور تیرا پروردگار ہر چیز کا حافظ اور نگہبان ہے ۔

تفسیر

کوئی شخص شیطانی وسوسوں کی پیروی پر مجبور نہیں ہے

ان آیات میں درحقیقت قوم سبا کی داستان سے کلی نتیجہ نکال کر پیش کیا گیا ہے، جو گزشتہ آیات میں بیان ہوئی تھی، اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ ہوائے نفس اور شیطانی وسوسوں کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی وجہ سے ان تمام بدبختیوں اور ناکامیوں میں کس طرح گرفتار ہوتے ۔

Marfat.com

پہلی آیت میں فرماتا ہے : " یقیناً شیطان نے اپنے گمان کو ان کے بارے میں (اور ہر اس جماعت کے بارے میں جو ابلیس کی پیروی کرتی ہے) درست پایا "(ولقد صدق علیھم ابلیس ظنہ)۔

" ان سب نے ہی اس کی پیروی کی، سوائے مومنین کے تھوڑے سے گروہ کے" (فاتبعوہ الا فریقاً من المؤمنین)۔

یا دوسری تعبیر کے مطابق ابلیس کی وہ پیشین گوئی ۔ جو اس نے آدمؑ کے سجدے سے روگردانی کرنے اور بارگاہ خداوندی سے دھتکارے جانے کے بعد کی تھی کہ : " فبعزتك لاغوینھم اجمعین الاعبادك منھم المخلصین " (تیری عزت کی قسم! تیرے مخلص بندوں کے سوائیں ان سب کو گمراہ کروں گا) [1] اس گروہ کے بارے میں ٹھیک نکلی ۔

اگرچہ اس نے یہ بات گمان اور اندازے سے کہی تھی، لیکن وہی گمان اور اندازہ آخرکار حقیقت بن گیا، کیونکہ یہ ارادوں کے کمزور اور ضعیف الایمان لوگ گروہ گروہ اس کے پیچھے چلنے لگے، صرف مومنین کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا کہ جنہوں نے شیطانی وسوسوں کی زنجیروں کو توڑ دیا، اور اس کے دام فریب میں نہ آئے، آزاد (رہی اس دنیا میں) آئے، آزادی سے زندگی بسر کی، اور آزاد ہی اس دنیا سے گئے، "اگرچہ وہ تعداد کے لحاظ سے تو کم تھے، لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک پورے ایک جہان کے ہم پلہ تھا" "اولئك ھم الاقلون عددا والاکثرون عند اللہ قدرًا" [2]

بعد والی آیت میں ۔ ابلیس کے وسوسوں، اور اُن لوگوں کے بارے میں کہ جو اس کے اثر و نفوذ کا شکار ہو جاتے ہیں، اور جو اس کے اثر و نفوذ سے باہر رہتے ہیں ۔ دو مطالب کی طرف اشارہ کرتا ہے، پہلے کہتا ہے : " شیطان کا ان کے اوپر کوئی تسلط اور قابو نہیں تھا، اور وہ کسی کو اپنی پیروی پر مجبور نہیں کرتا " (وما کان لہ علیھم من سلطان)۔

یہ ہم ہی ہیں، کہ جو اُسے اپنے اندر داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں، اور مملکت بدن کی سرحدوں کو عبور کرنے کے بعد دل میں داخل ہونے کا پروانہ اس کے لیے جاری کرتے ہیں ۔

یہ وہی چیز ہے کہ جسے قرآن دوسری جگہ پر خود شیطان کی زبانی نقل کر رہا ہے کہ : (وما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی) " میرا تم پر کوئی تسلط تو نہیں تھا، سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے بھی میری دعوت کو قبول کر لیا " (ابراہیم ۔ ۲۲)

لیکن یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ، ہوا پرست اور بے ایمان لوگوں کی طرف سے اس کی دعوت قبول ہو جانے کے بعد وہ آرام سے نہیں بیٹھتا بلکہ اپنے غلبہ اور تسلط کی بنیادوں کو ان پر مستحکم کر لیتا ہے ۔

---

[1] سورۂ ص ۔ ۸۲، ۸۳ ۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار ۔

Marfat.com

اس لیے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے کہ : " ابلیس کو اس کے وسوسوں میں آزاد چھوڑ دینے کا مقصد یہ تھا کہ آخرت پر ایمان لانے والے اور شک میں پڑے ہوئے بے ایمان لوگ الگ الگ پہچانے جائیں" (الا لنعلم من یؤمن بالاٰخرۃ ممن ھو منھا فی شک) [1]

یہ بات بدیہی ہے کہ خدا ازل سے ان تمام چیزوں سے، کہ جو اس جہان میں ابد تک واقع ہوں گی، آگاہ ہے۔ اس بنا پر (لنعلم) "تاکہ ہم جان لیں" کے جملہ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو ان سے کہ جو شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں نہیں پہچانتے لہٰذا شیطانی وسوسوں کو درمیان میں آنا چاہیئے، تاکہ وہ پہچانے جائیں، بلکہ اس جملہ سے مراد خدا کے علم کا تحقق عینی ہے کیونکہ خدا ہرگز اشخاص کے باطن اور ان کے بالقوہ اعمال کو جاننے اور ان کا علم رکھنے کی بنا پر کسی کو سزا اور عذاب نہیں کرتا، بلکہ ضروری ہے کہ میدانِ امتحان فراہم ہو، شیطانی وسوسے اور خواہشات نفسانی کا آغاز ہو، تاکہ ہر شخص جو کچھ اپنے اندر رکھتا ہے، اپنے ارادہ اور اختیار کی پوری آزادی کے ساتھ اسے باہر نکال دے، اور خدا کا علم تحقق عینی حاصل کرے، کیونکہ جب تک خارج میں کوئی عمل انجام نہ پائے اس وقت تک عذاب وعقاب کا استحقاق حاصل نہیں ہوتا۔

دوسرے لفظوں میں وہ بات جو بالقوہ موجود ہے فعل میں نہ آئے صرف حسنِ باطن یا سوءِ باطن کی بنا پر کسی کو جزا، یا کسی کو سزا نہیں دیتے۔

اور آیت کے آخر میں تمام بندوں کو تنبیہ اور خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ : " اور تیرا پروردگار ہر چیز کا محافظ اور نگہبان ہے" (و ربّك علیٰ كل شیء حفیظ)۔

تاکہ شیطان کے پیروکار یہ تصور نہ کرلیں کہ ان کے اعمال و گفتار میں سے کوئی چیز اس جہان میں ختم ہو جائے گی، یا خدا اس کو فراموش کر دے گا۔ نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ خدا ہر چیز کی قیامت کے دن کے لیے نگہداری اور حفاظت کرتا ہے۔

---

[1] اس معنی کی بنا پر کہ جو ہم نے آیہ کی تفسیر میں بیان کیے ہیں، استثناء، یہاں پر استثنائے متصل ہے، اس بات کے قرینہ سے کہ جو سورہ حجر کی آیہ ۴۲ میں بیان ہوئی ہے کہ: "ان عبادی لیس لك علیھم سلطان الا من اتبعك من الغاوین" کیونکہ اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ شیطان، غاوین، پر تسلط جماتا ہے، البتہ بعض مفسرین نے استثناء منفصل کا احتمال بھی دیا ہے۔

Marfat.com

۲۲ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ
مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا
مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ○
۲۳ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى
اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا
الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ○
۲۴ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ
اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○
۲۵ قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○
۲۶ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۭ
وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ○
۲۷ قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَاۗءَ كَلَّا ۭ بَلْ
هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

ترجمہ

۲۲ کہہ دو، کہ جن کو تم خدا کے سوا (اپنا معبود) خیال کرتے ہو انہیں پکارو!
(وہ ہرگز بھی تمہاری کسی مشکل کو حل نہ کریں گے کیونکہ) انہیں آسمانوں اور زمین

Marfat.com

میں ذرّہ برابر بھی اختیار نہیں ہے، اور نہ ہی وہ (اُس کی خلقت و مالکیت) میں شریک ہیں، اور نہ ہی وہ (پیدائش کے کام میں) اس کے یار و مددگار تھے۔

(۲۳) اس کے پاس کسی کے لیے بھی کوئی شفاعت فائدہ نہ دے گی، سوائے ان لوگوں کی شفاعت کے جن کی (شفاعت کرنے کی) اجازت دے دی جائے گی (اس دن سب کے سب اضطراب میں ہوں گے) یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے اضطراب زائل ہو جائے گا (اور اس کی طرف سے فرمان "شفاعت" صادر ہو جائے گا، تو اس وقت مجرمین شفاعت کرنے والوں سے) کہیں گے کہ تمہارے پروردگار نے کیا حکم دیا ہے تو وہ کہیں گے کہ حق (کو بیان کیا ہے اور مستحقین کے بارے میں شفاعت کرنے کی اجازت دی ہے) اور وہی ہے بلند مقام اور بزرگ مرتبہ والا۔

(۲۴) کہہ دو: آسمانوں اور زمین سے تمہیں کون روزی دیتا ہے، کہہ دو، اللہ۔ تو ہدایت پر یا کھلی گمراہی میں ہم ہیں یا تم۔

(۲۵) کہہ دو! کہ جو گناہ ہم نے کیے ہیں اس کی تم سے پوچھ گچھ نہ ہو گی اور (اسی طرح) جو عمل تم کرتے ہو اس کی باز پرس ہم سے نہ ہو گی۔

(۲۶) کہہ دو! کہ ہمارا پروردگار ہم سب کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا (اور مجرموں کو نیکوکار لوگوں سے جدا کر دے گا) اور وہی فیصلہ کرنے والا، جُدا کرنے والا اور آگاہ ہے۔

(۲۷) کہہ دو! کہ جنہیں تم نے اس کا شریک بنا کر اس کے ساتھ ملحق کیا ہے مجھے دکھاؤ تو سہی) ہرگز ایسا نہیں ہے (اس کا کوئی شریک اور مثل نہیں ہے)

Marfat.com

بلکہ وہی عزیز و حکیم خدا ہے ۔

تفسیر

مجھے بتاؤ کہ کیوں ؟ ....

ہم نے سورت کے آغاز میں کہا تھا کہ اس سورہ کی آیات کا ایک قابل ملاحظہ حصّہ مبدأ و معاد اور اعتقاداتِ حقّہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، اور ان کے ملانے سے سچے معارف کا ایک مجموعہ حاصل ہو جاتا ہے ۔

آیات کے اس حصّہ میں واقعاً مشرکین کو محاکمہ میں کھینچ لے جاتا ہے، اور منطقی سوالات کی بحل دینے والی ضربوں کے ذریعہ ان کو گھٹنوں کے بل گراتا ہے' اور بتوں کی شفاعت کے بارے میں ان کی بوسیدہ منطق کا بے بنیاد ہونا واضح و آشکار کرتا ہے ۔

آیات کے اس سلسلے میں پیغمبرؐ کو پانچ مرتبہ مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے، اور ان سے کہہ دے ....، اور ہر مرتبہ بُتوں اور بُت پرستی کے کام کے سلسلہ میں ایک نیا مطلب پیش کرتا ہے' اس طرح سے کہ انسان آخر میں اچھی طرح سے محسوس کر لیتا ہے کہ کوئی مکتب بُت پرستوں کے مکتب سے زیادہ کھوکھلا نہیں ہے' بلکہ اس کو تو مکتب و مذہب کہا ہی نہیں جا سکتا ۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے : " ان سے کہہ دے کہ جنہیں تم خدا کے علاوہ (اپنا معبود) خیال کرتے ہو، انہیں پکارو، لیکن یہ جان لو کہ وہ ہرگز بھی تمہاری دعا اور پکار کا جواب نہیں دے سکتے اور تمہاری مشکلات کو حل نہیں کر سکتے " (قل ادعوا الذین زعمتم من دون اللّٰہ)[1]

اس کے بعد اس گفتگو کی دلیل پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ : " اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بناوٹی معبود نہ تو آسمان و زمین میں ایک ذرہ برابر اختیار رکھتے ہیں اور نہ ہی ان میں کی پیدائش اور ملکیت میں کوئی حصّہ اور شرکت رکھتے ہیں اور نہ ہی ان میں سے کوئی تخلیق کے کاموں میں خدا کا یار و مددگار تھا " (لا یملکون مثقال ذرۃ فی السماوات ولا فی الارض وما لھم فیھما من شرک وما لہ منھم من ظھیر) ۔

---

[1] اس جملہ میں درحقیقت دو تقدیریں ہیں، پہلی " زعمتم " کے بعد " انھم اٰلھۃ " کا جملہ مقدر ہے، اور " من دون اللّٰہ " کے بعد " لا یستجیبون دعاکم " کا جملہ مقدر ہے' اور مجموعی طور پر یہ جملہ اس طرح ہو جاتا ہے،
" قل ادعوا الذین زعمتم انھم اٰلھۃ من دون اللّٰہ لا یستجیبون لکم "

Marfat.com

اگر وہ کسی مشکل کے حل پر قادر ہوں، تو اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تین اوصاف میں سے کسی ایک کے تو حامل ہوں، یا تو آسمان و زمین میں کسی چیز کی مستقل ملکیت رکھتے ہوں، یا کم از کم امرِ خلقت میں خدا کے ساتھ شرکت رکھتے ہوں، یا ان امور میں سے کسی میں پروردگار کے معاون و مددگار ہوں۔

حالانکہ یہ بات صاف طور پر واضح و روشن ہے کہ واجب الوجود ایک ہی ہے اور باقی سب کے سب ممکن الوجود اور اسی کے ساتھ وابستہ ہیں، کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے لطف وکرم کی نظر اُن سے اٹھ جائے تو وہ دیارِ عدم کی طرف چلتے بنیں۔

"اگر نازی کند یکدم، فرو ریزند قالبھا"!

اگر وہ ایک لمحہ کے لیے بھی فخر و ناز کریں، تو سارے سانچے گر پڑیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے: "مثقال ذرة فی السماوٰت ولا فی الارض" یعنی ایسی موجودات کہ جو ایک بے قدر و قیمت ذرّہ کے وزن کی مقدار کے برابر بھی اس بے کراں آسمان اور وسیع و عریض زمین میں کسی چیز کے مالک نہیں ہیں، تمہاری مشکلات تو رہی ایک طرف وہ اپنی ہی کون سی مشکل حل کرنے کے قابل ہیں؟!

٭ ٭ ٭

یہاں یہ سوال فوراً ذہن میں آتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے مسئلہ کا کیا بنے گا۔

بعد والی آیت میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: اگر خدا کی بارگاہ میں کچھ شفاعت کرنے والے موجود ہیں تو وہ بھی اس کے اذن و فرمان سے ہے کیونکہ "اس کے یہاں کوئی شفاعت فائدہ نہ دے گی سوائے ان کے جن کے لیے اس نے اذن دیا ہوگا" (ولا تنفع الشفاعة عنده الا لمن اذن له)۔

اس بنا پر بُت پرستوں کا بُتوں کی پرستش کے بارے میں یہ بہانہ کہ جو کہتے تھے: "ھٰؤلاء شفعاؤنا عند الله" —— یہ خدا کے یہاں ہماری شفاعت کرنے والے ہیں۔ (یونس۔ ۱۸) اس وسیلہ سے ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ خدا نے ہرگز انہیں شفاعت کی اجازت نہیں دی ہے۔

اس بارے میں کہ: "الا لمن اذن له" "سوائے اس کے کہ جس کے لیے وہ اذن دے" کا جملہ شفاعت کرنے والے کی طرف اشارہ ہے یا ان کی طرف کہ جن کی شفاعت کی جائے گی؟ مفسرین نے دونوں احتمال دیئے ہیں، لیکن اس مناسبت سے کہ گزشتہ آیت میں بتوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی اور وہ بتوں کو اپنا شفیع خیال کرتے تھے، لہذا مناسب یہی ہے کہ یہ "شفاعت

Marfat.com

کرنے والوں" کی طرف اشارہ ہو۔

کیا یہاں "شفاعت" سے مراد دنیا کی شفاعت ہے یا آخرت کی' دونوں ہی احتمال ہو سکتے ہیں' لیکن بعد والے جملے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہاں آخرت کی شفاعت مدّنظر ہے۔

لہٰذا اس جملہ کے بعد اس طرح کہتا ہے: "اس دن دلوں پر اضطراب اور وحشت کا غلبہ ہوگا" (شفاعت کرنے والے بھی اور جن کی شفاعت کی جائے گی وہ بھی اضطراب میں ڈوبے ہوئے ہوں گے، اور وہ سب کے سب اس انتظار میں ہوں گے کہ دیکھیں خدا کن لوگوں کو شفاعت کی اجازت دیتا ہے؟ اور کن لوگوں کی شفاعت کرنے کے لیے؟ اور یہ اضطراب اور پریشانی کی حالت اسی طرح جاری رہے گی) "یہاں تک کہ فزع و اضطراب ان کے دلوں سے زائل ہو اور خدا کی طرف سے یہ فرمان صادر ہو" (حتّٰی اذا فزّع عن قلوبھم) [1]

بہرحال اُس دن ایک شور و غوغا برپا ہوگا، شفاعت ہونے والوں کی نگاہیں شفاعت کرنے والوں پر لگی ہوئی ہوں گی، اور زبانِ حال سے یا زبانِ قال سے ملتمسانہ ان سے شفاعت کا تقاضا کر رہے ہوں گے۔

لیکن شفاعت کرنے والوں کی نگاہیں بھی فرمانِ خدا پر لگی ہوئی ہوں گی، تاکہ (دیکھیں کہ) کس طرح اور کس کے حق میں شفاعت کی اجازت دیتا ہے، یہ عمومی اور ہر وقت کا وحشت و اضطراب بھی اسی طرح جاری رہے گا، یہاں تک کہ ان لوگوں کے بارے میں کہ جو اس کے لائق ہیں خدائے حکیم کی طرف سے شفاعت کا فرمان صادر ہوگا۔

یہ وہ مقام ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کی طرف رُخ کریں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے (یا مجرم شفاعت کرنے والوں سے پوچھیں گے) اور "کہیں گے کہ تمہارے پروردگار نے کیا حکم دیا ہے" (قالوا ماذا قال ربکم)۔

"وہ جواب میں کہیں گے کہ خدا نے حق کو بیان کیا ہے" (قالوا الحق)۔

اور حق تو اس کے سوا کچھ نہیں، کہ شفاعت کی اجازت صرف ان کے لیے ہوگی جنہوں نے خدا سے کلی طور پر اپنا رابطہ منقطع نہیں کیا تھا، نہ کہ ان گنہگاروں اور مجرموں کے لیے کہ جنہوں نے خدا، پیغمبر، اولیاء اللہ سے کلی طور پر بیگانگی اختیار کر لی ہے اور تعلقات کے تمام رشتوں کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔

---

[1] "فزع" مادہ "فزع" ہے جس وقت "عن" کے ذریعہ متعدی ہو تو فزع کے ازالہ اور وحشت و اضطراب کے برطرف ہونے کے معنی میں ہے، یہ مادہ اس صورت میں بھی جبکہ یہ "ثلاثی مجرد" کی شکل میں ہو اور "عن" سے متعدّی ہو تو پھر بھی یہی معنی دیتا ہے۔

Marfat.com

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے : " وہی ہے بلند مقام اور بزرگ مرتبہ خدا " (وھو العلی الکبیر) ۔
یہ جملہ شفاعت کرنے والوں کی گفتگو کا آخری حصّہ اور اس کی تکمیل کرنے والا ہے حقیقت میں وہ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ خدا علیّ وکبیر ہے' لٰہذا وہ جو حکم دیتا ہے وہ عین واقعیت ہے اور ہر واقعیت اس کے احکام و دستور پر منطبق ہے ۔
ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ایسی نزدیک ترین تفسیر ہے کہ جو آیہ کے جملوں کے ساتھ ہم آہنگ اور منظم ہے' یہاں مفسرین نے دوسری تفسیریں بھی بیان کی ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض میں آیت کے متن، اس کے ظاہر و باطن اور اس کے قبل و بعد کے ربط و تعلق کو کسی طرح بھی نظر میں نہیں رکھا گیا ۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں ایک اور طریقہ سے مشرکین کے عقائد کو باطل کرنے کے لیے آغاز کیا ہے' اور " رازقیت " کے مسئلہ کو' مسئلہ " خالقیت " کے بعد کہ جو گزشتہ آیات میں بیان ہوا تھا، عنوان کرتا ہے' یہ دلیل بھی سوال وجواب کی صورت میں ہے تاکہ ان کے سوئے ہوئے وجدان کو اس طرح سے بیدار کرے ، اور اس جواب سے کہ جو ان کے اندر سے جوش مارتا ہے ، اپنی غلطی اور اشتباہ کو سمجھ لیں ۔
کہتا ہے : " تم کہہ دو کہ کون ہے وہ کہ تمہیں آسمانوں اور زمین سے روزی دیتا ہے اور ان کی برکات کو تمہارے اختیار میں قرار دے دیتا ہے" (قل من یرزقکم من السّماوات والارض) ۔
یہ بات صاف طور پر واضح و ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پتھر اور لکڑی کے بُت آسمان سے بارش برساتے ہیں' اور زمین سے گیاہ اور سبزے اگاتے ہیں' اور آسمانوں اور زمین کے منبعوں اور ذخائر کو ہمارے اختیار میں دیتے ہیں ۔
قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بغیر اس کے کہ ان کے جواب کا انتظار کرتا ، بلا فاصلہ فرماتا ہے : " کہہ دو کہ اللہ " (قل اللہ) ۔
کہہ دو کہ وہ خدا ہی ہے کہ جو ان تمام برکات کا منبع ہے' یعنی یہ مطلب اس قدر واضح و روشن ہے کہ طرفِ مقابل کے جواب کا محتاج ہی نہیں ہے' کیونکہ مشرکین بھی خدا ہی کو خالق اور رزقوں کا عطا کرنے والا جانتے تھے اور بُتوں کے لیے وہ بھی صرف مقام شفاعت ہی کے قائل تھے ۔
یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ پروردگار کے رزق اور روزیاں جو آسمان کی طرف سے انسانوں تک پہنچتی ہیں وہ بارش میں منحصر نہیں ہیں ، بلکہ " سورج کی روشنی اور حرارت " اور " ہوا " کہ جو زمین کی فضا میں موجود ہے ، بارش کے حیات بخش قطرات سے بھی زیادہ اہم ہے ۔

Marfat.com

جیسا کہ زمین کی برکات بھی گیاہ اور سبزہ زاروں میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ زیر زمین انواع و اقسام کے پانی کے منبع، طرح طرح کی معدنیات کہ جن میں سے بعض تو اُس زمانہ میں بھی دریافت ہو چکے تھے، اور بعض زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں سب کے سب اسی عنوان میں جمع ہیں۔

آیت کے آخر میں ایک ایسے مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو خود ایک دلیل کی بنیاد بن سکتا ہے، ایک ایسی دلیل کہ جو حقیقت بینی اور انصاف و آدب سے ملی ہوئی ہے، اس طرح سے کہ مخالف ہٹ دھرمی اور غرور کے مرکب سے نیچے اتر آئے اور غور و فکر کرے، کہتا ہے: "یقیناً ہدایت پر، یا کھلی ہوئی گمراہی میں، ہم ہیں یا تم" (وانّا او ایّاکم لعلی ھدی او فی ضلال مبین) [1]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمارا اور تمہارا عقیدہ آپس میں واضح تضاد رکھتا ہے، اس بناء پر ممکن نہیں ہے کہ دونوں حق ہوں، کیونکہ نقیضین اور ضدین میں جمع ممکن نہیں ہے، پس ایک گروہ اہلِ ہدایت کا ہے اور دوسرا ضلالت و گمراہی میں گرفتار ہے۔

اب تم خود غور کرو کہ کونسا ہدایت یافتہ ہے اور کونسا گمراہ، دونوں گروہوں میں نشانیاں دیکھو کہ کس گروہ میں ہدایت کی نشانیاں ہیں اور کس میں گمراہی کی نشانیاں۔

اور یہ مناظرہ اور بحث کے طریقوں میں سے ایک بہتر طریقہ ہے کہ مدِمقابل اور فریقِ مخالف کو خود بخود غور و فکر اور جوش میں آنے کے لیے ابھاریں، اور یہ جو بعض نے اسے تقیہ کی ایک قسم خیال کیا ہے انتہائی غلط اور اشتباہ والی بات ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "ہدایت" کو لفظ "علیٰ" کے ساتھ ذکر کیا ہے اور "ضلالت کو" "فی" کے ساتھ، کہ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہدایت یافتہ تو گویا ایک تیز رو مرکب پر بیٹھے ہوئے ہیں، جبکہ گمراہ لوگ گمراہی اور جہالت کی ظلمت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ پہلے "ہدایت" کے بارے میں گفتگو کی ہے، اور اس کے بعد "ضلالت" و گمراہی کے متعلق، کیونکہ پہلے جملہ کی ابتداء میں کہتا ہے "ہم" اور پھر کہتا ہے "تم" تاکہ یہ پہلے گروہ کی ہدایت اور دوسرے گروہ کے بے ہدایت ہونے کی طرف ایک لطیف اور ہلکا سا اشارہ ہو۔

اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت نے "مبین" کی صفت کو صرف "ضلال" کے ساتھ مربوط سمجھا ہے، کیونکہ ضلالت و گمراہی کئی اقسام رکھتی ہے اور ضلالتِ شرک سب سے زیادہ واضح و آشکار ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ توصیف "ہدایت" و "ضلالت" دونوں کے لیے ہو، کیونکہ

---

[1] یہ جملہ تقدیر میں اس ترتیب سے دو جملوں کی طرف لوٹتا ہے: وانا لعلی ھدی او فی ضلال مبین وانکم لعلی ھدی او فی ضلال مبین۔ تفسیر مجمع البیان جلد ۷، ص ۳۸۸۔

Marfat.com

اس قسم کے موقعوں پر فصحاء کے کلمات میں صفت کا تکرار نہیں ہوتا، اس بناء پر ہدایت بھی مبین کے ساتھ توصیف ہوئی ہے اور ضلالت بھی، جیساکہ دوسری آیاتِ قرآنی میں یہ توصیف دونوں قسموں کے لیے نظر آتی ہے[1]

بعد والی آیت میں پھر اسی استدلال کو ایک دوسری شکل میں — پھر اسی منصفانہ لب و لہجہ میں کہ جو مخالف کو ہٹ دھرمی اور غرور کے مرکب سے اتار دے — جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: "کہہ دے کہ تم سے ہمارے گناہوں کے بارے میں باز پرس نہیں ہوگی اور نہ ہی ہم سے تمہارے اعمال کے بارے میں کچھ پوچھا جائے گا" (قل لا تسئلون عما اجرمنا ولا نسئل عما تعملون)۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہاں پیغمبر اس بات پر مامور ہیں کہ اپنے بارے میں تو جرم کی تعبیر کرے اور اپنے مخالفین کے بارے میں ایسے کاموں سے تعبیر کرے کہ جو وہ انجام دیتے ہیں اور اس طرح سے اس حقیقت کو واضح و روشن کرے کہ ہر شخص کو اپنے اعمال کا جوابدہ ہونا چاہیئے، کیونکہ ہر انسان کے اعمال کے نتائج — وہ بُرے ہوں یا اچھے خود اسے ہی پہنچتے ہیں۔

ضمنی طور پر اس نکتہ کی طرف بھی ایک لطیف سا اشارہ ہے کہ اگر ہم تمہاری رہنمائی پر اصرار کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمہارے گناہ ہمارے ذمہ لکھ دیئے جاتے ہیں یا تمہارا شرک ہمیں کچھ ضرر پہنچاتا ہے، بلکہ ہم تو دل سوزی و حق جوئی اور حق طلبی کی بناء پر اس کام پر اصرار کرتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

بعد میں آنے والی آیت درحقیقت گزشتہ دو آیات کے نتیجہ کا بیان ہے کیونکہ جس وقت انہیں اس بات سے آگاہ اور خبردار کر دیا گیا، کہ دونوں گروہوں میں سے ایک حق پر ہے اور دوسرا باطل پر ہے، اور اس بات کے لیے بھی خبردار کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے تو پھر اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ سب کی وضع و کیفیت کی جانچ پڑتال کیسے ہوگی، اور حق و باطل ایک دوسرے سے کس طرح جدا ہوگا، اور ہر کسی کو اس کی ذمہ داریوں اور مسئولیت کے مطابق ہی جزا و سزا ملے گی، لہٰذا فرماتا ہے: "ان سے کہہ دے کہ ہمارا پروردگار ہم سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا، اور پھر ہمارے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ اور ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے گا تاکہ ہدایت یافتہ گمراہوں سے پہچانے جائیں اور ہر ایک اپنے اعمال کے نتیجہ تک جا پہنچے" (قل یجمع بیننا ربنا ثم یفتح بیننا بالحق)۔

اگر تم یہ دیکھ رہے ہو کہ آج سب کے سب ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ہر ایک یہی

---

[1] سورہ نمل کی آیہ ۱، نور کی ۱۲، ہود کی ۶، قصص کی ۲ اور نمل کی آیہ ۹۰ کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

دعویٰ کرتا ہے کہ مَیں حق پر ہوں اور مَیں ہی اہلِ نجات میں سے ہوں، تو یہ کیفیت ہمیشہ باقی اور برقرار نہیں رہے گی اور آخر کار ان صفوں کی جدائی کا دن آن پہنچے گا، کیونکہ پروردگار کی "ربوبیت" کا تقاضا یہی ہے کہ اچھائی برائی سے، خالص ناخالص سے، اور حق باطل سے آخر کار جدا ہو جائیں اور ہر ایک اپنے مقام پر رہے۔

اب تم غور کرو کہ تم اس دن کیا کرو گے؟ اور تم کون سی صف میں قرار پاؤ گے، کیا تم نے اس دن کے لیے پروردگار کے سوالات کا جواب تیار کر لیا ہے۔

آیت کے آخر میں اس حقیقت کو واضح و روشن کرنے کی غرض سے کہ یہ کام یقینی طور پر ہو کر رہے گا، مزید کہتا ہے: "وہی ہے فیصلہ کرنے والا اور حق کو باطل سے جدا کرنے والا، آگاہ اور جاننے والا"، (وھو الفتّاح العلیم)۔

یہ دونوں نام کہ جو خدا کے اسمارِ حسنیٰ میں سے ہیں، ان میں سے ایک صفوں کو الگ کرنے کے مسئلہ پر قدرت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرا اس کے بے پایاں علم کی طرف کیونکہ حق و باطل کی صفوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ان دو کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اوپر والی آیت میں "رب" (پروردگار) کے عنوان پر تکیہ کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا ہم سب کا مالک و مربی ہے، اور یہ مقام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس قسم کے دن کے لیے پروگرام فراہم کیا جائے، اور حقیقت میں یہ "معاد" کی دلائل میں سے ایک دلیل کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

لفظ "فتح" جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے، اصل میں شبہات اور پیچیدگی کو ختم کرنے کے معنی میں ہے، اور وہ دو قسم پر ہے: کبھی تو یہ آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے، مثلاً تالا کھولنا اور کبھی غور و فکر کرنے سے اس کا ادراک ہوتا ہے، مثلاً غم و اندوہ اور دکھ درد کی پیچیدگی کو دُور کرنا، یا علوم کے سربستہ رازوں کو کھولنا، اور اسی طرح دو افراد کے درمیان فیصلہ کرنا، اور ان کے نزاع اور مخاصمت کی مشکل کو کھولنا۔

اس بنا پر اگر یہ لفظ صفوں کو جدا کرنے کے بارے میں — خاص طور پر جہاں وہ آپس میں ایک دوسرے سے ملی جلی ہوں — استعمال ہوا ہے، تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ اس طرح ان کے درمیان جدائی کے علاوہ قضاوت اور فیصلہ بھی — کہ جو فتح کا ایک معنی ہے — انجام پا جاتا ہے اور ہر کسی کو جس کا وہ مستحق ہوتا ہے، جزا دیتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں مشکلات کے حل کے لیے "یا فتّاح" کے ذکر پر تکیہ کیا گیا ہے، کیونکہ خدا کا یہ عظیم نام کہ جو "فتح" سے صیغہ مبالغہ کی شکل میں آیا ہے، پروردگار کی ہر

Marfat.com

مشکل کو حل کرنے کی طاقت، اور غم و اندوہ کو دور کرنے اور ہر فتح و کامرانی کے اسباب فراہم کرنے کی قدرت کو بیان کرتا ہے، واقعاً کوئی بھی اس کے سوا "فتاح" نہیں ہے اور بند دروازوں کی "مفتاح" اور چابی اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں کہ جو پیغمبرؐ کے لیے (اس سلسلے کا) پانچواں فرمان ہے پھر ایک مرتبہ مسئلہ توحید کی طرف ــ کہ جس سے گفتگو کی ابتداء کی تھی ــ دوبارہ لوٹتا ہے، اور اس مسئلہ کے ساتھ بحث کو ختم کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "کہہ دے کہ جنہیں تم نے شریک کے عنوان سے خدا کے ساتھ ملحق کیا ہے مجھے دکھا توسہی" (قل ارونی الذین الحقتم بہ شرکاء)۔

ان میں کون سی صلاحیت اور کیا قدر و قیمت ہے، اگر تمہاری مراد یہی مٹھی بھر بے جان اور خاموش پتھر اور لکڑیاں ہیں تو کتنی بدبختی اور شرمساری کی بات ہے کہ عالم جمادات میں سے اپنے ہی ہاتھ کی ساختہ و پرداختہ چیزوں کو کہ جو موجودات میں سے سب سے پست ہیں لے لو اور انہیں خداوند عظیم کے مانند خیال کرو۔

اور اگر تم انہیں ارواح اور فرشتوں کے سمبل اور نمونہ سمجھتے ہو تو پھر بھی یہ ایک مصیبت ہے اور گمراہی ہے کیونکہ وہ بھی اسی کی مخلوق اور اسی کے تابع فرمان ہیں۔

لہٰذا اس جملہ کے بعد ایک ہی لفظ کے ساتھ ان تمام اوہام پر خطِ بطلان کھینچتے ہوئے کہتا ہے: "نہیں ہرگز نہیں ایسا نہیں ہے" (کلّا)۔

یہ قطعاً معبود ہونے کے لائق نہیں اور تمہارے ان خیالات میں کچھ بھی واقعیت نہیں ہے، انتہا ہوچکی ہے اب تو تم بیدار ہو جاؤ، کب تک اس غلط راستے پر چلتے رہو گے۔

حقیقت میں "کلّا" ایک ایسا چھوٹا سا لفظ ہے کہ جو ان تمام معانی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور آخر میں اس بات کی تاکید اور فیصلہ کے طور پر کہتا ہے: "بلکہ وہی صرف خداوند عزیز و حکیم ہے" (بل ھو اللہ العزیز الحکیم)۔

اس کی عزت اور اس کے شکست ناپذیر ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے حریم الوہیت تک کسی کی رسائی نہ ہو اور اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس قدرت کو صحیح طور سے صرف کرے۔

ہاں! ان صفات کا حامل ہونا واجب الوجود ہونے کی نشانی ہے اور واجب الوجود لامتناہی ہستی ہوتی ہے کہ جو کبھی بھی قابلِ تعدد نہیں ہوتی اور اس کا کوئی شریک اور مثل نہیں ہوتا، کیونکہ ہر تعدد اسے محدود ممکن بناتا ہے، جبکہ وجود بے پایاں صرف ایک ہی ہے۔ (غور کیجئے)

Marfat.com

نکتہ

دلوں کو تسخیر کرنے کا طریقہ

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اہل فضل اور دانشمند افراد، بحث و استدلال کے داؤ پیچ سے بے نیازی اور نفسیاتی پہلوؤں کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے، دوسرے کے افکار و نظریات میں بالکل نفوذ نہیں کر سکتے۔

اس کے برعکس ہم ایسے کئی افراد کو جانتے ہیں، کہ وہ علمی لحاظ سے اس پائے کے نہیں ہوتے، لیکن دلوں کو جذب کرنے اور انہیں مسخر کرنے اور دوسروں کے افکار میں نفوذ کرنے میں کامیاب اور موفق ہوتے ہیں۔

اس کا اصل سبب یہ ہے کہ مباحث کو پیش کرنے کا طریقہ اور مدِمقابل سے مباحثہ کرنے کی طرز ایسے اصولوں کے ساتھ ہونی چاہیئے کہ جو اخلاقی اور نفسیاتی پہلو سے ملی ہوئی ہو، تاکہ مدِمقابل میں منفی پہلوؤں کو نہ ابھارے، اور اُسے ہٹ دھرمی اور بُغض و عناد پر نہ اکسائے، بلکہ اس کے برعکس اس کے وجدان کو بیدار کرتے ہوئے حق طلبی اور حق جوئی کی روح اس میں زندہ کرے۔

یہاں اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ انسان صرف غور و فکر اور عقل و خرد کا مجموعہ ہی نہیں ہے کہ وہ قدرتِ استدلال کے سامنے سرِتسلیم خم کر دے، بلکہ وہ اس کے علاوہ گوناں گوں "عواطف" اور "احساسات" وجذبات کا مجموعہ بھی ہے کہ جس کا اہم حصّہ اس کی روح کو تشکیل دیتا ہے، وہ اس کے وجود کے اندر ہی چھپا ہوا ہے کہ جسے صحیح اور معقول طریقہ سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔

قرآن نے ہمیں اس راہ و روش کی تعلیم دی ہے کہ مخالفین کے مقابلہ میں کس طرح منطقی مباحث پیش کرتے ہوئے انہیں اخلاقی اصول کے ساتھ اس عنوان سے ملائیں کہ وہ ان کی روح کی گہرائیوں میں اتر جائیں۔

نفوذ کی شرط یہ ہے کہ مدِمقابل یہ احساس کرلے کہ کہنے والا ان اوصاف کا حامل ہے:

۱۔ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اُن باتوں پر ایمان بھی رکھتا ہے، اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھ رہا ہے۔

۲۔ اس بحث سے اس کا مقصد حق جوئی و حق طلبی ہے، نہ کہ غالب آنا اور فوقیت حاصل کرنا۔

۳۔ وہ مدِمقابل کی قطعاً تحقیر و تذلیل نہیں چاہتا، اور اپنے آپ کو بزرگ اور بڑا کرکے پیش کرنا نہیں چاہتا۔

۴۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے دلسوزی اور خلوص سے کہہ رہا ہے اور اس کا اس میں کوئی خاص شخصی

Marfat.com

نفع نہیں ہے۔

۵۔ وہ مدِمقابل کے لیے احترام کا قائل ہے، اور اسی وجہ سے وہ اپنی تعبیرات میں بحث کی نزاکت کو فراموش نہیں کرتا۔

۶۔ وہ اپنے مدِمقابل کی ہٹ دھرمی کی حس کو بلا وجہ بھڑکانا نہیں چاہتا اور اگر کسی موضوع پر کافی مقدار میں بحث ہو چکی ہو تو وہ اسی پر قناعت کر لیتا ہے اور بحث میں اصرار کرنے اور اپنی بات کو فوقیت دینے سے پرہیز کرتا ہے۔

۷۔ وہ انصاف کرنے والا ہے اور انصاف کے پہلو کو کبھی بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، چاہے مدِمقابل اس اصول کی رعایت نہ کرتا ہو۔

۸۔ وہ اپنے افکار کو دوسروں پر ٹھونسنا نہیں چاہتا، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ خود دوسروں میں ولولہ پیدا کر دے تاکہ وہ خود اپنے شوق میں آزادی کے ساتھ حقیقت تک پہنچ جائیں۔

اوپر والی آیات میں غور و فکر کرنا، اور حکمِ خدا سے پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مخالفین کے ساتھ مباحثہ کرنے کا طریقہ ـــ جس میں بہت سے قابلِ غور نکات ہوتے تھے ـــ اوپر والے مباحث پر بہترین گواہ ہیں۔

وہ بعض اوقات تو یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ وہ حتمی طور پر اس بات کا تعین بھی نہیں کرتے، کہ ہم تو راہِ ہدایت پر ہیں اور تم گمراہی کے طریقہ پر ہو، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ: "ہدایت یا گمراہی پر ہم ہیں یا تم" تاکہ وہ اس بات میں غور کریں کہ ہدایت اور گمراہی کی نشانیاں کس گروہ میں پائی جاتی ہیں۔

یا وہ یہ کہتا ہے کہ: "قیامت کے دن خدا ہم سب کے درمیان فیصلہ کرے گا اور ہر کسی کو اس کی لیاقت کے مطابق جزاء دے گا۔"

البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب باتیں ان لوگوں کے بارے میں ہیں کہ جن کی ہدایت کی امید ہو، لیکن بے رحم، ظالم اور ہٹ دھرم دشمنوں کے ساتھ ـــ جن کی طرف سے قبول کرنے کی کوئی امید ہی نہ ہو ـــ قرآن ایک دوسرے طریقہ سے پیش آتا ہے [1]

اس بحث کے لیے ـــ پیامبرِ اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کا اپنے مخالفین کے ساتھ بحث کا طریقہ ـــ ایک بہترین نمونہ ہے، نمونہ کے طور پر اس سلسلے میں امام صادقؑ سے کتبِ حدیث میں جو کچھ نقل ہوا اس پر توجہ کیجئے۔

توحیدِ "مفضل بن عمر" کی مشہور حدیث کے مقدمہ میں اس طرح نقل ہوا ہے: وہ کہتا ہے کہ میں

---

[1] اس تفسیر کی سولہویں جلد سورہ عنکبوت کی آیت ۴۶ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

Marfat.com

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مطہر کے پاس تھا، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبہ ومقامِ عظمت کے بارے میں غور وفکر کر رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ "ابن ابی العوجا" (مشہور مادہ پرست شخص) وارد ہوا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا، اس طرح سے کہ میں اس کی باتیں سن سکتا تھا۔ جب اس کے ساتھی اس کے گرد جمع ہو گئے، تو اس نے کفر آمیز باتیں شروع کر دیں کہ جن کا نتیجہ محمدؐ کی نبوت کا انکار، اور اس سے بڑھ کر خداوند تبارک وتعالیٰ کا انکار تھا، اس نے بہت ہی شیطنت آمیز اور جچی تلی باتیں کیں۔

میں اس کی باتیں سُن کر غضبناک اور پریشان ہوا، میں اٹھ کھڑا ہوا اور چیخ کر کہا، اے دشمنِ خدا! کیا تو نے کفر کی راہ اختیار کر لی ہے؟ اور اس خدا کا جس نے تجھے بہترین شکل میں پیدا کیا ہے انکار کر دیا ہے؟

"ابن ابی العوجا" نے میری طرف رُخ کیا اور کہا، تُو کون ہے، اگر تُو علمِ کلام کا عالم ہے تو دلیل پیش کر، تاکہ ہم تیری پیروی کریں اور اگر تُو عالم نہیں ہے، تو پھر تُو بات نہ کر، اور اگر تو جعفر بن محمد صادقؑ کے پیروکاروں میں سے، تو وہ تو ہم سے اس طرح سے بات نہیں کرتے، جس طرح سے تُو بحث کر رہا ہے۔

انہوں نے تو اس سے بھی بڑھ کر باتیں ہم سے سُنی ہیں، انہوں نے تو کبھی بھی ناسزا اور گالی نہیں دی اور ہمارے جواب میں غصہ یا زیادتی کا راستہ اختیار نہیں کیا، وہ تو ایک بردبار، عاقل، سمجھدار اور سنجیدہ آدمی ہیں، اور ان کے کبھی سبک سری دامن گیر نہیں ہوتی۔ وہ ہماری باتوں کو غور سے سنتے ہیں، اور ہمارے دلائل سے آگاہ ہوتے ہیں، جب ہم اپنی تمام باتیں کر لیتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان پر فتحیاب ہو گئے، تو اس کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور جچی تلی باتوں کے ساتھ ہمارے تمام دلائل کا جواب دیتے ہیں، اور ہمارے تمام دلائل کو قطع کر دیتے ہیں۔ اس طرح سے کہ پھر ہم میں جواب دینے کی قدرت وطاقت ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر تُو ان کے اصحاب میں سے ہے، تو پھر تُو بھی ہمارے ساتھ اسی طرح سے بات کر[1]

---

[1] "توحید مفضل" (اوائل کتاب)۔

Marfat.com

(۲۸) وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا وَّلٰكِنَّ
اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۞
(۲۹) وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۞
(۳۰) قُلۡ لَّكُمۡ مِّيۡعَادُ يَوۡمٍ لَّا تَسۡتَاۡخِرُوۡنَ عَنۡهُ سَاعَةً
وَّلَا تَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ۞

ترجمہ

(۲۸) ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر تمام لوگوں کے لیے (رسول بنا کر) تا کہ (انہیں خدائی جزا اور ثواب کی) بشارت دے اور (اس کے عذاب سے) ڈرائے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۲۹) اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ (قیامت کا) وعدہ کب ہوگا۔

(۳۰) تم کہہ دو: تمہارا وعدہ اس دن ہوگا کہ جس میں نہ ایک گھڑی کی تاخیر ہو گی اور نہ (ہی اس پر) مقدم ہو سکو گے۔

تفسیر

تم تمام جہان والوں کے لیے مبعوث کیے گئے ہو

پہلی زیر بحث آیت پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اور اس کے بعد والی آیات معاد و قیامت کے سلسلہ میں بحث کرتی ہیں، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گزشتہ آیات میں گفتگو توحید سے متعلق تھی، عقائد دینی کے ایک کامل مجموعہ کو بیان کیا جا رہا ہے کہ جو سورۂ سبا جیسی مکی سورتوں کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

Marfat.com

پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی وسعت اور تمام انسانوں کے لیے ان کی نبوت کی عمومیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر تمام جہان کے لوگوں کے لیے، درآنحالیکہ تم سب کو خدا کی عظیم جزاؤں کی بشارت دیتے ہو اور عذاب الٰہی سے ڈراتے ہو لیکن اکثر لوگ اس معنی سے بے خبر ہیں" (وما ارسلناك الا كافة للناس بشيرًا و نذيرًا ولكن اكثر الناس لا يعلمون)۔

"کافّة" مادہ "کف" سے ہاتھ کی ہتھیلی کے معنی میں ہی ہے، اور چونکہ انسان اپنے ہاتھ سے چیزوں کو پکڑتا ہے، یا اپنے سے دور کرتا ہے لہٰذا یہ لفظ کبھی "جمع کرنے" کے معنی میں آتا ہے اور کبھی "منع کرنے" کے معنی میں۔

مفسرین نے زیر بحث آیت میں دونوں احتمال دیئے ہیں، پہلا یہ کہ جمع کرنے کے معنی میں ہو، اور اس صورت میں آیت کا مفہوم وہی ہوگا کہ جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے "کہ ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر جہان کے تمام لوگوں کے لیے" یعنی یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے عالمی اور جہانی ہونے کو بیان کرتا ہے۔

متعدد روایات کہ جو شیعہ اور سُنّی طرق سے اس آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہیں وہ بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔

اس بنا پر آیت کا مفہوم و مطلب سورۂ فرقان کی آیہ ۱ کی طرح ہے کہ جو یہ کہتی ہے کہ (تبارك الذی نزل الفرقان علی عبده ليكون للعالمين نذيرًا) "ہمیشہ ہی برکتوں والا ہے وہ خدا کہ جس نے اپنے بندے پر قرآن کو نازل کیا تاکہ سارے جہان کے تمام لوگوں کو ڈرائے"۔

اور سورۂ انعام کی آیہ ۱۹ کی طرح ہے کہ جو یہ کہتی ہے کہ: (واوحی الیّ هٰذا القراٰن لانذركم به و من بلغ) "یہ قرآن مجھ پر وحی ہوا ہے تاکہ میں تمہیں بھی اور تمام ان لوگوں کو بھی کہ جن تک یہ بات پہنچے، ڈراؤں"۔

ایک حدیث میں، کہ جسے بعض مفسرین نے اوپر والی آیت کی مناسبت سے ذکر کیا ہے، پیغمبرؐ کی دعوت کی عمومیت، ان کے ایک عظیم اعزاز و افتخار کی حیثیت سے منعکس ہو رہی ہے۔ آپؐ نے یہ فرمایا ہے کہ:

"اعطيت خمسًا - ولا اقول فخرًا - بعثت الى الاحمر والاسود، و جعلت لى الارض طهورًا و مسجدًا، واحل لى المغنم ولا يحل لاحد قبلى، نصرت بالرعب فهو يصير امامى مسيرة شهر، واعطيت الشفاعة فادخرتها لامتى يوم القيامة"

Marfat.com

"خدا نے مجھے پانچ چیزیں عطا فرمائی ہیں — اور میں اس بات کو فخر و مباہات کے طور پر نہیں کہتا — (بلکہ شکرِ نعمت کے طور پر کہتا ہوں) میں تمام انسانوں کے لیے، خواہ وہ گورے ہوں یا کالے، مبعوث ہوا ہوں، اور میرے لیے زمین کو پاک و پاکیزہ اور اس کی ہر جگہ کو مسجد و عبادت گاہ قرار دیا گیا ہے، جنگ میں حاصل شدہ مالِ غنیمت میرے لیے حلال ہے، جو مجھ سے پہلے کسی کے لیے بھی حلال نہیں کی گئی تھی۔ دشمنوں کے دل میں دہشت اور رعب ڈال کر میری مدد کی گئی ہے' (اور خدا نے ہمارا رعب ہمارے دشمن کے دل میں ڈال دیا ہے) اس طور سے کہ وہ (رعب) میرے آگے آگے ایک مہینہ کی راہ کے برابر بڑھتا ہے اور مجھے مقامِ شفاعت دیا گیا ہے، اور میں نے اسے اپنی امت کی خاطر قیامت کے دن کے لیے ذخیرہ کیا ہوا ہے[1]

اگرچہ اوپر والی حدیث میں آیت کی تفسیر کے طور پر تصریح نہیں ہوئی ہے، البتہ اس سلسلہ میں اور بھی احادیث ہمارے پاس موجود ہیں کہ جن میں یا تو آیت کی تفسیر کی تصریح ہوئی ہے، اور یا "للناس کافّۃ" کی تعبیر ہے، کہ جو وہی اوپر والی آیت کی تعبیر ہے[2] اور یہ سب کی سب اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اوپر والی آیت پیغمبرؐ کی دعوت کے جہانی ہونے کو بیان کر رہی ہے۔ دوسری تفسیر، جو اس آیت کے لیے بیان کی گئی ہے "کف" کے دوسرے معنی یعنی منع کرنے سے لی گئی ہے، اس تفسیر کے مطابق "کافۃ" پیغمبر کی صفت ہے[3] اور اس سے مراد یہ ہے کہ: خدا نے پیغمبر کو انسانوں کے لیے کفر و معصیت و گناہ سے روکنے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن پہلی تفسیر زیادہ نزدیک نظر آتی ہے۔

بہر حال چونکہ تمام انسان جلبِ منفعت اور دفعِ ضرر کی خواہش رکھتے ہیں، لہٰذا پیغمبر بھی مقام "بشارت" و "نذارت" کے حامل تھے، تاکہ وہ ان دونوں خواہشات کو مجتمع رکھیں، اور انہیں حرکت میں لے آئیں لیکن غافل اور بے خبر اکثریت اپنے انجام پر توجہ کیے بغیر ان کے مقابلے میں کھڑی ہو جاتی اور خدا کی ان عظیم نعمتوں کا انکار کر دیتی۔

٭ ٭ ٭

چونکہ گزشتہ آیات میں اس معنی کی طرف اشارہ ہوا تھا کہ خدا قیامت کے دن تمام لوگوں کو جمع کرنے

---

[1] تفسیر مجمع البیان ذیل آیات زیرِ بحث، یہ حدیث درالمنثور میں بھی ابن عباس سے نقل ہوئی ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ ص ۲۵۵، ۲۵۶۔

[3] کبھی "تاء" اسم فاعل سے ملحق ہوتی ہے اور مبالغہ کا معنیٰ دیتی ہے، نہ کہ تانیث کا مثلاً "راویہ"۔

Marfat.com

کے بعد ان کے درمیان فیصلہ کریگا۔ لہٰذا بعد والی آیت میں منکرین معاد کی طرف سے ایک سوال کو اس صورت میں نقل کرتا ہے کہ: " وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو پھر یہ قیامت کا وعدہ کس زمانہ میں پورا ہوگا " (ویقولون متٰی ھٰذا الوعد ان کنتم صادقین)۔

یہ سوال منکرینِ معاد، پیغمبرِ اسلامؐ یا دوسرے تمام پیغمبروں سے بارہا کیا کرتے تھے، جو کبھی تو مطلب کو سمجھنے کے لیے ہوتا تھا، اور شاید اکثر استہزاء اور تمسخر کے طور پر ہوا کرتا تھا کہ آخر یہ قیامت جس کا تم ہمیشہ سہارا لیتے ہو اگر تم سچ کہتے ہو تو بتلاؤ کہ وہ کب آئے گی۔ ان کا یہ پوچھنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچ بولنے والے آدمی کو اس مطلب کے تمام جزئیات کا جس کی وہ خبر دے رہا ہے علم ہونا چاہیئے اور اس کے کم وکیف اور زمان و مکان سے بھی آگاہ ہونا چاہیئے۔

لیکن قرآن ہمیشہ اس مطلب کے صریح جواب اور قیامت کے وقوع کے زمان کی تعین سے پہلوتہی کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ یہ ان امور میں سے ہے کہ جس کا علم خدا کے ساتھ ہی مخصوص ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں ہے۔

لہٰذا بعد والی آیت میں اسی مطلب کو ایک دوسری عبارت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: " کہہ دو کہ تمہارا وعدہ اس دن ہوگا کہ نہ ایک گھڑی اس سے تاخیر ہوگی اور نہ ہی ایک لمحہ بھر اس سے آگے بڑھو گے " (قل لکم میعاد یوم لا تستأخرون عنہ ساعۃ ولا تستقدمون)۔

یہ قیامِ قیامت کی تاریخ کا مخفی ہونا ۔ یہاں تک کہ پیغمبرِ اسلامؐ پر بھی ۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، اس بناء پر ہے خدا چاہتا ہے کہ لوگ ایسی آزادیٔ عمل ۔ جو انہیں ہمیشہ آمادہ رہنے کی حالت میں تیار رکھے ۔ کے حامل ہوں کیونکہ اگر قیامت کی تاریخ معین ہو جائے تو اگر اس کا زمانہ دور ہوتا تو سب کے سب غفلت، غرور اور بے خبری میں جا پڑتے، اور اگر اس کا زمانہ نزدیک ہوتا، تو ممکن تھا کہ وہ آزادیٔ عمل کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے اور ان کے اعمال اضطراری صورت اختیار کر لیتے اور دونوں صورتوں میں انسان کے تربیتی ہدف بے نتیجہ رہ جاتے، اسی بناء پر قیامت کی تاریخ تمام لوگوں سے پوشیدہ ہے، جیسا کہ شب قدر کی تاریخ وہی رات کہ جو ہزار ماہ کی فضیلت رکھتی ہے' یا حضرت مہدیؑ کے قیام کی تاریخ۔

وہ تعبیر کہ جو سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۵ میں آئی ہے: " ان الساعۃ اٰتیۃ اکاد اخفیھا لتجزیٰ کل نفس بما تسعٰی " (قیامت یقینی طور پر آئے گی، میں چاہتا ہوں کہ اسے مخفی رکھوں تاکہ ہر شخص کو اس کی اپنی سعی و کوشش کے مقابلہ میں جزا دی جائے) اسی معنی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

اس ضمن میں کہ وہ یہ تصور کرتے تھے کہ پیغمبر جو قیامت کے بارے میں خبر دے رہا ہے، اگر وہ سچ کہہ رہا ہے تو اسے اس کی یقینی تاریخ کا بھی علم ہونا چاہیئے۔ یہ ان کی انتہائی غلط فہمی ہے' اور ان کے وظیفۂ نبوت

Marfat.com

سے بے خبری اور لاعلمی کی دلیل ہے، کیونکہ وہ تو صرف احکام کو پہنچانے اور بشارت و انذار پر مامور تھے، باقی رہا قیامت کا مسئلہ تو وہ خدا سے مربوط ہے اور صرف وہی اس کے تمام جزئیات سے آگاہ ہے، اور صرف اسی حصّہ کو جسے مسائل تربیتی کے لیے اُس نے ضروری سمجھا پیغمبر کے اختیار میں دیا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن مخالفین کی تہدید کے مقام میں کہتا ہے کہ:

"تم قیامت کے مقررہ وعدہ سے ایک لحظہ کے لیے بھی تاخیر نہیں کرو گے" (لا تستاخرون) لیکن یہ کیوں کہتا ہے کہ ایک لحظہ کے لیے مقدم بھی نہیں ہو گی، قرآن کے ہدف میں اس بات کا کیا اثر ہے؟

اس کے جواب میں دو نکات کی طرف توجہ رکھنا ضروری ہے: پہلا یہ ہے کہ ان دونوں کو اکٹھا ذکر کرنا ہمیشہ کسی چیز کی تاریخ کے قطعی اور یقینی ہونے کی طرف اشارہ ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں کام میں دیری یا جلدی نہیں ہے بلکہ اس کے وعدہ کا وقت قطعی ویقینی ہے۔

دوسرا یہ کہ ہٹ دھرم کفار کی ایک جماعت ہمیشہ پیغمبروں پر دباؤ ڈالتی رہتی تھی کہ یہ قیامت آتی کیوں نہیں، دوسرے لفظوں میں انہیں اس کے لیے جلدی تھی خواہ استہزار کے طور پر یا بغیر استہزار کے، قرآن انہیں کہتا ہے کہ تم جلدی نہ کرو، اس کی تاریخ اور وقت وہی ہے جو خدا نے مقرر کیا ہوا ہے۔

Marfat.com

(۳۱) وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ
بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚۖ
يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ٍۨالْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا
لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ○
(۳۲) قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ
عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ○
(۳۳) وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ
وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ
وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ
فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

(۳۱) کافروں نے کہا کہ: ہم اس قرآن پر اور جو کتابیں اس سے پہلے تھیں ہرگز بھی ایمان نہیں لائیں گے، اور اگر تُو دیکھے کہ جس وقت یہ ستمگر اپنے پروردگار کی بارگاہ میں (حساب کتاب اور جزا و سزا کے لیے) کھڑے ہوئے ہوں گے (تو ان کی وضع و کیفیت سے تجھے تعجب ہوگا) جبکہ ان میں سے ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کی گردن میں ڈال رہا ہوگا، مستضعفین مستکبرین سے کہہ رہے

Marfat.com

ہوں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہو جاتے ۔

(۳۲) (لیکن) مستکبرین مستضعفین کو جواب دیں گے کہ کیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روک رکھا تھا، اس کے بعد کہ وہ تمہارے پاس آئی (اور تم نے اسے اچھی طرح سے پا لیا تھا) بلکہ تم خود ہی مجرم تھے ۔

(۳۳) مستضعفین مستکبرین سے کہیں گے، تمہارے رات دن کے فریب دینے والے وسوسے (ہماری گمراہی کا سبب بنے) جس وقت تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم خدا کا انکار کر دیں، اور اس کے لیے شریک قرار دیں، وہ جس وقت عذاب (الٰہی) کو دیکھیں گے تو اپنی ندامت اور پشیمانی کو چھپائیں گے (کہ کہیں زیادہ رسوا نہ ہوں) اور ہم کافروں کی گردن میں طوق و زنجیر ڈال دیں گے، کیا اس کے علاوہ کہ جو وہ عمل کرتے تھے کوئی اور جزا انہیں دی جائے گی ؟ !

تفسیر

اس بحث کی مناسبت سے کہ جو گزشتہ آیات میں مسئلہ معاد پر مشرکین کی طرف سے اعتراضات کے بارے میں تھی، زیرِ بحث آیات میں ان کے لیے معاد کے بعض دردناک مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے تاکہ وہ اپنے کام کے انجام سے واقف ہو جائیں ۔

پہلے کہتا ہے کہ : "ہم اس قرآن پر اور جو کتابیں اس سے پہلے تھیں ہرگز بھی ایمان نہیں لائیں گے" (وقال الذین کفروا لن نؤمن بھذا القراٰن ولا بالذی بین یدیه)۔

لفظ "لن" جیسا کہ ہم جانتے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کی نفی کے لیے ہے، اس بنا پر وہ کنایہ چاہتے ہیں کہ اگر تم ابد تک بھی ہمیں تبلیغ کرو تو ہم ایمان نہیں لائیں گے' اور یہ ان کی ہٹ دھرمی کی دلیل ہے کہ انہوں نے ابد تک ۔ کے لیے اپنے ارادے کو پختہ کر لیا تھا، حالانکہ ایک حق طلب آدمی اگر کسی دلیل سے مطمئن نہ ہو تو وہ آئندہ کی احتمالی دلیلوں کا سنے بغیر انکار نہیں کر سکتا، اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں دوسرے دلائل کو بھی رد کرتا ہوں ۔

Marfat.com

اس بارے میں کہ " الذین کفروا " سے کون لوگ مراد ہیں، مفسرین کی ایک جماعت نے تو اس کی مشرکین کے ساتھ تفسیر کی ہے' اور بعض نے یہود اور اہل کتاب کے ساتھ، لیکن بعد والی آیات کے قرآن، کہ جو شرک کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں' اس بات کی دلیل ہیں، کہ اس سے مراد مشرکین ہی ہیں' " الذی بین یدیہ " سے مراد وہی کتب آسمانی ہیں کہ جو قرآن سے پہلے دوسرے پیغمبروں پر نازل ہوئی تھیں، کیونکہ قرآن کی بہت سی آیات میں یہ تعبیر ــ خصوصاً ذکر قرآن کے بعد ــ اسی معنی میں استعمال ہوئی ہے' اور یہ بات جس کا بعض نے احتمال دیا ہے کہ اس سے مراد " معاد " اور یا قرآن کے مضامین تھے، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

بہرحال پہلے انبیاء کی کتب پر ایمان سے انکار شاید اس بناء پر تھا کہ قرآن اس مطلب پر تکیہ کرتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی نشانیاں تورات و انجیل میں وضاحت کے ساتھ آئی ہیں' اور پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کی نفی کرنے کے لیے دوسری کتب آسمانی کی بھی نفی کرتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ نہ ہم اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں' اور نہ اس سے پہلے کی کتب پر۔

اس کے بعد پیغمبرؐ کی طرف رُوئے سخن کرتے ہوئے قیامت میں ان کی وضع و کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: " اگر تُو دیکھے کہ جب یہ ستمگر اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حساب و کتاب اور داد رسی کے لیے کھڑے کیے جائیں گے (تو ان کی وضع و کیفیت سے تُو حیرت میں ڈوب جائے گا) جبکہ ان میں سے ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کی گردن میں ڈالے گا، اور ایک دوسرے کے خلاف جھگڑا اور لڑائی کر رہے ہوں گے" (ولو تری اذ الظالمون موقوفون عند ربھم یرجع بعضھم الی بعض القول)[1]

اوپر والی آیت سے ایک دفعہ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ " ظلم " کے اہم ترین مصادیق میں سے ایک وہی " شرک " اور " کفر " ہے۔

" عند ربھم " کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایسی ہستی کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے کہ جو اُن کا مالک اور پروردگار ہے' اور اس سے بڑھ کر شرمندگی و شرمساری کی اور کیا بات ہوگی کہ انسان ایک ایسی ہستی کے سامنے پیش ہو کہ نہ تو وہ اس پر ایمان لایا ہو اور نہ ہی اس کے احکامات و فرامین پر، درآنحالیکہ اس کا سارا وجود اسی کی نعمتوں کا مرہون منت ہو۔

" اس حال میں " مستضعفین " وہی بے خبر لوگ کہ جو آنکھ، کان بند کیے ہوئے دوسروں کے پیچھے لگے

---

[1] " یرجع " فعل لازم کی شکل میں بھی استعمال ہوتا ہے اور فعل متعدی کی شکل میں بھی۔ اور یہاں دوسری شکل میں ہے اور ارجاع اور لوٹانے کا معنی دیتا ہے اور چونکہ اس کے بعد (بعضھم الی بعض) آیا ہے لہٰذا نتیجہ " مفاعلۃ " کا معنی دیتا ہے۔

Marfat.com

ہوتے تھے مستکبرین سے — یعنی انہیں لوگوں سے — کہ جو کبر و غرور اور دوسروں پر تسلط جمانے اور انہیں شیطانی سوچ کا راستہ دکھاتے تھے، اس طرح کہیں گے: "اگر تم نہ ہوتے' اور اگر تمہارے شیطنت آمیز فریب دینے والے وسوسے نہ ہوتے تو ہم مومنین میں سے ہوتے" (یقول الذین استضعفوا للذین استکبروا لولا انتم لکنّا مؤمنین)۔

وہ اس طرح سے اپنے تمام گناہ ان بے رحم مستکبرین کی گردن میں ڈالنا چاہیں گے، اگرچہ دُنیا میں وہ اس قسم کی قطعی اور دو ٹوک بحث کرنے کی مجال نہ رکھتے تھے، چونکہ ضعف و ناتوانی ان کے وجود پر غالب آئی ہوئی تھی اور وہ اپنی حریت و آزادی کھو چکے تھے، لیکن اب جبکہ وہ تمام جھوٹے مفاہیم جنہوں نے مستکبرین کو ان سے جُدا کیا ہوا تھا برباد ہو گئے، اور سب کے اعمال کے نتائج ظاہر و آشکار ہو گئے تو ان کے عین سامنے کھڑے ہو جائیں گے اور صراحت کے ساتھ ان سے بات کریں گے' اور ان سے پرخاش رکھیں گے۔

٭ ٭ ٭

لیکن مستکبرین بھی خاموش نہیں رہیں گے،" وہ جواب میں مستضعفین سے یہ کہیں گے' کہ کیا ہم نے تمہیں ہدایت کی راہ سے روکا تھا، جبکہ ہدایت بھی تمہارے پاس آگئی تھی' اور کافی حد تک اتمام حجت بھی ہو گئی تھی' اور پیغمبروں نے بھی تمام ضروری باتیں کہہ دی تھیں" (وقال الذین استکبروا للذین استضعفوا انحن صددناکم عن الھدٰی بعد اذ جاءکم)۔

نہیں ہم تمہارے جوابدہ نہیں ہیں'، "بلکہ تم خود ہی گنہگار تھے' کہ تم نے آزادئ ارادہ رکھنے کے باوجود ہماری بے بنیاد باتوں کے سامنے سر تسلیم خم کیا، کفر و الحاد کی طرف رُخ کیا، اور انبیاء کی منطقی باتوں کو بھلا بیٹھے" (بل کنتم مجرمین)۔

٭ ٭ ٭

یہ ٹھیک ہے کہ مستکبرین اپنے وسوسوں کی وجہ سے عظیم گناہ کے مرتکب ہوئے تھے لیکن ان کی یہ بات بھی واقعیت رکھتی ہے کہ ان پیچھے لگنے والوں کو آنکھ اور کان بند کر کے ان کے پیچھے نہیں لگ جانا چاہیئے تھا، اس لحاظ سے ان کا گناہ خود انہیں کی گردن پر ہے۔

٭ ٭ ٭

لیکن "مستضعفین" اس جواب پر قناعت نہیں کریں گے، اور مستکبرین کو مجرم ثابت کرنے کے لیے دوبارہ گفتگو شروع کر دیں گے' اور مستکبرین سے اس طرح کہیں گے: "بلکہ تمہارے وسوسے، سازشیں اور شب و روز کے مکارانہ پروپیگنڈے اس بات کا سبب بن گئے کہ ہم ہدایت حاصل کرنے سے باز رہیں، جس وقت تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم خدا کا انکار کر دیں اور اس کے لیے شریک و شبیہ قرار

Marfat.com

دیں" (وقال الذین استضعفوا للذین استکبروا بل مکر اللیل والنہار اذ تأمروننا ان نکفر باللہ ونجعل لہ اندادًا)۔

ہاں! تم ہی تو تھے جو اپنے بُرے پروپیگنڈے سے دست بردار نہیں ہوتے تھے اور دن رات اپنے بُرے مقاصد کی پیش رفت کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم قبول کرنے میں آزاد تھے اور قصوروار و گنہگار لیکن عامل فساد ہونے کی بنار پر تم بھی جوابدہ اور گنہگار ہو، بلکہ سنگِ بنیاد تو تمہارے ہی ناپاک ہاتھوں سے رکھا گیا، خاص طور پر جبکہ تم ہمیشہ ہی اپنی قدرت و طاقت اور اقتدار کی بنار پر بات کرتے تھے " تأمروننا " کی تعبیر اس مطلب پر گواہ ہے۔

یہ بات صاف طور پر واضح اور ظاہر ہے کہ مستکبرین اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے، اور اس عظیم جرم میں اپنی شرکت کا انکار نہیں کر سکتے تھے۔

لہٰذا دونوں گروہ اپنے کیے پر پشیمان ہوں گے، مستکبرین تو دوسروں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے اور مستضعفین ان بُرے وسوسوں کو بلاقید و شرط قبول کرنے کی وجہ سے، "لیکن جس وقت عذاب الٰہی کو دیکھیں گے تو اپنی ندامت و پشیمانی کو چھپائیں گے کہ کہیں اور زیادہ رسوا نہ ہو جائیں، اور ہم طوق و زنجیر کافروں کی گردن میں ڈال دیں گے" (واسروا الندامۃ لما راوا العذاب وجعلنا الاغلال فی اعناق الذین کفروا)۔

اگرچہ اس جہان میں کہ جو ہر چیز کے ظاہر ہو جانے کا دن ہے اور اس دن کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھی جا سکے گی، کسی چیز کو چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن وہ اپنی اسی پرانی عادت کے مطابق کہ جو وہ دنیا میں رکھتے تھے، اس خیال سے کہ وہ (یہاں بھی) اپنی حالت کو چھپا سکتے ہیں چھپانے کی کوشش کریں گے۔

ہاں! وہ دنیا میں بھی جس وقت اپنی غلطی کو محسوس کرتے تھے، اور اس پر نادم و پشیمان ہوتے تھے تو اظہارِ ندامت کی جرأت ــ جو تجدیدِ نظر اور بازگشت کے لیے ضروری تھی ــ نہیں رکھتے تھے اور اپنی اسی اخلاقی خصوصیت کو قیامت میں بھی استعمال کریں گے لیکن کیا فائدہ؟

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ ندامت کو پنہاں رکھنا عذابِ الٰہی کے مشاہدہ اور ان کی گردن میں طوق و زنجیر کے پڑنے سے شدتِ وحشت کی بنار پر ہوگا ان کے سانس ان کے سینوں میں رُک جائیں گے اور ان کی زبان بات کرنے سے عاجز ہو گی۔

اگرچہ قیامت کے دوسرے مواقف میں وہی لوگ " یا ویلنا انا کنا ظالمین " " ہائے افسوس! ہم ہی ظالم تھے " کی فریاد کریں گے۔ (انبیار۔ ۱۴)

بعض نے یہاں " اسرار " کا معنی " اظہار " کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ لفظ عربی زبان میں دو متضاد معانی

Marfat.com

میں استعمال ہوتا ہے اور اس کی مثالیں کم نہیں ہیں۔ لیکن قرآن میں بھی اور غیر قرآن میں بھی اس لفظ "اسرار" کے مواقع استعمال کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ معنی بعید نظر آتا ہے کیونکہ "سر" عام طور پر "علن" کے مقابلہ میں آتا ہے، اور راغب نے بھی "مفردات" میں اس قول کے ضعیف ہونے کی تصریح کی ہے اگرچہ بعض علماءِ لغت نے دونوں معانی کی طرف اشارہ کیا ہے [1]

بہرحال یہ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے کہ جو انہوں نے پہلے سے فراہم کیا ہے "کیا انہیں کوئی اور جزا ۔ سوائے ان اعمال کے کہ جو وہ انجام دیا کرتے تھے ۔ ملے گی" (ھل یجزون الا ما کانوا یعملون)۔

ہاں! یہ کفار و مجرمین کے اعمال و کردار ہی ہوں گے، جو اُن کی گردن اور ہاتھ پاؤں میں قید کی زنجیروں کی صورت میں ڈال دی جائے گی، وہ اِس جہان میں بھی ہوائے نفس اور زر و زور اور پستی و بلندی کے اسیر تھے، اور قیامت میں جب اعمال مجسم ہو کر سامنے آئیں گے تو وہی قیدیں دوسری شکل میں ظاہر ہوں گی ۔

اوپر والی آیت ایک مرتبہ پھر تجسم اعمال کے مسئلہ کو، جس کی طرف ہم نے بارہا اشارہ کیا ہے، واضح کر رہی ہے، کیونکہ وہ یہی بات کہہ رہی ہے کہ "ان کی جزا، خود انہیں کے اعمال ہیں"۔ اور تجسم اعمال کے لیے اس سے زیادہ ظاہر و واضح اور کون سی تعبیر ہوگی ۔

"الذین کفروا" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ اغوا اور گمراہ کرنے والے مستکبر بھی اسی انجام کو پہنچیں گے اور اغوا اور گمراہ ہونے والے مستضعف اور سب کافر بھی اسی انجام میں گرفتار ہوں گے اور اصولی طور پر اس وصف کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کی مجازات اور سزا کی علت وہی ان کا کفر ہے ۔

٭ ٭ ٭

---

[1] "لسان العرب" میں مادہ "سر" کے ذیل میں اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کی گئی ہے، اور اہلِ لغت و ادب کے اس بارے میں اختلاف کو نقل کیا ہے ۔ (جلد ۴ صفحہ ۳۵۷)

Marfat.com

(۳۴) وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَةٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَآ ۙ
اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ○
(۳۵) وَقَالُوۡا نَحۡنُ اَكۡثَرُ اَمۡوَالًا وَّاَوۡلَادًا ۙ وَّمَا
نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ ○
(۳۶) قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ وَلٰكِنَّ
اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ○
(۳۷) وَمَآ اَمۡوَالُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ بِالَّتِیۡ تُقَرِّبُكُمۡ عِنۡدَنَا
زُلۡفٰٓی اِلَّا مَنۡ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۙ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمۡ
جَزَآءُ الضِّعۡفِ بِمَا عَمِلُوۡا وَهُمۡ فِی الۡغُرُفٰتِ اٰمِنُوۡنَ ○
(۳۸) وَالَّذِيۡنَ يَسۡعَوۡنَ فِیۡۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيۡنَ اُولٰٓئِكَ
فِی الۡعَذَابِ مُحۡضَرُوۡنَ ○

ترجمہ

(۳۴) ہم نے کسی شہر اور بستی میں کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے مترفین (جو ناز و نعمت میں مست تھے) نے کہا کہ ہم اُس سے کہ جو کچھ تم دے کر بھیجے گئے ہو کافر ہیں۔

(۳۵) اور انہوں نے یہ کہا کہ ہمارے اموال اور اولاد (سب سے) زیادہ ہیں (اور یہ اس بات کی نشانی ہے کہ خدا کا ہمارے ساتھ تعلق ہے) اور ہمیں ہرگز

Marfat.com

عذاب نہیں ہوگا۔

(۳۶) کہہ دے کہ میرا پروردگار جس کی چاہتا ہے روزی وسیع یا تنگ کر دیتا ہے (اور یہ بات اس کی بارگاہ میں قرب سے کوئی ربط نہیں رکھتی) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۳۷) تمہارے مال اور اولاد ہرگز تمہیں ہمارا مقرب نہیں بناتے، سوائے ان کے کہ ایمان لے آئیں اور عمل صالح انجام دیں، ان کے لیے ہی ان کے اعمال کے بدلے میں جو انہوں نے انجام دیئے ہیں کئی گنا جزا ہے، اور وہ (جنت کے) بالاخانوں میں (انتہائی) امن و امان میں ہوں گے۔

(۳۸) اور وہ لوگ کہ جو ہماری آیات کے انکار و ابطال کی کوشش کرتے رہے اور یہ خیال کرتے رہے کہ ہماری قدرت کے چنگل سے نکل کر بھاگ جائیں گے، وہ عذاب (الٰہی) میں داخل ہوں گے۔

تفسیر

مال و اولاد قربِ خدا کی دلیل نہیں ہیں

چونکہ گزشتہ آیات میں مستکبرین کے (لوگوں کو) اغوا کرنے کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں اس اغواگری کے ایک گوشے کو بیان کیا جا رہا ہے، اور ضمنی طور پر پیغمبر گرامی اسلام کو بھی تسلی دی جارہی ہے، کہ اگر وہ تیری مخالفت کریں تو اس بات پر تعجب نہ کر کیونکہ مرفہ الحال مستکبرین کی طرف سے سچے پیغمبروں کی مخالفت کرنا تو ان کا شیوہ اور عادت رہی ہے۔

کہتا ہے: "ہم نے کسی شہر یا بستی میں کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے مترفین۔ وہی لوگ جو ناز و نعمت میں مست اور مغرور ہو چکے تھے۔ نے کہا ہم اس چیز کے کہ جو تم دے کر بھیجے گئے ہو منکر و کافر ہیں، اور جسے تم خدائی پیغام کا نام دیتے ہو اُسے ہم قبول نہیں کرتے" (وما ارسلنا فی قریة

Marfat.com

من نذیر الا قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کافرون)۔

"نذیر" کا معنی ہے ڈرانے والا اور یہ خدا کے پیغمبروں کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگوں کو ان کی کج رویوں، بیدادگریوں اور گناہ و فساد کے مقابلہ میں خدا کے عذاب سے ڈراتے تھے۔

"مترفوھا" جمع ہے "مترف" کی "ترف" "بروزن طرف" کے مادہ سے جو تنعم کے معنی میں ہے، اور مترف اس شخص کو کہتے ہیں کہ جسے نعمت کی زیادتی اور زندگی کی مرفہ الحالی نے مست، مغرور اور غافل کر دیا ہو، اور سرکشی پر اکسایا ہو۔[1]

ہاں! عام طور پر وہ لوگ کہ جو انبیاء کے صفِ اوّل کے مخالف تھے، وہ یہی مترف، سرکش اور غافل لوگ تھے، چونکہ وہ ایک طرف سے تو انبیاء کی تعلیمات کو اپنے مقاصد کے حصول اور اپنی ہوس رانی سے مزاحم سمجھتے تھے اور دوسری طرف سے وہ اُسے اُن محرومین کے حقوق کا دفاع کرنے والا جانتے تھے کہ جن کے حقوق کو غصب کر کے وہ ایسی زرق برق زندگی گزار رہے تھے، اور تیسری طرف سے وہ ہمیشہ اپنے مال و ثروت کی حفاظت کے لیے حکومت کی قدرت کو معاون و مددگار سمجھتے تھے، اور پیغمبروں کو ان تمام جہات میں اپنا مدِمقابل سمجھتے تھے، لہٰذا فوراً ان سے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ کسی خاص حکم یا تعلیم کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ وہ تو کلی طور پر یہ کہتے تھے کہ: "ہم اُن تمام چیزوں کے کہ جن کے ساتھ تم مبعوث ہوئے ہو، کافر ہیں" یہاں تک کہ ہم ایک قدم بھی تمہارے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہیں، اور ان کی یہ بات خود حق کے مقابلہ میں ان کی لجاجت، ہٹ دھرمی اور عناد کی بہترین دلیل تھی۔

یہ حقیقت ایک اہم مسئلہ ہے کہ جس سے قرآن نے مختلف آیات میں پردہ اٹھایا ہے کہ عام طور پر محرومین ہی پہلے وہ افراد ہوتے تھے کہ جو انبیاء کی دعوت پر لبیک کہتے تھے، اور مغرور ثروت مند متنعمین ہی وہ پہلا گروہ ہوتا تھا جو علمِ مخالفت بلند کرتا تھا۔

باوجودیکہ مسلّمہ طور پر دعوتِ انبیاء کے منکر اسی گروہ میں منحصر نہیں تھے لیکن عام طور پر عاملینِ فساد اور شرک و خرافات کی طرف دعوت دینے والے وہی ہوا کرتے تھے کہ جو ہمیشہ اس بات کی کوشش کیا کرتے تھے کہ زبردستی دوسروں کو بھی انہیں راستوں پر چلائیں۔

سورہ زخرف کی آیہ ۲۳، سورہ ہود کی آیہ ۱۱۶ اور سورہ مؤمنوں کی آیہ ۳۳ میں بھی یہی مطلب بیان ہوا ہے۔

---

[1] "لسان العرب" جلد ۹ ص ۱۷۔

Marfat.com

نہ صرف انبیاء کے مقابلہ میں بلکہ ہر اصلاحی قدم جو کسی دانشمند، مصلح اور عالم مجاہد کی طرف سے اٹھے یہ گروہ مخالفت کے لیے سر اٹھاتا، اور مصلحین کے پروگراموں کو درہم برہم کرنے کے لیے سازشیں کرتا اور کسی بھی جرم کے ارتکاب سے باز نہیں رہتا۔

☆ ☆ ☆

بعد والی آیت ان کی لچر اور پوچ منطق کی طرف ــ کہ جس سے ہر زمانہ میں اپنی برتری کو ثابت کرنے کے لیے متوسل ہوا کرتے تھے ــ اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ: "اور انہوں نے یہ کہا کہ ہم سب سے زیادہ ثروت مند اور سب سے زیادہ آل اولاد رکھتے ہیں" (وقالوا نحن اکثر اموالاً واولاداً)۔

خدا ہم سے محبت رکھتا ہے، لہٰذا اس نے ہمیں مال بھی فراواں دے رکھا ہے اور بہت سی افرادی قوت بھی، اور یہ بات ہمارے حق میں اس کے لطف وکرم کی اور اس کی بارگاہ میں ہمارے مقام اور حیثیت کی دلیل ہے: "اور ہم (نورچشموں) کو ہرگز بھی عذاب نہیں ہوگا" (وما نحن بمعذّبین)۔

کیا خدا اپنے معززین اور پیاروں کو عذاب دے گا؟! اگر ہم اس کی بارگاہ سے دھتکارے ہوئے ہوتے، تو وہ یہ ساری نعمتیں ہمیں کیوں دیتا؟! خلاصہ یہ ہے کہ ہماری دنیا کا آباد ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ہماری آخرت بھی آباد ہوگی۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ (وما نحن بمعذّبین) کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کُلی طور پر قیامت اور عذاب کے ہی منکر تھے، لیکن بعد والی آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ جملہ اس معنی میں نہیں ہے، بلکہ ان کی مراد یہ تھی کہ وہ اپنی ثروت و دولت کو مقربِ بارگاہِ خدا ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔

بعد والی آیت ان کی اس گھٹیا اور عوام کو فریب دینے والی منطق کا انتہائی اعلیٰ طریقہ سے جواب دیتی ہے اور ان کی سرکوبی کرتی ہے، روئے سخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے کہتی ہے کہ: "ان سے کہہ دے کہ میرا پروردگار جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہے اس میں تنگی کر دیتا ہے" (اور یہ سب کچھ ایسی مصلحتوں کے مطابق کرتا ہے کہ جنہیں مخلوق کی آزمائش اور انسانی زندگی کے نظم ونسق کے لیے ضروری سمجھتا ہے اور یہ چیز بارگاہِ خداوندی میں قدر و منزلت اور مقام وحیثیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتی) (قل ان ربی یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر)۔

اس بناء پر وسعتِ رزق کو سعادت کی اور تنگیٔ رزق کو شقاوت کی دلیل ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے: "لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں" (ولکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

البتہ بے خبر اور ناواقف اکثریت ایسی ہے، ورنہ واقف اور آگاہ لوگوں کیلئے یہ مسئلہ واضح وآشکار ہے۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

اس کے بعد مزید وضاحت کے ساتھ اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "ہرگز ایسا نہیں ہے، کہ تمہارا مال واولاد تمہیں ہمارا مقرب بنا دے" (وما اموالکم ولا اولادکم بالتی تقربکم عندنا زلفٰی)[1]

یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ جو عوام کے ایک گروہ کو دامن گیر ہوگئی ہے۔ کہ جو یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ لوگ جو دنیا میں مادی لحاظ سے محروم ہیں وہ بارگاہِ خدا میں مغضوب ومطرود ہیں اور وہ لوگ کہ جو نعمت کی فراخی میں ڈوبے ہوئے ہیں وہ اس کے محبوب ومقبول ہیں۔

کتنے ہی ایسے محروم افراد ہوتے ہیں کہ جن کی اس (محرومیت) کے ذریعہ آزمائش ہوتی ہے اور بدترین مقامات تک پہنچتے ہیں اور کتنے ہی متنعم افراد ایسے ہیں کہ جن کا مال و دولت ان کے لیے بلائے جان بن جاتا ہے اور ان کی گناہ گاری یا حد سے بڑھ جانے کا مقدمہ بنتا ہے۔

کیا قرآن سورہ تغابن کی آیہ ۱۵ میں صراحت کے ساتھ یہ نہیں کہتا کہ: (انما اموالکم واولادکم فتنة والله عنده اجر عظیم) "تمہارے مال اور اولاد تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں اور اجرِ عظیم خدا کے پاس ہے"۔

اس بات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان زندگی کے لیے لازمی وضروری سعی وکوشش سے ہی دستبردار ہوجائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اقتصادی وسائل اور فراواں انسانی قدرت وطاقت ہرگز خدا کی بارگاہ میں انسانوں کی معنوی قدر وقیمت کا معیار نہیں ہوتا۔

اس کے بعد انسانوں کی قدر وقیمت کا اصلی معیار اور جو چیز خدا کی بارگاہ میں تقرب کا سبب بنتی ہے اُسے بیان کرتے ہوئے (ایک استثنائے منفصل کی صورت میں) کہتا ہے کہ: "مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیئے ان کے لیے ان کے اعمال کے مقابلہ میں کئی گنا اجر وثواب ہے، اور وہ جنت کے بالاخانوں میں انتہائی امن وامان کے ساتھ زندگی بسر کریں گے" (الا من اٰمن وعمل صالحًا فاولٰئك لهم جزاء الضعف بما عملوا وهم فی الغرفات اٰمنون)[2]

اس بنا پر تمام معیار ان ہی دونوں امور کی طرف لوٹتے ہیں، "ایمان" اور "عمل صالح"

---

[1] "زلفٰی" اور "زلفة" مقام ومنزلت اور منزل گاہ کے معنی میں آیا ہے (مفردات راغب) اسی بنا پر رات کی منازل کو زلف اللیل کہتے ہیں "التی" کی تعبیر اس بنا پر ہے، کیونکہ بہت سے موارد میں مفرد مؤنث کی ضمیر جمع مکسر کی طرف لوٹتی ہے اس بنا پر یہاں تقدیر کی ضرورت نہیں ہے۔

[2] جزاء الضعف کی تعبیر موصوف کی صفت کی طرف اضافت کی قبیل سے ہے۔

Marfat.com

خواہ کوئی بھی آدمی ہو، ہر زمانے میں اور ہر جگہ، وہ کسی بھی طبقہ سے ہو یا کسی گروہ سے ہو، بارگاہ خدا میں انسانوں کے درمیان تفاوت اور فرق ان کے ایمان کے درجات اور عمل صالح کے مراتب کے تفاوت اور فرق کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے سوا اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

یہاں تک کہ علم و دانش اور بزرگ افراد کی طرف نسبت، یہاں تک کہ پیغمبروں کے ساتھ (نسبت بھی) اگر ان دونوں معیاروں سے توأم نہ ہو، تو صرف یہ اکیلی نسبت انسان کی قدر و قیمت میں ذرا سا بھی اضافہ نہیں کرتی۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں قرآن نے اپنی بے نظیر صراحت کے ذریعہ پروردگار کے قرب کے عوامل کے سلسلہ میں اور انسان کی وجودی قدر و قیمت کے بارے میں تمام بے معنی اور لغو خیالات پر قلم بطلان کھینچ دیا ہے، اور اصل معیار کا دو چیزوں میں خلاصہ کر دیا ہے کہ جن کے حاصل کرنے پر تمام انسان قدرت رکھتے ہیں، اور مادی امکانات و وسائل اور محرومیتیں اس میں مؤثر نہیں ہیں۔

ہاں! اگر مال و اولاد بھی یہی راستہ اختیار کر لیں تو وہ بھی اسی خدائی رنگ میں رنگے جائیں گے، اور ایمان اور عمل صالح کا رنگ قبول کر لیں گے اور قرب خدا کا سبب بن جائیں گے، لیکن وہ مال اور اولاد کہ جو انسان کو خدا سے دور کر دیں، اور ایک بُت کی طرح پوجے جانے لگیں اور فساد برپا کرنے کا سبب بن جائیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں، اور قرآن کے کہنے کے مطابق انسان کی جان اور اس کی سعادت و نیک بختی کے لیے دشمن ہیں۔ (یا ایھا الذین اٰمنوا ان من ازواجکم و اولادکم عدوًا لکم فاحذروھم) "اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور کچھ اولاد تمہاری دشمن ہے ان سے ڈرتے رہو" (تغابن - ۱۴)

ضمنی طور پر۔ جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے۔ "ضعف" صرف "دگنے" کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ "چند برابر" (کئی گنا) کے معنی میں بھی آیا ہے، اور زیر بحث آیت میں اسی معنی میں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر نیک کام کی پاداش اور اجر، خدا کے ہاں کم از کم دس گنا ہے: (من جاء بالحسنة فله عشر امثالها) (انعام - ۱۶۰) اور کبھی اس سے بھی کئی گنا زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

"غرفات" جمع ہے "غرفه" کی کہ جو اُن کمروں کے معنی میں ہے کہ جو اوپر والے طبقہ میں ہوں، کہ جن میں روشنی بھی زیادہ آتی ہے اور ہوا بھی بہتر ہوتی ہے اور آفات سے بھی بچے ہوئے ہوتے ہیں، اسی بنا پر یہ تعبیر جنت کے اعلیٰ منازل کے لیے استعمال ہوئی ہے۔

یہ لفظ اصل میں مادہ "غرف" (بروزن برف) کسی چیز کو اوپر لے جانے اور اٹھانے کے معنی میں ہے۔

"اٰمنون" (وہ لوگ جو امن و امان میں زندگی بسر کرتے ہیں) کی تعبیر، اہل بہشت کے بارے

Marfat.com

میں بہت ہی جامع تعبیر ہے، کہ جو ان کی روح اور جسم کے آرام وسکون کو ہر لحاظ سے ظاہر کرتی ہے' کیونکہ وہاں انہیں نہ تو فنا و زوال کا اور موت کا خوف ہوگا، اور نہ ہی دشمن کے حملہ کا خطرہ، نہ کوئی بیماری اور آفت اور غم و اندوہ، یہاں تک کہ انہیں خوف کا بھی کوئی خوف نہیں ہوگا، اور اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہوگی کہ انسان ہر لحاظ سے امن و امان میں زندگی بسر کرے، جیسا کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بدامنی سے بدتر کوئی بلا اور مصیبت نہیں ہے۔

٭ ٭ ٭

اور بعد والی آیت میں ان کے مدِّمقابل گروہ کی توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے: "باقی رہے وہ لوگ کہ جو ہماری آیات کے انکار و ابطال کے لیے سعی و کوشش کرتے ہیں، نہ تو وہ خود ایمان رکھتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو حق کی راہ میں قدم رکھنے کی اجازت دیتے ہیں، اس حال میں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہماری قدرت کے چنگل سے نکل کر بھاگ جائیں گے' وہ تو قیامت کے دن دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے" (والذین یسعون فی اٰیاتنا معاجزین اولئك فی العذاب محضرون)۔

یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے مال و اولاد اور افرادی قوت سے استفادہ کرتے ہوئے انبیاء کی تکذیب کرتے ہیں، اور مخلوقِ خدا کو وسوسے میں ڈالنے میں مشغول رہتے ہیں' اور وہ اس قدر مغرور ہو گئے تھے کہ وہ یہ گمان کرنے لگ گئے تھے کہ وہ عذابِ الٰہی کے چنگل سے نکل کر بھاگ جائیں گے لیکن وہ سب کے سب خدا کے حکم سے جلانے والی آگ کے اندر جھونک دیئے جائیں گے۔

"اولئك فی العذاب محضرون" کے جملہ میں کیونکہ آئندہ زمانہ کے بارے میں کوئی بات نہیں ہے، لہٰذا ممکن ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اب اس وقت بھی عذاب میں گرفتار ہیں۔ اس زندان سے بڑھ کر اور کونسا عذاب ہوگا کہ جو انہوں نے مال و اولاد کے ذریعہ اپنے لیے بنا لیا ہے۔

یہ احتمال بھی اس میں موجود ہے کہ اوپر والی تعبیر اس بناء پر ہو کہ خدا کا یہ وعدہ ایسا مسلم اور یقینی ہے کہ گویا وہ اسی وقت اس میں قرار پا گئے ہیں جیسا کہ جملہ " فھم فی الغرفات اٰمنون" میں بیان ہوا ہے۔

"معاجزین" کی تعبیر۔ جیسا کہ بعض اربابِ لغت نے کہا ہے۔ اس معنی میں ہے کہ وہ اس طرح خیال کرتے ہیں کہ وہ خدا کی قدرت اور اس کے عذاب سے نکل کر فرار کر سکتے ہیں، حالانکہ یہ خیال باطل اور بے بنیاد ہے[1]

---

[1] "لسان العرب" اور "مفرداتِ راغب" نے "معاجزین" کی (ظانین انھم یعجزون اللہ) "گمان کرتے ہیں کہ وہ خدا کو عاجز کر دیں گے" کے ساتھ تفسیر کی ہے' اور حقیقت میں یہ "یخادعون اللہ ورسولہ" کی تعبیر کے مشابہ ہے کہ جو سورۂ بقرہ کی آیہ ۹ میں آئی ہے، کیونکہ باب مفاعلہ کبھی کبھی اس معنی میں آتا ہے۔

Marfat.com

چند نکات

قدروں کا تعیّن

فرد اور جامعہ کی زندگی میں اہم مسئلہ پہچاننے کے معیار اور اس جامعہ کے تمدن پر حاکم اقدار کا نظام ہے۔

کیونکہ فرد اور معاشرے کی زندگی کی تمام تحریکیں قدروں کے اسی نظام سے پھوٹتی ہیں، اور پھر یہی تحریکیں نئی اقدار کو پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں۔

اس مسئلہ میں کسی قوم و ملت کی غلطی اور خیالی و بے بنیاد اقدار کو بروئے کار لانا، ان کی تاریخ کو تباہی کی طرف کھینچ لے جانے کے لیے کافی ہے، اور واقعی اقدار اور سچے معیاروں کا ادراک ان کے ایوانِ سعادت کی محکم ترین بنیاد بنتا ہے۔

مغرور دنیا پرست قدر و قیمت کو صرف مال و منال، مادی وسائل اور افرادی قوتوں تک محدود سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ بارگاہِ خدا میں شخصیت کا معیار بھی انہیں چیزوں میں تصور کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے اوپر والی آیات میں اس کا نمونہ دیکھا، اور اس کے بہت سے اور نمونے قرآن میں نظر آتے ہیں۔

۱۔ زر و زور پرست اور جبار فرعون اپنے مصاحبین سے کہتا ہے: "مجھے یقین نہیں آتا کہ موسیٰ خدا کی طرف سے ہو۔ اگر وہ سچ کہتا ہے تو پھر اُسے سونے کے کنگن کیوں نہ دیئے گئے؟"! (فلولا القی علیه اسورة من ذهب)۔ (سورہ زخرف۔ آیہ ۵۳)

یہاں تک کہ وہ اس قسم کے زر و زیور نہ رکھنے کو موسیٰ کے مقام اور مرتبہ کی پستی کی دلیل شمار کرتا تھا اور کہتا تھا: "ام انا خیر من هٰذا الذی هو مهین"۔ (سورۂ زخرف۔ آیہ ۵۲)

۲۔ پیغمبرؐ کے زمانے کے مشرک اس بات سے کہ قرآن ایک تہی دست شخص پر نازل ہوا ہے، تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ: "لولا نزل هٰذا القرآن علیٰ رجل من القریتین عظیم" (یہ قرآن سرزمینِ مکہ یا طائف کی کسی عظیم ثروت مند شخصیت پر کیوں نازل نہ ہوا)۔ (زخرف، آیۃ ۳۱)

۳۔ بنی اسرائیل نے اپنے زمانہ کے پیغمبر "اشموئیل" سے لشکر کی فرماندہی کے لیے "طالوت" کے انتخاب کے سلسلے میں اعتراض کرتے ہوئے کہا: "نحن احق بالملك منه ولم یؤت سعة من المال" (ہم فرماندہی اور حکمرانی کے لیے اس سے زیادہ حقدار ہیں، کیونکہ ہم مشہور و معروف خاندان سے ہیں، علاوہ ازیں طالوت کے پاس کچھ مال و دولت نہیں ہے)۔ (سورہ بقرہ ۔ ۲۴۷)

۴۔ قوم نوح کے مشرک ثروت مندوں نے اُن پر اعتراض کیا: "ان پست اور رذیل افراد نے تیرے اطراف کو کیوں گھیر رکھا ہے" اور پستی سے ان کی مراد مال و ثروت کا نہ ہونا ہے (قالوا انؤمن

Marfat.com

لک واتبعك الارذلون) "کیا ہم تجھ پر ایمان لے آئیں حالانکہ اراذل اور پست لوگوں نے تیری پیروی کی ہے (اور تجھ پر ایمان لائے ہیں" (سورۂ شعراء آیہ ۱۱۱)

۵۔یہی اعتراض مکہ کے ثروت مندوں نے پیغمبر اسلامؐ پر کیا تھا، کہ پا برہنہ (غریب) لوگوں نے تجھے کیوں گھیر رکھا ہے؟ ہم تو ان کے بدن کی بدبو سے بھی ناراحت اور پریشان ہو جاتے ہیں، اگر تو انہیں اپنے سے دور کر دے تو پھر ہم تیرے پاس آئیں گے۔قرآن سورۂ کہف میں اُن پر سختی کے ساتھ حملہ کرتا ہے اور شدید ترین لب ولہجہ میں انہیں تہدید کرتا ہے اور پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ تجھے ایسے ہی لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیئے کہ جو اگرچہ تہی دست ہیں لیکن ان کے دل عشقِ خدا سے پُر ہیں اور وہ صبح و شام درگاہِ خدا کی طرف رُخ کرتے ہیں، اور اس کے سوا کسی کو نہیں چاہتے، اے پیغمبر! تم انہیں کے ساتھ رہو، اور ان سے منہ نہ پھیرو، "واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداة والعشى يريدون وجهه ولا تعد عيناك عنهم" (کہف - ۲۸)

ان ہی وجوہات کی بناء پر انبیاء کا پہلا اور اہم ترین اصلاحی قدم اسی جھوٹی عزت اور قدر وقیمت کی دیوار کو توڑنا تھا، انہوں نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ ان غلط معیاروں کو ختم کیا، اور اصل خدائی اقتدار کو ان کا جانشین بنایا، اور ایک "علمی انقلاب" کے ذریعہ شخصیت کے محور کو مال و اولاد، ثروت وجاہ اور کنبہ وقبیلہ کی شہرت سے تقویٰ و ایمان اور عمل صالح میں بدل دیا۔

اس کا نمونہ ہم نے زیر بحث آیات میں پڑھ لیا ہے، کہ اموال و اولاد پر خطِ بطلان کھینچنے کے بعد بارگاہِ الٰہی میں تقرب کے ایک وسیلہ کے عنوان سے اور (وما اموالكم ولا اولادكم بالتى تقربكم عندنا زلفىٰ) کہہ کر بلا فاصلہ اصل قدر وقیمت کو (الا من اٰمن وعمل صالحاً) کے جملہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

آیہ شریفہ: (ان اكرمكم عند الله اتقاكم) کہ جو ایک اسلامی شعار اور نعرے کی شکل میں آئی ہے، کنبہ اور قبیلہ سے وابستہ قدروں کی نفی کے بعد اسی فکری و اقداری انقلاب کو بیان کررہی ہے۔

اسی آیہ (سورہ حجرات - ۱۳) کے مطابق کوئی چیز بھی اُس تقویٰ اور ایمان کے سوا کہ جو احساس مسئولیت اور پاکیزگیٔ عمل کے ساتھ ہو — انسانوں کی شخصیت اور قدر وقیمت کا معیار اور خدا کی بارگاہ میں ان کے قرب کا ذریعہ نہیں ہے، اور جو شخص اس اصل معیار سے زیادہ سے زیادہ حصّہ رکھتا ہے وہی زیادہ مقرب اور زیادہ باعزت اور گرامی قدر ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ سرزمین عرب کے ماحول میں، اسلام اور قرآن کی حیات بخش تعلیمات کے ظہور سے پہلے، زر و زور کی قدر وقیمت کے نظام کی حاکمیت کی وجہ سے اس ماحول کا نتیجہ اور ماحصل ابوسفیان، ابوجہل اور ابولہب جیسے غارت گر اور منہ پھٹ لوگ تھے، لیکن اسی ماحول سے،

Marfat.com

اقدار کے نظام میں انقلاب آجانے کے بعد سلمان، ابوذر، مقداد اور عمار یاسر جیسے افراد سامنے آئے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید سورہ زخرف میں ان آیات کے ذکر کرنے کے بعد کہ جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہتا ہے: "نہ صرف یہ کہ مادی شان وشوکت شخصیت کی دلیل نہیں ہے، بلکہ اگر ایسا کرنے سے کچھ مفاسد وجود میں نہ آتے، تو ہم کافروں کے لیے ایسے گھر قرار دے دیتے کہ جن کی چھتیں چاندی کی ہوتیں اور اس کی سیڑھیاں (گراں قیمت) ہوتیں کہ جن کے ذریعہ وہ اوپر والے طبقات کی طرف جاتے اور ان کے کمروں کے لیے (شان وشوکت والے) ایسے دروازے اور (خوب صورت) تخت قرار دیتے کہ جن پر تکیہ لگاتے، اور ہر قسم کے زیورات ہم ان کے اختیار میں دے دیتے، لیکن یہ سب کچھ دنیاوی زندگی کے مال ومتاع ہیں، اور آخرت کا گھر تیرے پروردگار کے پاس پرہیزگاروں کیلئے ہے" (ولولا ان یکون الناس امة واحدة لجعلنا لمن یکفر بالرحمٰن لبیوتھم سقفًا من فضة ومعارج علیها یظھرون ۝ ولبیوتھم ابوابًا وسررًا علیها یتکئون ۝ وزخرفًا وان کل ذالک لما متاع الحیاة الدنیا والاٰخرة عند ربك للمتقین ۝)
(زخرف، آیات ۳۳-۳۴-۳۵)

یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ جھوٹی قدریں انسان کی واقعی اور حقیقی اقدار کی جگہ نہ لے لیں۔

Marfat.com

(۳۹) قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ
یَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ
وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ○
(۴۰) وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ
اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ○
(۴۱) قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا
یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ○
(۴۲) فَالْیَوْمَ لَا یَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ
وَنَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ
كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ○

ترجمہ

(۳۹) کہہ دے: میرا پروردگار جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ (اور محدود) کر دیتا ہے اور جو چیز تم (اس کی راہ میں) خرچ کرو گے وہ اس کی جگہ اور دے دے گا، اور وہ بہترین روزی دینے والا ہے۔

(۴۰) اور اس دن کو یاد کر کہ جب خدا ان سب کو محشور کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا، کیا یہ تمہاری عبادت کرتے تھے؟

Marfat.com

(۴۱) وہ کہیں گے: تُو (ان ناروا نسبتوں سے) منزہ اور پاک ہے، تُو ہی ہمارا ولی ہے، نہ کہ وہ (وہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے) بلکہ وہ تو جِنّ کی پرستش کیا کرتے تھے! اور اُن میں سے اکثر ان پر ایمان رکھتے تھے۔

(۴۲) آج کے دن تم میں سے کوئی بھی کسی دوسرے کے لیے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہے اور ہم ظالموں سے کہیں گے کہ تم اس آگ کا عذاب چکھو کہ جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے۔

تفسیر

معبودوں کی عبادت کرنے والوں سے بیزاری

ان آیات میں دوبارہ ان لوگوں کی گفتگو کی طرف رُخ کرتا ہے کہ جو اپنے اموال اور اولاد کو بارگاہِ خدا میں اپنے قرب کی دلیل سمجھتے تھے اور تاکید کے طور پر کہتا ہے: "کہہ دے کہ میرا پروردگار اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے روزی کو کشادہ یا محدود کر دیتا ہے" (قل ان ربی یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ و یقدر لہ)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، "تم راہِ خدا میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے خدا اس کی جگہ اور دے دے گا، اور وہ بہترین روزی دینے والا ہے" (وما انفقتم من شیء فھو یخلفہ وھو خیر الرازقین)۔

اگرچہ اس آیت کا مضمون گزشتہ مطلب کی تاکید ہے، لیکن دو جہات سے نئی چیز بھی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ گزشتہ آیت، جس کا مفہوم یہی تھا، زیادہ تر کفار کے اموال و اولاد کے بارے میں تھی، جبکہ "عباد" (بندے) کی تعبیر زیرِ بحث آیت میں اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ مومنین کے بارے میں ہے، یعنی مومنین کے لیے بھی کبھی روزی کو فراخ اور کشادہ کرتا ہے — جہاں مومن کے لیے مصلحت ہو — اور کبھی ان کی روزی کو تنگ اور محدود کر دیتا ہے — جہاں اس کی مصلحت معلوم ہو، بہرحال معیشت کی وسعت و تنگی کسی چیز کی دلیل نہیں بن سکتی۔

دوسری بات یہ کہ گزشتہ آیت تو معیشت کی وسعت و تنگی کو دو مختلف گروہوں کے بارے میں بیان کر رہی تھی، جبکہ زیرِ بحث آیت میں ممکن ہے کہ یہ ایک ہی انسان کی دو مختلف حالتوں کی طرف

Marfat.com

اشارہ ہو، کہ جس کی روزی کبھی کشادہ اور فراخ اور کبھی تنگ اور محدود ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ جو کچھ اس آیت کی ابتداء میں بیان کیا گیا ہے وہ حقیقت میں اس چیز کیلئے ایک مقدمہ اور تمہید ہے کہ جو آیت کے آخر میں بیان کیا گیا ہے اور وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تشویق (شوق دلانا) ہے۔

«فھو یخلفہ» (وہ اس کی جگہ کو پُر کر دیتا ہے) کا جملہ، ایک جالب اور عمدہ تعبیر ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جو کچھ راہِ خدا میں خرچ کیا جاتا ہے وہ حقیقت میں ایک نفع بخش تجارت ہے، کیونکہ خدا نے اس کا بدلہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی کریم شخص کسی چیز کا بدلہ دینے کا وعدہ کرلے تو وہ صرف اس کے مساوی اور برابر ہی بدلہ نہیں دیتا بلکہ وہ اس سے کئی گنا اور کبھی سو گنا بدلہ دیتا ہے۔

یقیناً خدا کا یہ وعدہ آخری اور دوسرے جہان کے لیے ہی نہیں ہے، ویسے وہ اپنی جگہ پر مسلّم ہے لیکن وہ دنیا میں بھی راہِ خدا میں خرچ کرنے کی جگہ کو انواع و اقسام کی برکات سے احسن طریقہ سے پُر کرتا ہے۔

(ھو خیر الرازقین) «وہ بہترین روزی دینے والا ہے» کا جملہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور مختلف جہات سے قابلِ غور ہے۔

وہ تمام روزی دینے والوں سے بہتر ہے، اس بنا پر کہ وہ یہ جانتا ہے کہ کونسی چیز بخشے، اور کتنی مقدار میں روزی دے کہ جو فساد و تباہی کا سبب نہ بنے، کیونکہ وہ ہر چیز کا عالم ہے۔

وہ جو کچھ چاہے عطا کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وہ جو کچھ عطا فرماتا ہے اس کے بدلے میں کوئی اجر اور جزا نہیں چاہتا، کیونکہ وہ غنی بالذات ہے۔

وہ درخواست کرنے اور مانگنے کے بغیر بھی دیتا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز سے باخبر اور حکیم ہے۔

بلکہ حقیقت میں اس کے علاوہ کوئی بھی «روزی دینے والا» نہیں ہے، کیونکہ جو شخص بھی جو کچھ بھی رکھتا ہے، وہ اسی کی طرف سے ہے، اور جو شخص بھی کسی کو کوئی چیز دیتا ہے وہ «انتقال روزی کا واسطہ» ہے نہ کہ روزی دینے والا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ وہ «فانی» اموال کے مقابلہ میں «باقی رہنے والی» نعمتیں عطا فرماتا ہے، اور «قلیل» کے مقابلہ میں «کثیر» بخشتا ہے۔

ٴ ٴ ٴ

اور چونکہ یہ ظالم اور سرکش دولت مندوں کا گروہ مشرکین کے زمرہ میں داخل تھا اور وہ یہ دعویٰ

Marfat.com

کرتے تھے کہ ہم فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور وہ قیامت میں ہماری شفاعت کریں گے، قرآن اس بے بنیاد دعوے کے مقابلے میں جواب دیتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "یاد کر اس دن کو جس میں خدا سب کو ۔ عبادت کرنے والوں کو بھی اور جن کی عبادت کی جاتی ہے اُن کو بھی ۔ محشور کرے گا، اس کے بعد فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہے گا، کیا یہ تمہاری عبادت کیا کرتے تھے"؟! (ویوم یحشرهم جمیعاً ثم یقول للملائکة اهٰؤلاء ایاکم کانوا یعبدون)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ سوال کوئی ایسا سوال نہیں ہے کہ جو کسی مجہول چیز کو خدا کی ذات پاک کے لیے واضح کرے، کیونکہ وہ تو ہر چیز کا علم رکھتا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ فرشتوں کے بیان کے ذریعہ حقائق بتائے جائیں، تاکہ عبادت کرنے والوں کا یہ گروہ نادم اور شرمندہ ہو اور جان لے کہ وہ ان کے عمل سے پورے طور پر بیزار ہیں، اور وہ ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائیں۔

اُن تمام معبودوں کے درمیان سے کہ جن کی مشرکین عبادت کیا کرتے تھے، صرف فرشتوں کا ذکر یا تو اس بناء پر ہے کہ جن جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اُن میں سے فرشتے شریف ترین مخلوق تھے، جہاں قیامت میں ان سے شفاعت حاصل نہ ہو تو پھر چند پتھروں اور لکڑیوں، جن اور شیاطین سے کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔

یا اس لحاظ سے ہے کہ بُت پرست پتھر اور لکڑیوں کو موجوداتِ علوی (فرشتوں اور ارواحِ انبیاؑ) کا مظہر اور سمبل سمجھتے تھے، اور اس طرح ان کی پرستش کرتے تھے، اور جیسا کہ قوم عرب کے درمیان بُت پرستی کی تاریخ میں بیان کیا گیا ہے کہ "عمرو بن لحی[1] جس سفر میں شام گیا تھا تو اس نے وہاں ایک گروہ کو بُت پرستی کرتے دیکھا، اُس نے اُن سے اس سلسلہ میں سوال کیا، توانہوں نے کہا کہ یہ وہ خدا ہیں کہ جنہیں ہم نے موجوداتِ علوی کی شکل میں بنایا ہے، ان سے ہم مدد طلب کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے بارش کی دعا کرتے ہیں، عمرو بن لحی نے ان کے اس عمل کو پسند کیا، اور ان کی پیروی اختیار کی، اور اپنے ساتھ ایک بُت سوغات کے طور پر حجاز کے لیے لایا، اور اسی وقت سے یہاں بت پرستی کی ابتداء ہوئی اور پھیلتی چلی گئی، یہاں تک کہ اسلام کا ظہور ہوا، اور اس کی بیخ کنی کی[2]۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ فرشتے، پروردگار کے سوال کے جواب میں کیا کہتے ہیں؟ وہ جامع ترین اور نہایت مؤدبانہ جواب کا انتخاب کرتے ہوئے، عرض کرتے ہیں: "اے پروردگار، تُو ان ناروا نسبتوں

---

[1] عمرو بن لحی مکہ کی جانی پہچانی شخصیت تھی (لحی لام کی پیش اور حاء کی زبر اور یا کی تشدید کے ساتھ)۔

[2] تفسیر روح المعانی جلد ۲۲ ص ۱۴۰ (زیر بحث آیت کے ذیل میں) سیرت ابن ہشام میں یہی مفہوم مختصر سے فرق کے ساتھ آیا ہے اور وہاں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے ساتھ شام سے "ہبل" بت لایا تھا۔ (سیرة ابن ہشام جلد ۱ ص ۷۹)

Marfat.com

سے، کہ جو تیری مقدس ذات کی طرف انہوں نے دی ہیں پاک اور منزہ ہے" (قالوا سبحانک)۔
ہمارا اس گروہ سے کسی طرح کا بھی ربط و تعلق نہ تھا، "صرف تو ہی ہمارا ولی ہے نہ کہ وہ" (انت ولینا من دونھم)۔
"وہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ تو جنّوں کی عبادت کرتے تھے اور ان میں سے اکثر جنّات پر ایمان رکھتے تھے" (بل کانوا یعبدون الجن اکثرھم بھم مؤمنون)۔
اس بارے میں کہ فرشتوں کے جواب کا مفہوم کیا ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، اور ہر ایک نے ایک الگ تفسیر کی ہے، لیکن جو زیادہ نزدیک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ "جن" سے مراد شیطان اور تمام ایسی خبیث موجودات ہیں کہ جو بت پرستوں کو اس عمل کا شوق دلاتے تھے اور اُسے ان کی نظروں میں زینت دیتے تھے، اس بنا پر جن کی عبادت سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے فرمان کی اطاعت و پیروی اور ان کے وسوسوں کو قبول کرتے تھے۔
فرشتے اس کام پر راضی نہ ہونے کے اعلان اور بیزاری و نفرت کے اظہار کے ضمن میں کہتے ہیں کہ فساد کے اصلی عامل شیاطین تھے، اگرچہ ظاہراً وہ ہماری عبادت کرتے تھے، لہٰذا اس کام کے واقعی چہرے کو کھول کر دکھانا چاہیئے۔
اور اس طریقہ سے وہ اُن عبادت کرنے والوں کو مکمل طور پر اپنے سے دور کرتے ہوئے ناامید کر دیں گے۔
اس معنی کی مثال ہمیں سورۂ یونس میں بھی ملتی ہے، جہاں یہ ارشاد ہوتا ہے: (ویوم نحشرھم جمیعاً ثم نقول للذین اشرکوا مکانکم انتم وشرکاؤکم فزیلنا بینھم وقال شرکاؤھم ما کنتم ایانا تعبدون) "اس دن کو یاد کرو کہ جس میں ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، پھر ہم مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے معبود اپنی جگہ پر ٹھہرو، (تاکہ تمہارا حساب لیا جائے) پھر ہم انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیں گے اور ان کے معبود اُن سے کہیں گے کہ تم ہرگز ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔" (یونس - ۲۸)
یعنی حقیقت میں تم اپنی ہوا و ہوس اور اوہام و خیالات کی پرستش کرتے تھے نہ کہ ہماری، اس سے قطع نظر تمہاری یہ عبادت ہمارے حکم اور فرمان سے نہیں تھی اور نہ ہی ہماری رضامندی سے تھی اور جو عبادت اس طرح سے کی جائے وہ درحقیقت عبادت ہی نہیں ہے۔
اس طرح سے مشرکین کی امید اس دن مکمل ناامیدی میں بدل جائے گی اور یہ حقیقت ان کے لیے واضح طور پر روشن ہو جائے گی کہ ان کے معبود ان کے کام کی چھوٹی سے چھوٹی گرہ بھی نہ کھول سکیں گے، بلکہ وہ ان سے متنفر و بیزار ہوں گے۔

Marfat.com

اس لئے بعد والی آیت میں ایک معنی خیز نتیجہ نکالتے ہوئے کہتا ہے: "آج کے دن تم میں سے کوئی بھی دوسرے کے لیے سود و زیاں اور نفع و نقصان کا مالک نہیں ہے" (فالیوم لا یملک بعضکم لبعض نفعاً ولا ضرًا)۔

اس بنا پر نہ تو فرشتے ہی کہ جو ظاہراً ان کے معبود تھے ان کی کوئی شفاعت کر سکیں گے اور نہ ہی وہ خود آپس میں ایک دوسرے کی کوئی مدد انجام دے سکیں گے۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں ہم ان ظالموں سے کہیں گے: "تم اس آگ کے عذاب کا مزہ چکھو کہ جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے" (ونقول للذین ظلموا ذوقوا عذاب النار التی کنتم بھا تکذبون)۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ جہاں قرآن مشرکین کے بارے میں ظالم اور ستمگر کی تعبیر کرتا ہے بلکہ قرآن کی بہت سی دوسری آیات میں "کفر" کو "ظلم" سے اور "کفار و مشرکین" کی ظالمین سے تعبیر ہوئی ہے کیونکہ وہ ہر چیز سے پہلے خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں کہ پروردگار کی عبودیت کا پُرافتخار تاج اپنے سر سے اتار کر بتوں کی ذلیل کرنے والی بندگی کا طوق اپنی گردن میں ڈالتے ہیں، اور اپنی ساری حیثیت، شخصیت اور قسمت کو برباد کر لیتے ہیں۔

حقیقت میں وہ قیامت کے دن اپنے شرک کی سزا بھی دیکھیں گے اور معاد و قیامت کے انکار کا عذاب بھی، اور (ونقول للذین ظلموا ذوقوا عذاب النار التی کنتم بھا تکذبون) کے جملہ میں دونوں معانی جمع ہیں۔

چند نکات

۱۔ انفاق زیادتی کا باعث ہے نہ کہ کمی کا

جو تعبیر اوپر والی آیت میں انفاق کے بارے میں بیان کی گئی ہے: "کہ جو چیز بھی تم راہ خدا میں خرچ کرو گے خدا اس کے بدلے میں اور دے دے گا" بہت معنی خیز تعبیر ہے۔

اوّل اس لحاظ سے کہ لفظ "شیء" اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے، انفاق کی تمام اقسام کے لیے۔ خواہ وہ مادی ہوں یا معنوی، چھوٹی ہوں یا بڑی۔ ہر ضرورت مند انسان کے لیے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو شامل ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان کے پاس جو بھی سرمایہ موجود ہے اُس میں سے خدا کی راہ میں بخشے چاہے وہ جس کیفیت میں ہو اور جس مقدار میں ہو۔

دوسرے انفاق کو فنا کے مفہوم سے باہر نکالتا ہے اور اسے بقا کا رنگ دیتا ہے کیونکہ خدا نے اپنی مادی و معنوی نعمتوں کے ساتھ۔ کہ جو کئی گنا اور کبھی ہزاروں گنا اور کم از کم دس گنا ہیں ۔۔۔ اس کی جگہ کو پُر کرنے کی ضمانت لی ہے، اور اس طرح سے انفاق کرنے والا شخص جس وقت اس جذبہ اور عقیدہ

Marfat.com

کے ساتھ میدان میں آتا ہے تو ہاتھ اور دل زیادہ کھلا رکھے گا، وہ کمی کے احساس اور فقر کی فکر کو ہرگز اپنے دماغ میں جگہ نہ دے گا بلکہ وہ خدا کا شکر ادا کرے گا کہ جس نے اُسے اس قسم کی پُر نفع تجارت کی توفیق عطا فرمائی۔

یہ وہی تعبیر ہے کہ جو قرآن مجید میں سورۂ صف کی آیہ ۱۰ و ۱۱ میں بیان کی ہے کہ: (یا ایھا الذین اٰمنوا ھل ادلکم علٰی تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم ۔ تؤمنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون) "اے وہ لوگو! کہ جو ایمان لائے ہو، کیا مَیں تمہیں ایک ایسی پُرنفع تجارت کی طرف کہ جو دردناک عذاب سے رہائی بخشے رہنمائی کروں؟ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور راہ خدا میں اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔"

ایک روایت میں پیغمبر گرامیٔ اسلامؐ سے منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

- ینادی منادکل لیلۃ لدوا للموت!
- وینادی مناد ابنوا للخراب!
- وینادی مناد اللھم ھب للمنفق خلفا!
- وینادی مناد اللھم ھب للممسك تلفا!
- وینادی مناد لیت الناس لم یخلقوا!
- وینادی مناد لیتھم اذ خلقوا فکروا فیما لہ خلقوا!

- ہر رات ایک آسمانی ندا کرنے والا یہ ندا کرتا ہے کہ مرنے کے لیے جیو۔
- اور دوسرا منادی یہ ندا کرتا ہے کہ ویرانی کے لیے بناکرو۔
- اور ایک منادی یہ ندا کرتا ہے کہ خداوندا! جو انفاق کرتے ہیں ان کے لیے عوض قرار دے۔
- ایک اور منادی یہ ندا کرتا ہے کہ خداوندا! جو امساک کرتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے ان کے لیے تلف قرار دے۔
- اور ایک منادی یہ ندا کرتا ہے کہ کاش انسان پیدا ہی نہ ہوتے۔
- ایک اور ندا کرنے والا یہ ندا کرتا ہے کہ اے کاش اب جبکہ وہ پیدا ہو ہی گئے ہیں تو وہ اس امر میں غور و فکر کرتے کہ وہ کس لیے پیدا ہوئے ہیں [1]

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

(ان ندا کرنے والوں سے مراد وہ فرشتے ہیں کہ جو فرمانِ خدا سے اس عالم کے امور کی تدبیر کرتے ہیں)۔

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ:

"من ایقن بالخلف سخت نفسه بالنفقه"

جسے اس بات کا یقین ہو کہ اُسے بدلہ ضرور ملے گا تو وہ خرچ کرنے میں زیادہ سخی ہوگا[1]

یہی مفہوم امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہُوا ہے۔

لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ انفاق حلال اور مشروع اموال میں سے ہو، کیونکہ خدا اس کے سوا دوسرے کو قبول نہیں کرتا اور برکت نہیں دیتا۔

اس لیے ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے یہ منقول ہُوا ہے کہ ایک شخص نے آپؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ قرآن میں دو آیات ایسی ہیں کہ مَیں جتنا ان پر عمل کرتا ہوں، اس کا نتیجہ نہیں دیکھتا، (اور اس کے مطلب کو حاصل نہیں کرتا)۔

امامؑ نے فرمایا وہ کونسی آیات ہیں؟

اس نے عرض کیا، پہلی تو خداوندِ بزرگ کی یہ بات ہے کہ اس نے یہ فرمایا ہے کہ: (ادعونی استجب لکم) "مجھے پکارو مَیں تمہاری دعا کو قبول کرتا ہوں" مَیں خدا کو پکارتا ہوں لیکن میری دعا قبول نہیں ہوتی۔

آپؑ نے فرمایا: کیا تیرا خیال یہ ہے کہ خدائے عزوجل نے اپنے وعدہ سے خلاف کیا؟

اس نے عرض کیا کہ: نہیں!

آپؑ نے فرمایا: پس اس کا سبب کیا ہے؟

اس نے عرض کیا کہ: مجھے معلوم نہیں ہے!

آپؑ نے فرمایا: لیکن مَیں تجھے بتاتا ہوں:

"من اطاع الله عزوجل فیما امره من دعائه من جهة الدعاء اجابه"

"جو شخص خداوند متعال کی اس چیز میں دعا کرے جس میں اس نے دعا کا حکم دیا ہے، اور اس میں جہتِ دعا کی رعایت کرے تو وہ اس کی دعا کو قبول کرے گا"

اس نے عرض کیا کہ: جہتِ دعا کیا ہے؟ آپؑ نے فرمایا: کہ پہلے تُو خدا کی حمد کرے گا اور اس

---

[1] نور الثقلین، جلد ۴ ص ۳۴۰۔

Marfat.com

کی نعمتوں کو یاد کرے گا، اس کے بعد شکر ادا کرے گا، اس کے بعد پیغمبرؐ پر درود بھیجے گا۔ پھر اپنے گناہوں کو دل میں لائے گا اور ان کا اقرار کرے گا، پھر اُن سے خدا کی پناہ مانگے گا اور توبہ کرے گا۔ یہ ہے جہتِ دعا۔"

پھر آپؑ نے فرمایا: دوسری آیت کونسی ہے؟

اس نے عرض کیا: وہ یہ آیت ہے کہ اس نے فرمایا ہے:

"وما انفقتم من شیء فهو یخلفه وهو خیر الرازقین"

لیکن مَیں خدا کی راہ میں انفاق کرتا ہوں، مگر وہ چیز جو اس کے بدلے میں دی جاتی ہے وہ مجھے نہیں ملتی۔

امامؑ نے فرمایا: کیا تُو یہ خیال کرتا ہے کہ خدا نے اپنے وعدے کے خلاف کیا؟

اس نے عرض کیا کہ: نہیں!

آپؑ نے فرمایا: کہ پھر ایسا کیوں ہے؟

اس نے عرض کیا کہ: مَیں نہیں جانتا!

آپؑ نے فرمایا: "لو ان احدکم اکتسب المال من حله، وانفقه فی حله، لم ینفق درهمًا الّا اخلف علیه"

اگر تم میں سے کوئی شخص کچھ حلال مال حاصل کرے، اور اُسے حلال طریقے سے ہی خرچ کرے، تو وہ کوئی ایک درہم بھی ایسا خرچ نہیں کرتا مگر یہ کہ خدا اس کا عوض اُسے دیتا ہے[1]

۲۔ اموال کا خدائی بیمہ

ایک مفسر نے یہاں ایک عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ:

تعجب کی بات یہ ہے کہ جب تاجر یہ جانتا ہو، کہ اس کے اموال میں سے کوئی مال تلف ہونے والا ہے، تو وہ اس بات پر بھی تیار ہو جاتا ہے کہ اُسے ادھار کے طور پر فروخت کر دے، چاہے لینے والا کوئی فقیر آدمی ہی ہو۔ وہ کہتا ہے: یہ بات اس سے بہتر ہے کہ اس مال کو یونہی چھوڑ دوں اور وہ نابود ہو جائے۔ اور اگر کوئی تاجر ان حالات میں اپنے مال کو فروخت کرنے کا اقدام نہ کرے یہاں تک کہ وہ تلف اور نابود ہو جائے، تو اسے "خطا کار"

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۳ ص ۳۵۳۔

Marfat.com

شمار کرتے ہیں۔

اور اگر ان حالات میں کوئی سرمایہ دار خریدار مل جائے اور وہ اس کے پاس فروخت نہ کرے تو اُسے بے عقل کہتے ہیں۔

اور اگر ان تمام باتوں کے ساتھ وہ خریدار مضبوط مالی حیثیت رکھتے ہوئے ہر قسم کا وثیقہ اسے سپرد کردے، اور ایک قابلِ اطمینان سند بھی اُسے لکھ دے، اور وہ تاجر اس کے پاس نہ بیچے تو اس کو دیوانہ کہتے ہیں۔

لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ ہم سب یہی کام انجام دیتے ہیں اور کوئی اسے جنون شمار نہیں کرتا۔

کیونکہ ہمارے تمام اموال معرضِ تلف میں ہیں اور خواہ مخواہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے حالانکہ راہِ خدا میں خرچ کرنا ایک قسم کا خدا کو قرض دینا ہے اور ایک بہت ہی معتبر ضامن، یعنی خدائے بزرگ فرماتا ہے کہ: (وما انفقتم من شیء فھو یخلفہ) "اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے وہ اس کا عوض دے گا" اور یہ اس حالت میں ہے جبکہ اُس نے اپنے اموال ہمارے پاس گروی رکھے ہوئے ہوں، کیونکہ جو کچھ انسان کے ہاتھ میں ہے وہ اس کی طرف سے عاریۃً ہے (اور کتبِ آسمانی میں سے ایک محکم ترین سند اس سلسلے میں اس نے ہمارے حوالہ کی ہوئی ہے) لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہم میں سے بہت سے اپنے اموال راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے، اور انہیں رہنے دیتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں، جس کے لیے نہ ہم کوئی اجر رکھتے ہیں نہ کوئی شکر[1]

۳۔ "انفاق" کے مفہوم کی وسعت

اس بات کو جاننے کے لیے کہ "انفاق" کا مفہوم اسلام میں کس قدر وسیع ہے، ہمارے لیے حدیث ذیل کو موردِ توجہ قرار دینا کافی ہے۔

پیغمبرِ گرامیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"کل معروف صدقہ، وما انفق الرجل علیٰ نفسہ واھلہ کتب لہ صدقۃ، وما وقی بہ الرجل عرضہ فھو صدقۃ، وما انفق الرجل من نفقۃ فعلی اللہ خلفھا، الا ما کان من نفقۃ فی بنیان او معصیۃ"

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵ ص ۲۶۳، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

" ہر نیک کام جو کسی بھی شکل میں ہو صدقہ ہے، اور راہِ خدا میں انفاق شمار ہوتا ہے۔ (اور یہ بات مالی انفاق تک ہی منحصر نہیں ہے)۔

" اور جو کچھ انسان اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضروریاتِ زندگی میں صرف کرتا ہے وہ صدقہ لکھا جاتا ہے "

" اور جس کے ساتھ انسان اپنی آبرو کو محفوظ رکھتا ہے وہ صدقہ شمار ہوتا ہے"

" اور جو کچھ انسان راہِ خدا میں انفاق کرتا ہے خدا اس کا عوض اسے دے گا سوائے اس کے کہ جو بنا ر میں صرف ہو (مثلاً گھر بنانے میں) یا معصیت کی راہ میں صرف ہو"[1]

ممکن ہے کہ گھر کا استثناء اس لحاظ سے ہو کہ اس کی اصل باقی ہے علاوہ ازیں لوگوں کی زیادہ تر توجہ اس کی طرف ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ٦ ص ٥٣٨٩، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

(۴۳) وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا
رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ
وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○
(۴۴) وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ
قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ؕ○
(۴۵) وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ
فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ○ۧ

ترجمہ

(۴۳) جس وقت ہماری واضح آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ: یہ فقط ایک ایسا آدمی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں اس سے کہ جن کی تمہارے آباؤ اجداد پرستش کیا کرتے تھے روکے، اور وہ یہ کہتے ہیں کہ: یہ ایک بہت بڑے جھوٹ کے سوا کہ جو خدا پر باندھا گیا ہے اور کچھ نہیں ہے۔ اور کافروں کے پاس جب حق پہنچا تو انہوں نے کہا کہ: یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے۔

(۴۴) ہم نے (اس سے پہلے) کتب آسمانی میں سے کوئی چیز انہیں نہیں دی کہ جسے وہ پڑھیں (اور اس کا سہارا لے کر تیری تکذیب کریں) اور تجھ سے پہلے ہم نے

Marfat.com

کوئی (بھی) پیغمبر ان کے لیے نہیں بھیجا۔

(۴۵) وہ لوگ کہ جو اُن سے پہلے تھے (انہوں نے بھی آیاتِ خدا کی) تکذیب کی تھی، حالانکہ یہ (اُن کی قدرت و طاقت کے) دسویں حصّہ کو بھی نہیں پہنچے (ہاں)! انہوں نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی، اب دیکھو! کہ میرا عذاب (ان کے لیے) کیسا تھا۔

تفسیر

کس دلیل کے ساتھ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں

گزشتہ آیات میں مشرکین اور بے ایمان افراد کی وضع و کیفیت کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں دوبارہ اس دُنیا میں ان کی وضع و کیفیت کو بیان کرتے ہوئے قرآن سننے کے مقابلہ میں ان کے ردِ عمل کو بیان کیا جا رہا ہے، تاکہ یہ بات واضح و روشن ہو جائے کہ قیامت میں ان کا وہ بُرا انجام دنیا میں آیاتِ الٰہی کے مقابلہ میں اس غلط تنقید اور طرزِ عمل کے باعث ہوگا۔

پہلے کہتا ہے: "جس وقت ہماری واضح کرنے والی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ مرد تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تمہیں اُس سے کہ جس کی تمہارے بڑے عبادت کرتے تھے باز رکھے"، (واذا تتلیٰ علیھم اٰیاتنا بیّنات قالوا ما ھٰذا الّا رجل یرید ان یصدکم عما کان یعبد اٰباؤکم)۔

اِن "آیاتِ بیّنات" کے مقابلہ میں ان کا یہ پہلا ردِ عمل تھا، کہ جو وہ اس متعصب قوم میں تعصب کے احساس کو تحریک کرنے کے لیے پیش کرتے تھے۔

خصوصاً "اٰباؤکم" (تمہارے آباؤ اجداد) کی تعبیر "اٰبائنا" (ہمارے آباؤ اجداد) کے بجائے زیادہ تر اسی بنا پر ہے تاکہ اس متعصب قوم کو سمجھائیں کہ تمہارے بزرگوں کی میراث خطرے میں ہے، لہٰذا تم کھڑے ہو جاؤ اور اس شخص کو اس کام سے روکو۔

"ما ھٰذا الّا رجل" کی تعبیر دو لحاظ سے پیغمبر کی تحقیر و توہین ہے' ایک لفظ "ھٰذا" (یہ) اور دوسرا "رجل" (مرد) نکرہ کی صورت میں، درآنحالیکہ وہ سب کے سب پیغمبر کو اچھی طرح سے اس کے سابقہ واضح و روشن کارناموں کی وجہ سے پہچانتے تھے۔

Marfat.com

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن "آیات" کی "بیّنات" کے ساتھ توصیف کرتا ہے یعنی اس کی حقانیت کی دلیلیں اس کے ساتھ ہیں، اور جب بات عیاں ہو تو بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس کے بعد ان کی اُس دوسری گفتگو کو جو وہ پیغمبر کی دعوت کو باطل کرنے کے لیے پیش کرتے تھے بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) ایک بڑے جھوٹ کے سوا کہ جو خدا پر باندھا گیا ہے اور کچھ نہیں ہے" (وقالوا ماھٰذا الّا افك مفترى)۔

"افك" (بروزن فکر) جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، کہ یہ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی اصلی صورت سے بدلی ہوئی ہو، اسی لیے مخالف ہَواؤں کو "مؤتفکات" کہتے ہیں، اس کے بعد جھوٹ، تہمت اور ہر قسم کی غلط بات کو "افک" کہا گیا، لیکن بعض کے قول کے مطابق "افک" بہت بڑے جھوٹ کے لیے بولا جاتا ہے۔

باوجود اس کے کہ پیغمبرؐ کو جھوٹ کے متہم کرنے کے لیے "افك" کی تعبیر کافی تھی، لیکن وہ لفظ "مفترى" کے ذریعہ اس میں مزید تاکید پیدا کرتے تھے، جبکہ ان کے پاس اپنے اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں تھی۔

آخر میں تیسرا اتہام جو انہوں نے پیغمبرؐ پر باندھا "سحر" (جادو) کی تہمت تھی، جیسا کہ زیرِ بحث آیت کے آخر میں بیان ہوا ہے: "وہ لوگ کہ جو کافر ہو گئے، جس وقت حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ چیز سوائے واضح جادو کے اور کچھ نہیں" (وقال الذين كفروا للحق لما جاءهم ان هٰذا الّا سحر مبين)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ گمراہ گروہ اپنی تینوں تہمتوں کو صریح ترین تاکید کے ساتھ اسی حصر کے ذریعہ بیان کرتے تھے، ایک جگہ کہتے تھے یہ فقط سحر ہے دوسری جگہ کہتے تھے، یہ فقط جھوٹ ہے، اور آخر میں تیسری جگہ کہتے تھے کہ: وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہارے بزرگوں کے معبودوں سے روک دے۔

یقیناً یہ تینوں ناروا نسبتیں آپس میں متضاد نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ ضد و نقیض گفتگو سے انکار نہیں رکھتے تھے۔ اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق ہم ان تہمتوں میں سے ہر ایک کو کافروں کے ایک گروہ سے نسبت دیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے پہلے اور دوسرے مرحلہ میں لفظ "قالوا" کا استعمال کیا ہے لیکن تیسرے مرحلے میں اس کے بجائے (قال الذين كفروا) کا جملہ استعمال کیا ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ بدبختیاں کفر، حق کے انکار اور حقیقت کے ساتھ دشمنی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ورنہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان کسی دلیل کے بغیر ان تمام تہمتوں کو یکے بعد دیگرے ایسے مرد کی طرف منسوب کرے

Marfat.com

جس کی حقانیت کے دلائل اس کی گفتگو، اس کے عمل اور اس کے سابقہ کارناموں سے واضح ہیں ۔

گویا وہ ان تینوں تہمتوں کے ساتھ پیغمبرؐ کے ساتھ مبارزہ کرنے میں ایک سوچے سمجھے پروگرام کو روبہ عمل لاتے تھے، ایک طرف وہ یہ دیکھتے تھے کہ یہ ایک نیا دین و آئین ہے، اور اس میں جذب و کشش موجود ہے ۔

دوسری طرف، پیغمبرؐ کی دنیا و آخرت میں عذابِ الٰہی سے تہدید خواہ مخواہ ایک گروہ کو وحشت زدہ بنا تی تھی

اور تیسری طرف پیغمبرؐ کے معجزات خواہ مخواہ عام لوگوں کے نفوس میں اثر انداز ہوتے تھے ۔

انہوں نے ان تینوں موضوعات کو بے اثر کرنے کے لیے ایک نہ ایک تدبیر سوچ رکھی تھی، اس نئے دین و آئین کے مقابلہ میں اپنے گزرے ہوئے بزرگوں اور آباؤ اجداد کی میراث کی حفاظت کے مسئلہ کو سامنے لے آتے حالانکہ ان کے گزرے ہوئے بزرگ قرآن کے قول کے مطابق (لا یعقلون شیئًا و لا یھتدون)، "کچھ نہیں سمجھتے تھے اور ہدایت یافتہ نہیں تھے" کے مصداق تھے ۔ (بقرہ - ۱۷۰)

اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے کہ لوگوں کو اس قسم کی بیہودہ رسومات سے کہ جو بے وقوف جاہلوں کی میراث ہوں، سے باز رکھے ۔

اور عذابِ الٰہی سے پیغمبرؐ کی تہدیدوں کے مقابلہ میں دروغ گوئی اور جھوٹ کا مسئلہ گھڑ کے تیار کرلیا تھا تاکہ عامۃ الناس کو خاموش کرسکیں ۔

اور معجزات کے مقابلہ میں "سحر" (جادو) کی تہمت لگاتے تھے، تاکہ اس کی اس ذریعہ سے توجیہ کرکے لوگوں کو اس کے سامنے جھکنے سے باز رکھیں ۔

لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں اور تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے، کہ ان شیطانی وسوسوں میں سے کوئی بھی مؤثر نہ ہوا، اور آخر کار لوگ فوج در فوج اس آئین و دینِ پاک میں داخل ہوئے ۔

☆ ☆ ☆

قرآن بعد والی آیت میں ان کے تمام دعووں پر خطِ بطلان کھینچ دیتا ہے اگرچہ بغیر کسی بیان کے بھی ان کا بطلان واضح ہے، ان کے تمام فضول اور بیہودہ دعووں کا ایک ہی جملہ کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہتا ہے : "ہم نے اس سے پہلے آسمانی کتابوں میں سے کوئی چیز انہیں نہیں دی ہے کہ جسے وہ پڑھ کر اس کی بنیاد پر تیری دعوت کا انکار کریں، اور تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر بھی ہم نے ان کے لیے نہیں بھیجا" (وما اٰتیناھم من کتب یدرسونھا وما ارسلنا الیھم قبلك من نذیر) ۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دعوے ایسا شخص کرسکتا ہے کہ جس کے پاس پہلے کوئی پیغمبر آیا ہو اور آسمانی کتاب اس کے پاس لے کر آیا ہو ۔ اور وہ نئی دعوت کے مضمون کو اس کے مخالف

Marfat.com

پاتا ہو، لہٰذا اس کی تکذیب کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے، کبھی تو وہ یہ کہتا ہے کہ تمہارے بزرگوں کا دین تمہارے ہاتھ سے نہ جانے پائے، اور کبھی یہ کہتا ہے کہ یہ نئی دعوت جھوٹی ہے اور کبھی اس کے لانے والے کو ساحر اور جادوگر کہتا ہے۔

لیکن وہ شخص کہ جس نے اپنی فکر پر تکیہ کرتے ہوئے — کسی قسم کی آسمانی وحی کے بغیر — کچھ بھی علم نہ رکھنے کے باوجود، خرافات کو دل سے گھڑ لیا ہے، اس قسم کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

اس آیت سے ضمنی طور پر اس نکتہ کا استفادہ ہوتا ہے، کہ انسان صرف اپنی قوت عقل کے بل بوتے پر زندگی کی نشیب و فراز سے پُر راہ طے نہیں کر سکتا، بلکہ اُسے وحی کی قوت سے مدد لینا چاہیئے اور خضرِ رسالت کی مدد سے قدم اٹھانا چاہیئے، ورنہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے کہ جس میں گمراہ ہو جانے کے خطرے سے ڈرنا ضروری ہے۔

٭ ٭ ٭

آخری زیرِ بحث آیت میں اس سرکش گروہ کو ایک مؤثر اور بلیغ بیان کے ساتھ تہدید کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "وہ لوگ کہ جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے بھی آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی تھی" (وکذّب الذین من قبلھم)۔

"درآنحالیکہ یہ لوگ قوت و قدرت کے لحاظ سے اس قوت کے دسویں حصّہ کو بھی نہیں پہنچے کہ جو ہم نے گزشتہ اقوام کو دی تھی" (وما بلغوا معشار ما اٰتیناھم)۔

لیکن دیکھو! ان کا انجام کیا ہوا؟ ہاں! "انہوں نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی تھی، تو دیکھ لو میرا عذاب ان کے لیے کس طرح کا تھا" (فکذبوا رسلی فکیف کان نکیر)۔

ان کے ویران شدہ شہر، جو سرکوبی کرنے والے عذابِ الٰہی کی ضربوں کے ذریعہ تباہ و برباد ہوئے تھے، تمہارے نزدیک ہی اور شام کی طرف جاتے ہوئے تمہارے راستے میں پڑتے ہیں، اُن سے عبرت حاصل کرو، اور ان ویرانوں کی زبان سے ضروری و لازمی پند و نصائح سنو، اور اپنے انجام کا اس پر قیاس کرو کیونکہ نہ تو سنتِ الٰہی تغیّر پذیر ہے، اور نہ ہی تم اُن سے برتر ہو۔

"معشار"، "عشر" کے مادہ سے ہے اور وہی معنی (دسواں حصہ) دیتا ہے۔

بعض نے اس کو "عشر عشر" کے معنی، یعنی سواں حصہ مراد لیا ہے، لیکن زیادہ تر کتب لغت و تفسیر نے اس پہلے معنی کو ہی ذکر کیا ہے، لیکن بہرحال اس قسم کے اعداد تعدادی پہلو نہیں رکھتے، اور تقلیل کے لیے ہیں، سات، ستر اور ہزار کے مقابلہ میں کہ جو تکثیر کے لیے ہیں۔

اس بناء پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ ہم نے تو ایسے ایسے سرکشوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے، جبکہ یہ تو ان کی قدرت کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی نہیں رکھتے۔

Marfat.com

اس معنی کی مثال قرآن کی دوسری متعدد آیات میں بھی وارد ہوئی ہے، منجملہ ان کے سورۂ انعام کی آیہ ۶ میں بیان ہوا ہے کہ: "الم یروا کم اھلکنا من قبلھم من قرن مکنٰھم فی الارض مالم نمکن لکم و ارسلنا السماء علیھم مدرارًا وجعلنا الانھار تجری من تحتھم فاھلکنا ھم بذنوبھم و انشأنا من بعد ھم قرنًا اٰخرین" "کیا انہوں نے اس بات کا مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم نے گزشتہ اقوام میں سے کتنوں کو ہلاک کیا ہے، ایسی اقوام کہ جو تم سے زیادہ طاقتور تھیں انہیں ہم نے ایسے وسائل عطا کیے تھے کہ جو تمہیں نہیں دیئے، ہم نے ان کے لیے پے در پے بارشیں برسائیں اور ان کے باغوں کے درختوں کے نیچے ہم نے نہریں جاری کر رکھی تھیں لیکن جس وقت انہوں نے سرکشی اختیار کی، تو ہم نے ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں نیست و نابود کر دیا، اور ان کے بعد ہم ایک دوسرا گروہ وجود میں لے آئے۔"

اسی معنی کی مثال سورۂ مومن کی آیہ ۲۱ اور سورہ روم کی آیہ ۹ میں بھی وارد ہوئی ہے۔

"نکیر" کا لفظ 'انکار' کے مادہ سے ہے، اور انکار ہی کے معنی میں ہے، اور خدا کے انکار کرنے سے مراد وہی سزا اور عذاب ہے۔[1]

---

[1] بعض مفسرین نے ایک اور خیال کا بھی اظہار کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ (وما بلغوا معشار ما اٰتینا ھم) کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اتمام حجت کے لیے گزشتہ اقوام کے اختیار میں ان آیات کا دسواں حصہ بھی قرار نہیں دیا تھا کہ جو مشرکین قریش کے اختیار میں دی ہیں، تو جب گزشتہ لوگوں کو ہم نے اتنا سخت عذاب کیا ہے تو پھر مشرکین قریش کی حالت کہ جن پر ان سے دس گنا زیادہ اتمام حجت کیا گیا واضح ہے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ پہلی تفسیر کے مطابق آیت میں جو چار ضمیریں ہیں ان میں سے پہلی اور دوسری ضمیر تو کفارِ قریش کی طرف لوٹتی ہے اور تیسری اور چوتھی گزشتہ مشرکین کی طرف۔ لیکن دوسری تفسیر کے مطابق پہلی مشرکین قریش' دوسری گزشتہ کفار' تیسری مشرکین قریش اور چوتھی گزشتہ کفار کی طرف لوٹتی ہے۔ (غور کیجئے)

Marfat.com

(۴۶) قُلۡ اِنَّمَاۤ اَعِظُكُمۡ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ مَثۡنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوۡا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمۡ مِّنۡ جِنَّةٍ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا نَذِيۡرٌ لَّكُمۡ بَيۡنَ يَدَىۡ عَذَابٍ شَدِيۡدٍ ۝

ترجمہ

(۴۶) کہہ دے کہ میں تو تمہیں صرف ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں، کہ تم دو دو افراد (مل کر) یا اکیلے اکیلے ہی خدا کے لیے کھڑے ہو جاؤ، اس کے بعد غور کرو اور سوچو (کہ) یہ تمہارا دوست اور ساتھی (محمدؐ) کسی قسم کا بھی جنون نہیں رکھتا، وہ تو صرف (خدا کے) سخت عذاب سے تمہیں ڈرانے والا ہے۔

تفسیر

انسلاب فکری ہر اصل انقلاب کی بنیاد ہے

آیات کے اس حصّہ میں اور آئندہ آیات میں کہ جن میں اس سورہ کے آخری مباحث بیان ہوئے ہیں، پیغمبر اسلامؐ کو ایک بار پھر حکم دیتا ہے، کہ اب ان لوگوں کو مختلف دلائل کے ذریعہ حق کی طرف دعوت دیں، اور گمراہی سے روکیں، اور گزشتہ مباحث کی طرح پانچ مرتبہ پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "ان سے کہہ دے" — (قل ......)۔

پہلی آیت میں تمام اجتماعی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی اور فرہنگی تغیرات اور تبدیلیوں کے اصل خمیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہت ہی مختصر اور پُرمعنی جملوں میں کہتا ہے کہ: "ان سے کہہ دو کہ میں تو تمہیں صرف ایک ہی چیز کے بارے میں نصیحت کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ تم خدا کے لیے کھڑے

Marfat.com

ہو جاؤ۔ دو، دو افراد (مل کر) یا ایک ایک فرد (اکیلے اکیلے ہی) اور پھر غور وفکر کرو» (قل انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنٰی و فرادٰی ثم تتفکروا)۔
«یہ تمہارا دوست اور ساتھی (محمدؐ) کسی قسم کی فکری کجی اور جنون نہیں رکھتا» (ما بصاحبکم من جنّۃ)۔
«بلکہ وہ تو صرف تمہیں خدا کے سخت عذاب سے ڈرانے والا ہے» (ان ھو الّا نذیر لکم بین یدی عذاب شدید)۔
اس آیت کے کلمات و تعبیرات میں سے ہر ایک' ایک اہم مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے' جن میں سے دس نکات ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:
۱۔ «اعظکم» (میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں) کا جملہ حقیقت میں اس واقعیت کو بیان کرتا ہے کہ اس گفتگو میں مجھے تمہاری خیر و صلاح مطلوب ہے نہ کہ کوئی اور دوسرا مسئلہ۔
۲۔ «واحدۃ» (صرف ایک ہی بات) کی تعبیر، خصوصاً «انما» کی تاکید کے ذریعہ اس واقعیت کی طرف ایک بولتا ہوا اشارہ ہے، کہ تمام انفرادی اور اجتماعی اصلاحات کی بنیاد فکر اور سوچ کو روبہ عمل لانا ہے جب تک کسی قوم و ملت کی سوچ اور فکر سوئی ہوئی ہے اس وقت تک وہ قوم و ملت دین و ایمان اور آزادی و استقلال کے چوروں اور ڈاکوؤں کے حملوں کی زد میں رہتی ہے لیکن جس وقت افکار بیدار ہو گئے، تو ان کے اوپر راستے بند ہو جاتے ہیں۔
۳۔ یہاں «قیام» کرنے کی تعبیر دو پاؤں پر کھڑے ہونے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ کام کو انجام دینے کی آمادگی کے معنی میں ہے، کیونکہ انسان جب اپنے دونوں پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے، تو وہ اپنی زندگی کے مختلف پروگراموں کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہوتا ہے، اس بنا پر غور وفکر کرنا پہلے سے آمادگی کا محتاج ہوتا ہے کہ جس سے انسان میں وہ حرکت اور تیاری وجود میں آتی ہے جس سے وہ پختہ ارادہ کے ساتھ غور وفکر کرنے لگتا ہے۔
۴۔ «للہ» کی تعبیر اس معنی کو بیان کرتی ہے کہ قیام اور آمادگی میں خدائی جذبہ ہونا چاہیئے، اور وہ سوچ جس کی تحریک اس طرح سے ہو قیمتی ہوتی ہے، اصولی طور پر کاموں میں خلوص، یہاں تک کہ سوچنے اور غور وفکر کرنے میں بھی نجات اور برکت کا سبب ہوتا ہے۔
یہ بات توجہ طلب ہے کہ «اللہ» پر ایمان کا ہونا یہاں پر تسلیم شدہ مانا گیا ہے، اس بنا پر دوسرے مسائل کے لیے غور وفکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توحید ایک فطری امر ہے' کہ جو بغیر کسی غور وفکر کے بھی واضح و روشن ہے۔
۵۔ «مثنٰی و فرادٰی» (دو دو یا ایک ایک) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ غور وفکر

Marfat.com

شور وغل سے دُور ہو کر کرنا چاہیئے۔ لوگوں کو ایک ایک کرکے اکیلے ہی یا زیادہ سے زیادہ دو دو مل کر قیام کرنا چاہیئے اور اپنی سوچ بچار اور فکر کو کام میں لانا چاہیئے، کیونکہ شور وغوغا کے درمیان سوچ وبچار گہرا اور عمیق نہیں ہوگا، خصوصاً جبکہ مجمع اور بہت سے لوگوں کی موجودگی میں اپنے اعتقاد سے دفاع اور اس کی حمایت میں خود خواہی اور تعصب کے عوامل زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس احتمال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ دونوں تعبیریں اس بنا پر ہیں چونکہ "انفرادی" اور "اجتماعی" افکار یعنی مشورے کی آمیزش کو اپنے ساتھ لیے ہوئے ہوتے ہیں، لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ ایک تو تنہائی میں سوچ بچار کرے، اور دوم دوسروں کے افکار سے بھی فائدہ اٹھائے، کیونکہ فکر و رائے میں استبداد و استقلال تباہی کا باعث ہوتا ہے اور ہمفکری اور علمی مشکلات کے حل کے لیے کوشش کرنا ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ، جہاں بات شور وغوغا تک نہ پہنچے وہاں پر قابلِ اطمینان حد تک اس کا بہتر اثر ہوتا ہے اور شاید اسی بنا پر مثنیٰ کو فرادیٰ پر مقدم رکھا ہے۔

۶۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن یہاں کہتا ہے: "تتفکّروا" (غور وفکر کرو) لیکن کس چیز میں؟ اس لحاظ سے یہ مطلق ہے اور اصطلاح کے مطابق "متعلق" کا حذف ہونا عمومیت پر دلالت کرتا ہے یعنی ہر چیز میں، معنوی زندگی میں، مادی زندگی میں، اہم مسائل میں، اور چھوٹے سے چھوٹے مسائل میں خلاصہ یہ کہ ہر کام میں پہلے غور کرنا چاہیئے، لیکن سب سے زیادہ اہم، ان چار سوالات کے جواب معلوم کرنے کے لیے سوچ بچار کرنا چاہیئے:

مَیں کہاں سے آیا ہوں؟ مَیں کس لیے آیا ہوں؟ مَیں کہاں جا رہا ہوں؟ اور اب مَیں کہاں ہوں؟

لیکن بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "تفکر" کا متعلق یہاں اس کے بعد کا جملہ: (ما بصاحبکم من جنّة) ہے، یعنی اگر تم تھوڑا سا بھی غور وفکر کرو تو تمہیں اچھی طرح سے معلوم ہو جائے گا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنون کے سلسلے میں تمہارے بیہودہ اتہام سے پاک و منزہ ہے۔

لیکن پہلا معنی زیادہ واضح نظر آتا ہے۔

لیکن مسلمہ طور پر منجملہ ان امور کے کہ جن میں غور وفکر کرنا چاہیئے یہی مسئلہ نبوت اور برجستہ (عمدہ) صفات کا مسئلہ ہے کہ جو پیغمبرِ اسلامؐ کی ذات اور ان کی عقل و خرد میں موجود تھیں، بغیر اس کے کہ (یہ غور وفکر کرنا) انہیں میں منحصر ہو۔

۷۔ "صاحبکم" (تمہارا ساتھی اور دوست) کی تعبیر، پیغمبرؐ کی ذات کے بارے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ آپ اُن کے غیر معروف اور ناشناختہ نہیں ہیں، آپ ان کے درمیان سالہا سال رہے ہیں، انہیں امانت و درایت اور صدق و راستی کے ساتھ تم نے پہچانا ہے، اب تک تم

Marfat.com

نے ان کی زندگی کے نامۂ عمل میں کوئی کمزوری کا نقطہ مشاہدہ نہیں کیا ہے، تو اس بنا پر انصاف سے کام لو۔ جو اتہامات تم ان پر باندھ رہے ہو وہ سب کے سب بے بنیاد ہیں۔

۸۔ "جنّة" جنون کے معنی میں اصل میں مادہ (جن) بروزن ظن سے ستر و پوشش کے معنی میں ہے، اور چونکہ مجنون کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ گویا اس کی عقل چھپی ہوئی ہے اور اس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ تعبیر اس کے بارے میں استعمال ہوتی ہے۔ بہرحال قابلِ ملاحظہ نکتہ یہاں یہ ہے کہ گویا وہ اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ سوچ بچار اور فکر کی بیداری کی دعوت دینے والا خود مجنون ہو۔ جبکہ وہ سوچ بچار اور تفکر کرنے کی منادی کر رہا ہے۔ اس کی یہی بات اس کی انتہائی عقل و درایت کی دلیل ہے۔

۹۔ "ان هو الا نذير لكم" کا جملہ پیغمبرؐ کی رسالت کو مسئلہ انذار میں خلاصہ کرتا ہے یعنی خدا کی دادگاہ میں جوابدہی اور اس کے عذاب سے ڈرانا، یہ ٹھیک ہے کہ پیغمبر بشارت کی رسالت بھی رکھتا ہے لیکن جو چیز انسان کو زیادہ سے زیادہ حرکت پر ابھارتی ہے وہ مسئلہ انذار ہے۔ اسی لیے قرآن کی بعض دوسری آیات میں بھی پیغمبر کی تنہا ذمہ داری کے طور پر ذکر ہوا ہے، مثلاً سورہ احقاف کی آیہ ۹ میں: (وما انا الا نذير مبين) "میں ایک واضح انذار کرنے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں" اسی معنی کی نظیر سورہ ص کی آیہ ۶۵ اور دوسری آیات میں بھی آئی ہے۔

۱۰۔ "بين يدى عذاب شديد" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت اس قدر نزدیک ہے کہ گویا تمہارے چہرے کے سامنے ہے، اور سچ مچ دنیا کی عمر کے مقابلہ میں وہ اسی طرح ہے، یہ تعبیر اسلامی روایات میں بھی آئی ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا:

"بعثت انا والساعة كهاتين" (وضم (ص) الوسطى والسبابة)۔ میری بعثت اور قیامِ قیامت ان دو کی طرح ہے۔ اس کے بعد آپ نے انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کو ایک دوسری سے ملا دیا[1]

چند نکات

۱۔ تمام انقلابات کی جڑ بنیاد

مادی اور کمیونسٹ مکاتبِ فکر کہ جو ہمیشہ سچے مذاہب کی طرف سے خطرہ محسوس کرتے رہتے ہیں، وہ ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ادیان کی دعوت اصل میں عوام الناس کے افکار کو بیکار کرنے

---

[1] تفسیر روح المعانی، ذیل آیہ زیرِ بحث جلد ۲۲ ص ۱۴۳۔

Marfat.com

کے مترادف ہے۔ ان کی یہ رسوا تعبیر کہ " دین عوام الناس کے لیے افیون ہے" مشہور و معروف ہے۔

اسی طرح شرق و غرب کے سامراجی اس خوف و ہراس کی وجہ سے جو وہ مومنین کے قیام اور ان کے افکارِ مذہبی اور راہِ خدا میں شہادت کو قبول کرنے کے ضمن میں رکھتے ہیں یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے ماہرینِ نفسیات اور اسکالرز کو اس مطلب کی تلقین کریں کہ وہ اپنی اپنی اصطلاح میں ــــ اپنی علمی کتابوں میں انہیں بیان کریں، کہ مذہب طبعی طور پر انسانی جہالت اور نادانی کی پیداوار ہے۔

البتہ یہ ایک وسیع بحث ہے، اور اپنی جگہ پر انہیں دو ٹوک اور دندان شکن جواب دیئے گئے ہیں، کہ ان سب کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ لیکن زیرِ بحث آیت کی مانند بہت سی آیات کہ جو غور و فکر اور سوچ بچار کی طرف دعوت دیتی ہیں ــ بلکہ دین کا نچوڑ اور انسان کی پیش رفت اور تکامل و ارتقاء کا سبب اسی غور و فکر کو جانتی ہیں۔ ان جھوٹ اور افتراء باندھنے والوں کا سارا پول کھول کر رکھ دیتی ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام جیسا دین و آئین بے حسی یا شل کر دینے کا ذریعہ یا جہالت کی پیداوار ہو۔ حالانکہ اس کا لانے والا اپنی بلند آواز کے ساتھ تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: سوئے ہوئے افکار کو بیدار کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہو اور قیام کرو۔ اور وہ بھی ایسے ماحول میں جو پُرسکون اور شور و غوغا سے خالی ہو۔

ایسے ماحول میں کہ جو ہوا و ہوس اور مسموم اور زہریلے پروپیگنڈے سے دور ہو۔

تعصبات سے دور ہو، جھگڑوں اور ہٹ دھرمیوں سے دور ہو۔

خدا کے لیے قیام کرو اور غور و فکر کرو۔

کہ میری طرف سے تمہیں یہی تنہا وعظ و نصیحت ہے۔ اور بس۔

کیا اس قسم کے دین کو کہ جو نہ صرف اس مقام پر بلکہ بہت سے دوسرے مقامات پر بھی اسی دعوت کو دہراتا ہے، افکار کو سُن کرنے والے اور نشہ آور کے ساتھ متہم کرنا مضحکہ خیز اور قہقہہ لگانے والی بات نہیں ہے؟!

خاص طور پر یہ بات کہ وہ کہتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ تم اکیلے تنہائی اور انفرادی طور پر غور و فکر کرو، بلکہ دو دو افراد کی شکل میں، اور ایک دوسرے سے تعاون اور معاونت کی صورت میں بھی غور و فکر کرنے میں مشغول رہو، انبیاءؑ کی دعوت کے مطالب و مفاہیم کو سنو، ان کے دلائل کا بغور مطالعہ کرو، اگر وہ تمہاری عقل کے ساتھ ہم آہنگ ہوں تو اسے قبول کر لو۔

ہمارے زمانہ میں شرق و غرب کی تباہ کن جہنمی طاقتوں اور قدرتوں کے مقابلہ میں جو حوادث، مختلف ممالک میں، انقلابی مسلمانوں کے قیام کی وجہ سے رونما ہوئے، انہوں نے متکبرین کی نگاہ میں دنیا کو تیرہ و تاریک کر کے رکھ دیا ہے۔ اور ان کی طاقت و قدرت کی بنیادوں کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ ان حوادث

Marfat.com

نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ وہ یعنی مستکبرین اچھی طرح سے اس نکتہ کو سمجھ چکے تھے کہ ان کے سخت ترین دشمن (مسلمان) کے اصل مذہبی عقائد ان کے لیے عظیم خطرہ ہیں، اور انہوں نے یہ بھی نشاندہی کر دی کہ ان اتہامات کا ہدف و مقصد کہ جو مذہب کے بارے میں کیے گئے ہیں کیا ہے؟

واقعاً عجیب بات ہے کہ مغربی فلسفی مردم شناسی کی اصطلاح کی تحلیلوں اور تجزیوں میں اس مسئلہ کو مسلّم سمجھتے ہیں کہ ماوراء طبیعت یعنی اس دنیا کے اوپر کوئی عالم نہیں ہے۔ اور دین نوع بشر کی ایک خود ساختہ چیز ہے، پھر اس مسئلہ کے بارے میں بحث کرتے ہیں کہ اس کا عامل کیا ہے؟ اقتصادی مسائل ہیں؟ انسانوں کا خوف ہے؟ بشر کی لاعلمی اور عدم آگاہی ہے؟ روحانی عقدے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ؟

لیکن وہ اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ایک لمحہ کے لیے ہی اس پہلے سے کیے ہوئے اپنے غلط فیصلہ سے خالی ہو کر فکر کریں کہ عالم طبیعت یعنی اس کائنات کے علاوہ ایک اور عالم ہے اور توحید کی روشن دلیلوں اور حضرت محمدؐ جیسے انبیاء کی نبوت کی آشکار اور واضح نشانیوں میں سوچ بچار سے کام لیں۔

یہ لوگ زمانۂ جاہلیت کے مشرکین سے ملتے جلتے ہیں اس فرق کے ساتھ کہ وہ تو متعصب اور ہٹ دھرم تھے اس صورت میں کہ وہ اَن پڑھ تھے، یہ متعصب اور ہٹ دھرم ہیں پڑھے لکھے ہونے کے باوجود، اسی بناء پر زیادہ خطرناک اور زیادہ گمراہ کن ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات کا آخری حصہ تفکر، تعقل اور تذکر کی دعوت ہے۔ کبھی کہتا ہے: "ان فی ذالك لاٰية لقوم يتفكرون" (نحل - ۱۱ - ۶۹)۔

اور کبھی کہتا ہے کہ: "ان فی ذالك لاٰيات لقوم يتفكرون" (رعد-۳ - زمر-۴۲ اور جاثیہ-۱۳)۔

اور کبھی کہتا ہے: "لعلهم يتفكرون" (حشر-۲۱، اعراف-۱۷۶)۔

اور کبھی اس جملہ کو دوبارہ خطاب کی صورت میں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "كذالك يبين الله لكم الاٰيات لعلكم تتفكرون"

"اس طرح سے خدا تمہارے لیے اپنی آیات کو بیان کرتا ہے، شاید کہ تم غور و فکر کرو۔"

(بقرہ - ۲۱۹ - ۲۶۶)۔

اسی طرح کے جملے قرآن میں بہت زیادہ ہیں، مثلاً قرآن کی بہت سی آیات میں "فقہ" (فہم) کی دعوت دی گئی ہے، عقل و تعقل کی دعوت اور ان افراد کی تعریف کی گئی ہے جو اپنی عقل کو استعمال کرتے ہیں، اور ان کی مذمت کہ جو اپنی فکر کو استعمال نہیں کرتے، یہ بات قرآن مجید کی ۴۶ آیات میں وارد ہوئی ہے۔

Marfat.com

علماء اور دانشمندوں اور علم و دانش کے مقام و مرتبہ کی اتنی زیادہ تعریف و توصیف کی ہے، کہ اگر ہم ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے ان کی تفسیر کریں تو وہ خود ایک مستقل کتاب بن جائے۔

اس سلسلہ میں بس اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن دوزخیوں کی صفات میں سے ایک صفت تفکر و تعقل نہ کرنے کو بیان کرتا ہے: "وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر" (دوزخی کہیں گے کہ اگر ہم سننے والے کان اور بیدار عقل رکھتے ہوتے تو دوزخیوں میں سے نہ ہوتے)۔ کیونکہ دوزخ میں صاحبانِ عقل کی جگہ نہیں ہے۔ (ملک - ۱۰)

اور ایک اور دوسری جگہ پر کہتا ہے: اصولی طور پر وہ لوگ کہ جو کان رکھتے ہیں لیکن سنتے نہیں، آنکھ رکھتے ہیں لیکن دیکھتے نہیں، اور عقل رکھتے ہیں لیکن سوچتے نہیں، وہ جہنم کے لیے نامزد ہو گئے ہیں۔

"ولقد ذرأنا لجهنم كثيرًا من الجن والانس لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم آذان لا يسمعون بها اولئك كالانعام بل هم اضل اولئك هم الغافلون"

"یقیناً جنوں اور انسانوں کے بہت سے گروہ جہنم کے لیے قرار دے دیئے ہیں۔ ان کی نشانی یہ ہے کہ وہ عقل رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ سوچتے نہیں، آنکھ رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں لیکن ان کے ساتھ سنتے نہیں، وہ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ، وہی تو اصل غافل ہیں" (اعراف - ۱۷۹)

۲- غور و فکر کے سلسلے میں روایاتِ اسلامی

روایاتِ اسلامی میں ــ قرآن کی پیروی کرتے ہوئے ــ غور و فکر کا مسئلہ اہمیت کے اعتبار سے درجہ اوّل میں قرار پاتا ہے، اور بہت ہی بلیغ اور پُرکشش تعبیرات اس سلسلہ میں دکھائی دیتی ہیں، کہ جن کے کچھ نمونے ہم یہاں پر پیش کرتے ہیں:

الف۔ غور و فکر کرنا عظیم ترین عبادت ہے۔

ایک حدیث میں امام علی بن موسٰی رضا علیہ السلام سے منقول ہے:

"لیس العبادة کثرة الصلاة والصوم انما العبادة التفکر فی امر الله عزوجل"

(عبادت نماز و روزہ کی کثرت میں نہیں ہے، عبادتِ واقعی تو خداوند تعالٰی کے کاموں اور جہانِ آفرینش کے کاموں میں غور و فکر کرنا ہے) [1]

---

[1] اصولِ کافی جلد ۲ کتاب "الکفر والایمان" باب "التفکر" (ص - ۴۵)۔

Marfat.com

ایک دوسری روایت میں یہ منقول ہوا ہے :

"کان اکثر عبادة ابی ذر التفکر"

(ابوذر کی زیادہ تر عبادت غور و فکر اور سوچ بچار کرنا تھا) [1]

ب۔ ایک ساعت غور و فکر کرنا ایک رات کی عبادت سے بہتر ہے۔

ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک شخص نے آپ سے سوال کیا کہ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ :

"تفکر ساعة خیر من قیام لیلة"

ایک ساعت غور و فکر کرنا ایک رات بھر عبادت کرنے سے بہتر ہے۔

اس سے کیا مراد ہے، اور غور و فکر کس طرح کرنا چاہیئے؟

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا :

"یمر بالخربة او بالدار فیقول این ساکنوك این بانوك مالك لاتتکلمین"

جب تُو کسی ویرانے کے پاس سے گزرتا ہے، یا کسی ایسے گھر کے پاس سے (کہ جو اپنے بسنے والوں سے خالی ہو) گزرتا ہے تو کہتا ہے، تجھ میں رہنے والے کہاں گئے؟ تیری بنیاد رکھنے والوں کا کیا ہوا؟ تُو بولتا کیوں نہیں؟ [2]

ج۔ غور و فکر سرچشمۂ عمل ہے۔

امیرالمؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

"ان التفکر یدعوا الی البر والعمل بہ"

"غور و فکر کرنا نیکی اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے" [3]

❖ ❖ ❖

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۳۸۳، مادہ فکر۔

[2] مدرک مذکورہ۔

[3] سفینۃ البحار، جلد ۲، ص ۳۸۳، مادہ فکر۔

Marfat.com

۴۷ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ
وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ○
۴۸ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ○
۴۹ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ ○
۵۰ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِیْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ
فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ○

ترجمہ

۴۷ کہہ دے کہ: جو اجر اور بدلہ میں نے تم سے مانگا ہے وہ خود تمہارے ہی لیے ہے میرا اجر تو صرف خدا پر ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

۴۸ کہہ دے کہ: میرا پروردگار حق کو (اپنے پیغمبروں کے دل پر) ڈالتا ہے۔ کیونکہ وہ علام الغیوب (اور تمام پوشیدہ اسرار سے واقف و آگاہ) ہے۔

۴۹ کہہ دے کہ: حق آگیا ہے اور باطل (سے کچھ نہیں ہوسکتا) نہ تو کسی چیز کا آغاز ہی کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کی تجدید۔

۵۰ کہہ دے کہ: اگر میں گمراہ ہوجاؤں تو میں خود اپنی طرف سے گمراہ ہوں گا اور اگر ہدایت یافتہ ہو جاؤں تو وہ اس وحی کے وسیلہ سے ہدایت حاصل کرتا ہوں کہ جو میرا پروردگار میری طرف کرتا ہے، وہ سننے والا اور نزدیک ہے۔

Marfat.com

تفسیر

باطل سے کوئی کام نہیں ہوتا

ہم بیان کر چکے ہیں کہ خدا آیات کے اس سلسلے میں پانچ مرتبہ اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ ان بے ایمان گمراہوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے بات کرو اور ہر طرف سے ان پر عذر کی راہ بند کردو۔

گزشتہ آیات میں تفکر کی دعوت کے بارے میں گفتگو تھی، اور پیغمبرؐ کی طرف سے ہر قسم کے روحانی عدم تعاون کی نفی تھی۔

پہلی زیر بحث آیت میں رسالت کے مقابلہ میں اجر اور مزدوری کے عدم مطالبہ کی گفتگو ہو رہی ہے۔

کہتا ہے: "کہہ دے کہ جو اجر و پاداش میں نے تم سے مانگا ہے وہ تمہارے ہی لیے ہے" (قل ما سألتکم من اجر فھو لکم)۔

"اور میرا اجر اور صلہ تو خدا ہی کے ذمہ ہے" (ان اجری الا علی اللہ)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عقلمند انسان جو کام بھی کرے اس کا کوئی نہ کوئی سبب اور محرک ہونا چاہیئے۔ تو جب میری عقل کا کامل ہونا تم پر ثابت ہو چکا ہے، اور تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ میں کوئی مادی سبب اور محرک نہیں رکھتا، تو تمہیں یہ جان لینا چاہیئے کہ خدائی اور معنوی محرک نے ہی مجھے اس کام پر آمادہ کیا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، میں نے تمہیں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے تو تم اب اچھی طرح سے سوچ لو، اور اپنے وجدان سے سوال کرو، کہ کونسی چیز اس بات کا سبب بنی ہے کہ میں تمہیں خدا کے سخت عذاب سے انذار کروں، اور ڈراؤں، اس کام سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ اور اس میں میرا کونسا مادی فائدہ ہے؟

اس کے علاوہ اگر اس مخالفت اور حق سے روگردانی کرنے میں تمہارا بہانہ یہ ہے کہ تمہیں اس کیلئے بے بہا قیمت ادا کرنی پڑے گی، تو میں نے اصولاً تم سے کوئی اجر اور صلہ مانگا ہی نہیں ہے۔

چنانچہ یہی معنی سورہ قلم کی آیہ ۴۶ میں بھی صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے: (ام تسئلھم اجرًا فھم من مغرم مثقلون) "کیا تو نے رسالت کی ادائیگی پر کوئی اجر اور صلہ ان سے مانگا ہے کہ جو ان کے کندھوں پر بوجھ بن گیا ہے"؟

اس بارے میں کہ (فھو لکم) کا جملہ کیا معنی رکھتا ہے، اس کے لیے دو تفاسیر موجود ہیں:

پہلی تفسیر تو یہ ہے کہ یہ مطلقاً ہر قسم کی اجرت کا مطالبہ نہ کرنے کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ: "جو کچھ ہم نے تجھ سے چاہا ہے خود تیرا ہی مال ہے" یہ اس بات کے لیے کنایہ ہے کہ میں نے تجھ سے

Marfat.com

کچھ بھی مطالبہ نہیں کیا، اس بات کا شاہد اس کے بعد والا جملہ ہے، کہ جس میں وہ کہتا ہے : (ان اجری الا علی اللہ) "میرا اجر اور صلہ تو صرف خدا پر ہے"۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اگر تم یہ دیکھتے ہو، کہ میں نے اپنی بعض باتوں میں، کہ جو میں پروردگار کی طرف سے لایا ہوں تم سے یہ کہا ہے کہ : (لا اسئلکم علیہ اجرًا الا المودة فی القربٰی) "میں تم سے کوئی صلہ اور اجر نہیں مانگتا سوائے اپنے اقربا کی دوستی کے"۔ (شوریٰ - ۲۳)

تو اس کا فائدہ بھی خود تمہاری طرف ہی لوٹتا ہے، چونکہ (مودت ذی القربیٰ) مسئلہ "امامت و ولایت" اور خطِ نبوت کے مسلسل جاری رہنے کی طرف بازگشت ہے کہ جو تمہاری ہدایت کے جاری رہنے کے لیے ضروری ہے۔

اس بات کی گواہ وہ شانِ نزول ہے کہ جو بعض مفسرین نے یہاں نقل کی ہے، کہ جس وقت آیہ : "قل لا اسئلکم علیہ اجرًا الا المودة فی القربیٰ" نازل ہوئی، تو پیغمبرؐ نے مشرکینِ مکہ سے فرمایا میرے اقربا اور اعزا کو اذیت نہ دو، تو انہوں نے بھی اس فرمائش کو قبول کر لیا، لیکن جس وقت پیغمبرؐ نے اُن کے بتوں کو بُرا بھلا کہا تو وہ کہنے لگے کہ محمدؐ ہم سے منصفانہ برتاؤ نہیں کرتا، ایک طرف تو ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہم اس کے اعزا و اقربا کو بھی اذیت نہ پہنچائیں لیکن دوسری طرف ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا کہہ کر ہمیں اذیت و آزار پہنچاتا ہے تو اس موقع پر آیہ " قل ما سألتکم من اجر فھو لکم " (زیر بحث آیت) نازل ہوئی، اور ان سے کہا کہ جو کچھ میں نے تم سے اس بارے میں سوال کیا ہے وہ تمہارے ہی نفع کیلئے ہے، اب تمہاری مرضی ہے کہ آزار و تکلیف پہنچاؤ یا نہ پہنچاؤ[1]

آیت کے آخر میں فرماتا ہے : "اور وہ ہر چیز پر شاہد و گواہ ہے" (وھو علیٰ کل شیء شھید)۔

اگر میں اپنا اجر اور صلہ اسی سے چاہتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ میرے تمام اعمال اور نیتوں سے آگاہ اور باخبر ہے۔

علاوہ ازیں وہ میری حقانیت کا گواہ ہے کیونکہ یہ تمام معجزات اور آیاتِ بینات اس نے میرے قبضہ اور اختیار میں دے رکھے ہیں، اور واقعاً سب سے زیادہ برتر و افضل گواہ خود وہ ہے، کیونکہ جو شخص حقائق کو سب سے بہتر طور پر جانتا ہے، اور وہ سب سے بہتر طور پر انہیں ادا کر سکتا ہے اور حق کے سوا کوئی چیز اس سے صادر نہیں ہوتی، تو وہی سب گواہوں سے بہتر گواہ ہے، اور وہ خدا ہے۔

٭ ٭ ٭

پیغمبرؐ کی حقانیت کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس پر توجہ کرتے ہوئے، بعد والی آیت میں کہتا

---

[1] تفسیر روح البیان، جلد ۷، ص ۳۰۸۔

Marfat.com

ہے: قرآن ایک ایسی حقیقت اور واقعیت ہے کہ جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ جو خدا کی طرف سے پیغمبرؐ کے دل پر القا، ہوا ہے۔ "کہہ دے کہ میرا پروردگار حق کو ڈالتا ہے، کہ جو علام الغیوب ہے اور تمام اسرارِ نہاں سے آگاہ ہے" (قل ان ربی یقذف بالحق علّام الغیوب)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "یقذف" "قذف" کے مادے سے (بروزن حذف) دور دراز کی جگہ پر پھینکنے یا دور کے راستے سے لڑھکانے کے معنی میں ہے، اس آیت کے لیے بہت سی تفسیریں لکھی گئی ہیں، کہ وہ سب کی سب آپس میں قابلِ جمع ہیں۔

پہلی تفسیر تو یہ ہے کہ "حق" کو پھینکنے سے مراد، کتب آسمانی اور وحی الٰہی کو انبیاء اور پروردگار کے بھیجے ہوؤں کے دلوں میں ڈالنا ہے۔ کیونکہ وہ علام الغیوب ہونے کے سبب آمادہ اور تیار دلوں کو پہچانتا ہے، اور ان کا انتخاب کر کے اپنی وحی کو ان میں ڈالتا ہے، تاکہ اس کی گہرائیوں میں نفوذ کرے۔

تو اس طرح یہ آیہ اُس مشہور حدیث:

"العلم نور یقذف اللّٰہ فی قلب من یشاء"

"علم ایک نور ہے کہ جسے خدا جس دل میں چاہتا ہے اور جسے لائق دیکھتا ہے ڈال دیتا ہے"۔ سے مشابہت رکھتی ہے۔

تعبیر "علّام الغیوب" اس معنی کی تائید کرتی ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد حق کو باطل پر پھینکنا اور حق کے ذریعہ باطل کی سرکوبی کرنا ہے۔ یعنی حق اس طرح کی قوت و طاقت رکھتا ہے، کہ جو اپنے راستے سے تمام رکاوٹوں کو دور کر دیتا ہے اور کسی شخص کو اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت اور قدرت نہیں ہے۔ تو اس طرح سے یہ مخالفین کے لیے ایک تہدید ہے، کہ وہ قرآن کے مقابلہ کے لیے کھڑے نہ ہوں اور وہ یہ جان لیں کہ قرآن کی حقانیت انہیں درہم برہم کر کے رکھ دے گی۔

اور اس صورت میں یہ اس مطلب کے مشابہ ہے کہ جو سورہ انبیاء کی آیہ ۱۸ میں بیان ہوا ہے: (بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق) "ہم حق کو باطل کے سر پر پھینکیں گے تاکہ وہ اس کو نابود اور ہلاک کر دے، اور باطل محو و نابود ہو جائے گا"۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہاں "قذف" کی تعبیر سے مراد قرآن کی حقانیت کا عالم کے دور و نزدیک کے نقاط میں نفوذ ہے، اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آخر کار یہ وحی آسمانی عالمگیر ہو جائے گی، اور ہر جگہ کو اپنے نور سے روشن و منور کر دے گی۔

❁ ❁ ❁

Marfat.com

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے : "کہہ دے کہ حق آگیا ہے، اور باطل سے اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ نہ تو وہ کوئی نیا کام انجام دے سکتا ہے، اور نہ ہی پرانے پروگرام کی تجدید کر سکتا ہے" (قل جاء الحق ومایبدئ الباطل ومایعید) [۱]

اور اس طرح سے حق کے مقابلہ میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا، نہ تو کوئی جدید نقش واثر ہوگا اور نہ ہی کوئی تکراری نقش و اثر ہوگا، کیونکہ اس کے تمام نقوش، نقش بر آب ہیں، اور ٹھیک اسی بنا پر وہ نورِ حق کی پردہ پوشی بھی نہیں کر سکتا اور اس کے اثر کو دلوں سے کم نہیں کر سکتا۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس آیت میں حق و باطل کو محدود مصادیق میں محصور کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ ان دونوں کا مفہوم وسیع وکشادہ ہے، قرآن، وحی خداوندی، تعلیماتِ اسلام، سب کے سب "حق" کے مفہوم میں جمع ہیں۔ جبکہ "شرک" وکفر، ضلالت وگمراہی، شیطانی وسوسے اور طاغوتی بدعتیں سب "باطل" کے معنی میں درج ہیں۔

اور حقیقت میں یہ آیت سورہ اسراء کی آیت ۸۱ کے مشابہ ہے کہ جس میں فرماتا ہے : " وقل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً " ۔ "کہہ دے کہ حق آگیا اور باطل چلا گیا، کیونکہ باطل تو جانے والا ہی ہے"۔

ایک روایت میں ابن مسعود سے اس طرح منقول ہے، کہ پیغمبرؐ مکہ میں وارد ہوئے، درآنحالیکہ خانہ خدا کے اطراف میں ۳۶۰ بُت تھے، آپ اس چھڑی کے ساتھ کہ جو آپ کے ہاتھ میں تھی ایک ایک بُت کو گراتے اور فرماتے جاتے تھے : " جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً ۔ جاء الحق ومایبدئ الباطل ومایعید " [۲]

سوال

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اوپر والی آیت یہ کہتی ہے، کہ حق کے ظہور کے ساتھ باطل رنگ باختہ ہو کر کلی طور پر کوئی نئی بات ایجاد کرنے سے باز آجاتا ہے، حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ باطل ابھی تک مصروفِ کار ہے اور بہت سے علاقوں کو اپنے زیرِ تسلط قرار دیئے ہوئے ہے؟

---

[۱] "یبدء" مادہ "ابداء" سے ابتدائی طور پر ایجاد کرنے کے معنی میں ہے اور "یعید"، "اعادہ" کے مادہ سے تکرار کے معنی میں ہے، باطل اس کا فاعل ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے : " مایبدء الباطل شیئا ومایعید شیئا " باطل نہ تو کسی چیز کی ابتداء کر سکتا ہے اور نہ ہی اعادہ "

[۲] تفسیر مجمع البیان، جلد ۸، ص ۳۹۷۔

Marfat.com

جواب

اس کے جواب میں اس نکتہ کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے کہ اولاً: تو حق کے ظاہر ہونے اور اس کے آشکار ہونے سے باطل یعنی شرک و کفر و نفاق اور جن جن کا وہ سرچشمہ ہے، بے رنگ ہو جاتے ہیں اور اگر وہ اپنی زندگی کو جاری بھی رکھیں تو وہ بھی زور و ظلم اور دباؤ کے طریقہ سے ہوگا۔ ورنہ اس کے چہرے سے نقاب ہٹ جائے گا اور اس کا مکروہ چہرہ حق کے متلاشیوں کے لیے آشکار ہو جائے گا' اور حق کے آنے' باطل کے محو ہو جانے سے یہی مراد ہے۔

ثانیاً: حق کی حکومت کے قیام، اور سارے عالم میں باطل کی حکومت کے زوال کے لیے، اُن امکانات و وسائل کے علاوہ کہ جو خدا نے بندوں کے اختیار میں دیئے ہیں، ایسے شرائط و حالات کا وجود بھی ان کی طرف سے ضروری ہے کہ جن میں سے اہم ترین چیز ان امکانات و وسائل سے استفادہ کے لیے مقدمات کی ترتیب دینا ہے۔

دوسرے لفظوں میں حق کی باطل پر کامیابی نہ صرف مکتبی، منطقی و ہدفی پہلوؤں میں ہے' بلکہ اجرائی پہلوؤں میں دو بنیادوں پر قرار پاتی ہیں، "فاعلیت فاعل" اور "قابلیت قابل" اور اگر قابلیتوں کے نہ ہونے کے باعث اجراء کے مرحلہ میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو تو حق کی عدم کامیابی کی دلیل نہیں ہے۔

مثال کے طور پر جیسا کہ قرآن کہتا ہے : "ادعونی استجب لکم" "مجھے پکارو تاکہ میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں" (مؤمن - ۶۰)۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ دعا کی قبولیت بے قید و شرط نہیں ہے، اگر اس کے شرائط حاصل ہو جائیں تو اس کی اجابت قطعی و یقینی ہے' ورنہ اس صورت کے علاوہ اجابت و قبولیت کی توقع نہیں ہونا چاہیئے۔ اس معنی کی تشریح سورہ بقرہ کی آیہ ۱۸۶ کے ذیل میں (جلد اول میں آچکی ہے)۔

یہ ٹھیک اس طرح ہے کہ ہم ایک حاذق اور ماہر طبیب و ڈاکٹر کو ایک مریض کے پاس لائیں' اور ہم کہیں کہ تیری نجات کے اسباب فراہم ہو گئے ہیں، اور جب ہم اس کی دوا بھی مہیا کر دیں، تو ہم کہتے ہیں کہ اب تیری مشکل حل ہو گئی۔ حالانکہ یہ سب چیزیں تو وہ ہیں کہ جو مقتضی تھیں، نہ کہ علت تامہ۔ بیمار کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوا سے استفادہ کرے اور طبیب کی شرائط پر کاربند ہو، اور وہ پرہیز کہ جو ضروری و لازمی ہیں ان کو نہ بھولے، تاکہ شفا کا حصول یقینی بن جائے۔ (غور کیجئے)

ٿ ٿ ٿ

اس کے بعد اس بنا پر کہ وہ یہ واضح کر دے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے خدا کی طرف سے ہے۔ اور ہر ہدایت خدا کی جانب سے ہے' اور وحی الٰہی میں ہرگز خطا کا گزر نہیں ہے۔ مزید کہتا ہے کہ: "کہہ دے کہ اگر میں گمراہ ہو جاؤں تو میں خود اپنی طرف سے گمراہ ہوں گا، اور اگر میں ہدایت پاؤں تو میں اُس

Marfat.com

چیز کے ذریعے سے کہ جو میرے پروردگار نے مجھے وحی کی ہے ہدایت پاؤں گا" (قل ان ضللت فانما اضل علیٰ نفسی و ان اھتدیت فیما یوحی الیّ ربی) [1]

یعنی میں بھی اگر اپنی حالت پر رہوں تو گمراہ ہو جاؤں گا، کیونکہ باطل کے انبوہ میں سے راہِ حق کو تلاش کرنا پروردگار کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور ہدایت کا وہ نور کہ جس میں گمراہی کا کوئی گزر نہیں ہے، اس کی وحی کا نور ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ عقل ایک پُر فروغ چراغ ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ انسان معصوم نہیں ہے اور اس چراغ کی شعاع ظلمت کے تمام پردوں کو نہیں چیر سکتی، پس آؤ اور تم بھی اس وحیِ الٰہی کے دامن میں ہاتھ ڈالو تاکہ وادیِ ظلمات سے نکل سکو، اور سرزمین نور میں قدم رکھو۔

بہر حال جہاں پیغمبر باوجود اپنے پورے علم و آگاہی کے خدا کی ہدایت کے بغیر کسی جگہ پر نہیں پہنچتا تو دوسروں کا معاملہ تو ظاہر اور روشن ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "وہ سننے والا اور نزدیک ہے" (انہ سمیع قریب)۔

کہیں یہ خیال نہ کر لینا کہ وہ ہماری اور تمہاری باتوں کو نہیں سنتا، یا سنتا تو ہے لیکن ہم سے دُور ہے' ایسا نہیں ہے، وہ سنتا بھی ہے، اور نزدیک بھی ہے، اس بنا پر ہماری گفتگوؤں اور خواہشات کا ایک ذرہ بھی اس سے مخفی نہیں رہ سکتا۔

---

[1] اس بارے میں کہ پہلے جملہ میں "علیٰ" کیوں لایا (علیٰ نفسی) اور دوسرے جملہ میں "با" (فبما یوحی الیّ ربی) بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ ان جملوں میں سے ہر ایک میں محذوف ہے کہ جو ایک دوسرے قرینہ کی وجہ سے حذف ہوا ہے اور اس کی تقدیر اس طرح تھی "ان ضللت فانما اضل نفسی و ان اھتدیت فانما اھتدی لنفسی بما یوحی الی ربی" اگر میں گمراہ ہو جاؤں تو میں خود سے گمراہ ہوا ہوں اور اگر میں ہدایت پاؤں تو میرے نفس نے اس چیز سے ہدایت حاصل کی ہے کہ جو میرے پروردگار نے میری طرف وحی کی ہے۔ (غور کیجئے)۔ تفسیر روح المعانی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

(۵۱) وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ
مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۙ
(۵۲) وَّقَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ
مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۚۖ
(۵۳) وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ
مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ
(۵۴) وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ
مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ۧ

ترجمہ

(۵۱) اگر تُو اُسوقت دیکھے جبکہ ان کی فریاد بلند ہو گی، لیکن وہ (عذابِ الٰہی کے پنجے سے) بھاگ نہ سکیں گے، اور وہ نزدیک کی جگہ (ایسی جگہ کہ جس کی انہیں امید تک نہ ہو گی) سے پکڑ لیے جائیں گے (تو تُو ان کی بے بسی پر تعجب کرے گا)۔

(۵۲) اور وہ (اس حالت میں) یہ کہیں گے کہ ہم ایمان لائے، لیکن وہ دُور کے فاصلے سے اس بات پر کیسے رسائی حاصل کر سکیں گے۔

(۵۳) وہ اس سے پہلے تو (جب کہ وہ انتہائی طور پر آزاد تھے) اس سے کافر ہو گئے تھے (اور اس کی طرف ناروا نسبتیں دیا کرتے تھے) اور دور ہی دور سے عالمِ غیب کے بارے میں اٹکل پچو باتیں بنایا کرتے تھے (اور اس کے لیے بغیر کسی غور و فکر

Marfat.com

کے فیصلے کیا کرتے تھے)۔

۵۴ (آخرکار) ان کے اور ان کی خواہشات، تمناؤں، آرزوؤں اور چاہتوں کے درمیان جدائی ڈال دی گئی، جیساکہ ان کے پیروکاروں (اور ہم مسلکوں) کے ساتھ اس سے پہلے کیا گیا تھا، کیونکہ وہ شک وشبہ میں مبتلا تھے۔

تفسیر

ان کے لیے راہِ فرار نہ ہوگی

زیرِ بحث آیات میں کہ جو "سورہ سبا" کی آخری آیات ہیں، ان مباحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو ہٹ دھرم مشرکین کے بارے میں گزشتہ آیات میں گزر چکی ہیں، دوبارہ پیغمبرؐ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے، اس گروہ کی حالت کو عذابِ الٰہی کے چنگل میں گرفتاری کے وقت مجسم کرتا ہے، کہ وہ (عذابِ الٰہی میں) گرفتار ہونے کے بعد کس طرح ایمان لانے کی فکر میں پڑیں گے لیکن ان کے ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ فرماتا ہے: "اگر تُو اس وقت دیکھے جبکہ ان کی فریاد بلند ہوگی، لیکن وہ بھاگ نہ سکیں گے اور عذابِ الٰہی کے چنگل سے نکل نہ سکیں گے، اور انہیں بالکل قریب سے ہی پکڑ لیں گے اور گرفتار کرلیں گے تو تُو ان کی بیچارگی اور بے بسی پر تعجب کرے گا" (ولو ترٰی اذ فزعوا فلا فوت واخذوا من مکان قریب)[1]

یہ بات کہ یہ نالہ وزاری اور فریاد و بے تابی کس زمانے سے تعلق رکھتی ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض اسے عذابِ دنیا یا موت کے وقت کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں، اور بعض اسے روزِ قیامت کے عذاب سے متعلق جانتے ہیں۔

لیکن زیرِ بحث آیتوں میں سے آخری آیت میں ایک ایسی تعبیر موجود ہے کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ آیات، سب کی سب دنیا ہی میں پہنچنے والے عذاب کے ساتھ، یا جان کنی کے لمحہ کے ساتھ مربوط ہیں۔ کیونکہ آخری آیت میں وہ یہ کہتا ہے کہ: "ان کے اور ان کی چہیتی چیزوں کے

---

[1] "ولو ترٰی" جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: "لرأیت امرًا عظیماً" یا "لعجبت من احوالھم" (تُو ایک امرِ عظیم دیکھتا۔ یا ان کے حالات پر تعجب کرتا)۔

Marfat.com

درمیان جدائی ڈال دی جائے گی" جیسا کہ اس سے پہلے کفار کے دوسرے گروہوں کے بارے میں یہی عمل انجام پایا ہے۔

یہ تعبیر روز قیامت کے عذاب کے ساتھ سازگار نہیں ہے کیونکہ اس دن تو سب کے سب ایک ہی جگہ حساب کے لیے جمع ہوں گے، جیسا کہ سورہ ہود کی آیہ ۱۰۳ میں بیان ہوا ہے کہ: " ذالك يوم مجموع له الناس وذالك يوم مشهود " " وہ ایسا دن ہے کہ جس میں تمام لوگ جمع ہوں گے، اور وہ ایسا دن ہے کہ جس کا سب مشاہدہ کریں گے"

اور سورہ واقعہ کی آیت ۴۹، ۵۰ میں یہ بیان ہوا ہے کہ: " قل ان الاولين والاٰخرين لمجموعون الٰى ميقات يوم معلوم " " کہہ دے کہ سب اولین و آخرین، روزِ معین کے وقت اکٹھے کیے جائیں گے"

اس بنا پر " اخذوا من مكان قريب " کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ یہ ستمگر اور بے ایمان لوگ نہ صرف یہ کہ وہ قدرتِ خدا کی حدود سے باہر نہ نکل سکیں گے بلکہ خدا انہیں ایسی جگہ سے گرفتار کرے گا کہ جو ان سے بہت ہی زیادہ قریب ہوگی۔

کیا فرعونی دریائے نیل کی لہروں میں کہ جو اُن کے لیے سرمایہ افتخار تھا، دفن نہیں ہوئے؟ اور کیا قارون اپنے ہی خزانوں کے درمیان زمین میں نہیں دھنسا؟ اور کیا قوم سبا، کہ جن کی داستان اسی سورہ میں بیان کی گئی ہے، نزدیک ترین مکان یعنی اسی عظیم سَد سے کہ جو اُن کی آبادی کا دل اور ان کی زندگی اور حرکت کا سرمایہ تھی۔ گرفتار نہیں ہوئے؟ اسی بنا پر خدا انہیں بھی نزدیک ترین جگہ سے ہی گرفتار کرے گا تاکہ وہ اس کی قدرت نمائی کو جان لیں۔

بہت سے ظالم بادشاہ اپنے نزدیک ترین افراد کے ذریعہ قتل ہوئے، اور نابود ہو گئے، اور بہت سے قدرتمند ستمگروں نے اپنے گھر کے اندر ہی آخری ضرب کھائی۔

اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بہت سی روایات میں کہ جو شیعہ اور اہلِ سنت کے وسیلوں سے نقل ہوئی ہیں، یہ آیت "سفیانی" کے خروج اور اُس کے لشکر (وہ گروہ کہ جو ابوسفیانی کے مکتب کے پیرو اور زمانہ جاہلیت کے پسماندگان ہیں، اور حق کے طرفداروں کے خلاف قیامِ مہدیؑ کی ابتدا میں خروج کریں گے) پر منطبق ہوئی ہے، کہ وہ مکہ کی تسخیر کے لیے اس کی طرف چلنے کے موقع پر صحرا میں گرفتارِ عذاب ہوں گے، اور زمین میں اس کے شگافتہ ہونے اور ان کے اس میں دھنس جانے کے سبب سے شدید زلزلہ اور لرزہ طاری ہوگا۔ تو یہ حقیقت میں (اخذوا من مكان قريب) کے ایک مصداق کا بیان ہے، کہ وہ اسی نقطہ سے کہ جو ان کے پاؤں کے نیچے ہے عذابِ الٰہی کے چنگل میں گرفتار ہوں گے۔

اس حدیث کا مضمون " ابنِ عباس "۔ " ابنِ مسعود "۔ " ابوہریرہ "۔ " ابوحذیفہ "۔ " ام سلمٰہ " اور حضرت عائشہ نے، اس کے مطابق کہ جو اہلِ سنت کی کتابوں میں آیا ہے، پیغمبر گرامی اسلام

Marfat.com

سے نقل کیا ہے [1]

اور بہت سے شیعہ مفسرین مثلاً "قمی" ۔ "مجمع البیان" ۔ "نور الثقلین" ۔ "صافی" نے اور اہلِ سنت کے مفسرین کی ایک جماعت مثلاً "روح المعانی" ۔ "روح البیان" اور "قرطبی" کے مؤلفین نے بھی اس کو زیرِ بحث آیات کے ذیل میں نقل کیا ہے ۔

مرحوم علامہ مجلسی نے متعدد روایات بحار الانوار میں امام محمد باقرؑ اور پیغمبر گرامی اسلامؐ سے اس سلسلہ میں نقل کی ہیں کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ زیرِ بحث آیات کے مصادیق میں سے ایک قیامِ مہدیؑ کے وقت "خروجِ سفیانی" کا مسئلہ ہے کہ جس کو خدا (اس کے لشکر سمیت) نزدیک ترین جگہ سے گرفتارِ عذاب اور نابود کردے گا [2]

جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ جو روایات آیات کی تفسیر میں وارد ہوتی ہیں وہ زیادہ تر واضح مصادیق کو بیان کرتی ہیں، اور وہ ہرگز آیات کے مفہوم کو محدود کرنے کی دلیل نہیں ہیں ۔

⁂

بعد والی آیت میں، ان کے عذابِ الٰہی کے چنگل میں گرفتار ہونے کے وقت ان کی حالت کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ کہیں گے کہ ہم اس (قرآن، اس کے لانے والے اور مبدأ و معاد) پر ایمان لائے" (وقالوا اٰمنا بہ) [3]

"لیکن وہ اس دور دراز کے فاصلہ سے اس پر کس طرح دسترس حاصل کرسکیں گے" (و انّٰی لھم التناوش من مکان بعید) ۔

ہاں! موت اور عذابِ استیصال کے آجانے پر بازگشت کے دروازے کلی طور پر بند ہوجاتے ہیں، اور انسان اور گزشتہ غلط کاریوں کی تلافی کے درمیان ایک محکم رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے، اسی بنا پر اس وقت ایمان کا اظہار کرنا ایسا ہوگا جیسا کہ یہ بات کسی دور دراز مقام سے انجام پائے جہاں ہاتھ نہ پہنچ سکتا ہو ۔

اصولی طور پر اس قسم کا ایمان — کہ جو اضطراری پہلو رکھتا ہو، اور اُس عذاب کے حد سے زیادہ خوف کی وجہ سے ہو، جسے وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کررہے ہوتے ہیں — کوئی وقعت نہیں رکھتا، لہٰذا قرآن

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۱۶ ص ۴۱۹ ۔

[2] بحار الانوار ۔ جلد ۵۲ ص ۱۸۵ سے بعد (باب علامات ظہور مہدی من السفیانی والدجال) ۔

[3] "بہ" کی ضمیر "حق" کی طرف لوٹتی ہے، کہ جو اس سے قریب ترین مرجع ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ آیات میں "حق" ۔ قرآن اور اس کے مضامین اور مبدأ و معاد اور پیغمبرِ اسلامؐ کے معنی میں ہے ۔

Marfat.com

کی دوسری آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ: "یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، اگر یہ پلٹ جائیں تو پھر انہیں پروگراموں پر عمل کرنے لگیں گے" (انعام ـ ۲۸)۔

"تناوش" مادہ "نوش" (بروزن خوف) کسی چیز کو پکڑنے کے معنی میں ہے اور بعض نے سہولت کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں لیا ہے، یعنی وہ ایسے دُور دراز کے ہدف تک آسانی کے ساتھ کیسے پہنچ سکتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

اس وقت جبکہ تمام چیزیں ختم ہوگئی ہیں وہ ایمان لاکر اپنی خطاؤں کی تلافی کیسے کرسکتے ہیں "حالانکہ وہ اس سے پہلے (جبکہ وہ انتہائی اختیار اور ارادہ کی آزادی کے مالک تھے)" اس سے کافر ہوگئے تھے" (وقد کفروا بہ من قبل)۔

وہ نہ صرف کافر ہی ہوئے تھے بلکہ پیغمبر اسلامؐ اور ان کی تعلیمات پر طرح طرح کی تہمتیں باندھتے تھے، اور عالم غیب ـ عالم ماوراء طبیعت، قیامت اور پیغمبرؐ کی نبوت ـ کے بارے میں ناروا فیصلے کیا کرتے تھے، اور دور دراز مقام سے اس کی طرف ناروا نسبتیں دیتے تھے۔ "ویقذفون بالغیب من مکان بعید"۔

"قذف" جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کسی چیز کو اٹھا کر پھینکنے کے معنی میں ہے۔ اور "غیب" عالم ماوراء حس کے معنی میں ہے، اور "مکان بعید" "دور کی جگہ" کے معنی میں ہے، اور مجموعی طور پر یہ ایک لطیف کنایہ ہے، ایسے شخص کے بارے میں کہ جو عالم ماوراء طبیعت کے لیے آگاہی و اطلاع کے بغیر فیصلہ کرے۔ جیسا کہ دور کی جگہ سے کسی چیز کو پھینکنا بہت ہی کم نشانہ پر لگتا ہے، اسی طرح ان کا یہ ظن و گمان اور فیصلہ بھی ہدف اور نشانہ پر نہیں لگتا۔

وہ کبھی تو پیغمبرؐ کو ساحر اور جادوگر کہتے تھے، کبھی "دیوانہ" کبھی "کذاب" (جھوٹا) کبھی قرآن کو انسانی فکر سے گھڑا ہوا کلام جانتے تھے اور کبھی جنت، جہنم اور قیامت کا کلی طور پر انکار کردیتے تھے، یہ تمام باتیں ایک قسم کا "غیب کے بارے میں اٹکل پچو باتیں بنانا" اور "تاریکی میں تیر پھینکنا"، اور "دور دراز کے مکان سے پھینکنا" "قذف من مکان بعید" تھا۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ: "آخرکار ان کے اور ان تمام چیزوں کے درمیان کہ جن سے وہ علاقہ و تعلق رکھتے تھے، موت کے ذریعہ جدائی ڈال دی جائے گی، جیسا کہ ان کے مانند و مشابہ گروہوں کے ساتھ اس سے پہلے عمل ہوا"۔ (وحیل بینھم و بین ما یشتھون کما فعل باشیاعھم من قبل)۔

Marfat.com

ایک ہی درد ناک لمحہ میں دیکھیں گے کہ ان کا تمام مال و دولت، تمام محلات اور مقام ومنصب اور ان کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں اُن سے جدا ہو رہی ہیں وہ لوگ کہ جو ایک ایک پیسے کے ساتھ (ایک ایک درہم و دینار سے) سختی کے ساتھ چمٹے ہوتے تھے، اور معمولی سے معمولی مادی وسائل واسباب سے بھی دل کو الگ نہیں کرتے تھے، ان کا اس لمحہ میں ـ کہ جس میں انہیں ایک ہی مرتبہ سب کو الوداع کہنا پڑے گا، آنکھیں بند ہو جائیں گی اور ایک تاریک اور وحشت ناک مستقبل کی طرف قدم اٹھا رہے ہوں گے ـ کیا حال ہوگا!

"حیل بینھم و بین مایشتھون" (ان کے اور ان تمام چیزوں کے درمیان کہ جن سے وہ علاقہ وتعلق رکھتے تھے جدائی ڈال دی جائے گی) کے جملہ کے لیے دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں:

پہلی تفسیر تو یہی ہے کہ جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ وہ چاہیں گے کہ ایمان لے آئیں، اور گزشتہ کی تلافی کریں، لیکن ان کے اور ان کی اس خواہش کے درمیان جدائی ڈال دی جائے گی۔

لیکن پہلی تفسیر "مایشتھون" والے جملے کے معنی کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔ علاوہ ازیں گزشتہ آیات میں "انّی لھم التناوش من مکان بعید" کے جملہ میں موت اور عذاب استیصال کے وقت ایمان پر ان کی دسترس نہ ہونے کا مسئلہ بیان ہوا تھا، لہٰذا اس کے تکرار کی ضرورت نہیں تھی۔

اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ بہت سے مفسرین نے ان آیات کو روزِ قیامت کے عذاب اور عرصہ محشر میں گنہگاروں کی ندامت سے متعلق جانا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آخری زیر بحث آیت میں "کما فعل باشیاعھم من قبل" کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے، یہ معنی مناسب نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد موت کا لمحہ، اور خدا کی طرف سے نابود کرنے والے عذاب کا مشاہدہ ہی ہے۔

٭ ٭ ٭

اور امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے، اور جان کنی کے لمحات اور دنیا کی نعمتوں سے جدائی کی اپنے نورانی کلمات میں بہت ہی واضح طریقہ سے تصویر کشی کی ہے:

"اجتمعت علیھم سکرۃ الموت، وحسرۃ الفوت، ففترت لھا اطرافھم و تغیرت لھا الوانھم!

ثم ازداد الموت فیھم ولوجًا، فحیل بین احدھم و بین منطقہ، و انہ لبین اھلہ ینظر ببصرہ ویسمع باذنہ .....!

یفکر فیم افنا عمرہ؟ وفیم اذھب دھرہ؟ ویتذکر اموالا جمعھا اغمض فی مطالبھا، واخذھا من مصرحاتھا و مشتبھاتھا .....!

فھو یعض یدہ ندامۃ علی ما اصحر لہ عند الموت من امرہ، ویزھد

Marfat.com

فیما کان یرغب فیہ ایام عمرہ، ویتمنی ان الذی کان یغبطہ بھا ویحسدہ علیھا قد حازھا دونہ !"

"سکرات موت، اور دنیا کی نعمتوں کو ہاتھ سے کھونے کی حسرتیں ان کے اوپر حملہ آور ہو جاتی ہیں، ان کے بدن کے اعضاء سست ہو جاتے ہیں اور ان کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے۔

اس کے بعد موت کا پنجہ ان کے اندر اور زیادہ نفوذ کرنے لگتا ہے۔ اس طرح سے کہ ان کی زبان کام کرنا بند کر دیتی ہے، اس حالت میں کہ وہ اپنے گھر والوں کے درمیان پڑا ہوا ہوتا ہے، آنکھ سے دیکھ رہا ہوتا ہے، اور کان سے سُن رہا ہوتا ہے، (لیکن اس میں بات کرنے کی طاقت باقی نہیں رہتی)۔

وہ یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ اس نے اپنی عمر کو کس راہ میں تباہ کر دیا؟ اپنی زندگی کا وقت کس راہ میں گزارا؟ اس مال و دولت کو یاد کرتا ہے کہ جسے حلال و حرام کی طرف توجہ کیے بغیر جمع کیا تھا، اور اس کے حصول کے طریقے کے بارے میں کبھی بھی نہ سوچا تھا۔

انگشتِ حسرت منہ میں رکھتا ہے، اور اپنا ہاتھ پشیمانی سے کاٹتا ہے کیونکہ موت کے وقت وہ مسائل اس پر روشن ہو جاتے ہیں کہ جو اس وقت تک مخفی و پوشیدہ تھے، وہ اس حالت میں ان تمام چیزوں سے کہ جن کے ساتھ وہ زندگی کے ایام میں شدت سے علاقہ اور لگاؤ رکھتا تھا بے اعتنار ہو جائے گا۔ اور یہ آرزو کرے گا کہ اے کاش! وہ لوگ کہ جو اس کی ثروت اور مال و دولت پر رشک اور حسد کیا کرتے تھے یہ مال اس کی بجائے ان کے قبضہ میں ہوتا"[1]

آخر میں آخری زیر بحث آیت کے آخری جملہ میں کہتا ہے کہ:

"ان سب مسائل کا سبب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ شک و شبہ کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے، لہٰذا طبعاً اس قسم کا انجام ان کے انتظار میں تھا" (انھم کانوا فی شک مریب)۔

پروردگارا! ہمیں ان لوگوں سے قرار دے کہ جو اوقات کے ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے بیدار ہو جاتے ہیں، اور جو کچھ ان سے فوت ہو چکا ہے اس کی

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۱۰۹۔

Marfat.com

تلافی کرتے ہیں۔

بار الٰہا! دنیا کا جال بڑا سخت ہے اور دشمن طاقت ور اور قوی ہے۔ اگر تیرا لطف و کرم شامل حال نہ ہو اور ہماری مدد نہ کرے تو ہمارا حال خراب ہے۔

خداوندا! ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے کہ جو نعمتوں کے ملنے کے وقت ان کا شکر ادا کرتے ہیں، اور مغرور و غافل نہیں ہوتے، اور مصیبتوں کے نازل ہونے کے وقت آہ و زاری نہیں کرتے، بلکہ عبرت حاصل کرتے ہیں۔

سورہ سبا کا اختتام

اول اسفند یار ۱۳۶۲ مطابق ۱۷/ج ۱/۱۴۰۴ھ

Marfat.com

سورۂ فاطر

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۴۵ آیات ہیں

شروع : ۱۸/ج ۱/۱۴۰۴ھ
۲/اسفندیار/۱۳۶۲

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ فاطر کے مضامین

یہ سورہ کہ جسے کبھی سورہ فاطر اور کبھی سورۂ ملائکہ کا نام دیتے ہیں (اس کے آغاز کو مدّ نظر رکھتے ہوئے کہ جو "فاطر" اور "ملائکہ" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے) مکّی سورتوں میں سے ہے، اگرچہ بعض نے اس کی دو آیات کا استثناء کیا ہے اور انہیں مدنی شمار کیا ہے (آیہ ۲۹-۳۲) لیکن اس کے استثناء کی واضح دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔

چونکہ یہ سورہ مکی ہے لہٰذا مکی سورتوں کے عام مضامین یعنی "مبدا" و "معاد" "شرک کے ساتھ مبارزہ"، "رسالتِ انبیاء کی دعوت"، "پروردگار کی نعمتوں کا تذکرہ" اور "روزِ جزاء میں مجرموں کا انجام" اس میں پورے طور پر منعکس ہیں۔

اس سورہ کی آیات کو پانچ حصّوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

۱- اس سورہ کی آیات کا ایک اہم حصہ عالمِ ہستی میں خدا کی عظمت کی نشانیوں اور توحید کے دلائل کے سلسلہ میں گفتگو کرتا ہے۔

۲- اس کا دوسرا حصّہ پروردگار کی ربوبیت اور سارے جہان کے لیے اور خصوصاً انسان کے بارے میں اس کی تدبیر، اس کی خالقیت و رازقیت اور مٹی سے انسان کی خلقت اور اس کے تکامل و ارتقاء سے بحث کرتا ہے۔

۳- اس کا تیسرا حصّہ معاد اور آخرت میں نتائجِ اعمال اور اس جہان میں خدا کی رحمت کی وسعت اور مستکبرین کے بارے میں اس کی تخلف ناپذیر سنت سے متعلق ہے۔

۴- اس کی آیات کا ایک حصّہ انبیاء کی رہبری اور ہٹ دھرم اور سخت قسم کے دشمنوں کے ساتھ مسلسل اور متواتر مبارزہ اور اس سلسلے میں پیغمبرِ اسلامؐ کی دلداری اور تسلی کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہے۔

۵- آخری حصّہ میں خدائی مواعظ اور پند و نصائح کا بیان ہے، یہ بیان مختلف امور کے بارے میں گزشتہ مباحث کی تکمیل کرتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس ساری سورت کو ایک ہی حلقہ میں خلاصہ کیا ہے اور وہ خدا کی قاہریت کا مسئلہ ہے[1]
یہ بات اگرچہ اس سورہ کی کچھ قابلِ توجہ آیات کے ایک حصّہ کو مدّنظر رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتی ہے

---

[1] تفسیر فی ظلال، آغاز سورہ فاطر۔

Marfat.com

لیکن اس کے باوجود اس سورہ میں دوسری مختلف بحثوں کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس سورہ کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

"من قرأ سورة الملائكة دعته يوم القيامة ثلاثة ابواب من الجنّة ان ادخل من اى الابواب شئت"

"جو شخص سورہَ فاطر کو پڑھے تو قیامت کے دن جنت کے دروازوں میں سے تین دروازے اسے اپنی طرف دعوت دیں گے کہ وہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے"[1]

"اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ جنت کے دروازے وہی عقائد اور اعمالِ صالحہ ہیں کہ جو بہشت میں داخل ہونے کا سبب بنتے ہیں، جیسا کہ بعض روایات میں باب المجاہدین کے عنوان سے ذکر ہوا ہے، ممکن ہے کہ یہ روایت توحید، معاد اور رسالتِ پیغمبر کے اعتقاد کے تین دروازوں کی طرف اشارہ ہو"

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

"قرآن مجید میں دو سورتیں (یکے بعد دیگرے قرار پائی ہیں) سورہ سبا و سورہ فاطر کہ جو "الحمد للہ" سے شروع ہوتی ہیں، جو شخص انہیں رات کو پڑھے گا تو خدا اسے اپنی حمایت کے سائے میں حفاظت کرے گا، اور جو شخص دن میں پڑھے گا تو اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، اور خدا اسے اس قدر خیرِ دنیا و آخرت عطا فرمائے گا کہ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا ہو گا، اور کسی نے اس کی تمنا تک نہ کی ہو گی"[2]

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ قرآن عملی پروگرام ہے اور اس کی تلاوت کرنا تفکر اور ایمان کا مقدمہ اور تمہید ہے، اور وہ اس کے معنی و مفہوم پر عمل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، اور یہ سب اجر اور صلے بھی اسی کی بنا پر ہیں اور انہیں شرائط کے ساتھ حقیقت بنتے ہیں۔ (غور کیجئے)

---

[1] مجمع البیان، آغاز سورہ فاطر۔

[2] ثواب الاعمال مطابق نقل تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۴۵۔

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

(۱) اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِکَۃِ
رُسُلًا اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ مَّثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ یَزِیۡدُ فِی
الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ○

(۲) مَا یَفۡتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنۡ رَّحۡمَۃٍ فَلَا مُمۡسِکَ لَہَا ۚ
وَ مَا یُمۡسِکۡ ۙ فَلَا مُرۡسِلَ لَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ وَ ہُوَ
الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ○

(۳) یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ ؕ
ہَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَیۡرُ اللّٰہِ یَرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ
لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۫ۖ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے۔

(۱) حمد و ثنا مخصوص اس خدا کے لیے ہے کہ جو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، وہی خدا کہ جس نے فرشتوں کو رسول قرار دیا ہے کہ جو دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے ہیں، وہ جتنا چاہتا ہے آفرینش میں اضافہ کر دیتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۲) خدا جس رحمت کو لوگوں پر کھول دے اُسے کوئی نہیں روک سکتا، اور خدا جس

Marfat.com

کو روک لے اس کے سوا کوئی شخص اس کے بھیجنے پر قدرت نہیں رکھتا، اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

(۳) اے لوگو! تم اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو، کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق ہے کہ جو آسمان و زمین سے تمہیں روزی دے؟ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اس حالت میں تم باطل کی طرف کس طرح منحرف ہوتے ہو۔

تفسیر

بند دروازوں کا کھولنے والا وہی ہے

اس سورہ کی ابتدا سورۂ "حمد" و "سبا" اور "کہف" کی طرح پروردگار کی حمد سے ہوتی ہے اس کی حمد و ثنا وسیع عالم ہستی کی خلقت و آفرینش کی بنا پر فرماتا ہے: "حمد مخصوص ہے اس خدا کے ساتھ کہ جو آسمان اور زمین کا خالق ہے" اور عالم ہستی کی تمام نعمات و مواہب کا سرچشمہ اسی کا وجود ذیجود ہے (الحمد للّٰہ فاطر السّماوات والارض)۔

"فاطر" فطور کے مادہ سے اصل میں شگافتہ کرنے کے معنی میں ہے اور چونکہ موجودات کی آفرینش ظلمت عدم کے شگافتہ ہونے اور نور ہستی کے باہر آنے کی مانند ہے اس لیے یہ تعبیر خلقت و آفرینش کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ خصوصاً جدید علوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو یہ کہتے ہیں کہ عالم ہستی کا مجموعہ ابتدا میں ایک ہی ٹکڑا تھا کہ جو بتدریج شگافتہ ہوا اور اس سے مختلف حصے جدا ہوئے، خدا کی ذات پاک کے لیے لفظ "فاطر" کا اطلاق اپنے اندر زیادہ واضح اور روشن مفہوم رکھتا ہے۔[1]

ہاں! ہم اس کی خالقیت کی بنا پر اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں، کیونکہ جو کچھ بھی ہے اسی کی طرف سے ہے اور کوئی شخص اس کے علاوہ اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتا۔

اور چونکہ اس عالم کی تدبیر — اس بنا پر کہ یہ عالم، عالم اسباب ہے — پروردگار کی طرف سے فرشتوں کے ذمہ لگائی ہے، لہٰذا بلا فاصلہ ان کی خلقت اور ان کی عظیم قدرتوں کے متعلق کہ جو پروردگار عالم

---

[1] "فاطر" اور "فطور" کے معنی کے بارے میں دسویں جلد — (سورہ ابراہیم) کی آیہ ۱۰ کے ذیل میں، اور اسی طرح پانچویں جلد — (سورہ انعام کی آیہ ۱۴ کے ضمن میں بھی) ہم نے بیان کیا ہے۔

Marfat.com

نے انہیں عطا کی ہیں گفتگو کرتا ہے: "وہی خدا کہ جس نے فرشتوں کو رسول قرار دیا ہے وہ دو دو، تین تین اور چار چار پروں کے حامل ہیں" (جاعل الملائکة رسلاً اولی اجنحة مثنیٰ وثلاث ورباع)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خدا جتنا چاہتا ہے خلقت میں اضافہ کر دیتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے" (یزید فی الخلق مایشاء ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر)۔

یہاں تین سوال پیدا ہوتے ہیں:

پہلا سوال یہ ہے کہ ملائکہ اور فرشتوں کی رسالت کہ جو اوپر والی آیت میں بیان کی گئی ہے، کس چیز میں ہے؟ کیا یہ رسالت تشریعی ہے؟ یعنی خدا کی طرف سے انبیاء کی طرف اس کے پیغام کا لانا ہے یا یہ رسالت تکوینی ہے؟ یعنی عالم آفرینش میں مختلف فرائض کی ذمہ داری کا سپرد ہونا، جیسا کہ نکات کی بحث میں اس کی طرف اشارہ ہوگا۔ یا یہ دونوں جہت ہیں؟

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گزشتہ جملے میں آسمان اور زمین کی خلقت کے بارے میں گفتگو تھی، اور زیر بحث جملے میں فرشتوں کے متعدد پروں کے متعلق گفتگو ہے، کہ جو اُن کی قدرت کی نشاندہی کرتا ہے اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے بھی کہ تمام فرشتوں کے لیے رسالت کا بیان ہوا ہے۔

(یہ بات قابل توجہ ہے کہ "الملائکہ" ایسی جمع ہے کہ جس کے ساتھ "الف و لام" آیا ہے لہٰذا یہ عموم کا معنی دیتا ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "رسالت" ایک وسیع و عریض معنی میں استعمال ہوا ہے کہ جو "رسالت تشریعی" اور "رسالتِ تکوینی" دونوں کو شامل ہے۔

رسالت کا اطلاق "تشریعی رسالت" پر اور انبیاء کی طرف وحی کے پیغام لانے پر، قرآن میں بہت زیادہ بیان ہوا ہے لیکن اس کا اطلاق "رسالتِ تکوینی" پر بھی کم نہیں ہے۔

سورہ یونس کی آیہ ۲۱ میں بیان ہوا ہے کہ: "ان رسلنا یکتبون ما تمکرون" "ہمارے رسول (ہمارے فرشتے) تمہارے مکر و فریب کو لکھتے رہتے ہیں۔"

اور سورۂ انعام کی آیہ ۶۱ میں بیان ہوا ہے کہ: "حتی اذا جاء احدکم الموت توفته رسلنا" (جس وقت تم میں سے کسی کی موت کا وقت آن پہنچتا ہے تو ہمارے رسول اس کی روح قبض کرتے ہیں)۔

سورۂ عنکبوت کی آیہ ۳۱ میں ان فرشتوں کے بارے میں کہ جو قوم لوط کی سرزمین کو زیر و زبر (تہ و بالا) کرنے پر معمور تھے یہ بیان ہوا ہے کہ: "ولما جاءت رسلنا ابراهیم بالبشری قالوا انا مهلکوا اهل هذه القریة ان اهلها کانوا ظالمین" (جس وقت ہمارے رسول ابراہیم کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ ہم اس آبادی میں رہنے والوں کو ہلاک کر دیں گے، کیونکہ وہ ستمگر لوگ ہیں)۔

قرآن کی دوسری آیات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ فرشتوں کے ذمہ جو مختلف کام لگائے گئے ہیں وہ

Marfat.com

ان کی رسالتیں شمار ہوتے ہیں، اس بنا پر رسالت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ فرشتوں کے پروں سے مراد، اور وہ بھی دو دو، تین تین اور چار چار، کیا ہے؟

بعید نہیں ہے کہ پر و بال سے مراد یہاں قدرت اور حرکت کی توانائی ہو کہ جس سے بعض دوسروں کی نسبت برتر اور بیشتر رکھتے ہوں۔

لہٰذا وہ بال و پر میں ان کے لیے سلسلۂ مراتب کا قائل ہوا ہے کہ بعض چار بال (مثنیٰ۔ دو دو) اور بعض چھ بال اور بعض آٹھ بال رکھتے ہیں۔

"اجنحۃ" "جناح" (بروزن جمال) کی جمع ہے، جو پرندوں کے پروں کے معنی میں ہے کہ جو انسان کے ہاتھوں کی طرح ہیں، اور چونکہ پر پرندوں کی نقل و انتقال اور ان کی حرکت و فعالیت کا ذریعہ ہوتے ہیں لہٰذا کبھی یہ لفظ فارسی یا عربی میں حرکت و اعمال کے وسیلہ اور قدرت و توانائی کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے بال و پر جل گئے، جو اس بات کا کنایہ ہے کہ اس سے حرکت و توانائی کی قوت سلب ہوگئی ہے، یا یہ کہ اُس نے فلاں شخص کو اپنے پر و بال کے نیچے لے لیا، یا یہ کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ علم و عمل کے دو پروں کے ساتھ پرواز کرے' اور اس قسم کی تمام تعبیرات کہ جو سب کی سب اس لفظ کے کنائی معنوں کو بیان کرتی ہیں۔

اور دوسرے موارد میں بھی کچھ تعبیرات، مثلاً: "عرش"۔ "کرسی"۔ اور "لوح" و "قلم" ایسی نظر آتی ہیں کہ جن میں عام طور پر ان کے معنوی مفہوم کی طرف ہی توجہ ہے نہ کہ ان کے مادی جسم کی طرف۔

البتہ قرینہ کے بغیر قرآن کے الفاظ کو ظاہری معنی کے غیر پر حمل نہیں کرنا چاہیئے لیکن جہاں واضح قرائن پائے جاتے ہوں وہاں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جبرائیل (وحیٔ خدا پہنچانے والا) کے چھ سو پر ہیں اور جس وقت اس حالت میں پیغمبر اسلامؐ سے ملاقات کی تو زمین و آسمان کے درمیانی فاصلہ کو پُر کر رکھا تھا[1]

یا یہ کہ "خدا کا ایک فرشتہ ہے کہ جس کے کان کی لَو سے آنکھ تک کا فاصلہ پانچ سو سال کی راہ ہے (تیز پرواز) پرندے کے ذریعہ"[2]

یا یہ کہ، نہج البلاغہ میں جس وقت پروردگار کے فرشتوں کی عظمت کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے تو فرماتے ہیں کہ:

"ومنهم الثابتة فی الارضین السفلی اقدامهم، والمارقة من

---

[1] و [2] تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۴۹۔

Marfat.com

السماء العليا اعناقهم، والخارجة من الاقطار اركانهم، والمناسبة لقوائم العرش اكتافهم"

"بعض فرشتے اس قسم کی عظمت رکھتے ہیں کہ ان کے پاؤں تو زمین کے نچلے طبقات میں قائم ہیں اور ان کی گردن آسمانِ بریں سے برتر ہے' ان کے وجود کے ارکان اقطار عالم سے باہر نکلے ہوتے ہیں اور ان کے کندھے عرشِ پروردگار کو اٹھانے کے لیے متناسب ہیں [1]

یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کی تعبیرات کو مادی جسمانی پہلوؤں پر حمل نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ ان کی معنوی عظمت اور جہاتِ قدرت کو بیان کرنے والی تعبیرات ہیں۔

اصولی طور پر ہم جانتے ہیں کہ پَر صرف زمین کی فضا میں اڑنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں' کیونکہ کرۂ زمین کے اطراف کو دباؤ ڈالنے والی ہَوا نے گھیر رکھا ہے، اور پرندے اپنے پَروں کے ذریعہ امواجِ ہَوا پر قرار پاتے ہیں، اور نیچے اوپر آجا سکتے ہیں، لیکن اگر زمین کی فضا کے محیط سے خارج ہو جائیں کہ جس میں ہَوا نہیں ہے، تو وہاں پر پَر و بال اڑنے کے لیے معمولی سے معمولی تاثیر بھی نہیں رکھتے' اور اس لحاظ سے وہ ٹھیک دوسرے اعضاء کے مانند ہوتے ہیں۔

اس سے قطع نظر وہ فرشتہ کہ جس کے پاؤں زمین کی گہرائیوں میں ثبت ہیں اور اس کا سر برترین آسمان سے بالاتر ہے تو اُسے جسمانی پرواز کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اس بارے میں بحث کہ فرشتہ جسم لطیف ہے یا مجردات میں سے ہے ایک دوسری بحث ہے کہ جس کی طرف انشاء اللہ نکات کی بحث میں اشارہ ہوگا۔

یہاں پر صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ہم جان لیں کہ پَر و بال فعالیت اور حرکت و قدرت کا ذریعہ ہیں۔ اور اس مقصد کو ثابت کرنے کے لیے اوپر والے قرائن کافی گویا ہیں، جیسا کہ عرش و کرسی کی بحث میں ہم نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ اگرچہ "بلند پائے والے" اور "چھوٹے پائے والے" تختوں کے معنی میں ہے، لیکن مسلمہ طور پر اس سے مراد عالم کے مختلف جہات میں پروردگار کی قدرت ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"الملائكة لا يأكلون ولا يشربون ولا ينكحون، وانما يعيشون بنسيم العرش"

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۔

Marfat.com

"فرشتے نہ تو کھانا کھاتے ہیں اور نہ پانی پیتے ہیں اور نہ ہی شادی بیاہ کرتے ہیں، وہ صرف نسیم عرش سے زندہ ہیں"۔ [۱] [۲]

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا "یزید فی الخلق مایشاء" "وہ خلقت میں جتنا چاہتا ہے اضافہ کردیتا ہے" فرشتوں کے پَروبال کے اضافہ کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے، یا یہ وسیع معنی رکھتا ہے، کہ جو اس کو بھی شامل ہے اور باقی افزائشوں کو بھی کہ جو آفرینش موجودات میں صورت پذیر ہوتے ہیں۔

ایک طرف تو جملہ کا مطلق ہونا، اور دوسری طرف بعض ایسی اسلامی روایات کہ جو اوپر والی آیات کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔

اُن میں سے ایک حدیث میں پیغمبرِ گرامی اسلامؐ سے منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے اس جملہ کی تفسیر میں فرمایا کہ:

"ھو الوجہ الحسن، والصوت الحسن، والشعر الحسن"

"اس سے مراد خوبصورت چہرہ، اچھی آواز اور خوبصورت بال ہیں"۔ [۳]

ایک اور حدیث میں پیغمبرِ اکرمؐ سے منقول ہے کہ:

"حسنوا القراٰن باصواتکم فان الصوت الحسن یزید القراٰن حسنا، وقرأ یزید فی الخلق مایشاء"

"قرآن کو خوبصورت آواز کے ساتھ زینت بخشو، کیونکہ اچھی آواز قرآن کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے، پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی" "یزید فی الخلق مایشاء"

ٌ ٌ ٌ

پروردگار کی خالقیت اور فرشتوں کی رسالت کا بیان کرنے کے بعد کہ جو فیضِ خدا کا واسطہ ہیں، اپنی رحمت کو بیان فرما رہا ہے کہ جو تمام عالمِ ہستی کی بنیاد ہے، فرماتا ہے کہ: "خدا جس رحمت کو لوگوں کے لیے کھول دے اُسے کوئی نہیں روک سکتا" (ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لھا)۔

---

[۱] تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل نورالثقلین جلد ۴ ص ۳۴۹۔

[۲] عرش کے معنی کے بارے میں ہم نے چھٹی جلد ص .... (سورۂ اعراف ذیل آیہ ۵۴) کے ذیل میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

[۳] مجمع البیان زیرِ بحث آیات کے ذیل میں، قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس حدیث کو زیرِ بحث آیت کے ذیل میں پیش کیا ہے۔

Marfat.com

"اور جسے روک لے اس کے سوا کوئی شخص اس کے بھیجنے پر قدرت نہیں رکھتا" (وما یمسك فلا مرسل له من بعده)۔
"کیونکہ وہ ایسا قدرت والا ہے کہ جو شکست ناپذیر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ حکیم و آگاہ ہے"۔ (وهو العزيز الحكيم)۔
خلاصہ یہ ہے کہ رحمت کے تمام خزانے اس کے پاس ہیں، اور جس کو وہ لائق سمجھتا ہے اس کو مشمولِ رحمت کرلیتا ہے، اور جہاں اس کی حکمت کا تقاضا ہو اس کے دروازے کھول دیتا ہے، اگر تمام جہانوں کے لوگ مل کر یہ چاہیں کہ اس دروازے کو کہ جسے اس نے کھولا ہے بند کر دیں یا جس دروازے کو اس نے بند کیا ہے اُسے کھول دیں تو ان میں ہرگز یہ قدرت نہیں ہوگی، یہ حقیقت میں توحید کی ایک شاخ ہے کہ جو دوسری شاخوں کی بنیاد ہے۔ (غور کیجئے)
اس معنی کے مشابہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں بھی بیان ہوا ہے، جہاں کہتا ہے کہ: " وان يمسسك الله بضر فلا كاشف له الا هو وان يردك بخير فلا رادّ لفضله يصيب به من يشاء من عباده وهو الغفور الرحيم " "اگر خدا (امتحان یا غلطی کی سزا کے لیے) تجھے کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی بھی اسے برطرف نہیں کرسکتا، اور اگر وہ تیرے لیے کسی خیر اور بھلائی کا ارادہ کرے تو کوئی شخص اس کے فضل سے مانع نہیں ہوگا، وہ اپنے بندوں میں سے جس شخص کو چاہے اپنا فضل پہنچاتا ہے، اور وہ غفور و رحیم ہے"۔ (یونس - ۱۰۷)

چند توجہ طلب امور

۱- "یفتح" کی تعبیر "فتح" کے مادہ سے کھولنے کے معنی میں ہے، یہ رحمتِ الٰہی کے خزانوں کے وجود کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، توجہ طلب بات یہ ہے کہ یہ خزانے ایسے ہیں کہ جو کھلنے کے ساتھ ہی مخلوقات پر جاری ہو جاتے ہیں اور کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور کوئی شخص اس سے مانع نہیں ہو سکتا۔
رحمت کے کھولنے کو اس کے امساک اور روکنے پر مقدم رکھنا اس بنا پر ہے کہ ہمیشہ خدا کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔
۲- "رحمت" کی تعبیر بہت ہی وسیع اور کشادہ معنی رکھتی ہے کہ جو عالم کے مواہب اور نعمات کو شامل ہے، کبھی معنوی پہلو رکھتی ہے اور کبھی مادی پہلو، اسی بنا پر جب کبھی کوئی انسان تمام ظاہری دروازوں کو اپنے سامنے بند دیکھتا ہے تو پھر بھی وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ رحمتِ الٰہی اس کے دل و جان میں جاری و ساری ہے۔ لہٰذا وہ خوش و خرم اور آرام و مطمئن ہے، اگرچہ وہ زندان کی کال کوٹھری

Marfat.com

میں گرفتار رہو۔

اس کے برعکس کبھی تمام ظاہری دروازوں کو انسان اپنے اوپر کھلا ہوا دیکھتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے رحمتِ الٰہی کے دروازے اس کی جان پر بند ہو گئے ہیں، لہٰذا وہ اپنے آپ کو اس طرح تنگی اور دباؤ میں محسوس کرتا ہے کہ جیسے دنیا اپنی پوری وسعت کے باوجود اس کے لیے ایک تاریک اور وحشت ناک زندان ہے، اور یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو بہت سے لوگوں کے لیے حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔

۳۔ دو اوصاف "عزیز و حکیم" کی تعبیر رحمت کے "ارسال" اور "امساک" پر اس کی قدرت کو بیان کرتی ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ کھولنا اور باندھنا ہر جگہ حکمت کی بنیاد پر ہے، کیونکہ اس کی قدرت اس کی حکمت سے ملی ہوئی ہے۔

بہرحال اس آیت کے مفہوم و مضمون کی طرف توجہ ایک مومن انسان کو اس طرح سکون و آرام پہنچاتی ہے کہ وہ تمام حوادث و مصائب کے مقابلہ میں کھڑا ہو جاتا ہے، اور کسی مشکل سے نہیں ڈرتا، اور کسی کامیابی سے مغرور نہیں ہوتا[1]

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں "توحید در عبادت" کے مسئلہ کی طرف "توحید در خالقیت و رازقیت" کی اساس پر اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ: "اے لوگو! اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو" (یا ایھا الناس اذکروا نعمۃ اللہ علیکم)۔

ٹھیک طریقہ سے غور و فکر کرو کہ یہ تمام انعامات اور برکات، اور زندگی کے یہ تمام وسائل و امکانات کہ جو تمہارے اختیار میں قرار دیئے گئے ہیں اور تم ان نعمتوں کے اندر ڈوبے ہوئے ہو، ان کا اصل پیدا کرنے والا کون ہے اور ان کا سرچشمہ کیا چیز ہے؟

"کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق آسمان و زمین سے تمہیں روزی دیتا ہے" (ھل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض)۔

وہ کون ہے کہ جو سورج کی حیات بخش روشنی اور بارش کے زندہ کرنے والے قطرات اور بادِ نسیم

---

[1] قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "فلا ممسك لها" کی ضمیر مؤنث کی شکل میں ہے اور "فلا مرسل له" میں مذکر کی شکل میں ہے چونکہ پہلی کا مرجع لفظ "رحمت" ہے، اور دوسری کا "ما" ہے، علاوہ ازیں "من بعدہ" ظاہراً خدا کی طرف لوٹتا ہے یعنی خدا کے سوا کوئی اس کے کھولنے پر قادر نہیں ہے، یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ ضمیر "امساک" کی طرف لوٹے یعنی "من بعد امساک اللہ" کہ جو معنی کے لحاظ سے چنداں فرق نہیں رکھتا۔

Marfat.com

کی روح پرور موجیں آسمان سے تمہاری طرف بھیجتا ہے؟ اور کون ہے وہ کہ جو زمین کے معادن، ذخائر، اور مواد غذائی، انواع و اقسام کے نباتات اور پھل اور دوسری برکات اس زمین سے تمہارے لیے نکالتا ہے۔

اب جبکہ تم اس بات کو جانتے ہو کہ ان سب برکات کا سرچشمہ وہی ہے تو پھر جان لو کہ:
"اس کے سوا کوئی اور معبود بھی نہیں ہے اور عبادت و پرستش صرف اسی کی ذاتِ پاک کے لائق ہے" (لا الٰه الّا هو)۔
"اس حالت میں تم کس طرح حق کی راہ سے باطل کی طرف منحرف ہوتے ہو اور اللہ کے بجائے بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہو" (فانّٰی تؤفکون)۔
"تؤفکون"۔ "افك" (بروزن فکر) کے مادہ سے ہے، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ "افک" ہر اُس چیز کو کہتے ہیں کہ جو اپنی اصلی حالت سے بدل جائے لہٰذا ہر اُس بات کو کہ جو حق سے انحراف پیدا کرے "افک" کہتے ہیں، اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جھوٹ اور تہمت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو یہ اسی لحاظ سے ہے، البتہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ لفظ جھوٹ اور بڑی بڑی تہمتوں کو بیان کرتا ہے۔

نکتہ

ملائکہ قرآن مجید میں

قرآن مجید میں ملائکہ کا بہت زیادہ بیان ہوا ہے۔

بہت سی آیاتِ قرآن فرشتوں کی صفات، خصوصیات، فرائض اور وظائف اور ذمہ داریوں کے سلسلہ میں گفتگو کرتی ہیں، یہاں تک کہ قرآن نے ملائکہ پر ایمان رکھنے کو خدا، انبیاء اور کتبِ آسمانی پر ایمان رکھنے کی ردیف میں قرار دیا ہے، اور یہ چیز اس مسئلہ کی بنیادی اہمیت کی دلیل ہے: (اٰمن الرسول بما انزل الیه من ربه والمؤمنون کل اٰمن باللّٰه وملائکته وکتبه ورسله)

"پیغمبرِ اسلام اس چیز پر کہ جو ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے ایمان لائے، اور مومنین بھی خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور رسولوں سب پر ایمان لائے ہیں۔" (بقرہ۔ ۲۸۵)

اس میں شک نہیں کہ فرشتوں کا وجود امورِ غیبیہ میں سے ہے کہ جس کے ثابت کرنے کے لیے ان صفات و خصوصیات کے ساتھ ادلہ نقلیہ کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں ہے اور ایمان بالغیب کے حکم کے مطابق انہیں قبول کرنا چاہیئے۔

قرآن مجید ان کی خصوصیات کو مجموعی طور پر اس طرح شمار کرتا ہے:

Marfat.com

۱۔ فرشتے عاقل اور باشعور موجودات ہیں اور خدا کے گرامی قدر اور معزز بندے ہیں: (بل عباد مکرمون) ۔ (انبیاء ۔ ۲۶)

۲۔ وہ خدا کے تابع فرمان ہیں اور ہرگز اس کی معصیت و نافرمانی نہیں کرتے: (لا یسبقونه بالقول وهم بامره یعملون) (انبیاء ۔ ۲۷)

۳۔ وہ خدا کی طرف سے اہم اور بہت ہی متنوع ذمہ داریاں اور وظائف اپنے ذمہ رکھتے ہیں۔

ایک گروہ حاملینِ عرش کا ہے۔ (حاقہ ۔ ۱۷)

ایک گروہ مدبر امر ہے، (نازعات ۔ ۵)

ایک گروہ قابض ارواح فرشتوں کا ہے: (اعراف ۔ ۳۷)

ایک گروہ اعمالِ انسانی کا نگران ہے۔ (سورہ انفطار ۔ ۱۰ تا ۱۳)

ایک گروہ انسان کی خطرات و حوادث سے حفاظت کرتا ہے۔ (انعام ۔ ۶۱)

ایک گروہ سرکش اقوام کو عذاب اور سزا دینے پر مامور ہے۔ (ہود ۔ ۷۷)

ایک گروہ جنگوں میں خدا کی طرف سے مومنین کی مدد کرنے والا ہے۔ (احزاب ۔ ۹)

اور بالآخر ایک گروہ انبیاء کے لیے وحی کا پہنچانے والا اور ان کے پاس کتب آسمانی کا لانے والا ہے۔ (نحل ۔ ۲)

اگر ہم چاہیں کہ ان کی ایک ایک ذمہ داری اور ماموریت کو شمار کریں تو بحث طویل ہو جائے گی۔

۴۔ وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں جیسا کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۵ میں بیان ہوا ہے: (والملائکة یسبحون بحمد ربهم ویستغفرون لمن فی الارض) "فرشتے اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجا لاتے ہیں، اور جو لوگ زمین میں ہیں ان کے لیے استغفار کرتے ہیں"

۵۔ اس کے باوجود انسان تکامل و ارتقاء کی استعداد کے مطابق ان سے بھی برتر و افضل تر ہے، یہاں تک کہ تمام فرشتے بغیر استثناء کے آدمؑ کی خلقت کے وقت اس کے سجدے میں گر پڑے، اور آدمؑ ان کے معلم قرار پائے۔ (بقرہ ۔ ۳۰ ۔ ۳۴)

۶۔ وہ کبھی انسان کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور انبیاء بلکہ غیر انبیاء کے سامنے بھی آتے ہیں، جیسا کہ سورۂ مریم میں بیان ہوا ہے کہ: "ایک عظیم خدائی فرشتہ ایک موزوں اور ٹھیک ٹھاک انسان کی شکل میں مریم کے سامنے ظاہر ہوا" (فارسلنا الیها روحنا فتمثل لها بشرًا سویًّا)۔ (مریم ۔ ۱۷)

دوسرے مقام پر انسانوں کی شکل میں ابراہیمؑ و لوطؑ پر ظاہر ہوئے۔ (ہود ۔ ۶۹ ۔ ۷۷)

یہاں تک کہ ان آیات کے ذیل میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قوم لوط نے بھی انہیں موزوں انسانی شکلوں میں دیکھا تھا۔ (ہود ۔ ۷۸)

Marfat.com

کیا چہرۂ انسانی میں ظہور ایک واقعیت عینی ہے، یا قوتِ ادراک میں تمثیل و تصرف ہے' آیات قرآنی کا ظاہر پہلا معنی ہے۔ اگرچہ بعض بزرگ مفسرین نے دوسرے معنی کا انتخاب کیا ہے۔

۷۔ روایاتِ اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ کسی طرح بھی انسان کے ساتھ قابلِ قیاس نہیں ہیں جیسا کہ ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جس وقت لوگوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ کیا فرشتوں کی تعداد زیادہ ہے یا انسانوں کی تو آپؐ نے فرمایا:

"قسم ہے اس خدا کی کہ جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، آسمانوں میں خدا کے فرشتوں کی تعداد زمین کے خاک کے ذرات سے بھی زیادہ ہے' اور آسمان میں ایک قدم رکھنے کی جگہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہاں ایک فرشتہ خدا کی تسبیح و تقدیس کرتا ہے۔"[1]

۸۔ وہ نہ غذا کھاتے ہیں، نہ پانی پیتے ہیں اور نہ ہی نکاح و ازدواج کرتے ہیں' جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

"ان الملائكة لا يأكلون ولا يشربون ولا ينكحون وانما يعيشون بنسيم العرش"

"فرشتے نہ کھانا کھاتے ہیں' نہ پانی پیتے ہیں اور نہ ہی نکاح و ازدواج کرتے ہیں' وہ تو صرف نسیم عرش سے زندگی بسر کرتے ہیں"[2]

۹۔ نہ انہیں نیند آتی ہے نہ سستی و غفلت ان پر طاری ہوتی ہے جیسا کہ حضرت علیؑ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ:

"ليس فيهم فترة، ولا عندهم غفلة، ولا فيهم معصية .... لا يغشاهم نوم العيون ولا سهو العقول، ولا فترة الابدان، لم يسكنوا الاصلاب ولم تضمهم الارحام"

"نہ اُن میں سستی ہے اور نہ غفلت، نہ عصیان و نافرمانی ہے اور نہ ہی ان پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ ان کی عقل سہو و نسیان میں گرفتار نہیں ہوتی، ان کا بدن سستی کی طرف مائل نہیں ہوتا، اور وہ باپوں کے صلب اور ماؤں کے رحم میں

---

[1] بحار الانوار، جلد ۵۹ ص ۱۷۶ (حدیث۔ ۷)۔ اس سلسلے میں اور دوسری بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں۔

[2] بحار الانوار، جلد ۵۹ ص ۱۷۴ (حدیث ۴)۔

Marfat.com

قرار نہیں پاتے ہیں۔[1]

۱۰۔ وہ مختلف مقامات اور متفاوت مدارج رکھتے ہیں، بعض ہمیشہ رکوع میں ہیں، اور بعض ہمیشہ سجدے میں ہیں۔

" ما منّا الّا له مقام معلوم و انّا لنحن الصافّون و انّا لنحن المسبّحون "

" ہم میں سے ہر ایک معلوم مقام رکھتا ہے، ہم ہمیشہ صف کشیدہ اس کے فرمان کے منتظر رہتے ہیں اور مسلسل اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں" (صافات: ۱۶۴تا۱۶۶)

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

"و ان لله ملائکة رکعًا الی یوم القیامة و ان الله ملائکه سجدًا الی یوم القیامة "

" خدا کے کچھ فرشتے ایسے ہیں کہ جو قیامت تک رکوع میں ہیں اور کچھ فرشتے ایسے ہیں کہ جو قیامت تک سجدے میں ہیں"[2]

ملائکہ کے اوصاف اور ان کے اصناف سے زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرنے کے لیے کتاب "السماء والعالم" ۔ بحار الانوار، ابواب الملائکہ (جلد ۵۹ ص ۱۴۴ تا ۳۲۶) کی طرف رجوع فرمائیں اسی طرح نہج البلاغہ خطبہ ہائے اول و ۹۱ ۔خطبہ اشباح: ۱۰۹ و ۱۷۱ سے رجوع کریں۔

٭ ٭ ٭

کیا ان اوصاف کے باوجود کہ جو فرشتوں کے بارے میں بیان ہوئے ہیں وہ کوئی مجرد وجود ہیں یا مادی ؟

اس میں شک نہیں کہ وہ ان اوصاف کے ساتھ اس کثیف عنصری مادہ سے تو نہیں ہو سکتے، لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے، کہ وہ اجسام لطیفہ سے خلق ہوئے ہیں، ایسے اجسام کہ جو اس عام مادہ سے مافوق ہو کہ جس سے ہم آشنا نہیں۔

فرشتوں کے لیے "تجرد مطلق" کا اثبات، حتیٰ زمان و مکان اور اجزاء سے "تجرد" کوئی آسان کام نہیں ہے، اور اس مسئلہ کے بارے میں تحقیق بھی کوئی زیادہ فائدہ مند نہیں ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم فرشتوں کو ان اوصاف کے ساتھ کہ جن کے ساتھ قرآن اور مسلمہ روایات اسلامی نے ان کی توصیف کی

---

[1] بحار الانوار، جلد ۵۹ ص ۱۷۵۔

[2] بحار الانوار، جلد ۵۹ ص ۱۷۴۔

Marfat.com

ہے انہیں پہچانیں، اور انہیں خدا کی عظیم اور عمدہ موجودات میں سے ایک عظیم نوع سمجھیں، بغیر اس کے کہ ہم ان کے لیے مقامِ بندگی اور عبودیت کے سوا کسی اور مقام و مرتبہ کے ان کے لیے قائل ہوں اور انہیں خلقت یا عبادت میں خدا کا شریک سمجھیں، کیونکہ یہ شرک اور کفر محض ہے۔

فرشتوں کے بارے میں ہم اسی قدر بحث پر قناعت کرتے ہیں اور اس کی تفصیل ان کتب کے حوالہ کرتے ہیں کہ جو خصوصیات کے ساتھ اس سلسلہ میں لکھی گئی ہیں۔

تورات کی بہت سی عبارتوں میں فرشتوں کو "خداؤں" کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کہ جو شرک آلود تعبیر ہے۔ اور موجودہ تورات کی تحریف کی نشانیوں میں سے ہے، لیکن قرآن مجید اس قسم کی تعبیروں سے پاک اور منزہ ہے۔ کیونکہ قرآن ان کے لیے مقام بندگی و عبادت اور احکام و فرامینِ الٰہی کے اجراء کے سوا اور کسی مقام کا قائل نہیں ہوا ہے۔ یہاں تک کہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کی مختلف آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانِ کامل کا مقام فرشتوں سے والاتر اور بالاتر ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

Marfat.com

(۴) وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ
وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○
(۵) يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا ٚ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ○
(۶) اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا
حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ○ؕ
(۷) اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ○ؑ

ترجمہ

(۴) اگر وہ تجھے جھٹلائیں (تو غم نہ کرو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے) تجھ سے پہلے جو پیغمبر تھے انہیں بھی جھٹلایا گیا تھا، اور تمام کام خدا ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔

(۵) اے لوگو! خدا کا وعدہ حق ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ زندگانی دنیا تمہیں مغرور کر دے اور کہیں شیطان تمہیں دھوکا دے کر خدا (کے کرم) سے مغرور نہ کر دے۔

(۶) یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے، تم اس کو اپنا دشمن سمجھو، وہ تو صرف اپنے ہی حزب (گروہ) کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ جلانے والی (جہنم کی) آگ والے ہو جائیں۔

(۷) جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان کے لیے عذاب شدید ہے اور جو ایمان

Marfat.com

لائے اور انھوں نے عمل صالح انجام دیئے ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔

تفسیر

دُنیا اور شیطان تمہیں فریب نہ دے

اِس سورہ کی آیات کے دوسرے حصّہ میں اُس گفتگو کے بعد کہ جو توحید و خالقیت و رازقیت کے سلسلہ میں تھی پہلے رُوئے سخن پیغمبرؐ کی طرف اور پھر عام لوگوں کی طرف کرتے ہوئے ان کے عملی پروگرام کی گزشتہ عقیدے سے متعلق پروگرام کے بعد تشریح کرتا ہے۔

پہلے پیغمبر کو اپنی راہ پر چلنے کے لیے استقامت کا درس دیتا ہے، کہ جو آپؐ کے لیے اہم ترین درس ہے، فرماتا ہے کہ: "اگر وہ تیری تکذیب کریں تو غم نہ کرو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، تجھ سے پہلے جو پیغمبر ہوئے ہیں ان کی بھی تکذیب کی گئی تھی" (وان یکذبوك فقد کذبت رسل من قبلك)۔

انہوں نے بھی اس راہ میں ثابت قدمی سے کام لیا، جب تک فرضِ رسالت کو ادا نہ کر لیا بیٹھے نہیں تھے۔ تم بھی مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور ادائے رسالت کرو نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

"اہم بات یہ ہے کہ تمام کام خدا ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ ہر چیز پر ناظر اور ہر کام کا حساب کتاب کرنے والا ہے" (و الی اللہ ترجع الامور)۔

وہ اس راہ میں تیری زحمات و تکالیف کو ہرگز بے اعتنائی سے نہیں دیکھتا، جس طرح سے کہ ان ہٹ دھرم مخالفین کے جھٹلانے کو بغیر سزا دیئے نہیں چھوڑتا، اگر قیامت کا دن آنے والا نہ ہوتا تو پریشانی کا مقام تھا، لیکن اس عظیم دادگاہ اور اس عظیم دن کے لیے لوگوں کے تمام اعمال کے ثبت و ضبط ہونے کی طرف توجہ کرتے ہوئے پریشانی کی کونسی بات ہے؟

اس کے بعد انسانوں کے اہم ترین پروگرام کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "اے لوگو! خدا کا وعدہ حق ہے" (یا ایھا الناس انّ وعد اللہ حق)۔

قیامت، حساب و کتاب، میزان، مجازات، کیفر، جنت، جہنم سب کے سب ایسے وعدے ہیں کہ جو خدائے قادر و حکیم کی طرف سے پورے ہونے والے ہیں۔

اس وعدۂ حق کی طرف توجہ کرتے ہوئے: "کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیاوی زندگی تمہیں دھوکہ دے دے، اور دھوکہ دینے والا شیطان کہیں تمہیں فریب نہ دے دے، اور خدا کے عفو و کرم سے مغرور کر دے" (فلا تغرنکم الحیٰوۃ الدنیا ولا یغرنکم باللہ الغرور)۔

Marfat.com

ہاں سرگرم کرنے والے عوامل اور اس جہان کے دل فریب ٹھاٹھ باٹھ چاہتے ہیں کہ تمہارے سارے دل کو ان سے بھر دیں، اور اس عظیم خدائی وعدے سے غافل بنا دیں۔

شیاطین، جن و انس فریب کاری کے گوناں گوں وسائل کے ساتھ لگاتار وسوسہ میں مشغول ہیں، وہ بھی چاہتے ہیں کہ تمہاری ساری فکر کو اپنی طرف مشغول رکھیں اور اس عظیم روزِ موعود سے کہ جو آگے آ رہا ہے اس سے تمہیں منحرف کر دیں، کہ اگر ان کے مکر و فریب اور وسوسے مؤثر ہو جائیں تو پھر تمہاری ساری زندگی تباہ و برباد اور تمہاری سعادت کی آرزو نقش بر آب ہو جائے گی لہٰذا ان سے بھی بچتے رہو۔

لوگوں کو بار بار اس بات کی تنبیہ کرنا کہ نہ تو وہ شیطانی وسوسوں سے مغرور ہوں اور نہ ہی دنیا سے واقع میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان میں گناہ کے نفوذ کی دو راہیں ہیں۔

۱۔ دنیا کے فریب دینے والے مظاہر، جاہ و جلال اور مال و منال اور طرح طرح کی خواہشات۔

۲۔ خدا کے عفو و کرم پر مغرور ہونا، اور یہ وہ مقام ہے کہ جہاں شیطان ایک طرف تو اس عالم کے ٹھاٹھ باٹھ کو انسان کی نگاہ میں زینت دیتا ہے، اور اس کو ایک نقد متاع، پُرکشش اور قیمتی اور دوست رکھنے کے لائق چیز ظاہر کرتا ہے۔

اور دوسری طرف جب انسان یہ چاہتا ہے کہ قیامت اور پروردگار کی عظیم دادگاہ کو یاد کر کے اپنے آپ کو دنیا کے فریب اور اس کی شدید کشش کے مقابلہ میں کنٹرول کرے تو وہ اس کو عفو الٰہی اور اس کی رحمت کی وسعت کا بیان کر کے مغرور کر دیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اُسے گناہ اور سرکشی کی دعوت دیتا ہے۔

وہ اس بات سے غافل ہے کہ خدا جس طرح رحمت کے مقام پر "ارحم الراحمین" (سب سے زیادہ رحم کرنے والا) ہے، سزا اور کیفر کے مقام پر "اشد المعاقبین" (سب سے سخت عقاب کرنے والا) بھی ہے، اس کی رحمت کبھی بھی گناہ کا شوق پیدا نہیں کرتی جیسا کہ اس کا غضب یاس و ناامیدی کا سبب نہیں ہو سکتا۔

"غرور" (بروزن جسور) مبالغہ کا صیغہ ہے اور اُس موجود کے معنی میں ہے کہ جو حد سے زیادہ فریب کار ہو، اور یہاں ممکن ہے کہ اس سے فریب کاری کا ہر عامل مراد ہو، جیسا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے خصوصیت کے ساتھ شیطان مراد ہو۔

البتہ دوسرا معنی بعد کی آیت کے ساتھ زیادہ مناسب ہے، خاص طور پر اس صورت میں کہ قرآنی آیات میں بارہا "فریب و غرور" کی شیطان کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں ایک تجزیہ کیا ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔

وہ افراد کہ جو عوامل فریب کے مقابل قرار پاتے ہیں، تین گروہ ہیں:

Marfat.com

ایک گروہ تو اس قدر ضعیف و ناتواں ہوتا ہے کہ جو معمولی سی چیز سے دھوکا کھا جاتا ہے۔

دوسرا گروہ کہ جو اُن سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے وہ صرف دنیا کے ٹھاٹھ باٹھ اور زرق برق سے فریفتہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف اس صورت میں فریب کھاتے ہیں کہ کوئی طاقتور وسوسہ ڈالنے والا انہیں تحریک کرے اور ان کے مفاسد اعمال کو ان کی نظر میں ہلکا کر کے پیش کرے، لہٰذا ایک طرف سے تو جلدی گزر جانے والی لذتیں اور دوسری طرف سے وسوسے انہیں بُرے اعمال کے انجام دینے پر ابھارتے ہیں۔

تیسرا گروہ وہ ہوتا ہے کہ جو ان سے بھی زیادہ طاقتور اور قوی ہے جو نہ تو خود ہی مغرور ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی دوسرا انہیں فریب دے سکتا ہے۔

"لا تغرنکم الحیاۃ الدنیا" کا جملہ پہلے گروہ کی طرف اشارہ ہے، اور "ولا یغرنکم باللہ الغرور" کا جملہ دوسرے گروہ کی طرف، اور باقی رہا تیسرا گروہ تو وہ درحقیقت "ان عبادی لیس لک علیھم سلطان" کے عنوان میں داخل ہے[1]

بعد والی آیت تمام مومنین کو، ان شیطانی وسوسوں کے مسئلہ سے مربوط کہ جس کا بیان اس سے پہلی آیت میں ہوا تھا، ایک تنبیہ ہے، کہتا ہے کہ: "شیطان یقیناً تمہارا دشمن ہے، تم بھی اس کو اپنا دشمن سمجھو" (ان الشیطان لکم عدو فاتخذوہ عدوًا)۔

اس کی دشمنی آدمؑ کی پیدائش کے پہلے دن سے ہی شروع ہو چکی تھی، اور جس وقت وہ آدمؑ کو سجدہ کرنے کے بارے میں حکم خدا کو تسلیم نہ کر کے راندۂ درگاہ ہو گیا تو اس نے قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ کے لیے آدمؑ اور اس کی اولاد سے دشمنی رکھے گا، یہاں تک کہ اس کام کے لیے خدا سے مہلت اور طویل عمر کا تقاضا کیا۔

وہ اپنی کہی ہوئی بات پر اڑا ہوا ہے، اور دشمنی نکالنے کے لیے اور تم پر ضرب لگانے کے لیے تھوڑی سے تھوڑی فرصت کو بھی غنیمت شمار کرتا ہے۔ کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ تم اس کو اپنا دشمن نہ سمجھو اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے غافل رہو؟ چہ جائیکہ تم یہ چاہنے لگو کہ "خطوات شیطان" اور اس کے قدموں کی پیروی کرو، یا یہ کہ تم اسے اپنا شفقت کرنے والا رفیق اور ناصح دوست سمجھنے لگو؛ (افتتخذونہ وذریتہ اولیاء من دونی وھم لکم عدو) "کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو میری بجائے اپنا دوست بناتے ہو، درحالیکہ وہ تمہارا بہت ہی سخت دشمن ہے" (کہف۔ ۵۰)

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۶ ص ۵۔

Marfat.com

علاوہ ازیں وہ ایک ایسا دشمن ہے کہ جو ہر طرف سے حملہ کرتا ہے، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے: "ثم لاٰتینھم من بین ایدیھم و من خلفھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم" (پھر میں ہر طرف سے اولادِ آدم کے پاس آؤں گا، ان کے آگے سے بھی، ان کے پیچھے سے بھی ان کے دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی)۔ (اعراف - ۱۷)

خصوصاً وہ جبکہ ایسی کمین گاہ میں ہے کہ: "وہ تو انسان کو دیکھتا ہے، لیکن انسان اسے نہیں دیکھتا"، (انه یراکم ھو و قبیلہ من حیث لا ترونھم) "شیطان اور اس کا قبیلہ تو تمہیں دیکھتا ہے، جبکہ تم اس کو نہیں دیکھتے۔" (اعراف - ۲۷)

البتہ یہ بات اس کے وسوسوں کے مقابلہ میں تمہارے اپنے آپ سے قدرتِ دفاع میں مانع نہیں ہے۔

موسیٰ بن عمران کو پروردگار کی وصیتوں میں ایک عمدہ تعبیر بیان ہوئی ہے، جیسا کہ امیرالمومنین حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ خدا نے موسیٰؑ سے فرمایا: میں تمہیں چار وصیتیں کرتا ہوں انہیں یاد رکھنا:

اولاً: "ھن مادمت لا تری ذنوبک تغفر فلا تشتغل بعیوب غیرک"

والثانیة: "مادمت لا تری کنوزی قد نفدت فلا تھتم بسبب رزقك"

والثالثة: "مادمت لا تری زوال ملکی فلا ترج احداً غیری"

والرابعة: "مادمت لا تری الشیطان میتا فلا تأمن مکرہ"

"پہلی وصیت تو یہ ہے کہ جب تک تُو اپنے گناہوں کو بخشا ہوا نہ دیکھ لے دوسروں کی عیب جوئی نہ کر۔

دوسری وصیت یہ ہے کہ جب تک تُو میرے خزانوں کو ختم ہونے والا نہ دیکھ لے اپنی روزی کے لیے غمناک نہ ہو۔

تیسری وصیت یہ ہے کہ جب تک تُو میری حکومت کو زائل ہونے والا نہ دیکھ لے میرے علاوہ کسی اور سے امید نہ باندھنا۔

چوتھی وصیت یہ ہے کہ جب تک تُو شیطان کو مرا ہوا نہ دیکھ لے اُس وقت تک اس کے مکر و فریب اور اس کے منصوبوں سے امن میں نہ رہ۔"[1]

بہرحال بنی آدم کے ساتھ شیطان کی دشمنی ایک ایسا مضمون ہے جس کی طرف قرآن کی بہت سی آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ بار بار تکرار کے ساتھ اُسے "عدو مبین"

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۱ صفحہ ۵۰۱ مادہ ربع۔

Marfat.com

(واضح دشمن) کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے [۱]

اس قسم کے دشمن سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیئے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے کہتا ہے: "وہ تو صرف اپنے ہی گروہ کو اس لیے دعوت دیتا ہے تاکہ وہ جہنم کی جلانے والی آگ میں داخل کیے جائیں" (انما یدعوا حزبہ لیکونوا من اصحاب السعیر)۔

"حزب" اصل میں جماعت اور ایسے گروہ کے معنی میں ہے کہ جو تشکل اور شدتِ عمل کا حامل ہو، لیکن عام طور پر ہر اس گروہ اور جمعیت کے لیے بولا جاتا ہے کہ جو ایک خاص پروگرام اور مقصد کی پیروی کرتا ہے۔

"حزبِ شیطان" سے مراد اس کے پیروکار اور وہ لوگ ہیں کہ جو اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں۔ البتہ شیطان ہر شخص کو اپنے حزب کا رسمی ممبر نہیں بنا سکتا، اور نہ ہی انہیں جہنم کی طرف دعوت دے سکتا ہے، اس کے حزب کے افراد تو وہ ہیں جن کا قرآن کی دوسری آیات میں بیان ہُوا ہے، اور وہ ذیل کی نشانیاں رکھتے ہیں:

وہ لوگ کہ جنہوں نے اس کی بندگی اور ولایت و دوستی کا طوق اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے۔ "انما سلطانہ علی الذین یتولونہ" :"اس کا تسلط صرف ان افراد پر ہے کہ جو اس کی ولایت کو قبول کرتے ہیں" (النحل - ۱۰۰)

"وہ لوگ کہ جن پر شیطان کا غلبہ ہے اس طرح سے کہ اُن سے خدا کی یاد کو بھلا دیا ہے' وہ شیطان کا حزب ہے' اور شیطان کا حزب ہی واقعی زیاں کار ہے" (استحوذ علیھم الشیطان فانسٰھم ذکر اللہ اولئٰک حزب الشیطان الا ان حزب الشیطان ھم الخاسرون)۔ (مجادلہ - ۱۸)

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں تین مقامات پر تو حزب اللہ کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے' اور تین ہی مقامات پر حزبِ شیطان کے بارے میں، تاکہ دیکھیں کہ کون کون سے افراد اِس حزب میں اپنا نام لکھاتے ہیں، اور کون سے اُس حزب کے ممبر بنتے ہیں۔

لیکن بہر حال یہ طبیعی امر ہے کہ شیطان اپنے حزب کو کس چیز کی دعوت دیتا ہے، آلودگی اور گناہ کی، شہوات کی پلیدی کی، شرک و طغیان کی ظلم و ستم کی، اور آخر کار جہنم کی آگ کی طرف [۲]

ہم انشاء اللہ "حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" کی خصوصیات کے بارے میں مزید تفصیل سورہ مجادلہ کی آیہ ۲۲ کے ذیل میں بیان کریں گے۔

---

[۱] آیہ ۱۶۱، ۲۰۸ بقرہ - انعام آیہ ۱۴۲ - اعراف - ۲۲ - یوسف ۵ - یٰسین - ۶۰ - زخرف - ۶۲ -

[۲] یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ "لیکونوا" "لام" لام علت بھی ہو سکتی ہے اور لام غایت بھی۔

Marfat.com

آخری زیرِ بحث آیت میں حزب اللہ کا انجام کار اور حزب الشیطان کی دردناک عاقبت کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ: "جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عملِ صالح انجام دیئے تو وہ مغفرت اور اجرِ عظیم کے مستحق ہیں" (الذین کفروا لهم عذاب شدید والذین اٰمنوا وعملوا الصالحات لهم مغفرة واجر کبیر)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں عذاب کے استحقاق کے لیے تو صرف مسئلہ کفر پر قناعت کرتا ہے لیکن مغفرت اور اجرِ کبیر کے مسئلہ میں ایمان کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ "عملِ صالح" کا بھی اس پر مزید اضافہ کرتا ہے، کیونکہ کفر تو تنہا ہی عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا سبب ہے لیکن ایمان عمل کے بغیر سببِ نجات نہیں ہوگا، بلکہ ایمان و عمل ایک لحاظ سے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں [1]

اوپر والی آیت میں آخر میں پہلے مغفرت کے بارے میں گفتگو ہے، اس کے بعد اجرِ کبیر کے بارے میں، کیونکہ مغفرت حقیقت میں مومنین کو ابتدا میں گناہوں سے دھو کر پاک کر دیتی ہے، اس کے بعد اس کو "اجرِ کبیر" کے قبول کرنے کے لیے آمادہ و تیار کر دیتی ہے۔ اصطلاح کے مطابق اوّل تخلیہ ہے اور دوسرا تحلیہ ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

---

[1] "مغفرت" اور "عذاب" میں تنوین تعظیم و تفخیم کے لیے ہے یعنی عظیم مغفرت اور دردناک عذاب۔

Marfat.com

(۸) اَفَمَنۡ زُيِّنَ لَهٗ سُوۡۤءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ
يُضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ۖؗ فَلَا تَذۡهَبۡ
نَفۡسُكَ عَلَيۡهِمۡ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ
بِمَا يَصۡنَعُوۡنَ ○
(۹) وَاللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيۡرُ سَحَابًا فَسُقۡنٰهُ
اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحۡيَيۡنَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ
كَذٰلِكَ النُّشُوۡرُ ○
(۱۰) مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ جَمِيۡعًا ؕ اِلَيۡهِ
يَصۡعَدُ الۡـكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ ؕ
وَالَّذِيۡنَ يَمۡكُرُوۡنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ؕ وَ
مَكۡرُ اُولٰٓـئِكَ هُوَ يَبُوۡرُ ○

ترجمہ

(۸) وہ شخص کہ جس کے لیے اُس کا بُرا عمل (اس کی نظروں میں) زینت دے دیا گیا ہے اور وہ اُسے اچھا اور خوبصورت لگتا ہے (اس شخص کی مانند ہے کہ جو واقع کو اسی طرح سے دیکھتا ہے کہ جس طرح سے وہ ہے) خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اس بناء پر ان کے اوپر شدتِ تاسف کی وجہ سے اپنی جان نہ دے کیونکہ خدا اس سے کہ جو وہ

Marfat.com

انجام دیتے ہیں باخبر ہے۔

(۹) اور خدا ہی ہے وہ کہ جس نے ہَوَاؤں کو بھیجا تاکہ وہ بادلوں کو حرکت میں لائیں، پس ہم ان بادلوں کو مردہ زمینوں کی طرف بھیجتے ہیں اور ان کے ذریعہ زمین کو مُردہ ہونے کے بعد زندہ کرتے ہیں، معاد و قیامت بھی اسی طرح ہے۔

(۱۰) جو شخص عزت چاہتا ہے (اُسے خدا سے چاہنا چاہیئے) کیونکہ ساری عزت خدا ہی کے لیے ہے، پاکیزہ باتیں اس کی طرف صعود کرتی ہیں اور وہ عمل صالح کو اوپر لے جاتی ہیں اور وہ لوگ جو بُرے منصوبے بناتے ہیں ان کے لیے شدید عذاب ہے، اور اُن کا مکر (اور فساد کی کوششیں) نابود ہو جائیں گی (اور وہ اس میں کامیاب نہ ہوں گے)۔

تفسیر

پاک اور صالح گفتار و کردار خدا کی طرف لے جاتے ہیں

چونکہ گزشتہ آیات میں لوگوں کی دو گروہوں میں تقسیم ہوئی تھی، ایک "گروہ مومن" اور "ایک گروہ کافر" یا ایک گروہ "حزب اللہ اور شیطان کا دشمن" اور دوسرا گروہ "اس کا پیرو اور اس کا حزب" پہلی زیر بحث آیت ان دونوں گروہوں کی ایک اہم خصوصیت کو، جو واقع میں ان کے تمام پروگراموں کا سرچشمہ ہے، بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: "کیا وہ شخص کہ جس کے عمل کی برائی اس کی نظروں میں زینت دے دی گئی ہے، اور وہ اس کو ایک اچھی اور خوبصورت بات سمجھتا ہے، اس شخص کی مانند ہے کہ جو واقعات کو بعینہٖ اسی طرح سے جیسے کہ وہ ہیں ۔ اچھے یا بُرے ۔ درک کرتا ہے"؟ افمن زین له سوء عمله فراٰه حسنًا)۔

حقیقت میں یہ مسئلہ گمراہ اور ہٹ دھرم قوموں کی سب بدبختیوں کی کلید ہے۔ کیونکہ ان کے تمام بُرے اعمال، ان کے سیاہ دل اور خواہشاتِ نفسانی سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے ان کی نظر

Marfat.com

میں خوبصورت دکھائی دیتے ہیں ۔

یہ بات محتاج ثبوت نہیں ہے کہ اس قسم کا آدمی نہ تو وعظ و نصیحت کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی تنقید کو سننے کے لیے آمادہ ہوتا ہے، اور نہ ہی اپنی رفتار کو بدلنے پر تیار ہوتا ہے ۔

نہ وہ اپنے اعمال کے سلسلہ میں تجزیہ و تحلیل کرتا ہے اور نہ ہی ان کے انجام سے ڈرتا ہے ۔

اور اس سے بالاتر بات یہ ہے کہ جس وقت برائی اور اچھائی یا قباحت و زیبائی کی بات چھڑتی ہے، تو اچھائیوں اور زیبائیوں کی ضمیر کا مرجع اپنی ذات کو سمجھتا ہے، اور برائیوں اور قباحتوں کی ضمیر کا مرجع مومنین کو ۔ اور کتنے ہی کفار لجوج ایسے ہیں کہ جس وقت انہوں نے حزب شیطان پر گزرے ہوئے عذاب اور ان کے انجام کے بارے میں سُنا تو انہوں نے اس کو سچے مومنین پر منطبق کر دیا اور خود اپنے آپ کو حزب اللہ کا مصداق شمار کیا ۔

اور یہ ایک بہت ہی بڑی مصیبت اور دکھ کی بات ہے ۔

لیکن وہ کون ہے کہ جو بدکاروں کے بُرے اعمال کو ان کی نظر میں جلوہ دیتا ہے ؟ کیا خدا ؟ یا ہوائے نفس ؟ یا شیطان ؟

اس میں شک نہیں کہ عامل اصلی تو ہوائے نفس اور شیطان ہی ہے، لیکن چونکہ یہ اثر خدا نے ان کے اعمال میں پیدا کیا ہے لہٰذا انہیں خدا کی طرف بھی منسوب کیا جا سکتا ہے، کیونکہ انسان جب کسی گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں تو ابتدا میں چونکہ ان کی فطرت پاک اور ان کا وجدان بیدار اور ان کی عقل واقع بیں ہوتی ہے لہٰذا وہ اپنے بُرے عمل سے بے چین اور پریشان ہوتے ہیں لیکن جس قدر وہ اُس عمل کو دہراتے ہیں تو ان کی پریشانی میں کمی ہوتی جاتی ہے ۔

آہستہ آہستہ وہ بے پرواہی کے مرحلہ تک پہنچ جاتے ہیں اور اگر پھر بھی اس عمل کو دہراتے رہیں تو برائیاں ان کی نظر میں اچھائیاں ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے لیے افتخارات اور فضائل شمار کرنے لگ جاتے ہیں ۔ حالانکہ وہ بدبختی کی منجدھار میں غوطہ زن ہوتے ہیں ۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جس وقت قرآن اس سوال کو پیش کرتا ہے کہ : "کیا وہ شخص کہ جس کے عمل کی برائی اس کی نظر میں مزین کر دی گئی ہے اور وہ اسے زیبا اور خوبصورت نظر آتی ہے ....." تو اس کے نقطۂ مقابل کو صراحت کے ساتھ ذکر نہیں کرتا ۔ گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ سننے والے کو ایک وسیع گنجائش دے تاکہ وہ ان مختلف امور کو کہ جو نقطۂ مقابل بن سکتے ہیں اپنی نظر میں مجسم کرے ۔ اور انہیں زیادہ سے زیادہ سمجھ سکے ۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ کیا اس قسم کے افراد واقع بیں افراد کی طرح ہیں ؟

Marfat.com

کیا اس قسم کے آدمی کے لیے بھی نجات کی اُمید ہے ؟[1]

اس کے بعد قرآن ان دونوں گروہوں کے درمیان فرق کا سبب بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے : ” خدا جس شخص کو چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت کرتا ہے “ (فان اللہ یضل من یشاء و یھدی من یشاء) ۔

اگر پہلے گروہ کے اعمال ان کی نظر میں زینت دے دیئے گئے ہیں تو یہ خدا کی طرف سے انہیں گمراہی میں رکھنے کا نتیجہ ہے ، وہی خدا ہے کہ جس نے بُرے اعمال کی تکرار میں یہ خاصیت قرار دے دی ہے کہ نفسِ انسانی اس کا خوگر ہو جاتا ہے اور اس کے ہم رنگ اور ہم آہنگ ہو جاتا ہے ۔

اور وہی خدا ہے کہ جو پاک دل مومنین کو ایسی ناقد و بینا آنکھیں اور ایسے کان ـ کہ جو حقائق کو اس طرح درک کرنے والے ہوں جیسے کہ وہ ہیں ـ بخشتا ہے ۔

واضح رہے کہ یہ مشیتِ الٰہی اس کی حکمت کے ساتھ توام ہے ۔ اور ہر شخص کو جس کا وہ لائق ہے اس کو وہی دیتا ہے ۔

اسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے : ” مبادا ان کی وضع وکیفیت پر شدتِ تاسف اور حسرت کے زیر اثر تُو اپنی جان دے بیٹھے “ (فلا تذھب نفسك علیھم حسرات) ۔

یہ تعبیر اسی تعبیر کی طرح ہے کہ جو سورۂ شعراء کی آیہ ۳ میں بیان ہوئی ہے : (لعلك باخع نفسك الّا یکونوا مؤمنین) ” گویا تُو چاہتا ہے کہ اپنی جان گنوا بیٹھے کہ وہ ایمان نہیں لاتے “ ۔[2]

” حسرات “ کی تعبیر کہ جو اصطلاح کے مطابق ” مفعول لاجلہ “ ہے گزشتہ جملہ کے لیے ۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تُو نہ صرف ایک ہی حسرت ان کے لیے رکھتا ہے ، بلکہ تجھے ان پر کئی حسرتیں ہیں ۔

نعمتِ ہدایت کو ہاتھ سے دینے کی حسرت ، گوہرِ انسانیت ضائع کرنے کی حسرت تشخیص کی حس ہاتھ سے دے بیٹھنے کی حسرت ، یہاں تک کہ وہ برائی کو اچھائی سمجھنے لگے ہیں اور آخر میں پروردگار کے قہر و غضب کی آگ میں گرفتار ہونے کی حسرت ۔

لیکن تُو حسرت نہ کر ، ” اس لیے کہ خدا ان کے اعمال سے آگاہ ہے اور وہ جس چیز کے لائق ہیں

---

[1] اس سے واضح ہو گیا ہے کہ اس آیت میں ایک جملہ مقدر ہے جو ممکن ہے کہ اس طرح ہو : ” کمن لیس کذالك .... کمن یحساب نفسه ویری القبیح قبیحا .... ھل یرجی له صلاح ومتاب ۔

[2] اوپر والی آیت کے لیے مفسرین نے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ ان کے آزاروں اور مخالفتوں کی شدت اور سختی سے پریشان نہ ہو کیونکہ خدا ان کے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان سے برمحل انتقام لے گا ۔

Marfat.com

وہی چیز انہیں دے گا" (ان اللہ علیم بما یصنعون)۔

آیت کے لب و لہجہ سے پیغمبرِ اسلامؐ کی گمراہوں اور منحرفین کے بارے میں دل سوزی پورے طور پر ظاہر ہے۔

اور ایک سچے خدائی رہبر کی حالت یہی ہوتی ہے، کہ وہ لوگوں کے حق کو قبول نہ کرنے، اور باطل کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے' اور سعادت و نیک بختی کے تمام وسائل کو پس پشت ڈال دینے سے اس طرح غمگین ہوتا ہے جیسے کہ وہ اپنی جان ہی دے دے گا۔

بعد والی آیت میں گزشتہ مباحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے ۔ کہ جو ہدایت و ضلالت اور ایمان و کفر کے سلسلے میں گزر چکی ہیں ۔ مبدأ و معاد کے بارے میں مختصر اور واضح بیان کر رہا ہے، اور "مبدأ و معاد" کے اثبات کو ایک عمدہ دلیل میں ایک دوسرے کے قریب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا وہی ہے کہ جس نے ہواؤں کو بھیجا تاکہ وہ بادلوں کو چلائیں" (واللہ الذی ارسل الریاح فتثیر سحاباً) [۱]

"پھر ہم ان بادلوں کو مُردہ اور خشک زمین کی طرف چلاتے ہیں" (فسقناہ الی بلد میت)۔

"اور اس کے ذریعہ ہم زمین کو مُردہ ہونے کے بعد زندہ کرتے ہیں" (فاحیینا بہ الارض بعد موتھا)۔

"ہاں! مُردوں کا موت کے بعد زندہ ہونا بھی اسی طرح ہے" (کذالک النشور)۔

ایک نپا تُلا نظام جو ہواؤں کے چلنے، اور اس کے بعد بادلوں کی حرکت اور اس کے بعد بارش کے حیات بخش قطرات کے برسنے' اور اس کے بعد مُردہ زمینوں کے زندہ ہونے پر جاری ہے وہ خود بہترین دلیل اور عمدہ ترین گواہ ہے اس حقیقت پر کہ ایک حکیم و دانا کا دستِ قدرت اس کارخانے کے پیچھے برقرار ہے اور وہ اس کی تدبیر کر رہا ہے۔

پہلے گرم اور جلا دینے والی ہواؤں کو حکم دیتا ہے کہ وہ مناطق استواء سے سرد منطقوں کی طرف جائیں اور اپنے راستے میں پڑنے والے سمندروں کے پانی کو بخارات میں تبدیل کرتے ہوئے آسمان کی طرف بھیجیں، اس کے بعد قطبین کی طرف سے منظم طور پر چلنے والی ٹھنڈی ہواؤں کو ۔ کہ جو ہمیشہ پہلے چلنے والی ہواؤں کے مخالف سمت میں چلتی ہیں ۔ حکم دیتا ہے کہ وہ حاصل شدہ بخارات کو جمع کر کے بادلوں کو تشکیل دیں۔

---

[۱] اس بارے میں کہ پہلا فعل ماضی کی شکل میں کیوں آیا ہے (ارسل) اور دوسرا فعل مضارع کی صورت میں (فتثیر) ایک غائب کی صورت میں آیا ہے (ارسل) اور دوسرا متکلم کی صورت میں (فسقناہ) اس کی مفسرین نے کئی وجوہ بیان کی ہیں لیکن چونکہ ان میں کوئی دقیق بات نہیں لہٰذا ان سے صرف نظر کیا گیا ہے، ممکن ہے کہ یہ بیان میں تفنن اور گفتگو میں تنوع کے لیے ہو۔

Marfat.com

پھر انہیں ہواؤں کو حکم دیتا ہے کہ وہ بادلوں کو اپنے دوش پر اٹھا کر مُردہ بیابانوں کی طرف دھکیل کر لے جائیں تاکہ بارش کے زندہ کرنے والے قطرات وہاں برسیں۔

پھر مخصوص حالات میں زمین اور ان نباتات کے بیجوں کو کہ جو اس میں بکھیرے ہوئے ہیں، پانی اور نشو و نما کو قبول کرنے کا حکم دیتا ہے' اور ظاہراً پست و بے قدر و قیمت موجود سے زندہ اور بہت ہی متنوع اور زیبا، خرم و سرسبز اور پُر بار موجودات کو وجود میں لاتا ہے۔ یہ اس کی قدرت کی بھی دلیل ہے' اس کی حکمت پر بھی گواہ ہے' اور قیامتِ کبریٰ کی نشانی بھی ہے۔

حقیقت میں اوپر والی آیت چند جہات سے توحید کی طرف دعوت دیتی ہے۔

برہانِ نظم اور برہانِ حرکت کے لحاظ سے، کہ ہر متحرک موجود کے لیے کسی محرک کی ضرورت ہے' اور نعمتوں کے بیان کے لحاظ سے کہ جو فطری ہونے کی بنا پر منعم کا شکر ادا کرنے کا محرک ہے، اور کئی جہات سے مسئلہ معاد پر بھی دلیل ہے۔

موجودات کے سیرِ تکامل وارتقاء کے لحاظ سے، اور مردہ زمین سے زندگی اور حیات کے چہرہ کے نمودار ہونے کے لحاظ سے، یعنی اے انسان معاد کا منظر ہر سال کی مختلف فصلوں میں تیری آنکھ کے سامنے اور تیرے پاؤں کے نیچے ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ "فتثیر" کا جملہ "اثارہ" کے مادہ سے منتشر کرنے اور پراگندہ کرنے کے معنی میں ہے اور اس مقام پر سمندروں کے اوپر ہواؤں کے چلنے کے اثر سے بادلوں کے پیدا ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے، چونکہ بادلوں کے چلنے کا مسئلہ بعد والے جملہ (فسقناہ الی بلد میت) میں آیا ہے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ جو ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرمؐ سے منقول ہوئی ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا کہ:

"یارسول اللہ کیف یحی اللہ الموتٰی وما اٰیۃ ذالک فی خلقہ"

اے اللہ کے رسول! خدا مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا، اور عالمِ خلقت میں اس کی نشانی اور نمونہ کیا ہے؟

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

"اما مررت بوادی اھلک ممحلا ثم مررت بہ یھتز خضرا؟"

کیا تُو کبھی اپنے قبیلہ کی سرزمین سے نہیں گزرا درانحالیکہ وہ مردہ اور خشک تھی اور پھر تُو وہاں سے اس حالت میں نہیں گزرا کہ وہ خرم و سرسبز ہونے کی وجہ سے ایسے لگتی ہے جیسے کہ حرکت میں آگئی ہے۔

Marfat.com

"قلت نعم یا رسول اللہ"

"میں نے عرض کیا جی ہاں اے اللہ کے رسول"

"قال : فکذالک یحیی اللہ الموتٰی وتلک اٰیتہ فی خلقہ"

آپؐ نے فرمایا: "خدا اس طرح سے مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور یہ عالم خلقت میں اس کا نمونہ اور نشانی ہے"[1]

ہم نے تفسیرِ نمونہ کی سولہویں جلد میں سورۂ روم کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں ایک دوسری بحث اس سلسلہ میں بیان کی ہے۔

توحید کی اس بحث کے بعد مشرکین کے ایک بہت بڑے اشتباہ اور غلطی کی طرف ـــ کہ وہ اپنے لیے بتوں سے عزت کے خواستگار تھے، اور پیغمبرؐ پر ایمان لانے کو اپنے گرد جمع شدہ لوگوں کی پراگندگی کا سبب سمجھتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ: "ان نتبع الھدٰی معک نتخطف من ارضنا" "اگر ہم تیرے ساتھ ہدایت کو قبول کرلیں، تو طاقتور دشمن ہمیں اس سرزمین سے اچک لیں" (قصص-۵۷) ـــ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ: "جو لوگ عزت چاہتے ہیں وہ خدا سے طلب کریں کیونکہ ساری عزت خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے" (من کان یرید العزۃ فللہ العزۃ جمیعًا)۔

"عزت" "مفردات" میں راغب کے قول کے مطابق اصل میں وہ حالت ہے کہ جو انسان کو مُحکم، مضبوط اور ناقابلِ شکست بنا دیتی ہے، سخت اور محکم زمینوں کو بھی اسی لیے "عزاز" (بروزن اساس) کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ صرف اسی کی ذات پاک ہے کہ جو ناقابلِ شکست ہے۔ ورنہ تمام مخلوقات اپنی محدُودیت کی بناء پر قابلِ شکست ہے۔ لہٰذا ساری عزت اسی کے لیے ہے۔ اور جو شخص بھی عزت حاصل کرتا ہے وہ اسی کے غیر متناہی دریائے عزت کی برکت سے ہے۔

ایک حدیث میں انس سے منقول ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"ان ربکم یقول کل یوم انا العزیز فمن اراد عز الدارین فلیطع العزیز!"

"تمہارا پروردگار ہر روز کہتا ہے کہ عزیز میں ہوں پس جو شخص دونوں جہانوں کی عزت چاہتا ہے وہ عزیز کی اطاعت کرے"

حقیقت میں آگاہ اور باخبر انسان کو چاہیئے کہ وہ پانی سرچشمہ سے حاصل کرے کیونکہ وہاں صاف شفاف اور فراواں پانی ہوتا ہے، نہ کہ چھوٹے چھوٹے برتنوں سے، کیونکہ ایک تو وہ محدود ہیں اور دوسرے آلودہ بھی، اور وہ اِس کے اور اُس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۴۰۹ (زیرِ بحث آیت کے ذیل میں)۔

Marfat.com

امام حسن علیہ السلام کے حالاتِ زندگی میں ہم پڑھتے ہیں کہ اپنی زندگی کے آخری وقت میں جبکہ آپ کے ایک صحابی "جنادہ بن ابی سفیان" نے آپ سے وعظ و نصیحت کی درخواست کی تو آپ نے قیمتی اور مؤثر نصیحتیں اس کے لیے بیان کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ:

"واذا اردت عزًا بلا عشیرة وھیبة بلا سلطان فاخرج من ذل معصیة اللّٰه الی عز طاعة اللّٰه"

"جب تُو یہ چاہے کہ قبیلہ و عشرہ کے بغیر عزیز رہے، اور اقتدارِ سلطنت کے بغیر ہیبت رکھے تو خدا کی معصیت کی ذلت سے نکل کر اس کی اطاعت کی عزت کی پناہ میں آجا" (بحارالانوار۔ ج ۴۴ ص ۳۹)

اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی بعض آیات میں "عزت" کو خدا کے علاوہ پیغمبر اور مومنین کے لیے بھی قرار دیتا ہے: "وللّٰه العزة ولرسوله وللمؤمنین" (منافقون - ۸)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بھی پروردگار کی عزت کے سایہ سے عزت حاصل کی ہے، اور اس کی اطاعت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں۔

اس کے بعد عزت حاصل کرنے کی راہ کی اس طرح تشریح کرتا ہے کہ: "پاکیزہ باتیں اس کی طرف صعود کرتی ہیں" (الیه یصعد الکلم الطیب)۔ "اور وہ عملِ صالح کو اوپر لے جاتا ہے" (والعمل الصالح یرفعه)۔

"الکلم الطیب" پاکیزہ باتوں کے معنی میں ہے، اور باتوں کی پاکیزگی اس کے مضمون کی پاکیزگی سے ہوتی ہے اور مضمون کی پاکیزگی ان مفاہیم کی بنا پر ہوتی ہے کہ جو پاک و درخشاں عینی واقعیتوں اور حقیقتوں کے مطابق ہوتے ہیں، اور خدا کی ذات پاک سے بالاتر اور اس کے حق و عدالت کے آئین سے بالاتر، اور اُن نیک اور پاک ہستیوں سے کہ جو اس کی نشر و اشاعت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں، سے بڑھ کر اور کونسی حقیقت ہوگی؟

اسی لیے "الکلم الطیب" کی، مبدا، و معاد اور دینِ خدا کے بارے میں صحیح اعتقادات کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے۔

ہاں! ایسا ہی پاک و پاکیزہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جو خدا کی طرف بلند ہوتا ہے، اور اپنے حامل کو بھی پَر پرواز دیتا ہے، تاکہ وہ حق تعالیٰ کے قرب میں جگہ حاصل کرے اور خدائے عزیز کی عزت میں غلطاں ہو جائے۔

یقیناً اس پاک و پاکیزہ اصل سے ایسی شاخیں پھوٹتی ہیں کہ جن کا پھل عملِ صالح ہے، ہر شائستہ، مفید اور اصلاحی کام، چاہے وہ حق کی طرف دعوت ہو، چاہے مظلوم کی حمایت ہو، چاہے ظالم و ستمگر کے ساتھ مبارزہ ہو، چاہے خود سازی و عبادت ہو اور چاہے تعلیم و تربیت ہو، خلاصہ یہ کہ ہر وہ چیز

Marfat.com

کہ جو اس وسیع و عریض مفہوم میں داخل ہو، اگر وہ خدا کے لیے اور اس کی رضا کے لیے انجام پائے تو وہ بھی بلند ہو جاتی ہے اور لطفِ پروردگار کے آسمان پر عروج کرتی ہے' اور اپنے حامل کی معراج اور تکامل وارتقاء کا سبب بنتی ہے' اور حق تعالیٰ کی عزت سے بہرہ اندوز ہوتی ہے۔

یہ وہی چیز ہے کہ جس کی طرف سورۂ ابراہیم کی آیہ ۲۴ میں اشارہ ہوا ہے: "الم تر کیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃً طیّبۃً کشجرۃٍ طیّبۃٍ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا"۔ "کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاکیزہ باتوں کے لیے کیسی مثل بیان کی ہے؟ جیسا کہ وہ ایک پاک درخت ہے کہ جس کی جڑ ثابت اور برقرار ہے اور اس کی شاخ آسمان میں پھیلی ہوئی ہے، وہ ہر وقت اپنے پروردگار کے اذن سے اپنے پھل (اشتیاق رکھنے والوں کو) دیتا ہے"۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض مفسرین نے کلمہ طیبہ کی "لا الٰہ الّا اللہ" سے اور بعض دوسروں نے "سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الّا اللہ واللہ اکبر" سے اور بعض نے توحید سے' توحید کے بعد "محمّد رسول اللہ، وعلی ولی اللہ وخلیفۃ رسولہ" کے ساتھ تفسیر کی ہے، یا بعض روایات میں "الکلم طیب" و "العمل الصالح" ولایت اہل بیت یا اسی کے مانند دوسری چیزوں سے تفسیر کی ہے، تو یہ سب اسی وسیع و عریض مفہوم کے واضح مصادیق کے بیان کی قبیل سے ہیں' اور اس کے مفہوم کو محدود نہیں کرتے کیونکہ ہر وہ بات کہ جو پاک و پاکیزہ اور بلند مفہوم کی حامل ہو وہ سب اس عنوان میں جمع ہو جاتی ہیں۔

بہر حال وہی خدا کہ جو گزشتہ آیت کے اقتضاء کے مطابق مُردہ زمین کو بارش کے حیات بخش قطرات سے زندہ کرتا ہے، وہی "کلام طیب" اور "عمل صالح" کو بھی پرورش کرتا ہے، اور اپنے قرب اور جوارِ رحمت تک پہنچاتا ہے۔

اس کے بعد نقطۂ مقابل کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ لوگ کہ جو بُرے منصوبے بناتے ہیں ان کے لیے شدید عذاب ہے۔ (والذین یمکرون السیّئات لھم عذاب شدید)۔

"اور ان کی آلودہ و ناپاک و فاسد سعی و کوشش نابود ہو جاتی ہے اور کسی مقام تک نہیں پہنچتی (ومکر اولئک ھو یبور)۔

اگرچہ یہ فاسدین و مفسد یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ظلم و ستم اور جھوٹ اور مکاری کے ذریعہ اپنے لیے عزت حاصل کر سکتے ہیں، اور مال و دولت اور طاقت و قدرت بھی، لیکن انجام کار انہوں نے اپنے لیے عذابِ الٰہی بھی فراہم کیا ہے اور ان کی ساری کوششیں بھی برباد ہو جاتی ہیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جو قرآن کے بیان کے مطابق "بناوٹی خداؤں کو اپنے لیے باعثِ عزت خیال کرتے تھے" (واتخذوا من دون اللہ اٰلھۃً لیکونوا لھم عزًّا)۔ (مریم - ۸۱)

Marfat.com

اور ایسے منافق بھی تھے کہ جو اپنے آپ کو عزیز اور مومنین کو ذلیل خیال کرتے تھے اور: " وہ یہ کہتے تھے کہ اگر ہم مدینہ میں پلٹ کر گئے تو عزت والے ذلیلوں کو باہر نکال پھینکیں گے" (یقولون لئن رجعنا الی المدینة لیخرجن الاعزّ منها الاذل) ۔ (منافقون - ۸)

کچھ افراد ایسے بھی تھے کہ جو فرعونوں کے قرب کو اپنی عزت کا سبب تصور کرتے تھے، یا گناہ و ظلم سے عزت و آبرو طلب کرتے تھے، لیکن وہ سب تباہ ہو گئے، اور یہ صرف ایمان و عمل صالح ہی ہے کہ جو خدائے عزیز کی طرف اوپر جاتا ہے ۔

" مکر" اگرچہ لغت میں ہر قسم کی چارہ جوئی کے معنی میں ہے لیکن بعض مواقع پر ایسی چارہ جوئی کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ جو فساد کے ساتھ توام ہو ۔ زیرِ بحث آیت اسی معنی میں ہے ۔

" سیئات " اوپر والی آیت میں تمام برائیوں اور قباحتوں کے لیئے عام اس سے کہ وہ عقائد کی برائیاں ہوں یا عمل کی، سب کو شامل ہے ۔

اور یہ جو بعض نے پیغمبرِ اسلام کو قتل کرنے یا مکہ سے جلا وطن کرنے کے سلسلہ میں مشرکین کی سازشوں کے ساتھ تفسیر کی ہے تو یہ واقع میں اس کے ایک مصداق کو بیان کیا ہے، نہ کہ اس کے پورے مفہوم کو ۔

" یبور " کا جملہ " بوار " اور " بوران " کے مادہ سے اصل میں حد سے زیادہ کساد بازاری کے معنی میں ہے، اور چونکہ اس قسم کا کساد نابودی کا سبب بنتا ہے، اس لیے یہ لفظ ہلاکت و نابودی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، مشہور ضرب المثل ہے، (کسد حتٰی فسد) " اس قدر کساد اور مندا ہوا کہ فاسد ہو گیا " ۔

چند نکات

۱۔ تمام " عزت " خدا کے لیے ہے

عزت کی حقیقت کیا ہے؟ کیا ناقابلِ شکست ہونے کے مرحلہ تک پہنچنے کے علاوہ کوئی چیز ہے؟ اگر اس طرح ہے تو پھر عزت کو کہاں تلاش کرنا چاہیئے؟ اور کونسی چیز انسان کو عزت دے سکتی ہے؟

ہم ایک واضح تحلیل و تجزیہ کے ذریعے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عزت کی حقیقت پہلے درجہ میں ایک ایسی قدرت ہے کہ جو انسان کے دل و جان میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ اس کو طاغیوں، باغیوں اور سرکشوں کے مقابلہ میں خضوع و خشوع کرنے اور سرِ تسلیم خم کرنے سے روکتی ہے ۔

ایسی قدرت کہ جس کے ہوتے ہوئے انسان خواہشات کا اسیر نہیں ہوتا، اور ہوا و ہوس کے مقابلہ میں سر نہیں جھکاتا ۔

ایسی قدرت کہ جو اُسے نفوذ ناپذیری کے مرحلہ میں " زر " و " زور " کے مقابلہ میں ارتقا تکامل بخشتی ہے

Marfat.com

کیا اس قدرت کا سرچشمہ ایمان بخدا یعنی قدرت و عزت کے اصل منبع سے ارتباط کے بغیر ہو سکتا ہے؟ یہ بات تو تھی فکر و عقیدہ اور روح وجان کے مرحلہ میں لیکن عمل کے مرحلہ میں عزت کا سرچشمہ ایسے اعمال ہیں کہ جو صحیح بنیادوں اور حساب شدہ پروگرام اور طریقہ کے حامل ہوں، دوسرے لفظوں میں اسے عمل صالح میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے، یہی وہ دو چیزیں ہیں کہ جو انسان کو سربلندی و عظمت دیتی ہیں اور اُسے عزت اور ناقابلِ شکست ہونے کا شرف بخشتی ہیں۔

فرعون کے زمانے کے دُنیا پرست جادوگروں نے اپنے عجائبات کا اس کے نام اور اس کی عزت کے ساتھ آغاز کیا۔ (وقالوا بعزة فرعون انّا لنحن الغالبون) "انہوں نے کہا فرعون کی عزت کی قسم کہ ہم ہی کامیاب ہوں گے" (شعراء۔ ۴۴)

لیکن وہ بہت ہی جلد موسیٰ کے عصا سے شکست کھا گئے، لیکن وہی جس وقت فرعون کے ذلت بار پرچم کے سائے سے باہر نکلے اور توحید کے سائے میں قرار پائے اور ایمان لے آئے، تو ایسے طاقتور اور ناقابلِ شکست ہو گئے کہ فرعون کی سخت ترین دھمکیاں بھی ان پر اثر انداز نہ ہوئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ پاؤں یہاں تک کہ اپنی جان بھی عاشقانہ راہِ خدا میں دے دی اور شربتِ شہادت نوش کر لیا۔ انہوں نے اپنے اس عمل کے ذریعے یہ واضح کر دیا کہ وہ زر اور زور کے سامنے سرِتسلیم خم نہیں کریں گے اور وہ ناقابلِ شکست ہیں، اور ان کی یہ پُر افتخار تاریخ آج ہمارے لیے ایک سبق آموز دنیا ہے۔

۲۔ "کلامِ طیّب" اور "عمل صالح" میں فرق

ممکن ہے کہ یہ سوال کیا جائے کہ زیرِ بحث آیت "کلامِ طیب" کے بارے میں یہ کیوں کہتی ہے کہ وہ خود بخود پروردگار کی طرف بلند ہوتا ہے لیکن عملِ صالح کے بارے میں یہ کہتی ہے کہ خدا اسے اوپر لے جاتا ہے؟

اس سوال کا اس طرح جواب دیا جا سکتا ہے کہ "کلامِ طیّب" جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ایمان اور پاکیزہ عقیدے کی طرف اشارہ ہے اور وہ خدا کی طرف عین بلندی ہے کیونکہ ایمان کی حقیقت اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے لیکن "عمل صالح" کو وہ قبول کرتا ہے اور اس کی پذیرائی کرتا ہے، اور اس پر کئی گنا اجر دیتا ہے اور اسے بقاء و دوام بخشتا ہے اور بلندی عطا کرتا ہے۔ (غور کیجئے)

Marfat.com

(۱۱) وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ
اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ
وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ
كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ○
(۱۲) وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ
شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا
طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ
فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۱) خدا نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے کوئی مادہ حاملہ نہیں ہوتی اور نہ جنتی ہے مگر اس کے علم کے ساتھ اور کسی شخص کی عمر نہیں بڑھتی اور نہ کسی شخص کی عمر میں کمی ہوتی ہے مگر یہ کہ (علم خدا کی) کتاب میں لکھا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ خدا کے لیے آسان ہے۔

(۱۲) یہ دونوں دریا یکساں نہیں ہیں۔ ایک دریا کہ جس کا پانی شیریں اور پینے میں خوشگوار ہے اور ایک یہ کہ جو کھاری اور گلوگیر ہے (لیکن) تم دونوں سے ہی تر و تازہ گوشت کھاتے ہو، اور زینت کی چیزیں نکال کر پہنتے ہو، اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں ان کا سینہ چیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں (اور ہر طرف کو بڑھ رہی ہیں) تاکہ تم فضلِ خدا

Marfat.com

سے فائدہ اٹھاؤ اور شاید کہ تم (اس کی نعمتوں کا) شکر ادا کرو۔

تفسیر

شیریں اور شور پانی والے دریا یکساں نہیں ہیں

گزشتہ آیات میں توحید، معاد اور صفاتِ خدا کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں بھی جاندار مخلوقات اور آفاق میں اللہ کی بعض اور نشانیوں کا ذکر ہے کہ جو خدا کی قدرت کی بھی دلیل ہیں اس کے علم کی بھی اور امکانِ معاد کی بھی۔

پہلے مختلف مراحل میں انسان کی پیدائش کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "خدا نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا" (واللہ خلقکم من تراب)۔

"پھر نطفہ سے" (ثم من نطفة)۔

"پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے" (ثم جعلکم ازواجًا)۔

یہ تین مرحلے انسان کی خلقت کے مراحل میں سے ہیں، مٹی، نطفہ اور زوجیت۔

یہ بات مسلم ہے کہ انسان مٹی سے بنا ہے اس لحاظ سے بھی کہ انسانوں کے جدِّ اعلیٰ حضرت آدمؑ مٹی سے پیدا ہوئے اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ تمام مادے کہ جو جسم انسانی کو تشکیل دیتے ہیں یا انسان اُن سے غذا لیتا ہے، یا اُس کا نطفہ ان سے بنتا ہے وہ سب کے سب مٹی ہی سے نشوونما پاتے ہیں۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ مٹی سے پیدائش صرف پہلی خلقت کی طرف اشارہ ہے لیکن نطفہ سے پیدائش بعد کے مراحل کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ پہلے انسانوں کی خلقت کا اجمالی مرحلہ ہے (کیونکہ سب کا وجود آدم کے وجود سے چلتا ہے) اور دوسرا مرحلہ تفصیلی ہے کہ جس میں انسان ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے۔

جبکہ زوجیت کا مرحلہ نسلِ انسانی کے تسلسل اور اضافے کا مرحلہ ہے۔

نیز یہ جو بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ "ازواج" یہاں "اصناف" یا "روح وجسم" وغیرہ کے معنی میں ہے، بہت بعید نظر آتا ہے۔

اس کے بعد حیاتِ انسانی کے چوتھے اور پانچویں مرحلے کا ذکر ہوتا ہے اور ماؤں کے حاملہ ہونے اور بچہ جننے کے بارے میں بات کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "کوئی مادہ حاملہ نہیں ہوتی اور بچہ نہیں جنتی مگر وہ خدا کے علم میں ہوتا ہے" (وما تحمل من انثیٰ ولا تضع الّا بعلمه)۔

حمل ٹھہرنا اور پھر جنین کی حالت میں بہت ہی عجیب اور پیچیدہ تبدیلیاں اور اس کے بعد وضع حمل

Marfat.com

یہ حساس اور حیرت انگیز تغیرات کہ جو ایک طرف ماؤں کو اور دوسری طرف جنین کو پیش آتے ہیں، اتنے عمیق اور دقیق ہیں کہ جو خدا کے بے پایاں علم کے بغیر ممکن نہیں ہیں، کیونکہ اگر ان پر حکم فرما نظام سوئی کی نوک کے برابر بھی معطل ہو جائے، تو حمل یا وضع حمل کے سارے پروگرام میں خلل واقع ہو جائے اور معاملہ تباہی تک پہنچ جائے۔

انسان کی زندگی کے ان پانچ مرحلوں میں سے ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر عجیب اور تعجب خیز ہے۔

بے جان مٹی کہاں اور زندہ، عقل مند، صاحب ہوش اور نو بہ نو کام کرنے والا انسان کہاں؟ بے قدر و قیمت نطفہ کہ جو متعفن پانی کے چند قطروں سے بنا ہے کہاں؟ صاحب رشد، خوبصورت مختلف حواس کا حامل اور طرح طرح کی کاریگری کا مظہر انسان کہاں؟[1]

جب ہم اس مرحلہ سے گزر جاتے ہیں تو نوع انسان کی دو صنفوں "مذکر" اور "مؤنث" میں تقسیم کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ اس میں جسم اور فزیالوجی کے حوالے سے بہت سے اختلافات موجود ہیں۔ یہ دونوں انعقاد نطفہ کے آغاز ہی سے اپنے اپنے راستے ایک دوسرے سے جدا کر لیتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک اپنی ذمہ داری کے مطابق آگے بڑھتے ہیں اور تکامل و ارتقاء کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

اس کے بعد اس بار کو قبول کرنے، اٹھانے، اس کی حفاظت کرنے، غذا دینے اور پرورش کرنے کے لیے ماں کی ذمہ داری کا ذکر آتا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس نے صدیوں سے عظیم علماء اور دانشوروں کے افکار کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوا ہے اور وہ اس بات کے معترف ہیں کہ یہ مسئلہ عالم ہستی کے عجیب ترین مسائل میں سے ہے۔

آخری مرحلہ بچہ کی پیدائش کا ہے، یہ ایک نہایت سخت اور تغیراتی مرحلہ ہے کہ جو بہت سے عجائبات کا حامل ہے۔ وہ کون سے عوامل ہیں کہ جو بچے کو شکم مادر سے باہر نکلنے کا حکم دیتے ہیں؟ اس حکم اور اندام مادر کا اس کے لیے آمادہ ہونا، ان دونوں کے درمیان کیسی مکمل ہم آہنگی برقرار ہوتی ہے؟

بچہ اس وضع و کیفیت کو کہ جس کا وہ نو ماہ سے عادی تھا لحظہ بھر میں کیسے بالکل بدل دیتا ہے اور ماں سے اپنا رابطہ منقطع کر لیتا ہے اور آزاد ہوا سے استفادہ کرنے لگتا ہے۔ اس کی غذا کی آمد و رفت

---

[1] "نطفہ" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اصل میں پانی یا تھوڑے سے صاف پانی کو کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس تھوڑے سے پانی کے لیے یہ لفظ بولا جانے لگا کہ جو انعقاد جنین کی بنیاد بنتا ہے۔

Marfat.com

بندِ ناف کی راہ سے اچانک بند ہو جاتی ہے اور غذا کی آمد و رفت کے لیے ایک نیا راستہ یعنی اس کا منہ کام کرنے لگتا ہے۔ ماں کے پیٹ کا تاریک ماحول چھوڑ کر روشنی میں آجاتا ہے اور ان تمام تغیرات کا مقابلہ کرتا ہے اور فوری طور پر خود کو ان کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔

کیا یہ خدا کے بے پایاں علم و قدرت کی بہترین نشانی نہیں ہے؟ اور کیا بے شعور مادہ اور بے ہدف طبیعت اور اندھے اتفاقات زنجیرِ خلقت کے ہزاروں حلقوں میں سے ایک چھوٹے سے حلقے کی تنظیم کا کام بھی سرانجام دے سکتے ہیں؟ کس قدر بے انصافی ہے کہ انسان اپنی خلقت کے بارے میں اس قسم کے موہوم خیالات کو قبول کرلے۔

اس کے بعد اس عجیب و غریب نظامِ عمل کے چھٹے اور ساتویں مرحلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ عمر کے مختلف مراحل کی مختلف عوامل کے زیرِ اثر زیادتی اور کمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "کوئی شخص طولانی عمر نہیں پاتا اور کسی کی عمر میں کمی نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ خدا کے علم کی کتاب میں ثبت ہے" یہ کام ایسے قوانین اور نظام کی پیروی کرتا ہے، کہ جن پر اس کا علم و قدرت حکم فرما ہے (ومایعمر من معمر ولاینقص من عمرہ الّا فی کتاب)[1]

وہ کون سے عوامل ہیں جو حیاتِ انسانی کو جاری رکھنے میں مؤثر ہیں اور وہ کون سے عوامل ہیں کہ جو اس کی حیات کو جاری رکھنے کی مخالفت کرتے ہیں؟ یعنی وہ کون سے عوامل ہیں کہ جن کے ہوتے ہوئے انسان سو سال یا اُس سے کم و بیش زندگی کو جاری رکھ سکے، اور وہ کون سے عوامل ہیں کہ جو انسانوں کی عمر میں اختلاف کا سبب بنتے ہیں؟

یہ سب کے سب امور دقیق اور پیچیدہ حقائق رکھتے ہیں، کہ جن سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں ہے موجودہ زمانے میں ہم جو کچھ اس سلسلے میں جانتے ہیں وہ اس کے مقابلے میں کہ جسے ہم نہیں جانتے بہت ہی کم ہے اور زیادہ قدر و قیمت کا حامل نہیں ہے۔

"معمّر" "عمر" کے مادہ سے ہے۔ اصل میں یہ لفظ "عمارت" سے لیا گیا ہے کہ جو آبادی کے معنی میں ہے۔ یہ جو حیاتِ انسانی کی مدت کو "عمر" کہا جاتا ہے تو یہ اس بنا پر ہے کہ اس کے بدن کی "عمارت" اور آبادی اسی مدت میں ہے۔ "معمّر" اس شخص کے معنی میں ہے کہ جس کی عمر طولانی ہو۔

آخرکار آیت کو اس جملے پر ختم کردیا گیا ہے: "یہ سب کچھ خدا کے لیے آسان ہے" (انّ ذالک علی اللہ یسیر)۔

---

[1] "کتاب" سے مراد خدا کا بے پایاں علم ہے اور یہ جو بعض اس سے لوحِ محفوظ یا "حیاتِ انسانی کا نامہ اعمال" مراد لیتے ہیں تو یہ مفہوم بھی علمِ خدا کی طرف لوٹتا ہے۔

Marfat.com

اس عجیب و غریب موجود کی "مٹی" سے خلقت اور "نطفہ کے پانی" سے ایک کامل انسان کی خلقت کا آغاز اور اسی طرح زوجیت، حمل، وضع حمل اور عمر کی زیادتی و کمی سے متعلق مسائل چاہے وہ قدرت کے لحاظ سے ہوں یا علم و حساب کے لحاظ سے، سب کے سب اس کے لیے سہل اور آسان ہیں۔ یہ سب دنیائے انفس میں اُس کی نشانیوں کا ایک گوشہ ہے۔ یہ امور ایک طرف تو ہمیں عالمِ ہستی کے مبداء سے مربوط و آشنا کرتے ہیں اور دوسری طرف معاد و قیامت کے امکان پر زندہ دلائل شمار ہوتے ہیں۔

وہ ذات کہ جو "مٹی" اور "نطفہ" سے پہلی خلقت پر قادر ہے کیا وہ انسانوں کی حیاتِ نو پر قادر نہیں ہے؟

اور وہ ذات کہ جو ان قوانین سے مربوط تمام جزئیات سے باخبر ہے کیا اسے بندوں کے حساب کتاب کو قیامت کے میدان کے لیے محفوظ رکھنے میں کوئی مشکل ہوگی؟

⁂ ⁂ ⁂

بعد والی آیت میں آفاق میں اس کی عظمت و قدرت کی کچھ نشانیاں ذکر کی گئی ہیں، دریاؤں کی خلقت اور ان کی برکات و فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "دو دریا یکساں نہیں ہیں، اُن میں سے ایک عمدہ، شیریں اور پینے میں خوشگوار ہے اور ان میں سے دوسرا کھاری اور گلوگیر ہے" (وما یستوی البحران هٰذا عذب فرات سائغ شرابه وهٰذا ملح اجاج)[1]

اگرچہ وہ دونوں پہلے دن تو بارش کے شیریں قطرات کی شکل میں آسمان سے زمین پر برسے تھے اور دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا، لیکن اب گویا دونوں کا چہرہ مختلف ہے اور مختلف فوائد کے حامل ہیں۔

اور تعجب کی بات یہ ہے کہ: "تم ان دونوں ہی سے ترو تازہ گوشت کھاتے ہو" (ومن کل تأکلون لحمًا طریًّا)۔

"اور دونوں سے ہی پہننے کے لیے زینت کی چیزیں نکالتے ہو" (وتستخرجون حلیة تلبسونها)۔ علاوہ ازیں دونوں ہی سے مال و متاع اور نقل و حمل کے لیے فائدہ اٹھاتے ہو، لہٰذا "تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ جو ہر طرف دریاؤں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں، تاکہ تم خدا کے فضل سے فائدہ اٹھاؤ، شاید اس کے شکر کا حق ادا کرو" (وتری الفلک فیه مواخر لتبتغوا من فضله ولعلکم تشکرون)۔

---

[1] "عذب" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے پاکیزہ اور سرد کے معنی میں ہے اور "لسان العرب" میں اس کا معنی صرف پاکیزہ پانی بیان ہوا ہے (الماء الطیب) ممکن ہے کہ اس کا ٹھنڈا و شیریں ہونا بھی "طیب" کے مفہوم میں داخل ہو۔

Marfat.com

چند قابلِ غور نکات

۱۔ "فرات" "لسان العرب" کے مطابق ایسا پانی ہے کہ جو بہت صاف ستھرا اور شیریں ہو۔ "سائغ" اس پانی کے معنی میں ہے کہ جو خوشگوار ہونے کی وجہ سے آسانی کے ساتھ گلے سے نیچے چلا جاتا ہے، "ملح" (شور پانی) کے برعکس۔ جبکہ "اجاج" ایسا کڑوا پانی ہے کہ جس سے گلے میں جلن ہو اور جو حلق کو بند کر دے۔

۲۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ مؤمن و کافر کی عدم مساوات کی ایک مثال ہے۔ لیکن قبل و بعد کی آیات کہ جو خلقت کی نشانیوں کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ یہ جملہ بھی اسرارِ توحید کے سلسلے میں ہے اور پانی کی مختلف قسموں، مختلف آثار اور مشترک فوائد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۳۔ اس آیت میں دریاؤں اور سمندروں کے بہت سے فوائد میں سے تین فائدے بیان ہوئے ہیں۔ ۱۔ غذا۔ ۲۔ زینت کی چیزیں، اور ۳۔ نقل و حمل۔

ہم جانتے ہیں کہ سمندر اور دریا نوع بشر کے منابع غذائی میں سے ایک اہم منبع ہے، اور ہر سال کئی ملین ٹن گوشت اس سے حاصل کیا جاتا ہے، بغیر اس کے کہ انسان اس کے لیے تکلیف اور مشقت اٹھائے۔ کارخانۂ قدرت نے اس سلسلے میں ایک دقیق نظام بنایا ہے تاکہ انسان خدا کے اس بچھے ہوئے دستر خوان اور خوانِ نعمت سے تھوڑی سی زحمت کر کے فائدہ حاصل کریں۔

زینت و تزئین کی مختلف چیزیں "صدف"، "موتی" اور "مرجان" اس سے نکالے جاتے ہیں۔ قرآن نے اس مسئلے کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ انسان کی روح چوپاؤں کی طرح نہیں ہے بلکہ مختلف جہات کی حامل ہے کہ جن میں سے ایک زیبائش کی حس ہے جو ذوق، ہنر اور ادب کا سرچشمہ ہے۔ یہ انسانی حس اگر ہر قسم کے افراط و تفریط اور اسراف و تبذیر سے بچتے ہوئے صحیح صورت میں سیر ہو تو یہ روح کی شادابی کا باعث ہے اور اس سے انسان کو نشاط اور سکون ملتا ہے اور وہ زندگی کے سخت کاموں کی انجام دہی کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔

باقی رہا نقل و حمل کا مسئلہ تو یہ انسانی تمدن اور معاشرتی زندگی کی ایک اہم بنیاد ہے۔ سمندروں نے زیادہ تر زمین کے حصے کو گھیر رکھا ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، اس امر کی طرف توجہ کی جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نقل و حمل کے سلسلے میں سمندر انسانوں کی نہایت اہم خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔

اس سازوسامان کا حجم کہ جس کی سمندروں کے ذریعے نقل و حمل ہوتی ہے اور وہ مسافر کہ جو ان

Marfat.com

کے ذریعے اِدھر اُدھر آتے جاتے ہیں، اس قدر زیادہ ہیں کہ کسی بھی دوسرے ذریعے پر اس کا قیاس نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ بعض اوقات ایک سمندری جہاز ہزارہا موٹروں اور ٹرکوں کے برابر بار اٹھا کر لے جاتا ہے [۱]

۴۔ البتہ سمندروں کے فوائد مذکورہ مسائل تک ہی منحصر نہیں ہیں اور قرآن ان کو ان ہی تین امور میں محدود نہیں کرتا، بادل ان سے بنتے ہیں، دوائیوں کے لیے مواد، تیل، پہننے کی چیزیں، بنجر زمینوں کی تقویت کے لیے مواد ان سے حاصل ہوتا ہے۔ ہَواؤں کے پیدا ہونے میں ان کا کردار بھی قابلِ ذکر ہے اور ان کے علاوہ سمندروں کی اور بھی برکات بہت سی ہیں۔

۵۔ "لحماً طریًا" (تر و تازہ گوشت) پر قرآن کا اظہار اس قسم کے گوشت کے غذائی فوائد کے بارے میں، پرانے اور ڈبوں میں بند اور اسی قسم کے دوسرے گوشتوں کے مقابلے میں — ایک پُرمعنی اشارہ ہے۔

۶۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کڑوے اور شور سمندر تو سارے کرۂ زمین میں پھیلے ہوتے ہیں لیکن میٹھے پانی کے سمندر کہاں ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میٹھے پانی کے سمندر اور بحیرے بھی کرۂ زمین میں کم نہیں ہیں مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ وغیرہ میں میٹھے پانی کے چھوٹے چھوٹے سمندر ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے دریاؤں کو بھی "بحر" کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے واقعے میں لفظ "بحر" کا دریائے نیل پر اطلاق ہوا ہے۔ (بقرہ - ۵۰، شعراء - ۶۳ اور اعراف ۱۳۸)۔

اس سے قطع نظر بڑے بڑے دریاؤں کا پانی سمندروں کے اندر تک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ سمندروں کے شور پانی کو پیچھے دھکیل دیتا ہے اور کچھ عرصے تک ان میں مخلوط نہیں ہوتا۔ اس طرح وہ خود میٹھے پانی کا ایک عظیم سمندر بنا دیتا ہے۔

۷۔ "لتبتغوا من فضله" (تاکہ اس کے فضل سے فائدہ اٹھاؤ) یہ جملہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس میں ہر وہ اقتصادی نقل و حرکت شامل ہے کہ جو سمندروں کے راستے سے ہوتی ہے۔

اور "لعلکم تشکرون" کا جملہ انسانوں کے احساسِ شکر گزاری کو بیدار کرنے کے لیے آیا ہے اور یہ احساس خدا جوئی اور خدا شناسی کے لیے ایک ذریعہ ہے۔

❖ ❖ ❖

---

[۱] اس وقت بھی پانچ لاکھ ٹن تک تیل لے جانے والے جہاز موجود ہیں۔ نقل و حمل کا کوئی بھی دوسرا ذریعہ ان کی جگہ نہیں لے سکتا اور سمندروں کے علاوہ کوئی بھی راستہ اس کو اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ گزشتہ زمانوں میں بھی کشتیوں اور بحری جہازوں کی صلاحیت چوپاؤں کی نسبت بہت زیادہ تھی۔

Marfat.com

طویل عمر اور کم عمر کے روحانی عوامل

زیر بحث آیات میں پروردگار کے فرمان سے عمر کی زیادتی اور کمی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں روایات بھی وارد ہوئی ہیں۔ اسی مناسبت سے مفسرین نے بھی عمر کے طویل اور کوتاہ ہونے کے بارے میں کئی بحثیں کی ہیں۔

البتہ طبیعی عوامل کا ایک سلسلہ عمر کی زیادتی یا کمی میں دخل رکھتا ہے کہ جن میں سے بہت سے عوامل کو نوعِ بشر نے اب تک پہچان لیا ہے۔ مثلاً افراط و تفریط سے بچتے ہوئے صحیح غذا کھانا، کام اور حرکت میں رہنا، ہر قسم کے نشے، خطرناک عادات اور الکحل کی مشروبات سے پرہیز کرنا، ہر وقت کے ہیجانات سے دُور رہنا اور قوی اور مضبوط ایمان رکھنا کہ جو انسان کی زندگی کی ناہمواریوں میں سکون بخش سکے۔

ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے عوامل ہیں کہ جن کا طول عمر کے ساتھ ظاہری ارتباط ہم پر چنداں واضح نہیں ہے۔ مگر روایاتِ اسلامی میں ان کے بارے میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ذیل کی چند روایات پر توجہ فرمائیں:

الف۔ پیغمبر گرامیؐ فرماتے ہیں:

ان الصدقة وصلة الرحم تعمران الديار، وتزيدان فی الاعمار۔

راہِ خدا میں خرچ کرنا اور صلہ رحمی گھروں کو آباد اور عمروں کو زیادہ کرتا ہے [1]

ب۔ ایک اور حدیث میں رسولِ اکرمؐ ہی سے منقول ہے:

من سره ان يبسط فی رزقه و ينسی له فی اجله فليصل رحمه۔

جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اُس کے رزق میں زیادتی ہو، اور اس کی اجل میں تاخیر ہو تو اسے چاہیئے کہ صلہ رحمی کرے [2]

ج۔ بعض گناہوں بالخصوص زنا اور بدکاری کے متعلق وارد ہوا ہے کہ وہ انسان کی عمر میں کمی کا باعث بنتے ہیں۔ پیغمبرِ اکرمؐ کی مشہور حدیث میں ہے کہ:

يا معشر المسلمين اياكم والزنا فان فيه ست خصال: ثلاث فی الدنيا، وثلاث فی الأخرة، اما التی فی الدنيا فانه يذهب بالبهاء و يورث الفقر و ينقص العمر۔

اے مسلمانو! زنا سے پرہیز کرو کیونکہ اس کے چھ بُرے نتائج ہیں، تین دنیا میں اور

---

[1] و [2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۵۴ و ص ۳۵۵۔

Marfat.com

تین آخرت میں۔ وہ تین کہ جو دنیا میں ہیں یہ ہیں: انسان کے (چہرے) کی رونق اور نورانیت ختم ہو جاتی ہے، فقر و فاقہ اور تنگدستی آجاتی ہے اور انسان کی عمر کم ہو جاتی ہے[1]

د۔ امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

البر و صدقة السر ینفیان الفقر و یزیدان فی العمر و یدفعان عن سبعین میتة سوء۔

نیکوکاری اور پوشیدہ طریقے سے صدقہ دینا فقر و فاقہ کو دُور کرتا ہے، عمر میں زیادتی کرتا ہے اور ستر قسم کی بُری موت سے بچاتا ہے[2]

بعض دوسرے گناہوں کے متعلق مثلاً ظلم بلکہ مطلق گناہوں کے بارے میں بھی کچھ اشارے آئے ہیں۔

بعض مفسرین کہ جو "اجل حتمی" اور "اجل معلق" کے درمیان فرق نہیں کرسکے، انہوں نے اس قسم کی احادیث پر سخت اعتراض کیا ہے اور انہیں نصوصِ قرآنی کے مخالف سمجھا ہے کیونکہ وہ انسان کی حدِ عمر کو ثابت اور غیر متبدل سمجھتے ہیں[3]

اس کی وضاحت

اس میں شک نہیں کہ انسان دو قسم کی اجل رکھتا ہے۔

ایک اجل حتمی کہ جو جسمِ انسانی کی استعدادِ بقاء کا اختتام ہے۔ اس کے پہنچ جانے سے ہر چیز فرمانِ الٰہی سے ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری اجل معلق کہ جو حالات و شرائط بدلنے کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ مثلاً ایک انسان خودکشی کرلیتا ہے حالانکہ وہ اگر اس گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کرتا تو شاید سالہا سال زندہ رہتا۔ اسی طرح الکحل کے مشروبات، نشہ آور چیزیں اور بے لگام شہوت پرستی سے بھی انسان اپنے جسم کی توانائی مختصر سی مدت میں کھو بیٹھتا ہے، حالانکہ اگر یہ امور نہ ہوتے تو وہ سالہا سال تک زندہ رہ سکتا تھا۔

یہ ایسے امور ہیں کہ جو سب کے لیے قابلِ ادراک ہیں اور تجربے میں آچکے ہیں اور کوئی بھی ان کا انکار نہیں کرسکتا۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۵۴ و ص ۳۵۵۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۲۳ مادۃ "صدقہ"۔

[3] تفسیر آلوسی جلد ۲۲ ص ۱۶۳ (زیر بحث آیات کے ذیل میں)۔

Marfat.com

اچانک پیش آنے والے واقعات اور حادثات کے بارے میں کچھ امور اجل معلق کے ساتھ مربوط ہیں کہ جو قابل انکار نہیں ہیں ۔

اس بناپر اگر بکثرت روایات میں یہ منقول ہوا ہے کہ راہ خدا میں خرچ کرنا یا صلہ رحمی عمر کو طولانی کر دیتا ہے اور مصیبتوں کو برطرف کر دیتا ہے تو وہ بھی حقیقت میں انہیں عوامل کے پیشِ نظر ہے ۔

اگر ہم اجل اور عمر کے خاتمہ کی یہ دو قسمیں ایک دوسرے سے جدا نہ کریں تو قضا و قدر اور سعی و کوشش کے اثرات سے مربوط بہت سے مسائل انسانی زندگی میں لاینحل ہو کر رہ جائیں ۔

اس بحث کو ایک عام اور سادہ مثال کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان نئی موٹروں کا ایک کارخانہ لگاتا ہے ۔ فرض کریں کہ مختلف تخمینوں کے مطابق کہ وہ بیس سال تک چل سکتی ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پوری احتیاط کے ساتھ ان کی دیکھ بھال کی جائے اور ضروری حفاظت کی جائے ۔ اس صورت میں اس موٹر کی حتمی عمر بیس سال ہوگی کہ جس سے آگے وہ نہ چل سکے گی ۔

لیکن اگر ضروری حفاظت اور دیکھ بھال نہ کی جائے اور اسے ناواقف اور بے پرواہ لوگوں کے سپرد کر دیا جائے اور اس سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لیا جائے ، روزانہ سنگلاخ راستوں پر اسے چلایا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس کی بیس سالہ عمر آدھی رہ جائے یا دسویں حصے تک کم ہو جائے تو یہ اس کی "اجل معلق" ہے ۔

ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ بعض مشہور مفسرین نے اس قسم کے واضح اور روشن مسئلے کی طرف توجہ کیوں نہیں کی ہے ۔

Marfat.com

(۱۳) يُولِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ لا
وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِى لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ط
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ط وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ
مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝ؕ
(۱۴) اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ج وَلَوْ سَمِعُوْا مَا
اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ط وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ط وَلَا
يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝ع

ترجمہ

(۱۳) وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔ سورج اور چاند کو اس نے (تمہارے لیے) مسخر کر دیا ہے، ان میں سے ہر ایک کو ایک معین وقت تک اپنی حرکت جاری رکھتا ہے۔ یہ ہے تمہارا پروردگار اللہ (سارے عالم کی) حاکمیت اسی کے لیے ہے۔ اور جنہیں تم اس کے علاوہ پکارتے ہو (اور ان کی عبادت کرتے ہو) وہ تو کھجور کی گٹھلی کی نازک جھلی کے برابر بھی حاکمیت (اور مالکیت) نہیں رکھتے۔

(۱۴) اگر تم انہیں پکارو گے تو وہ تمہاری آواز نہیں سنیں گے اور اگر سن بھی لیں تو تمہیں کوئی جواب نہیں دیں گے، اور قیامت کے دن تمہارے شرک (اور پرستش) کا انکار کر دیں گے اور کوئی بھی تجھے خبیر (اور آگاہ خدا) کی مانند (حقائق سے)

Marfat.com

باخبر نہیں کرے گا۔

تفسیر

یہ جھوٹے معبود تو تمہاری آواز تک نہیں سنتے

ان آیات میں قرآن ایک مرتبہ پھر توحید کی نشانیوں اور پروردگار کی بے پایاں نعمتوں کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ انسان کے احساس تشکر کو ابھار کر اُسے معبودِ حقیقی کی شناخت کی طرف لایا جائے اور اسے ہر قسم کے شرک اور بے ہودہ عبادتوں سے باز رکھا جائے، فرمایا گیا ہے: "وہ وہی ہے کہ جو رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے" (یولج الیل فی النھار و یولج النھار فی الیل)۔

"یولج" "ایلاج" کے مادہ سے داخل کرنے کے معنی میں ہے ممکن ہے اس لفظ سے ذیل کے دو معانی میں سے ایک کی طرف یا دونوں کی طرف اشارہ ہو۔

۱۔ سال بھر میں رات دن کی تدریجی زیادتی اور کمی کہ جو۔ اپنے تمام آثار و برکات کے ساتھ۔ مختلف موسموں کی پیدائش کا سبب ہے۔

شفق اور بین الطلوعین کے ذریعے رات کا دن میں اور دن کا رات میں بتدریج منتقل ہونا، کہ جو اچانک اور ناگہانی طور پر ظلمت سے نور کی طرف اور نور سے ظلمت کی طرف منتقل ہونے کے خطرات سے روکتا ہے، اور انسان کو مکمل اور بے خطر ایک کیفیت سے دوسری میں جانے کے قابل بناتا ہے[1]

اس کے بعد سورج اور چاند کی تسخیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے" (وسخر الشمس والقمر)۔

اس سے بڑھ کر اور تسخیر کیا ہوگی کہ وہ سب انسان کے فائدے میں حرکت کر رہے ہیں اور انسانی زندگی میں انواع و اقسام کی برکات کا سرچشمہ ہیں۔ اَبر، ہَوا، سورج، چاند اور فلک سب کے سب کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ انسان اپنی زندگی کو سنوار سکے اور غفلت میں وقت نہ گزارے اور مسلسل ان نعمات کے اصل منبع کی یاد میں رہے۔ (سورج اور چاند کی تسخیر کے سلسلے میں ہم جلد ۱۰ سورہ رعد کی آیہ ۲ اور سورہ ابراہیم کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں)۔

لیکن یہ سورج اور چاند باوجودیکہ پورے طور پر منظم طریقے سے اپنے راستے پر چل رہے ہیں اور انسان

---

[1] رات اور دن کی تدریجی تبدیلی کے بارے میں جلد دوم میں سورہ آل عمران کی آیہ ۲۷ کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے۔

Marfat.com

کے اچھے خدمت گزار ہیں، تاہم جو نظام ان پر حاکم ہے وہ جاودانی اور ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ یہاں تک کہ یہ عظیم سیارے بھی باوجود اس نور کے آخرکار تاریک اور بے کار ہو جائیں گے۔

اس لیے قرآن تسخیر کے بارے میں بات کرنے کے بعد مزید کہتا ہے: "ان دونوں میں سے ہر ایک ایک خاص زمانے تک کہ جو ان کے لیے معین ہوا ہے اپنی حرکت جاری رکھے گا" (کل یجری لاجل مسمّی)۔

اور "اذا الشمس کورت، واذا النجوم انکدرت" (تکویر - ۱ و ۲) کے تقاضے کے مطابق آخرکار یہ سب کے سب تاریکی اور خاموشی میں ڈوب جائیں گے۔

بعض مفسرین نے "اجل مسمّی" (معین وقت) کے لیے ایک دوسری تفسیر کی ہے اور وہ سورج اور چاند کی حرکت دوری ہے کہ جن میں سے پہلی ایک سال میں مکمل ہوتی ہے اور دوسری ایک ماہ میں ختم ہوتی ہے۔[۱]

لیکن قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ تعبیر عمر کے ختم ہونے کے معنی میں آئی ہے۔ ان مواقع استعمال کی جانب توجہ کی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ تفسیر درست نہیں ہے اور پہلی تفسیر ہی درست ہے یعنی چاند اور سورج کی عمر کا اختتام۔ (نحل - ۶۱، فاطر - ۴۵، زمر - ۴۲، نور - ۴ اور مؤمن - ۶۷ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

پھر توحید کی اس بحث سے نتیجہ نکالنے کے طور پر فرمایا گیا ہے: "یہ ہے خدا تمہارا عظیم پروردگار" (ذالکم الله ربکم)۔

وہ خدا کہ جس نے سورج اور چاند کے نور و ظلمت اور حرکات کے حساب شدہ نظام کو تمام برکات کے ساتھ مقرر فرمایا ہے۔

"عالم ہستی میں حاکمیت اسی کے ساتھ مخصوص ہے" (له الملك)۔

"اور وہ معبود کہ جنہیں تم اسے چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ تو کھجور کی گٹھلی کے اوپر کی نازک جھلی کے برابر بھی عالم ہستی میں حق حاکمیت اور مالکیت نہیں رکھتے" (والذین تدعون من دونه ما یملکون من قطمیر)۔[۲]

"قطمیر" مفردات میں راغب کے مطابق وہ جھلی ہے کہ جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتی ہے اور مجمع البیان میں طبرسی کے مطابق اور تفسیر قرطبی کے مطابق یہ ایک پتلا سا سفید رنگ کا چھلکا ہے کہ جو پوری گٹھلی کو چھپائے ہوتا ہے۔

---

[۱] تفسیر روح المعانی اور ابوالفتوح رازی۔

[۲] الذین کی تعبیر کہ جو عام طور پر جمع مذکر عاقل کے لیے آتی ہے، بتوں کے بارے میں مشرکین کے توہم کی بنا پر ہے کہ جو وہ ان بے جان موجودات سے متعلق رکھتے تھے۔ قرآن انہی کی تعبیر ذکر کرکے، پھر اس کی سختی سے تردید کرتا ہے۔

Marfat.com

بہر حال یہ بہت ہی چھوٹی اور حقیر اسم چیز کی طرف اشارہ ہے۔

جی ہاں! یہ بُت نہ تو کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان، نہ وہ تمہارا دفاع کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنا، نہ وہ حاکمیت رکھتے ہیں اور نہ ہی مالکیت۔ یہاں تک کہ کھجور کی گٹھلی کے اوپر کی جھلی پر بھی نہیں اس حالت میں تم بے عقل کس طرح ان کی پرستش کرتے ہو اور اپنی مشکلات کا حل ان سے چاہتے ہو۔

ٹ ٹ ٹ

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: "اگر تم انہیں اپنی مشکلات کے حل کے لیے پکارو تو وہ ہرگز تمہاری پکار نہیں سنتے" (ان تدعوھم لا یسمعوا دعائکم)۔

کیونکہ وہ چند پتھروں اور لکڑی کے ٹکڑوں کے علاوہ کچھ نہیں ہیں، وہ بے شعور جمادات ہی تو ہیں۔

"اور بالفرض وہ تمہارے نالہ و فریاد کو سن بھی لیں تب بھی وہ تمہاری حاجات کا جواب دینے کی توانائی نہیں رکھتے" (ولو سمعوا ما استجابوا لکم)۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ تو کھجور کی گٹھلی کی جھلی کے برابر بھی عالم ہستی میں سود و زیاں کے مالک نہیں ہیں، اس کے باوجود تم کس طرح سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے لیے کوئی کام کر سکیں گے یا تمہاری کوئی مشکل آسان کر سکیں گے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ "جب قیامت کا دن ہوگا تو وہ تمہاری عبادت اور شرک کا انکار کر دیں گے" (ویوم القیامة یکفرون بشرککم)۔

اور کہیں گے کہ خداوندا! یہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے، بلکہ حقیقت میں یہ تو اپنے نفس کی پرستش کرتے تھے۔

یہ گواہی یا تو زبان حال کے ساتھ ہے، کہ جو شخص بتوں کی حالت کو دیکھے تو وہ گوش ہوش کے ساتھ یہ بات ان سے سنتا ہے اور یا یہ بات ہے کہ وہ خدا جو اس دن انسان کے اعضاء و جوارح اور بدن کی جلد کو قوت گویائی دے گا، انہیں بھی بات کرنے کا فرمان جاری کرے گا، تاکہ وہ یہ گواہی دیں کہ یہ منحرف بُت پرست حقیقت میں اپنے اوہام اور خواہشات کی پرستش کرتے تھے۔

سورہ یونس کی آیت ۲۸ میں بھی ایسی بات بیان کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ویوم نحشرھم جمیعًا ثم نقول للذین اشرکوا مکانکم انتم وشرکاؤکم فزیلنا بینھم وقال شرکاؤھم ما کنتم ایانا تعبدون۔

"اور اس دن کو یاد کرو کہ جب ہم اُن سب کو جمع کریں گے، پھر ہم مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے معبود اپنی جگہ پر ٹھہرو (تاکہ تمہارا حساب کتاب چکایا جائے) پھر ہم انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیں گے (تاکہ ہر ایک سے الگ الگ سوال ہو) تو وہاں ان کے معبود ان سے کہیں گے، تم ہرگز ہماری

Marfat.com

عبادت نہیں کرتے تھے ۔
مفسرین کے ایک گروہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ تعبیر ملائکہ اور حضرت عیسیٰ جیسے "معبودوں" کے بارے میں ہے، کیونکہ قیامت میں صرف وہی بات کرسکیں گے اور "ان تدعوھم لا یسمعوا دعائکم" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں ایسے مشغول ہوں گے کہ اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری باتوں کو نہیں سنیں گے ۔[1]
لیکن "والذین تدعون من دونہ" کے مفہوم کی وسعت کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہے کہ مراد بُت ہی ہیں ۔ "ان تدعوھم لا یسمعوا دعائکم" (اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری آواز کو نہیں سنتے) یہ جملہ ظاہراً دنیا کے ساتھ مربوط ہے ۔
آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: "خدا کے مانند کہ جو ہر چیز سے آگاہ ہے، کوئی بھی تجھے باخبر نہیں کرے گا" (ولا ینبئك مثل خبیر) ۔
اگر وہ یہ کہتا ہے کہ بُت قیامت میں تمہاری پرستش کا انکار کردیں گے اور تم سے بیزاری اختیار کریں گے، تو اس سے تعجب نہ کرو، کیونکہ ایسی ذات اس موضوع کی خبر دے رہی ہے کہ جو تمام عالم ہستی اور اس کے ذرہ ذرہ سے آگاہ ہے، اس کے علم کی بارگاہ میں مستقبل بھی ماضی اور حال کی طرح آشکار ہے ۔
اگرچہ اس جملے میں ظاہراً ذاتِ پیغمبرؐ مخاطب ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ نظر تمام انسانوں پر ہے ۔

آیات سے سوءِ استفادہ اور انحرافی تفاسیر

اگرچہ آیات کی تفسیر کے دوران میں واضح ہوگیا ہے کہ آخری زیر بحث آیت "ان تدعوھم لا یسمعوا دعائکم" سے مراد بُت ہیں کہ جو اوّل تو اپنی عبادت کرنے والوں کے تقاضوں کو سننے والا کان ہی نہیں رکھتے، اور اگر رکھتے بھی تو ان کی مشکل حل کرنے پر قادر نہیں ہیں، اور نہ ہی وہ عالم ہستی میں سوئی کی نوک کے برابر مالکیت وحاکمیت رکھتے ہیں ۔
لیکن بعض ہٹ دھرم وہابیوں نے پیغمبرِ اسلامؐ اور ہادیانِ برحق پیشواؤں سے توسل اور شفاعت طلب کرنے کے خلاف اس آیت اور اسی قسم کی دوسری آیات کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے کہ وہ تمام لوگ کہ جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو یہاں تک کہ انبیاء اور پیغمبر بھی تمہاری بات نہیں سنتے اور اگر سنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے یا جیسا کہ سورہ اعراف کی آیہ ۱۹۷ میں بیان ہوا ہے کہ :

---

[1] یہ احتمال تفسیر مجمع البیان، تفسیر آلوسی اور قرطبی میں مذکور ہے ۔

Marfat.com

والذین تدعون من دونہ لا یستطیعون نصرکم ولا انفسھم ینصرون ۔

"خدا کے علاوہ جن جن کو تم پکارتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کرسکتے اور نہ اپنی مشکلات میں اپنی ہی مدد کرسکتے ہیں"۔

وہ لوگ اس قسم کی آیات اور اس طرح سے پیغمبروں اور آئمہ کے ارواح سے ہر قسم کے توسل کی نفی کرتے ہیں، اور اسے توحید کے مخالف شمار کرتے ہیں ۔

حالانکہ ان آیات سے پہلے اور بعد کی آیات پر ایک سرسری سی نگاہ اس حقیقت کے ادراک کے لیے کافی ہے کہ اس سے مراد بُت ہیں کیونکہ ان تمام آیات میں بتوں ہی کے بارے میں گفتگو ہے۔ پتھر اور لکڑی کے متعلق گفتگو ہے کہ جنہیں وہ خدا کا شریک خیال کرتے تھے اور وہ ان کے لیے خدا کی قدرت کے مقابلے میں قدرت کے قائل تھے ۔

لیکن کون نہیں جانتا کہ شہداء راہِ خدا کی طرح ۔۔ کہ جن کی زندگی کے بارے میں قرآن صراحت کے ساتھ بات کرتا ہے ۔۔ انبیاء واولیاء بھی حیاتِ برزخی کے حامل ہے اور ہم جانتے ہیں کہ برزخی زندگی میں روح کی فعالیت زیادہ وسیع اور کشادہ ہے ۔کیونکہ وہ مادی حجابات اور دنیوی تعلقات سے رہائی پاچکی ہوتی ہے ۔

دوسری طرف ان ارواحِ پاک سے توسل اس معنی میں نہیں ہے کہ ہم ان کے لیے خدا کے مقابلے میں کسی استقلال کے قائل ہوں ،بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کی جاہ ومنزلت جو بارگاہِ خدا میں ہے اس سے ہم مدد طلب کریں اور جو عظمت واحترام وہ درگاہِ خدا میں رکھتے ہیں اس سے مدد چاہیں اور یہ عین توحید اور عبودیتِ پروردگار ہے ۔ (غور کیجئے گا)

اس بناء پر جیسا کہ قرآن صراحت کے ساتھ مسئلہ شفاعت کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ خدا کے اذن اور فرمان سے شفاعت کریں گے :

من ذا الذی یشفع عندہ الّا باذنہ

"کون ہے کہ جو بارگاہِ خدا میں اس کے فرمان کے بغیر شفاعت کرسکے"۔ (بقرہ ۔ ۲۵۵)

اسی طرح ان سے توسل بھی اسی طریقے سے ہے ۔

کون شخص ہے کہ جو توسل کی صریح آیات کا انکار کرسکے ؟ یا اُسے شرک خیال کرے اور قرآن کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے اور پھر توحید کا دم بھرے سوائے ایسے مغرور جاہلوں کے کہ جنہوں نے ایسے منحوس راگ الاپے ہیں کہ جو مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اور اختلاف پیدا کرنے کا سبب ہیں ۔

لہٰذا ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کے حالات میں پڑھتے ہیں کہ وہ مشکلات کے وقت رسول اکرمؐ کی قبر کے پاس آتے تھے اور توسل قائم کرتے ہوئے آپؐ کی روح پاک سے بارگاہِ خداوندی میں مدد

Marfat.com

طلب کرتے تھے ۔

جیسا کہ اہلِ سنت کے مشہور محدث "بیہقی" نے نقل کیا ہے کہ خلیفۂ دوم کے زمانہ میں خشک سالی اور قحط پڑ گیا، تو حضرت بلالؓ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ پیغمبرِ اکرمؐ کی قبر کے پاس آئے اور اس طرح کہا:

یا رسول الله استق لامتك .... فانهم قد هلكوا

"اے خدا کے رسولؐ! اپنی امت کے لیے بارش طلب کیجیے... کہ وہ ہلاک ہوگئی ہے"[1]

آلوسی کے مانند اہلِ سنت کے بعض مفسرین نے اس سلسلے میں بہت سی احادیث نقل کی ہیں، آلوسی ان احادیث کے بارے میں سختی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں:

مَیں ان تمام باتوں کے باوجود بارگاہِ خدا میں پیغمبر کے مرتبے سے توسل میں کچھ مانع نہیں دیکھتا، چاہے وہ حیات ہوں یا ان کی وفات کے بعد...

اس کے بعد کچھ دوسرے لوگوں کا کہ جو بارگاہِ خدا میں مرتبہ و مقام رکھتے ہیں اضافہ کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ ان سے توسل رکھنا جائز ہے[2]

اس سلسلے میں ہم تفصیل بحث جلد ۴ میں سورۂ مائدہ کی آیت ۳۵ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

---

[1] از کتاب "التوصل الی حقیقۃ التوسل"۔

[2] روح المعانی۔

Marfat.com

(۱۵) یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ۚ وَاللّٰہُ
ھُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ○
(۱۶) اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡھِبۡکُمۡ وَیَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ○
(۱۷) وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیۡزٍ ○
(۱۸) وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ؕ وَاِنۡ تَدۡعُ مُثۡقَلَۃٌ
اِلٰی حِمۡلِھَا لَا یُحۡمَلۡ مِنۡہُ شَیۡءٌ وَّلَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی ؕ اِنَّمَا
تُنۡذِرُ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّھُمۡ بِالۡغَیۡبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ؕ وَمَنۡ
تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفۡسِہٖ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ الۡمَصِیۡرُ ○

ترجمہ

(۱۵) اے لوگو! تم خدا کے محتاج ہو اور صرف خدا ہی بے نیاز ہے اور ہر قسم کی حمد و ثنا کے لائق ہے۔

(۱۶) وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور ایک نئی مخلوق لے آئے۔

(۱۷) اور یہ امر خدا کے لیے ناممکن (اور مشکل) نہیں ہے۔

(۱۸) کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا اور اگر کوئی بھاری بوجھ والا کسی دوسرے کو اپنے گناہ کا بوجھ اٹھانے کے لیے بلائے، تو وہ اس میں سے کوئی چیز اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا، اگرچہ وہ اس کے نزدیکیوں میں سے ہی ہو۔ تم تو صرف انہیں لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو کہ جو

Marfat.com

بے دیکھے بھی اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو شخص پاکیزگی (اور تقویٰ) اختیار کرے تو اس کا نتیجہ اسی کو ملے گا اور سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے۔

تفسیر

کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا

گزشتہ آیات میں توحید کی دعوت تھی اور ہر قسم کے شرک اور بُت پرستی کی نفی کی گئی تھی ممکن ہے کہ اس سے بعض کے دل میں یہ توہم پیدا ہو کہ خدا کو ہماری پرستش کی کیا ضرورت ہے۔ اس قدر اصرار اور تاکید کیوں کی گئی ہے، اس لیے زیر بحث آیات میں اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے کہ ہمیں تو ضرورت ہے کہ اس کی عبادت کریں، وہ ہماری عبادت کا محتاج نہیں ہے، فرمایا گیا ہے: "اے لوگو! تم خدا کے محتاج ہو اور وہ ہر لحاظ سے بے نیاز اور حمد و ستائش کے لائق ہے" (یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید)۔

یہ کتنی اہم اور قیمتی گفتگو ہے کہ جو عالم ہستی میں ہمیں ہستی بخشنے والے کے سامنے ہماری حیثیت واضح کرتی ہے اور بہت سے عقدے کھولتی ہے اور بہت سے سوالات کا جواب دیتی ہے۔

ہاں! حقیقی بے نیاز اور تمام عالم ہستی میں قائم بالذات ایک ہی ہے اور وہ خدا ہے۔ تمام انسان بلکہ تمام موجودات سر تا پا احتیاج و فقر ہیں اور اس مستقل وجود کے ساتھ وابستہ ہیں، کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی ان کا ربط اُس سے ٹوٹ جائے تو وہ بے کار ہو کر رہ جائیں۔

جیسا کہ وہ بے نیاز مطلق ہے، انسان فقیر مطلق ہے اور جس طرح کہ وہ قائم بالذات ہے، ساری مخلوق اس کے ساتھ قائم ہے۔ کیونکہ وہ ہر لحاظ سے ایک لامتناہی وجود ہے اور ذات و صفات میں واجب الوجود ہے۔

تو ان حالات میں اُسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ہماری عبادت کا محتاج ہو، یہ تو ہم ہی ہیں کہ جو اس کی عبادت اور اطاعت کے ذریعے تکامل و ارتقا کی راہ طے کرتے ہیں اور بے پایاں فیض کے مبداء سے اس کی عبادت کے سائے میں لحہ بہ لحہ زیادہ سے زیادہ نزدیک ہوتے جاتے ہیں، اور اس کی ذات و صفات کے انوار سے بہرہ اندوز ہیں۔

حقیقت میں یہ آیت ان گزشتہ آیات کی ایک وضاحت ہے کہ جن میں فرمایا گیا ہے کہ:

Marfat.com

"ذالکم اللہ ربکم لہ الملک ....."

"یہ ہے خدا، تمہارا پروردگار، عالمِ ہستی کی مالکیت وحاکمیت اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔
دوسرے موجودات تو کھجور کی گٹھلی کی نازک جھلی کے برابر بھی اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتے۔"

اس بنا پر انسان اس کے محتاج ہیں نہ کہ کسی اور کے۔ انہیں ہرگز اس کے غیر کے آستانے پر سر نہیں جھکانا چاہیئے۔

اور اپنی حاجت اُس کے غیر سے طلب نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ وہ سب کے سب اس مانگنے والے کی طرح ہی نیازمند اور محتاج ہیں، یہاں تک کہ خدائی پیغمبروں اور پیشوایانِ حق کی بزرگی وعظمت بھی اس بنا پر ہے کہ وہ اس کے بھیجے ہوئے نمائندے ہیں، نہ کہ وہ اپنی طرف سے قائم ہیں۔

اس بنا پر وہ غنی بھی ہے اور حمید بھی یعنی بے نیاز ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر عطا والا ہے کہ ہر قسم کی حمد وستائش کے لائق ہے، اور بخشندگی اور بندہ نوازی کے ساتھ ساتھ سب سے بے نیازی بھی ہے۔

اس حقیقت پر توجہ مومن انسانوں میں دو مثبت اثر رکھتی ہے۔ ایک طرف تو وہ انہیں غرور وتکبر اور خودخواہی اور سرکشی سے بچاتی ہے اور انہیں خبردار کرتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتے کہ جس پر فخر کرسکیں جو کچھ بھی ان کے پاس ہے پروردگار کی امانت ہے۔

دوسری طرف اُس کے غیر کی بارگاہ میں دستِ نیاز دراز نہ کریں اور غیر اللہ کی عبودیت کا طوق اپنی گردن میں نہ ڈالیں اور ان تمام بندھنوں سے آزاد ہوکر ہمت سے کام لیں۔

مومنین اس نظر سے عالم میں جو کچھ دیکھتے ہیں اسے اسی کے وجود کا پرتو سمجھتے ہیں اور ان کے اسباب کی طرف توجہ انہیں ہرگز مسبب الاسباب سے غافل نہیں کرتی۔

بعض فلاسفہ نے اس آیت کو "فقر وامکان" یا "امکان و وجوب واجب الوجود" کے بارے میں مشہور دلیل کی طرف اشارہ سمجھا ہے اگرچہ آیت وجودِ خدا کا استدلال پیش نہیں کررہی بلکہ اس کے اوصاف بیان کررہی ہے لیکن مذکورہ برہان کو مفہوم آیت کا ایک لازمی نتیجہ سمجھا جاسکتا ہے۔

برہان امکان و وجوب (فقر وغنٰی) کی وضاحت

تمام موجودات کہ جنہیں ہم اس جہان میں دیکھتے ہیں، وہ سب کے سب ایک دن معدوم تھے، پھر انہوں نے لباسِ وجود پہنا یا زیادہ دقیق تعبیر کے مطابق ایک دن وہ کچھ بھی نہ تھے اور پھر وجود میں آئے۔ یہ امر اس چیز کی دلیل ہے کہ وہ کسی اور وجود کے "معلول" ہیں اور وہ خود سے کوئی وجود وہستی نہیں رکھتے۔

Marfat.com

ہم جانتے ہیں کہ ہر معلول وجود اپنی "علت" سے وابستہ اور اس کے ساتھ قائم ہے اور سراپا نیاز و احتیاج ہے۔ اب اگر وہ علت بھی کسی اور علت کی معلول ہو تو وہ بھی اپنے مقام پر محتاج اور نیاز مند ہوگی اور اگر یہ امر لامتناہی ہو تو نیاز مند اور محتاج موجودات کا ایک مجموعہ بن جائے۔ مسلّم ہے کہ اس قسم کا مجموعہ ہرگز وجود میں نہیں آسکتا، کیونکہ لامتناہی احتیاج بہرحال احتیاج ہے اور لامتناہی فقر و نیاز بہرحال فقر و نیاز ہے۔ اور لامتناہی صفر کسی عدد کو وجود نہیں بخش سکتے اور لامتناہی وابستہ اور غیر مستقل سے استقلال حاصل نہیں ہو سکتا۔

تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انجام کار ہمیں ایک ایسے وجود تک پہنچنا چاہیئے کہ جو قائم بالذات ہو اور تمام جہات سے مستقل ہو۔ وہ خود علت ہو لیکن کسی اور کا معلول نہ ہو، اور وہی واجب الوجود ہے[1]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ زیر بحث آیت میں صرف انسانوں اور ان کی خدا کی طرف احتیاج کے بارے میں گفتگو کیوں کی گئی ہے، جبکہ یہ فقر و احتیاج عالم ہستی میں عمومی حیثیت رکھتا ہے اور کائنات کی ہر چیز محتاج ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انسان جو کہ اس جہان کا گل سر سبد ہے، سر تا پا اس کا محتاج ہے تو پھر باقی موجودات کی حالت واضح ہے۔ دوسرے لفظوں میں باقی موجودات بھی علتِ فقر یعنی امکانِ وجود میں انسان کے ساتھ شریک ہیں۔

انسان کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اس بناء پر گفتگو کی گئی ہے کہ اسے مرکب غرور و تکبر سے نیچے اتارا جائے، اور وہ ہر حال میں ہر چیز کے لیے اور ہر جگہ اپنی حاجت کی خاطر خدا ہی کی طرف توجہ دے۔ وہی توجہ کہ جو صفاتِ فاضلہ اور ملکاتِ اخلاقی کی اصل بنیاد ہے۔ وہی توجہ کہ جو تواضع و انکساری، ترکِ ظلم و ستم، ترکِ غرور و تکبر اور ترکِ بخل و حرص و حسد کی رمز ہے اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی محرک ہوتی ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں انسانوں کی اسی احتیاج و فقر کی تاکید کے لیے ان سے فرمایا گیا ہے: "اگر وہ چاہے تو تمہیں اٹھا لے اور ایک نئی مخلوق لے آئے" (ان یشأ یذھبکم و یأت بخلق جدید)۔

اسی بناء پر اسے تمہاری اور تمہاری عبادت کی کوئی احتیاج نہیں اور یہ تم ہو کہ جو اس کے محتاج ہو۔

---

[1] اس بات پر بھی توجہ رہے کہ امکان و وجوب کی برہان کی دو تفسیریں ہیں۔ کیونکہ فلاسفہ نے امکان کے دو معانی کیے ہیں۔ امکان ماھوی اور امکان وجودی، اور چونکہ محققین فلاسفہ کی نظر اصالۃ الوجود پر ہے اس بناء پر یہاں امکان کی امکان وجودی کی شکل میں تفسیر کرنا چاہیئے کہ علت کی طرف نیاز و وابستگی اصل وجود میں ہے (اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے کتب فلسفہ کا مطالعہ کریں)۔

Marfat.com

یہ آیت اسی مطلب کی مثال ہے کہ جو سورۂ انعام میں بیان ہوا ہے، جہاں فرمایا گیا ہے:

وربّك الغنی ذوالرحمة ان یشأ یذهبکم ویستخلف من بعدکم ما یشاء کما انشأکم من ذریة قوم اٰخرین۔

"تیرا پروردگار بے نیاز و مہربان ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور جسے چاہے تمہاری جگہ لے آئے جیسا کہ تمہیں دوسری قوموں کی نسل سے وجود میں لایا ہے۔" (انعام۔ ۱۳۳)

وہ نہ تو تمہاری اطاعت کا محتاج ہے اور نہ ہی اسے تمہارے گناہوں کا خوف ہے لیکن اس کے باوجود اس کی وسیع رحمت تم سب پر سایہ فگن ہے۔ نہ تو اس سارے جہان کے ختم ہو جانے سے اس کی عظمت میں کسی چیز کی کمی ہوگی اور نہ ہی اس عالم کی خلقت نے اس کے مقامِ کبریائی میں کوئی اضافہ کیا ہے۔

آیت کے آخر میں نئے سرے سے تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: "اور یہ کام خدا کے لیے ناممکن نہیں ہے" (وما ذالك علی الله بعزیز)۔

جی ہاں! وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے، حکم دیتا ہے کہ ہو جا، وہ فوراً وجود میں آجاتی ہے، تخلیقِ انسان تو معمولی سی بات ہے، یہ بات تو تمام عالمِ ہستی کے بارے میں صادق ہے۔

بہرحال اگر وہ تمہیں ایمان، اطاعت اور پرستش کا حکم دیتا ہے تو سب تمہارے ہی فائدہ میں ہے اور اس کی برکات تمہیں ہی حاصل ہوتی ہیں۔

٭ ٭ ٭

آخری زیر بحث آیت گزشتہ آیات کے ربط میں پانچ "نکات" کی طرف اشارہ کرتی ہے:

اوّل یہ کہ گزشتہ آیات میں بیان ہوا تھا کہ "اگر خدا چاہے تو وہ تمہیں اٹھا لے اور تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے"۔ یہ گفتگو ممکن ہے کہ بعض افراد کے لیے یہ سوال پیدا کرے کہ اس آیہ کے مخاطب تمام گنہگار افراد نہیں ہیں، کیونکہ ہر زمانے میں مومنین صالح موجود رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ بھی دوسروں کے گناہوں کی سزا میں گرفتار ہوں اور وہ بھی فنا ہو جائیں؟

اسی سبب سے فرمایا گیا ہے: "کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بار اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا" (ولاتزر وازرة وزر اُخرٰی)۔

"وزر" بوجھ کے معنی میں ہے اور "وزر" (بروزن "نظر") سے لیا گیا ہے کہ جو پہاڑوں کی پناہ گاہ کے معنی میں آیا ہے اور کبھی مسئولیت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ "وزیر" کو اس لحاظ سے "وزیر" کہتے ہیں کہ وہ ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے۔ "موازرہ" بھی معاونت کے معنی میں ہے کیونکہ ہر شخص معاونت کرتے وقت دوسرے کے بار کا ایک حصہ اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے۔

Marfat.com

یہ جملہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ حقیقت میں یہ ایک طرف تو عدلِ خداوندی سے ارتباط رکھتا ہے کہ جو ہر شخص کو اس کے عمل کے بدلے گروی شمار کرتا ہے، اس کی سعی و کوشش کا اسے اجر دیتا ہے اور اس کے گناہوں کی اسے سزا دیتا ہے۔

اور دوسری طرف قیامت کے دن کی شدتِ مجازات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی بھی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا چاہے اس سے انتہائی لگاؤ اور تعلق ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔

اس مطلب کی طرف توجہ انسانوں کی خود سازی میں زیادہ اثر رکھتی ہے کیونکہ جو شخص اپنے کو بچانا چاہے وہ ہرگز اس بہانہ سے کہ اس کا ماحول یا اس کا معاشرہ خراب ہے، برائی میں کودنے کے لیے تیار نہیں ہوگا اور ماحول کی خرابی کو اپنی بے راہ روی کے لیے وجہ جواز نہیں بنائے گا کیونکہ ہر شخص اپنے گناہ کا بوجھ خود ہی اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے۔

عدلِ الٰہی کا یہ پہلو انسانوں کو یہ ادراک اور سوجھ بوجھ بھی دیتا ہے کہ خدا معاشروں کا مجموعی طور پر حساب نہیں لیتا، بلکہ ہر شخص کا اپنا حساب لیا جائے گا یعنی اگر اس نے اپنی اصلاح کے لیے اور برائی کے خلاف جہاد کرنے کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو نبھایا ہو تو اُسے کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا چاہے اس کے علاوہ سارے جہان کے لوگ کفر و شرک اور ظلم و گناہ میں آلودہ ہوں۔

اصولی طور پر کوئی تربیتی پروگرام اس بنیادی اصول کی طرف توجہ دیئے بغیر مؤثر نہیں ہوسکتا۔ (غور کیجئے گا)۔

دوسرے جملے میں اسی مسئلے کو ایک دوسری شکل میں پیش کیا گیا ہے، قرآن کہتا ہے: اگر کوئی شخص بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے ہو اور وہ کسی دوسرے شخص کو اپنے گناہوں کو اٹھانے کے لیے کہے، تو وہ اس کا منفی جواب دے گا اور اس کے گناہ اور جواب دہی میں سے کسی چیز کو نہیں اٹھائے گا، چاہے وہ اس کے قریبیوں اور رشتہ داروں میں سے ہو" (وان تدع مثقلة الیٰ حملها لا یحمل منه شیء ولو کان ذا قربیٰ) [1]

---

[1] "مثقلة" بھاری بوجھ کے معنی میں ہے اور یہاں وہ شخص مراد ہے جو گناہوں کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے ہے اور "حمل" (بروزن "شعر") "مفردات" میں راغب کے قول کے مطابق "وہ بوجھ ہے جو پشت پر اٹھایا جاتا ہے" "حمل" (بروزن "حمد") کے مقابلے میں کہ یہ ایسا بوجھ ہے کہ جو پیٹ میں اٹھایا جاتا ہے مثلاً "جنین" یا وہ پانی کہ جو بادل کے اندر ہے یا وہ پھل کہ جو درخت کے اوپر ہے اور چونکہ زیر بحث آیت میں گناہ کو اُس بوجھ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جو کندھے پر اٹھایا جاتا ہے اس لیے "حمل" حا کی زیر کے ساتھ آیا ہے۔

Marfat.com

ایک حدیث میں ہے :

قیامت کے دن ایک ماں اور ایک بیٹے کو لایا جائے گا۔ ان دونوں ہی کے کندھوں پر گناہوں کا بھاری بوجھ ہوگا۔ ماں بیٹے سے تقاضا کرے گی کہ ان تمام زحمتوں کے بدلے میں کہ جو میں نے تیرے لیے دنیا میں جھیلی ہیں میرے گناہوں کی مسئولیت کا کچھ بوجھ اپنے کندھے پر اٹھا لے، اس پر بیٹا ماں سے کہے گا کہ تو مجھ سے دور ہو جا، کیونکہ میں تو تجھ سے بھی زیادہ گرفتار ہوں[1]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ آیت اُن بہت سی روایات کے منافی تو نہیں جن میں سنتِ حسنہ و سنتِ سیئہ کا ذکر ہے۔ کیونکہ وہ روایات یہ کہتی ہیں کہ جو شخص کوئی اچھی سنت قائم کرے گا تو ان تمام لوگوں کا اجر کہ جنہوں نے اس پر عمل کیا ہے اس کے لیے لکھا جائے گا بغیر اس کے کہ ان کے اجر میں کچھ کمی ہو اور جو شخص بُری سنت کی بنیاد رکھے گا تو ان لوگوں کا بوجھ بھی کہ جو اس پر عمل کریں گے اُس پر ہوگا بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں کوئی کمی ہو۔

لیکن ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اس صورت میں ایک شخص کا گناہ دوسرے کے ذمہ نہیں لکھا جاتا کہ جب وہ کسی قسم کا دخل اس میں نہ رکھتا ہو لیکن اگر وہ کسی کام کی بنیاد رکھے، معاونت کرے یا ترغیب دے اور اس طرح اس میں حصہ دار ہو تو پھر یقیناً یہ اس کا عمل شمار ہوگا اور وہ اس میں شریک قرار پائے گا۔

تیسرے جملے میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ پیغمبرؐ کی تنبیہ صرف آمادہ دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "تم صرف انہی لوگوں کو ڈرا پاتے ہو جو اپنے پروردگار سے غیب اور تنہائی میں ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں" (انما تنذر الذین یخشون ربھم بالغیب واقاموا الصلٰوۃ)۔

انبیاء اور اولیاء کے ڈراوے اس وقت تک بے اثر رہیں گے جب تک دل میں خوفِ خدا نہ ہو اور انسان پنہاں و آشکار اپنے اوپر ایک مافوق قوت کی نگرانی کا احساس نہ کرے اور نماز کے ذریعے اس اندرونی احساس کو قوی نہ کرے کیونکہ نماز دل کو زندہ کرتی ہے اور ذکرِ خدا پر ابھارتی ہے۔

---

[1] اگرچہ یہ حدیث مختلف تفاسیر میں کبھی فضیل بن عیاض سے اور کبھی ابن عباس سے نقل ہوئی ہے، لیکن یہ بات بعید نظر آتی ہے کہ یہ بات انہوں نے خود اپنی طرف سے کہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اصل حدیث پیغمبرؐ سے منقول ہو (تفسیر ابوالفتوح، قرطبی اور روح البیان کی طرف رجوع کریں)۔

Marfat.com

ابتدا میں جبکہ انسان نے کوئی عقیدہ نہ اپنایا ہو اور ایمان نہ لایا ہو، اگر اس میں حق جوئی اور حق طلبی کی روح موجود نہیں ہے، اور اس میں حقائق کی شناخت کے سلسلے میں جوابدہی کا احساس بھی نہیں ہے تو وہ انبیاء کی دعوت پر کان نہیں دھرے گا اور عالم ہستی میں پروردگار کی نشانیوں میں غور وفکر بھی نہیں کرے گا۔

چوتھے جملے میں قرآن پھر اس حقیقت کی طرف لوٹتا ہے کہ خدا سب سے بے نیاز ہے اور مزید کہتا ہے کہ: "جو شخص پاکیزگی اور تقویٰ اختیار کرے تو اس پاکیزگی کا نتیجہ خود اسی کو حاصل ہوگا" (ومن تزکّٰی فانما یتزکّٰی لنفسہ)۔

آخرکار پانچویں اور آخری جملے میں قرآن خبردار کرتا ہے کہ اگر نیک و بد افراد اس جہان میں اپنے اعمال کے نتائج نہ پائیں تو کوئی اہم بات نہیں ہے کیونکہ "سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور آخرکار وہ سب کا حساب چکائے گا" (والی اللہ المصیر)۔

Marfat.com

(۱۹) وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۝

(۲۰) وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ۝

(۲۱) وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ۝

(۲۲) وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ
مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝

(۲۳) اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ۝

ترجمہ

(۱۹) نابینا اور بینا ہرگز برابر نہیں ہیں ۔

(۲۰) اور نہ ہی ظلمتیں اور روشنی ۔

(۲۱) اور نہ ہی (آرام بخش) سایہ اور گرم جلانے والی ہوا ۔

(۲۲) اور مُردہ اور زندہ بھی ہرگز برابر نہیں ہیں ۔ خدا اپنا پیغام جس کے کان تک چاہتا ہے پہنچاتا ہے اور تم قبروں (میں سونے) والوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتے ۔

(۲۳) تم تو صرف ڈرانے والے ہو (اب اگر وہ ایمان نہ لائیں تو پریشان نہ ہونا کہ تم نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے) ۔

تفسیر

نور و ظلمت یکساں نہیں ہیں

ان مباحث کی مناسبت سے کہ جو ایمان و کفر کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں بیان ہوئے تھے

Marfat.com

زیر بحث آیات میں چار پُرکشش مثالیں مومن اور کافر کے بارے میں بیان کی گئی ہیں جن میں "ایمان و کفر" کے آثار نہایت واضح طور پر مجسم ہو گئے ہیں۔

پہلی مثال میں کافر و مومن کو نابینا اور بینا کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے: "نابینا اور بینا ہرگز برابر نہیں ہیں" (وما یستوی الاعمٰی والبصیر)۔

ایمان نور ہے اور روشنی بخشنے والا ہے اور انسان کو کائنات شناسی، اعتقاد، عمل اور تمام زندگی میں روشنی اور آگاہی بخشتا ہے لیکن کفر ظلمت اور تاریکی ہے اور اس میں نہ تو سارے عالم ہستی کے بارے میں صحیح دانش و بینش ہے اور نہ صحیح اعتقاد اور عمل صالح کی کوئی خبر ہے۔

قرآن مجید اسی سلسلے میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۵۷ میں حق مطلب ادا کرتے ہوئے کہتا ہے:

الله ولی الذین اٰمنوا یخرجهم من الظلمٰت الی النور والذین کفروا اولیائهم الطاغوت یخرجونهم من النور الی الظلمات اولئك اصحاب النار هم فیها خالدون۔

"خدا مومنوں کا ولی، راہنما اور سرپرست ہے۔ وہ انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف ہدایت کرتا ہے لیکن کافروں کا ولی طاغوت ہے کہ جو انہیں روشنی سے ظلمتوں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے، وہ اصحاب دوزخ ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے"۔

چشم بینا تنہا کافی نہیں ہے، لہٰذا روشنی اور نور بھی ہونا چاہیئے تاکہ انسان ان دو عوامل کی مدد سے موجودات کا مشاہدہ کر سکے۔ بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: "نہ ہی تاریکیاں نور کے برابر ہیں" (ولا الظلمات ولا النور)۔

چونکہ تاریکی گمراہی کا سبب ہے، تاریکی سکون و جمود کی عامل ہے اور تاریکی طرح طرح کے خطرات کی عامل ہے لیکن نور اور روشنی حیات و حرکت، رشد و نمو اور تکامل و ارتقاء کا منشاء ہے۔ اگر نور ختم ہو جائے تو عالم کی تمام قوتیں اور طاقتیں ختم ہو جائیں، اور موت سارے مادی عالم کو گھیر لے، اور اسی طرح عالم روحانی میں نور ایمان ہے کہ وہ رشد و تکامل کا عامل ہے اور حیات و حرکت کا سبب ہے۔ اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: "(آرام بخش) سایہ گرم ہوا اور جلانے والی لُو کے برابر نہیں ہے" (ولا الظل ولا الحرور)۔

مومن اپنے ایمان کے سائے میں سکون اور امن و امان سے زندگی بسر کرتا ہے لیکن کافر اپنے کفر کی وجہ سے تکلیف اور رنج میں جلتا رہتا ہے۔

راغب مفردات میں کہتا ہے "حرور" (بروزن "قبول") گرم اور جلانے والی ہوا کے معنی میں ہے (مارنے والی اور خشک کر دینے والی ہوا)۔

Marfat.com

بعض اِسے بادِ سموم کے معنی میں سمجھتے ہیں اور بعض سورج کی سخت اور شدید حرارت کے معنی میں۔

زمخشری کشاف میں کہتا ہے کہ "سموم" موذی اور ہلاک کرنے والی ہواؤں کو کہتے ہیں۔ جو دن کے وقت چلتی ہیں لیکن "حرور" کہا تو انہیں ہواؤں کو جاتا ہے لیکن بغیر اس تمیز کے کہ وہ دن کے وقت چلیں یا رات کو۔ بہرحال اس قسم کی ہوائیں کہاں اور ٹھنڈا اور نشاط آفریں سایہ کہاں کہ جو انسان کی روح اور جسم کو نوازتا ہے۔

آخری تشبیہ میں فرمایا گیا ہے: "اور زندہ اور مردہ ہرگز برابر نہیں ہے" (وما یستوی الاحیاء ولا الاموات)۔

مومنین زندہ ہیں اور سعی و کوشش، حرکت و جنبش اور رشد و نمو کے حامل ہیں۔ وہ شاخیں، پتے، پھول اور پھل رکھتے ہیں لیکن کافر خشک لکڑی کی طرح ہیں کہ جس میں نہ طراوت ہے نہ پتا، نہ پھول اور نہ کوئی سایہ اور سوائے جلانے کے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

سورۂ انعام کی آیہ ۱۲۲ میں ہے کہ:

اومن کان میتاً فاحییناہ وجعلنا لہ نورًا یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منھا۔

"کیا وہ شخص کہ جو مُردہ تھا اور ہم نے اُسے زندہ کیا، اور ہم نے اسے نور عطا کیا کہ جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اُس شخص کے مانند ہے کہ جو ظلمات اور تاریکیوں میں غوطہ زن ہے اور ہرگز اس سے نہیں نکلے گا؟"

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: "خدا جسے چاہتا ہے سننے والا بنا دیتا ہے" تاکہ وہ حق کی دعوت کو دل کے کان سے سنے اور توحید کی منادی کرنے والوں کی ندا پر لبیک کہے" (ان اللہ یسمع من یشاء)۔ "اور تم اپنی بات ہرگز ان مُردوں کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتے جو قبروں میں سوئے ہوئے ہیں" (وما انت بمسمع من فی القبور)۔

تمہاری فریاد چاہے جس قدر رسا ہو اور تمہاری گفتگو جس قدر بھی دل نشین ہو اور تمہارا بیان جتنا بھی فصیح و بلیغ ہو مُردے اس میں سے کسی چیز کو سمجھ نہیں سکتے اور وہ لوگ کہ جو گناہ پر اصرار اور تعصب، عناد، ظلم اور فساد میں غوطہ زن ہونے کی وجہ سے اپنی روح انسانی کو کھو بیٹھے ہیں، یقیناً تمہاری دعوت قبول کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔

⁂ ⁂ ⁂

اس بناء پر ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے پریشان اور بے تاب نہ ہو۔ تمہاری ذمہ داری تو

Marfat.com

صرف بات کو پہنچانا اور ڈرانا ہے۔ "تم تو صرف ڈرانے والے ہو" (ان انت الا نذیر)۔

٭ ٭ ٭

چند اہم نکات

۱۔ **ایمان و کفر کے آثار:** ہم جانتے ہیں کہ قرآن جغرافیائی، نسلی اور طبقاتی قسم کی سرحدوں میں سے کہ جو انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں کسی کا قائل نہیں ہے۔ اس نے تو صرف ایک ہی سرحد شمار کی ہے اور وہ ایمان و کفر کی سرحد ہے اور وہ اس طرح سے تمام انسانی معاشرے کو دو گروہوں ــ مؤمن اور کافر میں تقسیم کر دیتا ہے۔

قرآن نے ایمان کے تعارف میں متعدد مواقع پر اُسے نور کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور کفر کو ظلمت کے ساتھ اور یہ تشبیہ ــ نتیجہ خیزی کے لیے ــ ایک زندہ ترین تشبیہ ہے[1]۔

ایمان ایک قسم کا باطنی ادراک اور بصیرت ہے۔ قلبی عقیدے اور جنبش و حرکت سے توأم یہ ایک قسم کا علم و آگاہی ہے۔ یہ ایک قسم کا یقین ہے کہ جو انسان کے قلب و روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور ایسے اسلامی کاموں کا سرچشمہ بن جاتا ہے کہ جو معاشرے کی رشد و نمو کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن کفر جہالت ہے، نا آگاہی اور بے یقینی ہے کہ جس کا نتیجہ عدم تحرک، احساس مسئولیت کا فقدان اور شیطانی اور مخرب حرکات ہیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ "نور" عالم مادہ میں انسان، حیوان اور نباتات کے لیے ہر قسم کی حیات، حرکت، نمو اور رشد کا مبداء ہے اور اس کے برعکس ظلمت و تاریکی خاموشی اور خواب و غفلت کی عامل ہے اور مسلسل جاری رہنے کی صورت میں موت ہے اور زندگی کے خاتمے کا سبب ہے۔

اس بنا پر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان آیات میں ایمان و کفر کو نور و ظلمت سے، حیات و موت سے اور آرام بخش سائے اور بادِ سموم سے تشبیہ دی گئی ہے اور اسی طرح مومن و کافر کو بینا و نابینا سے تشبیہ دی گئی ہے۔

کہنے کے لائق تمام باتیں ان چار تشبیہوں میں بیان ہو گئی ہیں۔

ہم زیادہ دور نہ جائیں، جس وقت ہم ایک مومن کے ساتھ نشست و برخاست کرتے ہیں، تو ہم اس کے تمام وجود میں اس نور کا اثر محسوس کرتے ہیں اس کے افکار ضیا بخش ہوتے ہیں، اس کی باتیں درخشندہ ہوتی ہیں اور اس کے اعمال و اخلاق ہمیں حقیقت زندگی اور حیات واقعی سے آشنا کرتے ہیں۔

لیکن کافر کے تمام وجود سے تاریکی برستی ہے۔ وہ اپنے مادی اور وقتی مفادات کے علاوہ کچھ نہیں

---

[1] بقرہ۔ ۲۵۷، مائدہ۔ ۱۵ و ۱۶، ابراہیم۔ ۱ و ۵، زمر۔ ۲۲، حدید۔ ۹ اور طلاق ۱۱ کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

سوچتا اُس کی فکر کا افق اور فضا اس کی شخصی زندگی کی چار دیواری سے اوپر نہیں جاتے، وہ شہوات کے طوفانوں میں غوطہ زن ہوتا ہے اور اس کی ہمنشینی انسان کے قلب و روح کو ظلمات و تاریکی کی موجوں میں ڈبو دیتی ہے کیونکہ:

ہمدمی مُردہ دھد مُردگی صحبت افسردہ دل افسردگی

مُردے کی ہمنشینی سے مُردگی حاصل ہوتی ہے۔ اور افسردہ دل کی صحبت سے افسردگی ملتی ہے۔

اور اس طرح سے قرآن نے جو کچھ ان آیات میں بیان کیا ہے اسے ہم محسوس بھی کر سکتے ہیں، سمجھ بھی سکتے ہیں یعنی وہ قابلِ ادراک ہے۔

۲۔ کیا مُردے کسی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے؟: اوپر والی آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر توجہ دینے سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

پہلا یہ کہ قرآن یہ کیسے کہتا ہے کہ: "تم اپنی آواز مُردوں کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتے" حالانکہ مشہور حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جنگِ بدر کے دن یہ حکم دیا تھا کہ جنگ کے اختتام پر کفار کے بدنوں کو کنویں میں پھینک دیا جائے۔ اس کے بعد آپؐ نے انہیں پکار کر فرمایا:

هل وجدتم ما وعد الله ورسوله حقًا؟ فانی وجدت ما وعدنی الله حقًا۔

"کیا تم نے اس چیز کو کہ جس کا خدا اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا حق پایا ہے؟ مَیں نے تو جس کا خدا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اُسے حق پایا ہے۔"

اس موقع پر حضرت عمر نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ! آپؐ ایسے اجساد سے کس طرح گفتگو کر رہے ہیں جن میں روح ہی نہیں ہے؟ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

ما انتم باسمع لما اقول منهم، غیر انهم لا یستطیعون ان یردوا شیئا۔

"تم میری باتوں کو ان سے بہتر طور پر نہیں سنتے، بات صرف اتنی ہے کہ وہ جواب دینے کی توانائی نہیں رکھتے"[1]

اسی طرح آدابِ میت میں سے ایک یہ ہے کہ عقائدِ حقّہ کی اسے تلقین کی جائے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات زیرِ بحث آیات کے ساتھ کس طرح مناسبت رکھتی ہے؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ زیرِ بحث

---

[1] تفسیر روح البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔ صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان ہوئی ہے (صحیح بخاری جلد ۵ ص ۹۷ باب قتل ابی جہل)۔

Marfat.com

آیات مُردوں کے عدم ادراک کو معمول کے لحاظ سے اور طبعی حوالے سے بیان کرتی ہیں لیکن جنگِ بدر کی روایات یا تلقینِ میت والی روایت فوق العادۃ شرائط و حالات کے ساتھ مربوط ہے کہ خدا نے اپنے پیغمبر کی باتیں فوق العادۃ طور پر ان مُردوں کے کانوں تک پہنچائیں۔

دوسرے لفظوں میں عالم برزخ میں انسان کا ربط عالمِ دنیا سے منقطع ہوجاتا ہے، سوائے ان موقعوں کے کہ جن کے بارے میں خدا حکم دے دے کہ یہ ارتباط برقرار رہے۔ اسی بنا پر عام حالات میں ہم مُردوں کے ساتھ ارتباط پیدا نہیں کرسکتے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ہماری آواز مُردوں کے کانوں تک نہیں پہنچتی تو پھر پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ پر سلام بھیجنا اور انہیں وسیلہ قرار دینا اور ان کی قبور کی زیارت کرنا اور بارگاہِ خداوندی میں ان سے شفاعت کا تقاضا کرنا کیا مفہوم رکھتا ہے؟

وہابیوں کی ایک جماعت کہ جو عام طور پر فکری جمود کے حوالے سے مشہور ہے، قرآن کی دوسری آیات کا مطالعہ کیے بغیر ابتدائی ظواہر سے یہی بات کرتی ہے۔ یہ لوگ بہت سی احادیث کو کہ جو پیغمبرؐ سے منقول ہوئی ہیں کوئی وقعت نہ دیتے ہوئے، مسئلہ توسل کی نفی کردیتے ہیں، اور یوں انہوں نے اپنے گمانِ ناقص سے ان پر خطِ بطلان کھینچ دیا ہے۔

اس سوال کا جواب بھی اُسی سے کہ جو ہم نے پہلے سوال کے جواب میں دیا ہے واضح ہوجاتا ہے، کیونکہ پیغمبر اکرمؐ اور اولیائے خدا کا معاملہ دوسرے لوگوں سے الگ ہے۔ وہ شہداء کے مانند (بلکہ ان کی پہلی صف میں) قرار پاتے ہیں، اور زندۂ جاوید ہیں، اور "احیاء عند ربھم یرزقون" کے مصداق پروردگار کی روزی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ خدا کے حکم سے اس جہان کے ساتھ ان کا ارتباط باقی رہتا ہے۔ جیسا کہ اِس جہان میں رہتے ہوئے وہ مُردوں کے ساتھ ارتباط برقرار رکھ سکتے ہیں جیسا کہ مقتولینِ بدر کی مثال موجود ہے۔

اسی بنا پر بہت سی روایات میں کہ جو اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی کتابوں میں منقول ہوئی ہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ کچھ لوگوں کی باتیں جو دُور یا نزدیک سے اُن پر سلام بھیجتے ہیں، سنتے ہیں اور انہیں جواب دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ امت کے اعمال بھی ان کی خدمت میں پیش ہوتے ہیں۔[1]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ہمیں یہ حکم ہے کہ نماز کے تشہد میں پیغمبر اکرمؐ پر سلام بھیجیں اور یہ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے چاہے وہ شیعہ ہوں یا اہلِ سنت، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم آنحضرتؐ سے ایسی بات کریں

---

[1] کشف الارتیاب ص ۱۰۹، آیہ ۱۰۵ سورہ توبہ کے ذیل میں ہم نے بھی "اعمال پیش ہونے کا مسئلہ" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (جلد ۸ تفسیر نمونہ ص ۱۰۱ اردو ترجمہ کی طرف رجوع کریں)۔

Marfat.com

کہ جسے آپؐ بالکل نہیں سنتے۔

متعدد روایات میں صحیح مسلم میں ابو سعید خدریؓ اور ابو ہریرہ سے خود پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لقنوا موتاکم لا الٰہ الا اللّٰہ۔

"اپنے مُردوں کو لا الٰہ الا اللّٰہ کی تلقین کرو"[1]

نہج البلاغہ میں بھی مُردوں کی ارواح کے ساتھ ارتباط کے مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ حضرت علیؑ نے ان مومنین کے ارواح سے کہ جو کوفے کے نواحی قبرستان میں تھے گفتگو کی ہے[2]

۳۔ تعبیرات کا تنوع فصاحت کا ایک حصہ ہے: ان چار تشبیہوں میں کہ جو اوپر والی آیات میں بیان ہوئی ہیں مختلف تعبیرات نظر آتی ہیں۔ مثلاً "اعمٰی" و "بصیر"۔ "ظل" و "حرور" مفرد کی صورت میں آئی ہیں۔ جبکہ "احیاء" و "اموات" دونوں جمع کی صورت میں ہیں اور "ظلمات" و "نور" میں سے ایک لفظ مفرد اور دوسرا جمع کی صورت میں آیا ہے۔

نیز پہلی اور دوسری تشبیہ میں جو منفی صورت رکھتے ہیں انہیں مقدم رکھا ہے (اعمٰی و ظلمات) جبکہ تیسری اور چوتھی تشبیہ میں جو کہ مثبت صورت رکھتے ہیں "ظل" اور "احیاء" کو مقدم رکھا گیا ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ پہلی تشبیہ میں حرفِ نفی کا تکرار نہیں ہوا جبکہ باقی تین تشبیہات میں نفی کا تکرار ہوا ہے۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ "ما یستوی" صرف پہلی اور آخری تشبیہ میں آیا ہے اور باقیوں میں نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے اس تفاوت کے لیے کچھ نکات بیان کیے ہیں۔ جن میں سے کچھ تو قابلِ ملاحظہ ہیں اور بعض قابلِ اعتراض۔

منجملہ ان نکات کے کہ جو قابلِ ملاحظہ ہیں ایک یہ ہے کہ "ظلمات" کا جمع ہونا اور "نور" کا مفرد ہونا اس بنا پر ہے کہ ظلمت یعنی کفر کے بہت سے شعبے ہیں، لیکن ایمان اور توحید کی صرف ایک ہی حقیقت ہے۔ ایمان خطِ مستقیم ہے کیونکہ دو نقطوں کے درمیان ایک خطِ مستقیم کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہوتا لیکن ظلمت کفر ٹیڑھے خطوط کی طرح ہے کیونکہ دو نقطوں کے درمیان ہزارہا ٹیڑھے خطوط ہوتے ہیں۔

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز حدیث ۱ و ۲ (جلد ۲ ص ۶۳۱)۔

۲۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ ۱۳۰۔

Marfat.com

پہلی دو مثالوں میں منفی صورتوں کو مقدم رکھنا آغازِ اسلام کی طرف اشارہ ہے کہ لوگوں نے جاہلیت کی نابینائی اور شرک کے ظلمات سے اسلام کی روشنی اور بینائی کی طرف ہدایت پائی۔

لیکن دو دوسری مثالیں دوسرے مراحل کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جب اسلام نے اپنی جڑوں کو دلوں کی زمین میں محکم کر لیا تھا اور اپنی اثباتی صورتوں کو معاشرے میں وسعت دی تھی۔

لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر اصولی طور پر بیان میں تنوع گفتگو میں ایک خاص قسم کی روح اور تازگی پیدا کر دیتا ہے اور اسے دل نشین، خوبصورت اور پرکشش بنا دیتا ہے۔ جبکہ ایک ہی طرح کے کلام کی تکرار۔ سوائے استثنائی مواقع کے۔ گفتگو کی لطافت ختم کر دیتی ہے۔ اسی بنار پر فصحار و بلغار ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی گفتگو کی تعبیروں کو متنوع اور دل نشیں بنائیں اور ہم جانتے ہیں کہ قرآن فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر ہے۔

اس بنار پر اگر فصاحت و بلاغت کے علاوہ ان تعبیرات میں اور کوئی نکتہ نہ بھی ہوتا تب بھی یہی چیز کافی تھی۔ اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ آنے والے حضرات ان اسرار کے علاوہ کہ جو ہم نے پیش کیے ہیں، ان تعبیرات میں دوسرے اسرار بھی تلاش کر سکیں کہ جو اس وقت ہم سے پوشیدہ ہیں۔

Marfat.com

(۲۴) إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا ۚ وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ○

(۲۵) وَإِنْ يُّكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيرِ ○

(۲۶) ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ○

ترجمہ

(۲۴) ہم نے تجھے حق کے ساتھ بشارت اور نذارت کے لیے بھیجا اور گزشتہ زمانہ میں ہر امت کے لیے کوئی نہ کوئی ڈرانے والا موجود رہا ہے ۔

(۲۵) اگر وہ تیری تکذیب کرتے ہیں (تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے) جو لوگ ان سے پہلے تھے (وہ بھی اپنے پیغمبروں کی) تکذیب کیا کرتے تھے ۔ وہ واضح دلائل، پند و نصائح کی کتب اور روشنی عطا کرنے والی آسمانی کتابیں (کہ جو معارف و احکام پر مشتمل تھیں) لے کر ان کے پاس آئے (لیکن دل کے اندھے ان پر ایمان نہ لائے) ۔

(۲۶) پھر میں نے کفار کو (اتمام حجت کے بعد) پکڑ لیا (اور انہیں سخت عذاب دیا) پس اُن پر میرا عذاب کیسا تھا ؟

تفسیر

دل کے اندھے ایمان نہ لائیں تو تعجب نہیں

گزشتہ آیات میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ کچھ افراد ایسے ہیں کہ جو مُردوں اور نابیناؤں کی مانند ہیں کہ جن کے دل میں انبیاء کی باتیں معمولی سا اثر بھی نہیں کرتیں ۔ اس کے بعد زیر بحث آیات میں

Marfat.com

پیغمبرِ اکرمؐ کی اس سلسلے میں دلجوئی کے لیے تاکہ وہ غمگین اور پریشان نہ ہوں، پہلے فرمایا گیا ہے: "ہم نے تجھے حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا اور گزشتہ زمانے میں کوئی امت ایسی نہ تھی کہ جس میں ڈرانے والا نہ آیا ہو" (انّا ارسلناک بالحق بشیرًا ونذیرًا وان من امة الّا خلا فیھا نذیر)۔

تُو "بشارت" و "انذار" کی ذمہ داری میں کوتاہی نہ کرے یہی تیرے لیے کافی ہے۔ تو اپنی ندا ان کے کانوں تک پہنچا، خدائی جزاؤں کی بشارت دے اور پروردگار کے عذاب سے انہیں ڈرا، چاہے وہ قبول کریں یا دشمنی اور ہٹ دھرمی اختیار کرلیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گزشتہ بحث کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ: "ان انت الّا نذیر" لیکن زیرِ بحث پہلی آیت میں یہ ہے کہ: "ہم نے تجھے برحق بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تُو ڈرانے والا ہے تو تُو خود اپنی طرف سے یہ کام نہیں کرتا، یہ تو ایک ماموریت ہے کہ جو ہم نے تیرے سپرد کی ہے۔

اور اگر گزشتہ آیت میں صرف انذار کا ذکر ہوا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں ہٹ دھرم جاہلوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ جو قبرستان کے مُردوں کی طرح کوئی بات قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے، لیکن یہاں پر انبیاء کی ذمہ داری کو کلّی طور پر بیان کیا جا رہا ہے کہ جو بشارت و انذار کے دونوں پہلوؤں کی حامل ہے۔ البتہ اس آیت کے آخر میں پھر نئے سرے سے "نذیر" کا ذکر ہے کیونکہ مشرکین اور ظالموں کے مقابلے میں انبیاء کی دعوت کا بنیادی حصّہ "انذار" پر مشتمل تھا۔

"خلا"، "خلاء" کے مادہ سے اصل میں اس مکان اور جگہ کے معنی میں ہے کہ جس میں کوئی ڈھانپنے والی چیز نہ ہو، یہ لفظ زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور مکان کے لیے بھی، اور چونکہ زمانہ گزر جانے والی چیز ہے اس لیے گزشتہ زمانوں کو "ازمنہ خالیہ" کہا جاتا ہے، کیونکہ اب وہ باقی نہیں ہیں اور دنیا ان سے خالی ہو چکی ہے۔

اس بنا پر "وان من امة الّا خلا فیھا نذیر" کا جملہ اس معنی میں ہے کہ: "گزشتہ امتوں میں سے ہر امت کے لیے گزشتہ زمانے میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا موجود رہا ہے"۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیت کے مطابق تمام امتیں خدا کی طرف سے انذار کرنے والا یعنی پیغمبر رکھتی تھیں، اگرچہ بعض نے اس کو ایک وسیع تر معنی میں لیا ہے کہ جس میں علماء اور ایسے دانشور بھی شامل ہیں کہ جو لوگوں کو متنبہ کیا کرتے ہیں لیکن یہ معنی ظاہرِ آیت کے خلاف ہے۔

بہر حال اس بات کا معنی یہ نہیں ہے کہ ہر شہر اور ہر علاقے میں ایک پیغمبر مبعوث ہوا ہو بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ پیغمبروں کی دعوت اور ان کی باتیں ان سب لوگوں کے کانوں تک پہنچ گئی تھیں۔ کیونکہ قرآن

Marfat.com

کہتا ہے: "خلا فیہا نذیر" یعنی "ان میں ڈرانے والا موجود تھا" یہ نہیں کہتا کہ "منہا" یعنی خود" ان میں سے" تھا۔
اس بنا پر جو کچھ زیر بحث آیت میں بیان ہوا ہے وہ سورۂ سبا کی آیہ ۴۴ سے اختلاف نہیں رکھتا کہ جو یہ کہتی ہے:

وما ارسلنا الیھم قبلک من نذیر۔

"ہم نے مشرکین مکہ کی طرف تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا تھا۔"

یہاں ڈرانے والا سے مراد خود انہیں میں سے ہے جبکہ زیر بحث آیت میں پیغمبر کی دعوت کا ان تک پہنچنا ہے۔

بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے: "اگر وہ تمہاری تکذیب کریں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور تم اس پر غمگین نہ ہو، کیونکہ جو لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی جبکہ وہ واضح معجزات و دلائل، پند و نصائح سے معمور کتب اور ایسی آسمانی کتب لے کر اُن کے پاس آئے تھے کہ جو ضیا بخش احکام و قوانین پر مشتمل تھیں" (وان یکذبوک فقد کذب الذین من قبلھم جائتھم رسلھم بالبیّنات و بالزبر و بالکتاب المنیر) صرف تم ہی نہیں کہ جو معجزات اور آسمانی کتاب کے حامل ہو۔ اس کے باوجود اس جاہل قوم نے تمہاری تکذیب کی ہے، بلکہ گزشتہ پیغمبر بھی اسی طرح کی مشکل سے گزرتے رہے ہیں۔ اس بنا پر تم غمگین نہ ہو اور مضبوطی کے ساتھ اپنے راستے پر قدم بڑھاتے رہو اور جان لو کہ قبول کرنے والے قبول کر ہی لیں گے۔

"بیّنات" "زبر" اور "کتاب منیر" کے درمیان فرق کے بارے میں مفسرین نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ ان میں سے زیادہ واضح دو تفسیریں ہیں:

۱۔ "بیّنات" ان واضح اور روشن دلائل و معجزات کے معنی میں ہے کہ جو پیغمبر کی حقانیت ثابت کر دیں لیکن "زبر" کہ جو "زبور" کی جمع ہے، ان کتابوں کے معنی میں ہے کہ جنہیں مستحکم کر کے لکھا گیا ہو (پتھر وغیرہ پر لکھی ہوئی تحریر کے مانند) جبکہ یہاں ان کے مطالب کے استحکام کے لیے کنایہ ہے[1]

بہرحال یہ ایسی کتابوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو حضرت موسیٰ سے پہلے نازل ہوئیں جبکہ "کتاب منیر" کتاب موسیٰ اور ان دوسری آسمانی کتابوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس کے بعد نازل ہوئیں (کیونکہ قرآن مجید میں سورہ مائدہ کی آیہ ۴۴ و ۴۶ میں تورات اور انجیل کو ہدایت و نور کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے' اور اسی سورہ کی آیہ ۱۵ میں قرآن مجید کے بارے میں بھی نور کی تعبیر آئی ہے)۔

---

[1] راغب مفردات میں کہتا ہے:

زبرت الکتاب کتبتہ کتابۃ عظیمۃ وکل کتاب غلیظ الکتابۃ یقال لہ زبور (مفردات مادہ زبر)

"میں نے مستحکم اور عظیم کتابت کی اور جس کتاب کی کتابت مستحکم اور سخت ہو اسے "زبور" کہتے ہیں"۔

Marfat.com

۲۔ "زبر" سے مراد کتبِ انبیاء کا وہ حصّہ ہے جس کے مطالب اور مضامین صرف وعظ و نصیحت اور مناجات پر مشتمل تھے (مثلاً زبورِ داؤد)۔

لیکن "کتابِ منیر" آسمانی کتابوں کی وہ قسم ہے کہ جو احکام و قوانین اور مختلف اجتماعی و انفرادی دستور کی حامل تھیں مثلاً تورات، انجیل اور قرآن مجید۔

دوسری تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں اس گروہ کے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ایسا نہیں تھا کہ وہ خدائی عذاب سے محفوظ رہ جائیں اور ہمیشہ اپنی تکذیبوں کو جاری رکھیں لہٰذا "اس کے بعد ہم نے کافروں کو پکڑ لیا اور انہیں سخت سزا دی" (ثم اخذت الذین کفروا)[1]

کسی گروہ کو طوفان نے آلیا، کسی اور کو تیز اور ویران کن آندھی نے تباہ کر دیا اور کسی جماعت کو ہم نے آسمانی چنگھاڑ، صاعقہ اور زلزلہ کے ذریعے درہم برہم کر دیا۔

اس کے بعد آخر میں تاکید اور ان کی سزا کی شدت بیان کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: "ان کے لیے میرا عذاب کیسا تھا"؟ (فکیف کان نکیر)۔

یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ایک شخص کوئی اہم کام انجام دیتا ہے اور اس کے بعد حاضرین سے سوال کرتا ہے کہ میں نے یہ کام کیسا کیا ہے؟

بہرحال یہ آیات ایک طرف تو راہِ خدا کے تمام راہیوں خصوصاً ہر زمانے اور ہر امت کے سچے رہبروں اور پیشواؤں کی دلجوئی کرتی ہیں اور ان کے دلوں کو گرماتی ہیں کہ وہ مخالف صداؤں سے دل تنگ اور مایوس نہ ہوں اور یہ جان لیں کہ خدائی دعوتیں ہمیشہ ہٹ دھرموں متعصبوں اور مفاد پرست ظالموں کی طرف سے شدید مخالفتوں کا سامنا کرتی رہی ہیں جبکہ کچھ دل سوز طالبانِ حق اور عاشقانِ پاکباز بھی موجود رہتے ہیں کہ جو داعیانِ حق کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی جان کو قربان کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف یہ آیات ان ہٹ دھرم مخالفین کے لیے ایک دھمکی کی حیثیت رکھتی ہیں تاکہ وہ یہ جان لیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے شرمناک اور مخرب اعمال جاری نہیں رکھ سکتے۔ جلد یا بدیر خدائی عذاب دامنگیر ہو کر رہے گا۔

---

[1] "اخذت" "اخذ" کے مادہ سے پکڑنے اور گرفت کرنے کے معنی میں ہے لیکن یہاں سزا کے لیے کنایہ ہے کیونکہ گرفت میں لینا اور پکڑنا سزا کی تمہید ہے۔

Marfat.com

(۲۷) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا
بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ
حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ○

(۲۸) وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ
كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ○

ترجمہ

(۲۷) کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے پانی نازل فرمایا کہ جس کے ذریعے ہم نے زمین سے گوناں گوں رنگ کے پھل نکالے اور پہاڑوں میں بھی (پروردگار کے لطف سے) سفید و سرخ رنگ کے راستے پیدا ہوئے مختلف رنگوں میں اور کبھی گہرے سیاہ رنگ میں۔

(۲۸) اور انسانوں، چلنے پھرنے والے جانداروں اور چوپاؤں کے بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ (ہاں!) حقیقت یہی ہے کہ خدا کے بندوں میں سے صرف علماء اُس سے ڈرتے ہیں۔ خدا عزیز و غفور ہے۔

تفسیر

وجود کے در و دیوار پر عجیب نقش و نگار

ان آیات میں پھر مسئلہ توحید زیرِ بحث ہے اور کتابِ تکوین کا ایک نیا صفحہ انسانوں کی نگاہوں کے سامنے ہے، تاکہ ہٹ دھرم مشرکین اور سخت منکرینِ توحید کا ایک دندان شکن جواب پیدا ہو۔

Marfat.com

اس عظیم کتاب آفرینش کے اس خوبصورت صفحہ میں بے جان موجودات کے تنوع کا ذکر ہے اور نباتات، حیوانات اور انسانوں کی دنیا میں حیات کے مختلف اور خوبصورت چہروں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور دعوت دی گئی ہے کہ دیکھیں خدا نے کس طرح بے رنگ پانی سے لاکھوں رنگ ظاہر کیے ہیں اور معین و محدود عناصر سے بالکل متنوع موجودات پیدا کیے ہیں کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے سے زیادہ زیبا اور خوبصورت ہے۔

اس غالب و ماہر نقاش نے ایک ہی قلم اور سیاہی سے انواع و اقسام کے نقش ایجاد کر دیئے ہیں کہ جو دیکھنے والوں کو فریفتہ و شیفتہ کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے فرمایا گیا ہے: "کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے ہم نے مختلف رنگ کے پھل پیدا کیے" (الم تر انّ اللہ انزل من السماء ماء فاخرجنا بہ ثمرات مختلفاً الوانہا)۔

اس جملے کی استفہام تقریری کے ذریعہ ابتداء، انسانوں کی تلاش و جستجو کی حس کو تحریک دیتے ہوئے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مطلب اتنا روشن و واضح ہے کہ جو شخص بھی نگاہ کرے گا، دیکھ لے گا۔ ہاں! وہ اس حقیقت کو دیکھ لے گا کہ ایک ہی پانی اور زمین سے کہ جن میں سے ایک بے رنگ ہے اور دوسری صرف ایک رنگ رکھتی ہے، یہ سب مختلف قسم کے رنگ، طرح طرح کے پھلوں، خوبصورت پھولوں، پتوں اور شگوفوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔

"الوان" ممکن ہے کہ پھلوں کے ظاہری رنگوں کے معنی میں ہو کہ ایک ہی قسم کے پھل میں بھی کئی قسم کے رنگ پائے جاتے ہیں۔ جیسے سیب مختلف رنگوں میں ہوتا ہے اور مختلف قسم کے پھلوں کی تو بات ہی اور ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے ذائقے، ساخت اور خواص میں اختلاف کی طرف اشارہ ہو، یہاں تک کہ ایک ہی پھل کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، مثلاً انگور کی شاید پچاس قسمیں ہیں اور کھجور کی تقریباً ستر قسمیں ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں فعل غائب کی شکل میں آیا ہے، اس کے بعد متکلم کی صورت میں شروع میں ہے کہ "خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا" پھر اضافہ کیا گیا ہے کہ "ہم نے اس کے ذریعہ رنگا رنگ میوے اور پھل نکالے" یہ طرز تعبیر صرف اسی آیت میں منحصر نہیں ہے، قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی یہی بات نظر آتی ہے۔ گویا پہلا جملہ مخاطب کو خدا کے بارے میں ایک تازہ ادراک و معرفت عطا کرتا ہے، اور وہ اس ادراک و معرفت کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور جب وہ حاضر ہو جاتا ہے تو اللہ اُس سے گفتگو کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں ان راستوں کے تنوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو پہاڑوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ فرق مختلف راستوں کی پہچان کا سبب بنتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "پہاڑوں میں بھی راستے بنائے

Marfat.com

گئے ہیں سفید و سرخ رنگ کے، مختلف رنگوں کے اور (کبھی) گہرے سیاہ رنگ کے" (و من الجبال جدد بیض و حمر مختلف الوانها و غرابیب سود) [1]

رنگوں کا یہ اختلاف ایک طرف تو پہاڑوں کو خوبصورت بناتا ہے اور دوسری طرف راستوں کو معلوم کرنے اور پُرپیچ کوہستانی سڑکوں میں گم نہ ہو جانے کا سبب ہے اور آخر میں ہر چیز میں خدا کی قدرت کی دلیل ہے۔

"جدد" جمع "جدہ" (بروزن "غدہ") جادہ اور راستے کے معنی میں ہے۔

"بیض" "ابیض" کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے "سفید" اور "حمر"، "احمر" کی جمع ہے، اس کا معنی ہے "سرخ"۔

"غرابیب" "غربیب" (بروزن "کبریت") کی جمع ہے گہرے سیاہ رنگ کے معنی میں ہے، یہ جو عرب لوگ کوّے کو "غراب" کہتے ہیں، تو یہ بھی اسی بنا پر ہے۔ نیز لفظ "سود" "اسود" کی جمع ہے اور سیاہ ہی کے معنی میں ہے یہ "غرابیب" کے بعد یہ لفظ اسی معنی کی تاکید کے طور پر آیا ہے اور یہ بعض کوہستانی راستوں کے گہرے سیاہ ہونے کے معنی میں ہے [2]

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ خود پہاڑ بھی خط اور راستوں کی مانند ہیں کہ جو زمین کی سطح کے اوپر کھینچے گئے ہیں اور وہ دُور کے فاصلوں سے خصوصیت کے ساتھ مکمل طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ ایسے خطوط کہ جو بعض سفید رنگ کے ہیں، بعض سرخ رنگ کے اور بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں، یہ ایسے خطوط ہیں کہ جو پروردگار کے دستِ تقدیر نے زمین کے چہرے پر نقش کیے ہیں [3]

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں انسانوں اور دوسرے جانداروں میں رنگوں کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "انسانوں، جانداروں اور چوپایوں میں سے بھی مختلف رنگوں والے ہوتے ہیں" (و من الناس

---

[1] بعض نے اس جملے کو جملۂ استینافیہ سمجھا ہے ("من الجبال"، خبر مقدم، اور "جدد" مبتدائے مؤخر ہے) اور بعض نے کہا ہے کہ یہ تقدیر میں اس طرح تھا:

الم تران من الجبال جدد بیض و حمر مختلف الوانها۔

[2] جس طرح سے کہ بعض کتب لغت مثلاً "لسان العرب" اور بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ زیرِ بحث آیت میں "سود" "غرابیب" کا بدل ہے کیونکہ رنگوں کے بارے میں تاکید مقدم نہیں ہوتی، (اس بات پر توجہ رکھیے کہ "غرابیب" میں سیاہی کے لحاظ سے "سود" کی نسبت زیادہ تاکید ہے) لہٰذا انہوں نے کہا ہے کہ اصل میں "سود غرابیب" تھا۔

[3] تفسیر المیزان، جلد ۱۷، ص ۴۳۔

Marfat.com

والدوابّ والانعام مختلف الوانہ) ۔

ہاں! سب انسان باوجودیکہ ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں مکمل طور پر مختلف قبیلوں اور رنگوں کے حامل ہیں۔ بعض برف کی طرح سفید، بعض سیاہی کے مانند سیاہ، یہاں تک کہ ایک ہی نسل اور خاندان میں بھی رنگوں میں بہت اختلاف ہے، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو جڑواں بچے بھی رنگ اور روپ میں یکساں نہیں ہوتے۔ اگرچہ انہوں نے جسم میں تمام مراحل ایک دوسرے کے ساتھ طے کیے ہیں اور ابتدار سے ایک دوسرے کے ہم آغوش رہے ہیں، باوجودیکہ وہ ایک ماں اور ایک باپ سے ہیں، ایک ہی وقت میں ان کا نطفہ قرار پاتا ہے اور انہوں نے ایک ہی قسم کی غذا کھائی ہوتی ہے۔

ظاہری چہرے سے قطع نظر، ان کے باطنی رنگ، ان کے اخلاق و عادات، ان کی صفات و خصوصیات اور ان کی استعداد اور ذوق، بالکل متنوع اور مختلف ہیں، یہاں تک کہ تمام ضروریات کے ساتھ مجموعی طور پر ایک منظم اکائی معرضِ وجود میں آتی ہے۔

جانداروں کی دنیا میں ہزارہا قسم کے حشرات، پرندے، رینگنے والے، دریائی اور وحشی جنگلی جانور موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک اپنی خصوصیات اور عجائبات خلقت کے ساتھ آفریدگار کی قدرت، عظمت اور علم کی نشانی ہیں۔

جس وقت ہم کسی بڑے چڑیا گھر میں قدم رکھتے ہیں، تو باوجودیکہ وہاں پر عالم کے زندہ موجودات کا ہزارواں حصہ بھی موجود نہیں ہوتا پھر بھی ہم اس طرح سے مبہوت و مسحور اور دنگ ہو جاتے ہیں کہ بے اختیار ہو کر اس خدا کی ستائش کرنے لگتے ہیں کہ جس نے وجود کے در و دیوار پر یہ تمام نقش بنائے ہیں۔

توحید کی ان نشانیوں کو بیان کرنے کے بعد آخر میں مجموعی طور پر فرمایا گیا ہے: ہاں! "معاملہ اسی طرح ہے" (کذالک) [1]

اور چونکہ ان عظیم آیاتِ خلقت سے بہرہ اندوز ہونا سب سے زیادہ عقلمند اور دانشمند افراد کا کام ہے اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "صرف علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں" (انما یخشی اللہ

---

[1] اس بارے میں کہ "کذالک" کا اعراب کے لحاظ سے کیا مقام ہے علماء نے مختلف آراء ذکر کی ہیں بعض اسے مستقل جملہ سمجھتے ہیں کہ جو تقدیر میں اس طرح تھا "الامر کذالک" اور ہم نے تفسیر میں اسی معنی کو اختیار کیا ہے کیونکہ یہ زیادہ پرکشش اور زیادہ مناسب ہے لیکن بعض نے اسے قبل کے جملے سے متعلق قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس کا معنی اس طرح ہے: "کما ان الثمرات وجدد الجبال مختلف الوانہا کذالک الناس والدواب والانعام" یہ احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ بعد والے جملے سے مربوط ہے اور اس کا معنی یوں ہے:

کذالک تختلف احوال العباد فی الخشیۃ ۔

Marfat.com

من عبادہ العلماء)۔

جی ہاں! تمام بندوں میں سے علماء ہی ہیں کہ جو خشیت کے عالی مقام پر فائز ہوتے ہیں یعنی وہ پروردگار کے مقام کی عظمت کو سمجھتے ہوئے دل میں مسئولیت کا خوف رکھتے ہیں۔ "خشیت" کی یہ حالت انفس و آفاق کی نشانیوں میں سیر، پروردگار کے علم و قدرت سے آگاہی اور مقصدِ آفرینش کو جاننے کا نتیجہ ہے۔

"راغب" "مفردات" میں کہتا ہے کہ "خشیت" اس خوف کے معنی میں ہے کہ جس کے ساتھ تعظیم کی آمیزش ہو اور زیادہ تر ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے کہ جب خوف کا سرچشمہ کسی چیز سے علم و آگاہی ہو۔ اس بناء پر قرآن مجید میں یہ مقام علماء کے ساتھ مخصوص شمار ہوا ہے۔

ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ خدا کا خوف ان مسئولیتوں اور ذمہ داریوں کے خوف کے معنی میں ہے کہ جو انسان پر خدا کی طرف سے عائد ہوتی ہیں۔ اس بات کا خوف کہ کہیں اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو جائے۔ اس سے قطع نظر اصولی طور پر عظمت کا ادراک، وہ بھی ایسی عظمت کہ جو غیر محدود و بے پایاں ہے، انسان جیسے محدود وجود کے لیے خوف آفرین ہے۔ (غور کیجئے گا)

اس جملے سے ضمناً یہ واضح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حقیقی علماء وہی ہیں کہ جو اپنی ذمہ داریوں کی جوابدہی کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اہلِ علم ہیں، اہلِ گفتار نہیں ہیں، چونکہ علم بغیر عمل کے عدم خشیت کی دلیل ہے اور ایسے افراد زیر بحث آیت میں علماء کے زمرے میں شمار نہیں ہوتے۔

یہی حقیقت ایک حدیث میں امام زین العابدین علی بن الحسینؑ سے منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

وما العلم باللہ والعمل الا الفان مؤتلفان فمن عرف اللہ خافہ: وحثہ الخوف علی العمل بطاعۃ اللہ، وان ارباب العلم واتباعھم (ھم) الذین عرفوا اللہ فعملوا لہ، ورغبوا الیہ، وقد قال اللہ: انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔

"علم و عمل دو مخلص دوست ہیں، جو شخص خدا کو پہچان لے وہ اس سے ڈرتا ہے اور یہی خوف اسے عمل اور فرمانِ خدا کی اطاعت پر آمادہ کرتا ہے۔ صاحبانِ علم اور ان کے پیروکار وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کو اچھی طرح پہچانا ہے اور اس کے لیے عمل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ عشق رکھتے ہیں جیسا کہ خدا فرماتا ہے: انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء"[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۵۹، بحوالہ روضۃ الکافی۔

Marfat.com

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ:

یعنی بالعلماء من صدق قوله فعله و من لم یصدق قوله فعله فلیس بعالم۔

"علماء سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جن کے اعمال ان کے اقوال کے ساتھ ہم آہنگ ہوں، جس شخص کی گفتار و کردار ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہ ہو وہ عالم نہیں ہے"[1]

ایک اور دوسری حدیث میں آیا ہے:

اعلمکم باللّٰہ اخوفکم للّٰہ۔

"تم میں سے زیادہ عالم وہ ہے جس کا خوفِ خدا سب سے زیادہ ہے"[2]

مختصر یہ کہ قرآن کی منطق کے مطابق علماء وہ لوگ نہیں ہیں کہ جن کا دماغ اِس کی اور اُس کی آرا و افکار کا صندوقچہ ہو اور عالمی قوانین اور علمی فارمولوں سے بھرا ہو اور ان کی زبان ان مسائل کو بیان کرتی ہو اور ان کی زندگی مدارس، یونیورسٹیوں اور کتاب خانوں میں گزرتی ہوں بلکہ علماء تو وہ صاحب نظر اور دانشمند ہیں کہ جن کے نورِ علم و دانش نے ان کے تمام وجود کو خدا کے نور اور ایمان و تقویٰ سے روشن کیا ہو اور اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں سختی سے احساسِ مسئولیت رکھتے ہوں اور سب سے زیادہ پابند ہوں۔

ہم نے سورہ قصص میں بھی پڑھا ہے کہ جس وقت مغرور و خود پسند قارون نے کہ جو ایک مقام علم کا بھی مدعی تھا اپنی ثروت کی نمائش کی تو دنیا پرست لوگوں نے جو اس کے ٹھاٹھ باٹھ سے بہت زیادہ متاثر تھے، یہ آرزو کی کہ اے کاش! وہ بھی اس قسم کے اموالِ دنیا سے بہرہ ور ہوتے لیکن بنی اسرائیل کے علماء نے پکار کر ان سے کہا: "تم پر وائے ہو! خدائی اجر و ثواب تو ان لوگوں کے لیے ہے کہ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیا ہے، اور وہ بہتر ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جو صرف صابر اور صاحبِ استقامت لوگوں کیلئے ہے"۔

وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللّٰہ خیر لمن اٰمن وعمل صالحاً ولا یلقاھا الّا الصابرون (قصص-۸۰)

آیت کے آخر میں سابقہ بیان پر ایک مختصر دلیل کے عنوان سے فرمایا گیا ہے: "خدا عزیز و غفور ہے" (ان اللّٰہ عزیز غفور)۔

اس کی بے پایاں "عزت" و قدرت علماء کے خوف و خشیت کا سرچشمہ ہے اور اس کی "غفوریت" کہ جو اس کی بے انتہا رحمت کی نشانی ہے ان کی رجاء و امید کا سبب ہے اور اس طرح سے یہ دو مقدس نام خدا کے بندوں کو خوف و رجاء کے درمیان محفوظ رکھتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ تکامل و ارتقاء کی طرف مسلسل حرکت ان دو صفات سے متصف ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖

---

[1] و [2] مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

(۲۹) اِنَّ الَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡفَقُوۡا
مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً یَّرۡجُوۡنَ تِجَارَۃً لَّنۡ تَبُوۡرَ ۙ○
(۳۰) لِیُوَفِّیَہُمۡ اُجُوۡرَہُمۡ وَ یَزِیۡدَہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ؕ
اِنَّہٗ غَفُوۡرٌ شَکُوۡرٌ ○

ترجمہ

(۲۹) جو لوگ کتابِ خدا کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے پنہاں و آشکار انفاق کرتے ہیں وہ (ایسی نفع بخش) تجارت کی امید رکھتے ہیں کہ جس میں گھاٹا نہیں ہے۔

(۳۰) (وہ یہ اعمالِ صالح اس لیے انجام دیتے ہیں) تاکہ خدا انہیں مکمل اجر اور صلہ دے اور اپنے فضل کا ان پر اضافہ کرے کہ وہ بخشنے والا اور قدر دان ہے۔

تفسیر

پروردگار کے ساتھ نفع بخش تجارت

گزشتہ آیات میں علماء کے خوف و خشیت کے مقام کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ زیرِ بحث آیات میں ان کے مقام "امید و رجاء" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ دو چیزوں کے ساتھ ہی انسان آسمانِ سعادت کی بلندی پر پرواز کرسکتا ہے اور تکامل و ارتقاء کی راہ طے کرسکتا ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: "جو لوگ کتابِ الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے پنہاں و آشکار خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں کہ جس میں گھاٹا نہیں ہے" (انّ الذین یتلون کتاب اللہ و اقاموا الصلٰوۃ و انفقوا ممّا رزقناھم

Marfat.com

سرًا وعلانية يرجون تجارة لن تبور)[1]

یہ بات واضح ہے کہ یہاں "تلاوت" سرسری اور غور و فکر سے خالی قرأت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس سے ایسا پڑھنا مراد ہے کہ جو غور و فکر کا سرچشمہ ہو، وہ فکر کہ جو عملِ صالح کا سرچشمہ بنے' ایسا عمل کہ جو ایک طرف تو انسان کا خدا سے رشتہ جوڑ دے جس کا مظہر نماز ہے اور دوسری طرف اسے مخلوق کے ساتھ مربوط کر دے کہ جس کا مظہر انفاق ہے۔

خرچ بھی تمام چیزوں میں سے کہ جو خدا نے انسان کو دی ہیں' اپنے علم میں سے' اپنے مال و ثروت اور اثر و رسوخ میں سے، اپنی قوی فکر و نظر میں سے اور اپنے اخلاق و تجربات میں سے' خلاصہ یہ کہ تمام خداداد نعمات میں سے۔

یہ انفاق کبھی تو پوشیدہ طریقے سے ہوتا ہے تاکہ مکمل اخلاص کی نشانی بنے (سرًّا) اور کبھی آشکارا اور علی الاعلان تاکہ دوسروں کے لیے تشویق کا سبب ہو اور شعائرِ الٰہی کی تعظیم بھی ہو (علانية)۔

ہاں! وہ علم کہ جو اس قسم کا اثر رکھتا ہو وہ رجاء و امید کا سبب بنتا ہے۔

اس آیت میں اور گزشتہ آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ سچے علماء ان صفات کے حامل ہوتے ہیں۔

روحانی لحاظ سے ان کا دل عظمتِ خدا کے احساس سے خوف و خشیت سے معمور ہوتا ہے۔

گفتگو کے لحاظ سے ان کی زبان آیاتِ خدا کی تلاوت میں مشغول ہوتی ہے۔

روحانی اور جسمانی عمل کے لحاظ سے نماز پڑھتے ہیں اور اسے بطور عبادت بجا لاتے ہیں۔

دولت سے متعلق عمل کے لحاظ سے جو کچھ ان کے پاس ہے اسے آشکارا اور پنہاں انفاق کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مقصد کے لحاظ سے اُن کا افقِ فکر اتنا بلند و بالا ہے کہ ان کا دل زُود گزر مادی دنیا سے اچاٹ ہو جاتا ہے، ان کی نظر صرف سود مند خدائی تجارت پر ہوتی ہے کہ جس کے دامن کی طرف فنا کا ہاتھ دراز نہیں ہوتا۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "تبور" "بوار" کے مادہ سے سخت گھاٹے کے معنی میں ہے اور چونکہ شدید گھاٹا باعثِ تباہی ہوتا ہے لہٰذا "بوار" ہلاکت کے معنی میں آیا ہے' اس طرح "بوار" سے خالی تجارت وہ ہے کہ جو نہ گھاٹا ہو اور نہ ہی تباہی۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

---

[1] توجہ رکھیے کہ "یرجون" "انّ" کی خبر ہے۔

Marfat.com

ایک شخص نے رسولِ خداؐ کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے موت کیوں پسند نہیں ؟

آپؐ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس کچھ مال و دولت ہے ؟

اس نے عرض کی : ہاں !

فرمایا: اسے اپنے سے پہلے آگے بھیج دے ۔

عرض کیا: میں ایسا نہیں کرسکتا ۔

فرمایا :

ان قلب الرجل مع ماله ان قدمه احب ان يلحق به وان اخره احب ان يتأخر معه ۔

"انسان کا دل اس کے مال کے ساتھ ہوتا ہے ،اگر وہ اسے اپنے آگے بھیج دے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ جا ملے اور اگر اسے اپنے پاس روک رکھے تو چاہتا ہے کہ وہ بھی اس کے ہمراہ یہیں رہے" [1]

یہ حدیث حقیقت میں زیرِ بحث آیت کی روح کو منعکس کرتی ہے ،کیونکہ ارشاد ہوتا ہے : کہ وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور راہِ خدا میں انفاق کرتے ہیں وہ دارِ آخرت کی امید اور اس سے لگاؤ رکھتے ہیں چونکہ انہوں نے نیکیوں کو اپنے سے پہلے بھیج دیا ہے لہٰذا وہ اس کے ساتھ جا ملنے کی آرزو کرتے ہیں ۔

آخری زیرِ بحث آیت سچے مومنین کے مقصد کو اس طرح بیان کرتی ہے :"وہ یہ اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں تاکہ خدا انہیں مکمل اجر اور صلہ دے اور اپنے فضل سے اضافہ بھی کرے کہ وہ بخشنے والا اور شکور ہے" (ليوفيهم اجورهم ويزيدهم من فضله انه غفور شكور) [2]

یہ جملہ حقیقت میں ان کے انتہائی خلوص کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے نیک اعمال میں خدائی اجر و ثواب کے سوا اور کسی چیز پر نظر نہیں رکھتے جو کچھ چاہتے ہیں اُس سے چاہتے ہیں اور ریا ، دکھاوے اور لوگوں کی تحسین و تعریف کے لیے قدم نہیں اٹھاتے کیونکہ اعمالِ صالح میں اہم ترین مسئلہ وہی نیت خالص ہے ۔

---

[1] مجمع البیان ، جلد ۸ صفحہ ۴۰۸ زیرِ بحث آیات کے ذیل میں ۔

[2] "ليوفيهم" یا تو "يتلون كتاب الله ..." سے متعلق ہے اس لحاظ سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کا مقصد تلاوت ، نماز اور انفاق سے خدا کا اجر و ثواب حاصل کرنا ہے اور یا یہ "لن تبور" سے متعلق ہے اور اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کی تجارت کبھی بھی گھاٹے کی طرف نہیں جائے گی کیونکہ ان کا اجر و صلہ دینے والا خدا ہے ۔

Marfat.com

"اجور" "اجر" کی جمع ہے اور "مزدوری" کے معنی میں ہے۔ حقیقت میں یہ تعبیر پروردگار کی طرف سے ایک لطف کی مظہر ہے گویا وہ بندوں کو اعمالِ صالح کے بدلے کا حقدار سمجھتا ہے۔ حالانکہ بندوں کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی کی طرف سے ہے، یہاں تک کہ اعمالِ صالح انجام دینے کی طاقت بھی اسی کی عطا کردہ ہے۔

اس تعبیر سے بھی زیادہ محبت آمیز "ویزیدھم من فضلہ" کا جملہ ہے کہ جس سے انہیں نوید اور خوشخبری دی گئی ہے کہ عام اجر کے علاوہ کہ جو خود کبھی عمل سے سینکڑوں گنا اور کبھی ہزاروں گنا ہے، اپنے فضل سے مزید اس میں اضافہ کرتا ہے اور وہ نعمتیں کہ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئیں اور اس جہان میں کوئی بھی شخص ان کا تصور نہیں کر سکتا اپنے وسیع فضل سے انہیں بخشے گا۔

ایک حدیث میں ابن مسعود سے منقول ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا:

ھو الشفاعة لمن وجبت لہ النار ممن صنع الیہ معروفاً فی الدنیا۔

"اس سے مراد مرتبہ و مقامِ شفاعت ہے کہ جو انہیں حاصل ہوگا تاکہ وہ ان لوگوں کی شفاعت کریں کہ جنہوں نے اُن سے دنیا میں کوئی نیکی کی ہے لیکن اپنے اعمال کی وجہ سے مستحق عذاب ہو گئے ہیں"[1]

اس طرح سے نہ صرف وہ خود اہلِ نجات ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی پروردگار کے فضل سے نجات کا باعث ہیں۔

بعض مفسرین نے "ویزیدھم من فضلہ" کو مقام "شہود" کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو قیامت میں مومنین کو حاصل ہوگا یعنی وہ پروردگار کے جمال و جلال کی طرف دیکھیں گے اور اس منظر سے بہت لذت حاصل کریں گے۔

لیکن ظاہراً مذکورہ جملہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں مذکورہ حدیث کا مضمون بھی شامل ہے اور دوسری نعمات بھی شامل ہیں۔

"انہ غفور شکور" کا جملہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پہلا لطفِ پروردگار تو اُن کے حق میں وہی گناہوں اور لغزشوں کی بخشش ہے کہ جو کبھی کبھی ان سے سرزد ہوتے رہے کیونکہ انسان کی زیادہ تر پریشانی اسی وجہ سے ہوگی۔

جب وہ اس لحاظ سے آسودہ خاطر ہو جائیں گے تو اللہ انہیں ان کے اعمال کا شکریہ ادا کرے گا اور انہیں افضل ترین جزا دے گا۔

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

تفسیر مجمع البیان میں یہاں عربوں کی ایک جاذب نظر ضرب المثل نقل ہوئی ہے کہ وہ کہتے ہیں :

اشکر من بروقہ

"فلاں شخص درخت بروقہ سے بھی زیادہ شکر گزار ہے"[1]

اور یہ ایک چھوٹے سے درخت کی طرف اشارہ ہے کہ جو سرزمین عربستان میں ہوتا تھا اور عربوں کا عقیدہ تھا کہ جب اس پر بادل کا سایہ ہوتا ہے تو یہ فوراً سرسبز ہو جاتا ہے اور بادل برسے بغیر اس کے پتے نکل آتے ہیں اور یہ انتہائی شکر گزاری کے لیے ایک ضرب المثل ہے کہ جو معمولی سی خدمت کے بدلے بڑی سے بڑی جزا اور اجر دینے کے موقع پر بولی جاتی ہے[2]

البتہ اس قسم کے درخت کا خالق و مالک اس سے بھی زیادہ قدر دانی کرنے والا اور بخشش کرنے والا ہے۔

اِس تجارت کی عجیب شرائط

پُرلطف بات یہ ہے کہ بہت سی آیاتِ قرآنی میں اس جہان کو ایسے تجارت گھر سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس کے تاجر انسان ہیں اور خریدار پروردگارِ عظیم اور مال و متاع عملِ صالح ہیں اور قیمت بہشت اور خدا کی رحمت و رضا ہے[3]

اگر ہم صحیح طور پر غور و فکر کریں تو خداوند کریم کے ساتھ یہ عجیب و غریب تجارت بے مثال ہے کیونکہ یہ ایسے امتیازات کی حامل ہے جو کسی بھی تجارت میں موجود نہیں ہیں :

۱۔ تمام سرمایہ اس نے خود ہی بیچنے والے کو دیا ہے اس کے بعد خود ہی خریدار بن جاتا ہے۔

۲۔ وہ خریدار ہے حالانکہ اُسے ان اعمال کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر چیز کے خزانے اُسی کے پاس ہیں۔

۳۔ وہ "متاعِ قلیل" کو بہت زیادہ قیمت پر خریدتا ہے :

یا من یقبل الیسیر و یعفو عن الکثیر

"اے وہ خدا کہ جو تھوڑے سے عمل کو قبول کر لیتا ہے اور بہت سے گناہوں کو بخش دیتا ہے"

---

[1] "بروقہ" بروزن "حنجرہ"۔

[2] مجمع البیان، جلد ۸ صفحہ ۴۰۷۔

[3] صف - ۱۰، توبہ - ۱۱۱، بقرہ - ۲۰۷، نساء - ۷۴۔

Marfat.com

۴۔ یہاں تک کہ وہ معمولی قسم کے مال و متاع بھی خرید لیتا ہے:

فمن یعمل مثقال ذرة خیرًا یرہ۔

"جو ذرہ برابر بھی عمل کرتا ہے وہ اسے دیکھے گا۔"

۵۔ کبھی وہ سات سو گنا اور کبھی اس سے بھی کہیں زیادہ قیمت دیتا ہے۔ (بقرہ۔ ۲۶۱)

۶۔ اس عظیم قیمت کے علاوہ اپنے فضل و رحمت سے اتنا اضافہ کرے گا کہ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔" ویزیدھم من فضلہ"۔ (زیر بحث آیت)

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک آزاد اور عاقل انسان اس قسم کی تجارت سے آنکھ بند کرلے اور اس کے غیر کی طرف رُخ کرے اور اس سے بھی بدتر بات یہ کہ اپنی ہستی اور وجود کے مال و متاع کو بے قیمت بیچ ڈالے۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وانہ لیس لانفسکم ثمن الا الجنة فلا تبیعوھا الا بھا۔

"جان لو کہ تمہارے سرمایہ ہستی کی قیمت جنت کے علاوہ کچھ نہیں اسے جنت کے علاوہ کسی اور چیز کے بدلے نہ بیچو"[1]

---

[1] نہج البلاغہ۔ کلمات قصار۔ جملہ ۴۵۶۔

Marfat.com

(۳۱) وَالَّذِیٓ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ ہُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا
لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِعِبَادِہٖ لَخَبِیۡرٌۢ بَصِیۡرٌ ○
(۳۲) ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡہُمۡ
ظَالِمٌ لِّنَفۡسِہٖ ۚ وَمِنۡہُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَمِنۡہُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَیۡرٰتِ
بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ ○

ترجمہ

(۳۱) ہم نے کتاب میں سے جو کچھ تجھے وحی کیا ہے وہ حق ہے اور اس سے پہلے والی کتب کے ساتھ ہم آہنگ ہے، خدا اپنے بندوں سے باخبر اور بینا ہے۔

(۳۲) پھر ہم نے یہ کتابِ آسمانی اپنے برگزیدہ بندوں میں سے ایک گروہ کو میراث میں دے دی (لیکن) ان میں سے ایک گروہ نے اپنے اوپر ظلم کیا اور ان میں سے کچھ میانہ رو تھے اور ایک جماعت اذنِ خدا سے نیکیوں میں سب سے (سبقت) لے گئی اور یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔

تفسیر

میراثِ انبیاء کے حقیقی وارث

گزشتہ آیات میں پاک دل مومنین کے بارے میں گفتگو تھی کہ جو کتاب اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ زیر بحث آیات میں اس آسمانی کتاب اور اس کی صداقت کے دلائل اور اسی طرح اس کتاب کے حقیقی حاملین کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے گزشتہ آیات میں

Marfat.com

توحید کے بارے میں بحث تھی اور یہاں نبوت کے متعلق گفتگو سے سلسلۂ کلام کی تکمیل کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: "ہم نے کتاب میں سے جو کچھ تجھے وحی کیا ہے وہ حق ہے اور جو کچھ گزشتہ کتب میں آیا ہے یہ اس کی تصدیق کرتی ہے۔ خدا اپنے بندوں کے بارے میں آگاہ اور بینا ہے" (والذی اوحینا الیك من الکتاب هوالحق مصدقاً لما بین یدیه ان الله بعباده لخبیر بصیر)۔

حق کا معنی ہے "ایسی چیز جو واقعیت سے ہم آہنگ اور اس کے مطابق ہو"۔ یہ تعبیر اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے ایک دلیل ہے کہ یہ آسمانی کتاب پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ ہم اس کے مضامین میں جس قدر بھی غور و فکر کرتے ہیں اسے اتنا ہی حقائق کے ساتھ ہم آہنگ پاتے ہیں۔

اس میں کوئی تناقض ہے، نہ جھوٹ اور نہ کوئی بیہودہ پن۔ اس کے اعتقادات و معارف عقل منطق سے ہم آہنگ ہیں، اس کی تاریخ افسانوں اور من گھڑت قصوں سے خالی ہے اور اس کے قوانین انسانی احتیاجات کے موافق ہیں۔ اس کی حقانیت اس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ یہ خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

اس مقام پر تو قرآن کے مقام اور حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے لفظ "حق" سے استفادہ کیا گیا ہے جبکہ قرآن کی دوسری آیات میں لفظ "نور"۔ "برہان"۔ "فرقان"۔ "ذکر"۔ "موعظہ" اور "ہدیٰ" سے استفادہ کیا گیا ہے کہ جن میں سے ہر ایک قرآن کی مختلف برکتوں اور پہلوؤں میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور "حق" لفظ ان سب کا جامع ہے۔

راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "حق" دراصل مطابقت اور موافقت کے معنی میں ہے اور یہ لفظ کئی معانی کے لیے بولا جاتا ہے:

پہلا: وہ ذات کہ جو کسی چیز کو حکمت کی اساس پر ایجاد کرے۔ اسی بناء پر خدا کو حق کہا جاتا ہے:

فذالکم الله ربکم الحق (یونس - ۳۲)۔

دوسرا: وہ چیز کہ جو حکمت کی بنیاد پر ایجاد ہوئی ہے اسے بھی حق کہا جاتا ہے اور چونکہ عالم ہستی خدا کا فعل ہے اور حکمت کے موافق ہے لہٰذا وہ سب کا سب حق ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ماخلق الله ذالك الا بالحق۔

"خدا نے ان موجودات (سورج اور چاند اور ان کی منازل) کو حق کے سوا پیدا نہیں کیا"۔ (یونس - ۵)

تیسرا: ان عقائد کو کہ جو حقیقت کے مطابق ہیں حق کہا جاتا ہے:

فهدی الله الذین اٰمنوا لما اختلفوا فیه من الحق۔

Marfat.com

"خدا نے مومنین کی اس بات کی طرف کہ جس میں انہوں نے حق سے اختلاف کیا تھا ہدایت فرمائی"۔ (بقرہ - ۲۱۳)

چوتھا اُن باتوں اور افعال کو بھی حق کہا جاتا ہے جو ذمہ داری کے مطابق اور وقت مقررہ پر انجام پاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ تیری بات حق ہے اور تیرا کردار حق ہے [1]

اس بنا پر قرآن مجید کا حق ہونا اس لحاظ سے بھی ہے کہ یہ مصلحت اور حقیقت کے مطابق گفتگو کرتا ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ اس میں موجود عقائد و معارف حقیقت سے ہم آہنگ ہیں اور یہ خدا کا کام بھی ہے کہ جسے اس نے حکمت کی بنیاد پر ایجاد کیا ہے۔ خود خداوندِ عالم کہ جو عین حق ہے کی اس میں تجلی ہے اور عقل اس چیز کی تصدیق کرتی ہے کہ جو حق اور واقعیت ہے۔

"مصدقًا لما بین یدیه" کا جملہ اس کتاب آسمانی کی صداقت کی دوسری دلیل ہے کیونکہ وہ ایسی نشانیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو گزشتہ کتب میں اس کے بارے میں اور اس کے لانے والے کے بارے میں آئی ہیں (اس سلسلے میں ہم سورۂ بقرہ کی آیہ ۸۹ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں) [2]

"ان الله بعباده لخبیر بصیر" کا جملہ قرآن کی حقانیت کی علت ہے اور حقائق اور انسانی تقاضوں کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کو بیان کرتا ہے کیونکہ یہ اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے کہ جو اپنے بندوں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے اور ان کی احتیاجات کے بارے میں بصیر و بینا ہے۔

"خبیر" اور "بصیر" کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس بارے میں عرض ہے کہ "خبیر" تو انسان کے باطن، اس کے عقائد، نیت اور روح کے معنی میں ہے اور "بصیر" اس کے ظواہر اور رونما ہونے والے جسمانی امور کے بارے میں بینا ہونے کے معنی میں ہے [3]

بعض مفسرین "خبیر" کو انسان کی اصل خلقت کی طرف اور "بصیر" کو اس کے اعمال و افعال کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں [4]

البتہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اگرچہ آیت سے دونوں معانی مراد ہونا بھی بعید نہیں ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

بعد والی آیت میں اس عظیم آسمانی کتاب کے حاملین کا ذکر ہے یعنی وہ لوگ کہ جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ

---

[1] مفرداتِ راغب مادۂ "حق"۔

[2] جلد اوّل ص۱۷۰ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

[3] فخر رازی تفسیر کبیر زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[4] روح البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

کے پاکیزہ دل پر قرآن کے نزول کے بعد اس مشعلِ فروزاں کو ہر زمانے میں روشن رکھا اور اس کی پاسداری کی ۔ ارشاد ہوتا ہے : "پھر ہم نے یہ آسمانی کتاب اپنے برگزیدہ بندوں میں سے ایک گروہ کو میراث میں دے دی" (ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا) ۔

واضح رہے کہ یہاں "کتاب" سے مراد وہی چیز ہے جو گزشتہ آیت میں بیان ہوئی ہے (یعنی قرآن مجید) اور اصطلاح کے مطابق اس میں الف اور لام عہد کا ہے اور یہ جو بعض علماء نے اسے تمام کتب آسمانی پر اشارہ سمجھا ہے اور اسے جنس کے لیے آنے والا الف لام سمجھا ہے بہت ہی بعید نظر آتا ہے اور گزشتہ آیات سے مناسبت نہیں رکھتا ۔

قرآن مجید میں یہاں اور اس کے مشابہ دوسرے مواقع پر "ارث" کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ "ارث" ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی زحمت کے بغیر ہاتھ آئے اور خدا نے بھی یہ بہت ہی عظیم کتاب اسی طرح مسلمانوں کو عطا کر دی ہے ۔

اس مقام پر اہلِ بیتؑ کے حوالے سے بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں اُن سب میں خدا کے برگزیدہ بندوں سے مراد ائمہ معصومین لیے گئے ہیں[1]

یہ روایات جیسا کہ ہم نے بارہا بیان کیا ہے، واضح اور درجہ اوّل کے مصادیق بیان کرتی ہیں ۔ یہ بات اس میں مانع نہیں کہ امت کے علماء، صالحین اور شہداء کہ جنہوں نے اس کتاب آسمانی کی حفاظت و پاسداری اور اس کے فرامین کو دوام بخشنے کے لیے کوشش کی ہے "الذین اصطفینا من عبادنا" (خدا کے برگزیدہ بندے) کے مفہوم میں داخل ہوں ۔

اس کے بعد اس سلسلے میں لوگوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : "ان میں سے کسی گروہ نے اپنے اوپر ظلم کیا، کسی نے درمیانی راہ اختیار کی اور کسی گروہ نے حکم خدا سے نیکیوں میں دوسروں سے سبقت حاصل کر لی اور یہ بہت بڑی فضیلت ہے" (فمنهم ظالم لنفسه و منهم مقتصد و منهم سابق بالخیرات باذن الله ذالك هو الفضل الکبیر) ۔

آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ تینوں گروہ "خدا کے برگزیدہ بندوں" میں سے ہیں کہ جو وارث و حامل کتاب الٰہی ہیں ۔

زیادہ واضح تعبیر میں خدا نے اس کتاب آسمانی کی پاسداری اور حفاظت اپنے پیغمبرؐ کے بعد اس امت کے ذمہ رکھی ہے ۔ وہ امت کہ جو خدا کی برگزیدہ ہے لیکن اس امت کے درمیان مختلف طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ان میں سے بعض اس کتاب کی پاسداری اور اس پر عمل کرنے کی عظیم ذمہ داری

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ صفحہ ۳۶۱ کی طرف رجوع کریں ۔

Marfat.com

میں کوتاہی کرتے ہیں اور انہوں نے حقیقت میں اپنے اوپر ظلم کیا ہے، یہ "ظالم لنفسہ" کے مصداق ہیں۔
دوسرے گروہ نے کافی حد تک اس فرداری کو پورا کیا ہے اور کتاب پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے اگرچہ ان سے کچھ لغزشیں اور خطائیں بھی ہوئی ہیں یہ "مقتصد" کے مصداق ہیں۔
ایک ممتاز گروہ وہ ہے جس نے اپنی بھاری ذمہ داری کو احسن طریقے سے انجام دیا ہے اور مقابلہ کے اس عظیم میدان میں یہ لوگ سب سے بازی لے گئے ہیں۔ یہ ان سب کے پیشوا ہیں جنہیں آیت میں "سابق بالخیرات باذن اللہ" کہا گیا ہے۔

ممکن ہے کہ یہاں یہ کہا جائے کہ "اصطفینا" اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام گروہ خدا کے برگزیدہ ہیں، لیکن یہاں ایک ظالم گروہ کا ذکر اس امر کے منافی ہے۔

ہم جواب میں کہیں گے کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے بنی اسرائیل کے بارے میں سورۂ مومن کی آیہ ۵۳ میں ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ولقد اٰتینا موسی الھدی واورثنا بنی اسرائیل الکتاب۔

"ہم نے موسیٰ کو ہدایت (آسمانی کتاب) دی اور یہی آسمانی کتاب ہم نے بنی اسرائیل کو میراث کے طور پر عطا کی"۔

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ سارے بنی اسرائیل نے اپنی اس عظیم میراث کے بارے میں اپنا فریضہ انجام نہیں دیا۔

اسی طرح سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۱۱۰ میں بھی ہے کہ:

کنتم خیر امۃ اخرجت للنّاس۔

"تم مسلمان بہترین امت ہو کہ جنہوں نے انسانوں کے فائدہ کے لیے عرصۂ حیات میں قدم رکھا"۔

اسی طرح سورۂ جاثیہ کی آیہ ۱۶ میں بنی اسرائیل کے بارے میں ہے:

وفضلناھم علی العالمین۔

"ہم نے انہیں عالمین پر فضیلت دی"۔

اسی طرح سورہ حدید کی آیہ ۲۶ میں ہے کہ:

ولقد ارسلنا نوحًا وابراھیم وجعلنا فی ذریتھما النبوۃ والکتاب فمنھم مھتد وکثیر منھم فاسقون۔

"ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی ان میں سے بعض تو ہدایت یافتہ ہیں اور بہت سے فاسق اور گنہگار ہیں"۔

مختصر یہ کہ اس قسم کی تعبیرات کا مقصد امت کا ہر فرد نہیں ہے بلکہ پوری امت مراد ہے، اگرچہ اس

Marfat.com

ہیں مختلف طرح کے گروہ اور لوگ پائے جاتے ہیں۔[1]

بہت سی روایات ہیں کہ جو اہلِ بیتؑ کے طرق سے وارد ہوئی ہیں "سابق بالخیرات" سے امام معصوم مراد لیا ہے اور "ظالم لنفسہ" سے وہ افراد کہ جو امام کی معرفت اور شناخت نہیں رکھتے اور "مقتصد" سے امام کے عارف پیروکار مراد لیے گئے ہیں۔[2]

یہ تفاسیر اس بات کی واضح گواہ ہیں کہ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ وارثانِ کتابِ الٰہی میں یہ تینوں گروہ شامل ہیں جیسا کہ ہم نے تفسیرِ آیت میں کہا ہے۔

شاید اس بات کی یاد دہانی کی ضرورت نہیں کہ مذکورہ بالا روایات کی تفسیر واضح مصادیق کا بیان ہے، یعنی امام معصوم "سابق بالخیرات" کی صفِ اوّل میں ہے اور علماء اور دینِ الٰہی کے محافظین دوسری صفوں میں ہیں۔

وہ تفسیر کہ جو ان روایات میں "ظالم" و "مقتصد" کے بارے میں بیان کی گئی ہے وہ بھی مصداق بیان کرتی ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ روایات میں آیت کے مفہوم میں علماء کی بالکل نفی کی گئی ہے تو ایسا درحقیقت ان صفوں کے آگے آگے امام معصوم کے وجود کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گزشتہ اور موجودہ مفسرین میں سے بعض نے ان تینوں گروہوں کے بارے میں دوسرے بہت سے احتمال بھی ذکر کیے ہیں کہ جو سارے کے سارے اس کے مصداق کا ہی بیان ہیں۔[3]

---

[1] بعض نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ تقسیم "عبادنا" کے ساتھ مربوط ہے نہ کہ برگزیدہ افراد کے ساتھ۔ اس بناء پر یہ تینوں گروہ وارثانِ کتابِ الٰہی میں شامل نہیں ہیں بلکہ وہ تمام بندگانِ خدا میں تو شامل ہیں لیکن برگزیدہ اور چنے ہوئے صرف تیسرے گروہ کے افراد یعنی سابق بالخیرات ہوں گے۔ لیکن یہ تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے۔ کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ گروہ ان لوگوں کا جن کا آیت میں ذکر کیا جا رہا ہے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ آیت تمام عباد کے بارے میں نہیں بلکہ برگزیدہ لوگوں کے متعلق گفتگو ہے۔ اس سے قطع نظر "عباد" کی "نا" کی طرف اضافت ایک طرح کی مدح کو بیان کرتی ہے کہ جو دوسری تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صا۳۶ کے بعد اسی طرح اصول کافی جلد ۱ باب ان من اصطفاہ اللہ من عبادہ ....۔

[3] بعض نے تو یہ کہا ہے کہ "سابق بالخیرات" اصحابِ پیغمبرؐ ہیں اور "مقتصد" "تابعین کا طبقہ ہے" اور "ظالم لنفسہ" دوسرے افراد ہیں۔ بعض دوسروں نے "سابق" سے وہ لوگ مراد لیے ہیں جن کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور "مقتصد" سے وہ لوگ کہ جن کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہے اور ظالم وہ کہ جن کا ظاہر ان کے باطن سے بہتر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ "سابقون" صحابہ ہیں اور "مقتصدون" ان کے تابعین ہیں اور "ظالمون" منافق ہیں۔

بعض نے اس آیت کو ان تینوں گروہوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جن کا ذکر سورہ واقعہ کی آیت ۷ تا ۱۱ میں آیا ہے:
(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے ظالمین کے بارے میں پھر درمیانے افراد کے بارے میں اور سب سے آخر میں "سابق بالخیرات" کے بارے میں بات کیوں کی گئی ہے جبکہ کئی ایک جہات سے الٹی ترتیب بہتر نظر آتی ہے۔

بعض بزرگ مفسرین نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اس کا مقصد سلسلۂ کمال میں لوگوں کے مقامات کی ترتیب بیان کرنا ہے کیونکہ پہلا مرحلہ عصیان وغفلت کا ہے، اس کے بعد توبہ و انابت کا مقام ہے اور انجام کار خدا کی طرف توجہ اور اس کے قرب کی منزل ہے۔ جس وقت انسان سے گناہ سرزد ہوتا ہے تو وہ "ظالم" ہے اور جس وقت وہ مقام توبہ میں آتا ہے تو "مقتصد" ہے اور جس وقت اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے اور خدا کی راہ میں اس کی مساعی بہت بڑھ جاتی ہیں تو وہ اس کے مقام قرب میں پہنچ جاتا ہے اور "سابق بالخیرات" میں شمار ہونے لگتا ہے[۱]

بعض نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ یہ ترتیب ان تینوں گروہوں کے افراد کی زیادتی اور کمی کے لحاظ سے ہے۔ ظالمین اکثریت میں ہوتے ہیں اور مقتصدین بعد والے مرحلہ میں اور سابقین بالخیرات کہ جو خاص اور پاک لوگ ہیں سب سے کم ہوتے ہیں اگرچہ کیفیت کے لحاظ سے سب سے بلند مرتبہ ہیں[۲]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ظالم کو اس سبب سے مقدم رکھا ہے تاکہ وہ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو جائے اور سابق بالخیرات کو اس لیے مؤخر کیا ہے تاکہ وہ اپنے عمل پر مغرور نہ ہوں[۳]

لہٰذا ممکن ہے کہ تینوں معانی مراد ہوں۔

آخری بات اس آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ "ذالك هو الفضل الكبير" (یہ بہت بڑی فضیلت ہے) کے جملے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ کہ اس میں مشار الیہ کیا ہے؟ بعض نے کہا ہے

سابقہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ: وكنتم ازواجا ثلاثة فاصحاب الميمنة ما اصحاب الميمنة واصحاب المشئمة ما اصحاب المشئمة والسابقون السابقون اولئك المقربون۔

ایک حدیث میں "سابق بالخیرات" سے ائمہ بزرگوار حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ اور شہیدانِ آل محمدؐ مراد لیا گیا ہے اور "مقتصد" سے متدین مجاہد ہیں اور "ظالم" سے وہ کہ جن کے نیک اعمال غیر صالح اعمال کے ساتھ ملے جلے ہیں۔

یہ تمام تفسیریں بیانِ مصداق کے عنوان سے قابل قبول ہیں سوائے پہلی تفسیر کے کہ اس کا کوئی درست مفہوم نہیں ہے۔

حاشیہ صفحہ ہذا:

[۱] طبرسی در مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[۲] تفسیر "فی ظلال القرآن"، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[۳] تفسیر ابو الفتوح رازی، جلد ۹، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

کہ اس سے مراد کتابِ الٰہی کی میراث ہی ہے اور بعض نے اسے اس توفیق کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو "سابق بالخیرات" کے شامل حال ہوتی ہے اور وہ اذنِ خدا سے اس راہ کو طے کرتے ہیں لیکن پہلا معنی ظاہر آیت کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

کتابِ الٰہی کے پاسدار کون ہیں؟

قرآن مجید کی گواہی کے مطابق خداوند تعالیٰ نے امتِ اسلامیہ کو اتنی عظیم نعمتیں عطا کی ہیں کہ جن میں سے زیادہ اہم خدا کی عظیم میراث قرآن مجید ہی ہے۔

اُس نے امت مسلمہ کو ساری امتوں پر برتری عطا کی اور اُسے یہ نعمت دی لیکن انہیں اپنے لطفِ خاص سے نوازا ہے تو اُن پر اسی نسبت سے ذمہ داری بھی عائد کی ہے۔

وہ صرف اسی صورت میں اس میراث عظیم کی پاسداری کا حق ادا کر سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو "سابق بالخیرات" کی صف میں داخل کرنے کے قابل بنالیں یعنی تمام امتوں سے نیکیوں کی انجام دہی میں آگے بڑھ جائیں، علم و دانش کے حصول میں سبقت حاصل کریں اور تقویٰ و پرہیزگاری میں، عبادت و خدمتِ خلق میں، جہاد و کوشش میں، نظم و ضبط اور حساب و کتاب میں اور ایثار و فداکاری میں سب سے بڑھ کر رہیں۔ اس صورت کے علاوہ وہ اس کا حق ادا نہ کر سکیں گے۔

خصوصاً "سابق بالخیرات" کی تعبیر اتنا وسیع اور کشادہ مفہوم رکھتی ہے کہ جو زندگی کے تمام مثبت پہلوؤں میں اور نیک اعمال میں تقدم حاصل کرنے کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

ہاں! اس قسم کی میراث کے حامل ایسے لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔

یہاں تک کہ وہ لوگ جو اس عظیم آسمانی عنایت کی طرف پشت کر لیتے ہیں اور اس کی حرمت کا خیال نہیں رکھتے، "ظالم لنفسہ" کا مصداق ہیں اور خود اپنے ہی اوپر ظلم کرتے ہیں کیونکہ اس کے مطالب ان کی نجات، خوش بختی اور کامیابی کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ وہ آدمی کہ جو کسی شفا بخش نسخہ کو استعمال نہیں کرتا اس نے اپنے درد اور تکلیف کے باقی رہنے میں خود کمک کی ہے اور جو شخص کسی تاریک راستے کو طے کرنے کے موقع پر اپنے روشن چراغ کو توڑ دیتا ہے وہ خود کو بے راہی اور ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جاتا ہے۔ کیونکہ خدا سب سے بے نیاز اور مستغنی ہے۔

اس کے باوجود اس گنہگار گروہ کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ بھی زیر بحث آیت کے مضمون کے مطابق "پروردگار کے برگزیدہ لوگوں" کے زمرے میں آتا ہے اور یہ استعداد رکھتا ہے کہ مرحلۂ ظلم کو پس پشت ڈال کر مقتصد کے مرحلے میں قدم رکھے اور وہاں سے پرواز کر کے "سابق بالخیرات" کے اوجِ افتخار پر جا پہنچے کیونکہ وہ بھی فطرت اور روحانی ساخت کے لحاظ سے حق تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں۔

Marfat.com

(۳۳) جَنّٰتُ عَدۡنٍ يَّدۡخُلُوۡنَهَا يُحَلَّوۡنَ فِيۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ
ذَهَبٍ وَّلُؤۡلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمۡ فِيۡهَا حَرِيۡرٌ ○
(۳۴) وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡۤ اَذۡهَبَ عَنَّا الۡحَزَنَ ؕ اِنَّ
رَبَّنَا لَغَفُوۡرٌ شَكُوۡرُ ۙ○
(۳۵) الَّذِىۡۤ اَحَلَّنَا دَارَ الۡمُقَامَةِ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيۡهَا
نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيۡهَا لُغُوۡبٌ ○

ترجمہ

(۳۳) (ان کی جزا) جنت کے ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں کہ وہ جن میں داخل ہوں گے۔ وہاں پر انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا اور وہاں ان کے لباس ریشم کے ہوں گے۔

(۳۴) وہ کہیں گے کہ حمد (اور ستائش) اس خدا کے لیے ہے کہ جس نے ہمارا غم دُور کر دیا۔ بے شک ہمارا پروردگار غفور و شکور ہے۔

(۳۵) وُہ خدا کہ جس نے اپنے فضل سے (ابدی) قیام کی اس جگہ پر ہمیں ٹھہرایا ہے کہ جہاں نہ تو ہمیں کوئی رنج و تکلیف پہنچے گی اور نہ ہی سُستی اور تھکان ہو گی۔

تفسیر

جہاں غم ہے نہ تھکان

جو کچھ گزشتہ آیات میں گزر چکا ہے، یہ آیات حقیقت میں اُسی کا ایک نتیجہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

Marfat.com

"نیکیوں میں پیش قدمی کرنے والوں کے لیے دائمی بہشت کے باغات ہیں جس میں وہ سب کے سب داخل ہوں گے" (جنات عدن یدخلونها)[1]

"جَنات" "جنة" کی جمع ہے اور باغ کے معنی میں ہے اور "عدن" استقرار و ثبات کے معنی میں ہے اور معدن کو اس وجہ سے معدن کہتے ہیں کیونکہ وہ مختلف دھاتوں اور جواہرات کے استقرار کی جگہ ہے۔ اس بنا پر "جنات عدن" کا معنی ہے "بہشت کے ہمیشہ رہنے والے باغات"۔

بہرحال یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہشت کی عظیم نعمتیں جاودانی اور قائم رہنے والی ہیں اور مادی دنیا کی نعمتوں کی طرح ان کے بارے میں زوال کا خوف نہیں ہے۔ بہشت میں رہنے والوں کے لیے بہشت کا ایک ہی باغ نہیں ہوگا بلکہ بہشت کے باغات ان کے پاس ہوں گے۔

اس کے بعد جنت کی نعمتوں کے تین حصّوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے بعض مادی اور ظاہری پہلو رکھتے ہیں، بعض روحانی اور باطنی اور ایک حصہ ہر قسم کے مزاحم کی نفی کرتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے "نیکیوں میں بڑھ جانے والے یہ لوگ بہشت جاودانی میں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ ہوں گے اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا" (یحلون فیها من اساور من ذهب ولؤلؤا ولباسهم فیها حریر)۔

انہوں نے اس دنیا میں اُس کے زرق برق سے بے اعتنائی برتی تھی اور خود کو سونے اور زیورات کا اسیر نہیں بنایا تھا۔ محروم لوگ سوتی لباس سے بھی محروم تھے تو انہوں نے بھی فاخرہ لباس نہیں پہنا تھا خدا اسی چیز کی تلافی کے طور پر انہیں دوسرے جہان میں بہترین لباس اور زیور پہنائے گا۔

انہوں نے اس جہان ظاہر میں اپنے آپ کو راہ خدا میں خیرات کے ساتھ آراستہ کیا تھا، خدا بھی دوسرے جہان میں کہ جو تجسم اعمال کا جہان ہے انہیں طرح طرح کے زیورات سے آراستہ کرے گا۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ ہمارے الفاظ اس جہان کی محدود زندگی کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ یہ قیامت کے عظیم عالم کے مفاہیم ہرگز بیان نہیں کر سکتے۔ ان نعمتوں کے بیان کے لیے کسی اور طرح کی الف۔ با اور کوئی دوسری زبان اور لغت کی ضرورت ہے لیکن بہرحال اس غرض سے کہ اس جہان میں مقید افراد کو ان عظیم نعمتوں کا ایک تصور پیش کرنے کے لیے انہی ناچیز اور نارسا الفاظ سے مدد لینا پڑتی ہے

اس مادی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد ایک خاص روحانی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

---

[1] جنات عدن .... ممکن ہے کہ مبتدائے محذوف کی خبر ہو اور تقدیر میں "جزائهم جنات عدن ..." یا "اولئك لهم جنات عدن" تھا (نظیر آیہ ۳۱ سورہ کہف)۔ بعض نے اسے فضل کبیر سے بدل سمجھا ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "فضل کبیر" "کتاب آسمانی کی میراث" کی طرف اشارہ ہے لہٰذا "جنت" اس سے بدل نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ ہم مسبب کو سبب کا جانشین بنالیں۔

Marfat.com

گیا ہے: "وہ کہیں گے کہ حمد و ستائش اس خدا کے ساتھ مخصوص ہے کہ جس نے ہم سے غم دُور کر دیا" (وقالوا الحمد للّٰہ الذی اذھب عنّا الحزن)۔

وہ اس عظیم نعمت کے لیے خدا کی حمد کرتے ہیں کہ جو انہیں نصیب ہوئی ہے اور خدا کے لطف کی برکت سے ان کی زندگی سے غم کے تمام عوامل دور ہو گئے ہیں اور ان کی روح کا آسمان رنج و غم کے تاریک بادلوں سے پاک ہو گیا ہے۔ نہ تو انہیں خدا کے عذاب کا کوئی خوف ہے اور نہ ہی مرگ و فنا سے کوئی وحشت۔ نہ دل کی بے اطمینانی کی کوئی وجہ ہے اور نہ بدخواہوں کی آزار، نہ جابروں کا دباؤ ہے اور نہ ہی بُرے اور کم ظرفوں کی ہم نشینی۔

بعض مفسرین نے اس حزن کو دنیاوی غموں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو میدانِ حشر میں انہیں اپنے عمل کے نتیجہ کے بارے میں ہوگا۔ یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تضاد نہیں رکھتیں اور دونوں ہی آیت کے معنی میں جمع ہو سکتی ہیں۔

"حزن" (بروزن "عدم") اور "حزن" (بروزن "مزد") جیسا کہ لغت اور تفسیر کی بہت سی کتابوں میں آیا ہے دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔ اصل میں یہ زمین کی ناہمواری کے معنی میں ہے اور چونکہ غم و اندوہ روح انسانی کو ناہموار اور سخت کر دیتے ہیں اس لیے یہ تعبیر اس معنی میں استعمال ہوئی ہے [1]

اس کے بعد یہ بہشتی مومنین مزید کہیں گے کہ: "ہمارا پروردگار غفور و شکور ہے" (انّ ربنا لغفور شکور)۔

اپنی غفوریت کی صفت کی بنا پر اس نے لغزشوں اور گناہوں کا بھاری غم دور کر دیا ہے اور اپنی شکوریت کے ذریعے ہمیشہ ہمیشہ کی نعمتیں کہ جن کے اوپر کبھی بھی غم و اندوہ کا منحوس سایہ نہیں پڑتا ہمیں عطا کی ہیں۔

ہمارے بہت سے گناہوں کو اس کے غفران نے چھپا لیا ہے اور ہمارے حقیر اور تھوڑے سے اعمال کا اپنی شکوریت کی بنا پر ہمیں بہت زیادہ اجر اور صلہ دیا ہے۔

٭ ٭ ٭

آخر میں آخری نعمت کا بیان ہے۔ ان کا قول نقل کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "حمد و ستائش اس خدا کے لیے ہے کہ جس نے اپنے فضل سے ہمیں اس ابدی ٹھکانے میں جگہ دی کہ جس میں نہ رنج و غم ہے

---

[1] تاج العروس میں بعض علماء ادب سے منقول ہے کہ جس وقت یہ لفظ رفع اور جر کے اعراب کے ساتھ استعمال ہو تو پھر (ز) کے سکون کے ساتھ اس کا تلفظ ہوتا ہے اور جب نصب اور زبر کی صورت میں ہو تو پھر (ز) کی فتح کے ساتھ۔ لیکن ادبیات عرب میں یہ امر ایک قانون کی صورت میں ہمیشہ کے لیے نہیں ہو سکتا اگرچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کیونکہ قرآن مجید میں بعض مواقع پر حالتِ نصب میں بھی (ز) کے سکون کے ساتھ آیا ہے۔

Marfat.com

اور نہ ہی خستگی اور تھکان" (الذی احلنا دار المقامة من فضله لا یمسنا فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب)۔

ایک طرف تو وہ ٹھہرنے اور قیام کی جگہ ہے اور ایسا نہیں ہے کہ انسان ابھی اس ماحول سے آشنا ہو رہا ہوگا اور اس کے ساتھ دل لگا رہا ہو کہ کوچ کا نقارہ بج جاتے گا۔

دوسری طرف اس کے باوجود کہ اس کی عمر طولانی اور ابدی ہوگی اور اس قسم کی مدت میں قاعدتاً تھکان تکلیف اور زحمت ہوتی ہوتی لیکن وہاں ایسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر روز نئی نعمت اور نعمتوں کی تازہ بہار اور پروردگار کے جلوے اہل بہشت کو نظر آئیں گے۔

"نصب" (بروزن "حسب") مشقت اور زحمت کے معنی میں ہے اور "لغوب" کو بھی بہت سے ارباب لغت اور مفسرین نے اسی معنی میں لیا ہے جبکہ بعض نے ان دونوں کے درمیان یہ فرق کیا ہے کہ "نصب" جسمانی مشقتوں اور "لغوب" روحانی تھکان کو کہتے ہیں [1]

بعض نے "لغوب" کو بھی اس سستی اور تھکاوٹ کے معنی میں سمجھا ہے کہ جو مشقت اور رنج سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح سے "لغوب" "نصب" کا نتیجہ ہوگا [2]

گویا وہاں نہ تو مشقتِ جسمانی کے عوامل موجود ہیں اور نہ ہی روحانی رنج و تکلیف کے اسباب کی کوئی خبر ہے۔

---

[1] و [2] تفسیر روح المعانی جلد ۲۲ ص۱۸۱ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

(۳۶) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ
فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ
نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۚ ○
(۳۷) وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا
غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ
مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ
مِنْ نَّصِيْرٍ ۧ ○
(۳۸) اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○

ترجمہ

(۳۶) جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، ہرگز ان کی موت کا فرمان جاری نہیں ہوگا کہ وہ مر جائیں اور نہ ہی ان کے لیے عذاب میں کوئی تخفیف ہو سکے گی۔ اس طرح سے ہم ہر کفران کرنے والے کو سزا دیں گے۔

(۳۷) وہ دوزخ میں فریاد کریں گے، پروردگارا! ہمیں نکال، تاکہ ہم ان اعمال کے بجائے کہ جو ہم انجام دیا کرتے تھے (اب) نیک عمل بجا لائیں۔ (انہیں جواب دیا جائے گا) کیا ہم نے تمہیں اس قدر عمر نہیں دی تھی کہ انسان چاہے تو اس میں متوجہ ہو جاتے؟ اور کیا (خدا کی طرف سے) متنبہ کرنے والا تمہارے پاس

Marfat.com

نہیں آیا تھا ؟ پس اب تم (اس کا مزہ) چکھو کیونکہ ظالموں کے لیے کوئی یاور و مددگار نہیں ہے ۔

(۳۸) خدا آسمانوں اور زمین کے غیب سے آگاہ ہے اور جو کچھ دلوں میں ہے وہ اُسے بھی جانتا ہے ۔

تفسیر

میں لوٹا دو تاکہ ہم اچھے عمل کریں

عام طور پر قرآن "وعدوں" کے ساتھ "وعید" اور بشارت کے ساتھ نذارت کا ذکر کرتا ہے تاکہ خوف و رجا، کے دونوں عوامل کو تقویت دے، کیونکہ یہ دونوں باہم انسان کے رشد و کمال کا سبب ہیں۔ انسان حُبّ ذات کے تقاضے کے ماتحت فائدے کے حصول اور دفع ضرر کی خواہش رکھتا ہے، اس لیے گزشتہ آیات میں "خیرات میں سبقت کرنے والے مومنین" کی عظیم اور روح پرور جزاؤں کے بارے میں گفتگو کی تھی اور زیر بحث آیات میں کفار کی دردناک سزا کے بارے میں بات کی جارہی ہے ۔

یہاں بھی مادی اور روحانی دونوں سزاؤں سے متعلق گفتگو ہے ۔

پہلے فرمایا گیا ہے : "وہ لوگ کہ جنھوں نے راہ کفر اختیار کی اُن کے لیے جہنم کی آگ ہے" (والذین کفروا لھم نار جھنم) ۔

جس طرح اُن لوگوں کے لیے بہشتِ جاودانی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ رہنے کی جگہ اور ٹھہرنے کا گھر ہے اسی طرح دوزخ بھی اس گروہ کے لیے ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا مقام ہے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : "ان کے لیے ہرگز موت کا حکم صادر نہیں ہوگا کہ وہ مرجائیں اور اس رنج والم سے رہائی پائیں" (لا یقضٰی علیھم فیموتوا) [1]

اس کے باوجود کہ جلانے والی آگ اور وہ تمام دردناک عذاب ہر لحہ موت کے منہ میں لے جاسکتا ہے لیکن چونکہ موت وحیات سمیت ہر چیز اللہ کے ہاتھ میں ہے اس لیے اس کی طرف سے موت کا حکم صادر نہیں ہوگا لہٰذا وہ نہیں مریں گے بلکہ انہیں زندہ رہنا پڑے گا تاکہ وہ عذاب الٰہی کا مزہ چکھیں ۔

موت تو اس قسم کے لوگوں کے لیے نجات کا ایک ذریعہ ہوگی لیکن اس جملے میں یہ دریچہ بند ہوگیا ہے

---

[1] "لا یقضٰی علیھم" "لا یحکم علیھم" کے معنی میں ہے ۔

Marfat.com

اب ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ زندہ رہیں اور ان کی سزا میں تدریجاً تخفیف ہو یا ان میں قوتِ برداشت کا اضافہ ہو تاکہ اس کے نتیجہ میں درد اور تکلیف میں تخفیف ہو۔ اس دریچے کو بھی ایک اور جملے کے ساتھ بند کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "دوزخ کے عذاب میں سے ان کے لیے کسی چیز کی تخفیف نہیں کی جائے گی" (ولا یخفف عنھم من عذابھا)۔

آیت کے آخر میں اس وعیدالٰہی کے قطعی ہونے کی تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: "ہر کفران کرنے والے کو ہم اسی طرح سے جزا دیں گے" (کذالك نجزی کل کفور)۔

جنہوں نے پہلے تو وجودِ انبیاء اور کتب آسمانی کی نعمت کا کفران کیا ہے ان خداداد صلاحیتوں کو ضائع کر دیا ہے کہ جو راہِ سعادت میں ان کے لیے مددگار ہو سکتی تھیں۔ ہاں! کفران کرنے والوں کی جزا آگ کے دردناک عذاب میں جلنا ہی ہے۔ ایسی آگ کہ جس کو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے دنیا کی زندگی میں روشن کیا ہے۔ اس کا ایندھن ان کے انکار و اعمال اور ان کے وجود بنیں گے۔

"کفور" مبالغے کا صیغہ ہے اس لیے "یہ کافر" سے زیادہ عمیق اور گہرا معنیٰ رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں کافر مومن کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے لیکن "کفور" تمام نعمتوں کا کفران کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا مفہوم زیادہ وسیع ہے۔ اس طرح سے "کفور" ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنہوں نے تمام خدائی نعمتوں کا کفران کیا ہے اور اس جہان میں اس کی رحمت کے تمام دروازوں کو اپنے اوپر بند کر لیا ہے۔ اس لیے آخرت میں خدا بھی نجات کے تمام دروازے ان پر بند کر دے گا۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت ان کے دردناک عذاب کے ایک اور حصہ کو بیان کرتی ہے اور اس سلسلے میں بعض حساس نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: "وہ دوزخ میں فریاد کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس جگہ سے نکال۔ تاکہ ہم عمل صالح بجا لائیں، اُن اعمال کے بجائے کہ جو ہم پہلے انجام دیتے تھے" (وھم یصطرخون فیھا ربنا اخرجنا نعمل صالحاً غیرالذی کنا نعمل)[1]

ہاں! وہ اپنے بُرے اعمال کو دیکھ کر گہری ندامت میں جا پڑیں گے اور دل سے فریاد کریں گے۔ وہ ایک محال چیز کا تقاضا کریں گے یعنی اعمالِ صالح بجا لانے کے لیے دنیا کی طرف بازگشت کرنے کا مطالبہ۔

"صالحاً" کی تعبیر (نکرہ کی شکل میں) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے کوئی معمولی سا عمل

---

[1] "یصطرخون"، "صراخ" کے مادہ سے شدید فریاد اور چیخ و پکار کے معنی میں ہے کہ جو انسان استغاثہ کرتے اور درد و تکلیف دور کرنے کے لیے اور مددگار کو بلانے کے لیے دل سے نکالتا ہے۔

Marfat.com

بھی انجام نہیں دیا۔ اور لازمی طور پر یہ سب عذاب اور رنج و تکلیف ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے کہ جو زندگی میں خدا کے ساتھ کوئی ربط و تعلق اور واسطہ نہیں رکھتے تھے اور عصیان و گناہ میں غرق تھے اس بنا پر ممکن ہے کہ کچھ تھوڑے بہت اعمالِ صالح بھی نجات کا سبب بن جائیں۔

"نعمل" کہ جو فعل مضارع اور استمرار کی دلیل ہے اسی معنی کی تاکید ہے کہ "ہم ہمیشہ غیر صالح اعمال میں مشغول رہے ہے۔"

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "صالح" کی "کنا نعمل" کے جملہ کے ساتھ توصیف ایک لطیف نکتے کی حامل ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے بُرے اعمال کو ہوائے نفس اور شیطان کی طرف سے مزین کیے جانے کی وجہ سے اعمالِ صالح خیال کرتے تھے۔ اب ہمارا مصمم ارادہ ہے کہ اگر ہم واپس چلے جائیں تو ان اعمال کے بجائے کہ جو ہم پہلے انجام دیتے تھے، واقعی اعمالِ صالح بجا لائیں گے۔

ہاں! گنہگار شروع شروع میں اپنی پاکیزگیٔ فطرت کے مطابق اپنے اعمال کی برائی کا ادراک کرتا ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کی برائی اس کی نظر میں کم ہوتی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ اس سے بھی اوپر چلا جاتا ہے اور اس کی نظر میں وہی برائی اچھائی دکھائی دینے لگتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

"زین لهم سوء اعمالهم"۔

"ان کے بُرے اعمال کو ان کی نظر میں اچھا بنا دیا جاتا ہے"۔ (توبہ - ۳۷)

قرآن کبھی یہ بھی کہتا ہے:

وهم يحسبون انهم يحسنون صنعًا۔

"وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ نیک عمل انجام دے رہے ہیں"۔ (کہف - ۱۰۴)

بہر حال اس تقاضے کے مقابلے میں خدا کی طرف سے انہیں ایک قاطع اور دو ٹوک جواب دیا جائے گا: "کیا ہم نے تمہیں بیداری اور غور و فکر کے لیے کافی عمر نہیں دی تھی" (اولم نعمركم ما يتذكر فيه من تذكر)۔

"اور کیا خدا کی طرف سے ڈرانے والا تمہارے پاس نہیں آیا تھا" (وجاءكم النذير)۔

اب جبکہ یہ بات ہے کہ نجات کے تمام وسائل تمہیں میسر تھے اور تم نے اُن سے فائدہ نہیں اٹھایا تو پھر اسی جگہ گرفتار بلا رہو، "پس اب تم مزہ چکھو کیونکہ ستمگروں کے لیے کوئی یار و مددگار نہیں ہے" (فذوقوا فما للظالمين من نصير)۔

یہ آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں تھی کیونکہ تمہارے پاس کافی مہلت تھی اور ضروری تعداد میں خدا کی طرف سے ڈرانے والے بھی تمہارے پاس آئے۔ بیداری و نجات کے یہ دونوں

Marfat.com

رُکن تمہیں حاصل ہوگئے تھے۔ اس بنا پر تمہارے لیے کوئی عذر اور بہانہ نہیں رہا۔ اگر تمہارے پاس کافی مقدار میں مہلت نہ ہوتی تو عذر تھا اور اگر مہلت تو ہوتی، لیکن معلّم و مربی اور رہبر و ہادی تمہارے پاس نہ آتا تب بھی کوئی عذر تھا لیکن ان دونوں کے ہوتے ہوئے کونسا عذر و بہانہ باقی رہ جاتا ہے۔

لفظ "نذیر" (ڈرانے والا) آیاتِ قرآن میں عام طور پر وجودِ انبیاء خصوصاً پیغمبرِ اسلامؐ کی طرف اشارے کے طور پر آیا ہے لیکن بعض مفسرین نے اس کے لیے ایک وسیع تر معنی بیان کیا ہے کہ جس میں انبیاءؑ، کتبِ آسمانی اور بیدارکن حوادث ۔ مثلاً دوستوں اور رشتہ داروں کی موت اور پیری و ناتوانی ۔ بھی شامل ہے۔ خصوصاً عربی اشعار میں لفظ "نذیر" بڑھاپے کے معنی میں بہت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ذیل کے شعر میں:

رأیت الشیب من نذر المنایا
لصاحبه وحسبك من نذیر

"مَیں نے بڑھاپے کے سفید بالوں کو موت سے ڈرانے والا دیکھا ہے اور تیرے لیے یہی "نذیر" کافی ہے"[1]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اسلامی روایات میں عمر کی اس حد کے بارے میں کہ جو انسان کی بیداری اور توجہ کے لیے کافی ہے، مختلف تعبیرات بیان کی گئی ہیں۔ بعض میں ساٹھ سال بیان ہوئی ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے:

من عمره الله ستین سنة فقد اعذر الیه۔

جسے خدا نے ساٹھ سال عمر دی ہے اس کے لیے عذر کی راہ بند کر دی ہے[2]

یہی معنی امیر المومنین علیؑ سے بھی نقل ہوا ہے[3]

ایک اور حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے کہ:

اذا کان یوم القیامة نودی (این) ابناء الستین؟ وهو العمر الذی قال الله فیه: اولم نعمرکم مایتذکر فیه من تذکر۔

"جس وقت قیامت کا دن ہوگا تو منادی ندا کرے گا کہ ساٹھ سالہ لوگ کہاں ہیں؟ یہ وہی عمر ہے کہ جس کے بارے میں خدا فرماتا ہے: "کیا ہم نے تمہیں اتنی مقدار میں عمر نہیں دی تھی کہ جس میں لوگ اچھی طرح غور و فکر کرتے ہیں"[4]

---

[1] و [2] و [3] مجمع البیان، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

[4] تفسیر قرطبی اور تفسیر در المنثور۔

Marfat.com

لیکن ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے اس کی مقدار صرف اٹھارہ سال معین ہوئی ہے۔[1]
البتہ ممکن ہے کہ آخری روایت کم سے کم کی طرف اشارہ ہو اور گزشتہ روایات زیادہ سے زیادہ کی طرف۔ اس بنا پر ان روایات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

یہاں تک کہ — افراد کے اختلاف کے ساتھ — دوسرے برسوں پر بھی قابل تطبیق ہے بہرحال آیت کے مفہوم کی وسعت پھر بھی باقی رہتی ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں کفار کے اس تقاضے کا جو وہ دوزخ میں دنیا کی طرف بازگشت کے لیے کریں گے، جواب دیا گیا ہے: "خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے، ایسا خدا یقیناً اس چیز سے بھی آگاہ ہے کہ جو دلوں کے اندر ہے" (ان اللہ عالم غیب السماوات والارض انہ علیم بذات الصدور)۔

درحقیقت پہلا جملہ دوسرے جملے کی ایک دلیل ہے یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا دلوں کے بھیدوں سے بے خبر ہو جبکہ زمین و آسمان کے تمام اسرار اور عالم ہستی کی تمام غیب چیزیں اس کے لیے آشکار ہیں۔

ہاں! وہ جانتا ہے کہ اگر دوزخیوں کے تقاضے کا مثبت جواب دیا جائے اور وہ دنیا کی طرف لوٹ آئیں تو وہی اعمال جاری رکھیں گے۔ جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۲۸ میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے:

ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ وانھم لکاذبون

اگر وہ پلٹ جائیں تو وہ پھر انہیں کاموں کو انجام دیں گے کہ جن سے انہیں منع کیا گیا ہے۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ آیت تمام مومنین کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ اپنی نیتوں میں اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کریں اور خدا کے علاوہ کسی پر نظر نہ رکھیں کیونکہ اگر ان کی نیت اور محرکاتِ عمل میں معمولی سی بھی ناخالصی ہوئی تو وہ جو تمام غیوب سے آگاہ ہے، اُسے بھی جانتا ہے اور اسی کے مطابق جزا دے گا۔

چند اہم نکات

۱۔ "ذات الصدور" سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید کی دس سے زیادہ آیات میں بعینہ یہی جملہ آیا ہے یا تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ بات آئی ہے:

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

ان اللہ علیم بذات الصدور۔

"ذات" کا لفظ کہ جس کا مذکر "ذو" ہے اصل میں "صاحب" کے معنی میں ہے۔ اگرچہ فلاسفہ کی تعبیرات میں، عین وحقیقت اور گوہر اشیاء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن مفردات میں راغب کے قول کے مطابق یہ ایک ایسی اصطلاح ہے کہ جو کلام عرب میں موجود نہیں ہے۔ اس بناء پر "ان اللہ علیم بذات الصدور" کا مفہوم یہ ہوگا کہ "خدا دلوں کے صاحب و مالک سے باخبر ہے"۔ یہ جملہ انسانوں کے عقائد و نیات کے بارے میں ایک لطیف کنایہ ہے کیونکہ عقیدے اور نیتیں جس وقت دل میں گھر کرلیں تو گویا وہ قلب انسان کی مالک ہو جاتی ہیں اور اس پر حکومت کرتی ہیں اور اسی بناء پر یہ عقائد و نیات انسانی دل کے صاحب و مالک شمار ہوتے ہیں۔

یہ وہی بات ہے کہ جس سے بعض بزرگ علماء نے استفادہ کرتے ہوئے اُسے اس عبارت میں مجسم کیا ہے:

الانسان اٰرائه وافکاره، لاصورته واعضائه۔

"انسان تو بس اس کے عقائد و افکار ہی ہوتے ہیں، نہ کہ اس کی شکل وصورت اور اعضاء بدن"[1]

۲۔ واپسی کی کوئی راہ نہیں: یقیناً قیامت اور موت کے بعد کی زندگی دنیا کی نسبت ایک مرحلۂ تکامل وارتقاء ہے اور وہاں سے اِس جہان کی طرف بازگشت کوئی معقول بات نہیں ہے۔ کیا ہم گزرے ہوئے کل کی طرف لوٹ سکتے ہیں؟ کیا نومولود بچہ جنینی دَور کی طرف لوٹ سکتا ہے؟ کیا وہ پھل جو شاخ سے جدا ہوگیا ہے ممکن ہے کہ پھر شاخ کی طرف لوٹ جائے؟ اسی بناء پر آخرت والوں کے لیے دنیا کی طرف بازگشت ممکن نہیں ہے۔

اگر بالفرض ممکن بھی ہو تو بھی فراموش کار انسان اپنی اس گزشتہ روش کو برقرار رکھے گا۔

دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے، ہم نے بارہا خود اپنے آپ کو آزمایا ہے کہ خاص حالات میں جبکہ ہم کسی تنگی یا سختی میں گرفتار ہوتے ہیں، تو اس وقت اپنے خدا کے ساتھ مخلصانہ عہد و پیمان کرتے ہیں، لیکن جس وقت وہ حالات بدل جاتے ہیں تو ہم تمام قول و قرار بھول جاتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو سچ مچ اپنے اندر ایک گہری تبدیلی پیدا کرلیتے ہیں۔ ایسی تبدیلی نہیں کہ جو حالات کے ساتھ مشروط ہو۔

یہ حقیقت قرآن مجید کی متعدد آیات میں بیان ہوئی ہے۔ سورۂ انعام کی آیہ ۲۸ میں قرآن صریحاً ایسے افراد کی تکذیب کرتے ہوئے کہتا ہے:

---

[1] عالم بزرگوار مرحوم کاشف الغطاء کی "اصل الشیعه واصولها"

Marfat.com

"اگر یہ پلٹ بھی جائیں تو ان کا طرزِ عمل وہی پہلے والا ہوگا۔"

لیکن سورۂ اعراف کی آیہ ۵۳ میں صرف اسی بات پر قناعت کی گئی ہے کہ وہ زیاں کار لوگ ہیں لیکن ان کی بازگشت کی درخواست کا صراحت کے ساتھ جواب نہیں دیا گیا:

فھل لنا من شفعاء فیشفعوا لنا او نرد فنعمل غیر الذی کنا نعمل قد خسروا انفسھم وضل عنھم ما کانوا یفترون۔

"کیا آج ہمیں کوئی شافعی مل جائیں گے کہ جو ہماری شفاعت کریں یا پھر ہمیں اجازت ملے کہ ہم واپس چلے جائیں اور جو عمل ہم پہلے کیا کرتے تھے اس کے بجائے نیک عمل انجام دیں؟ انہوں نے اپنے وجود کا سرمایہ گنوا دیا ہے اور اپنا ہی نقصان کیا ہے اور وہ سارے جھوٹے معبود جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو گئے اور ان کے بناوٹی معبودوں کا کوئی نام و نشان وہاں نہیں ملے گا۔"

یہی مطلب سورۂ مومنون کی آیہ ۱۰۷ و ۱۰۸ میں دوسری طرح بیان ہوا ہے:

ربنا اخرجنا منھا فان عدنا فانا ظالمون قال اخسئوا فیھا ولا تکلمون۔

"پروردگارا! ہمیں دوزخ سے نکال، اگر ہم پلٹ گئے (اور پھر انہیں اعمال کو دہرایا) تو پھر ہم ظالم ہیں، وہ ان کے جواب میں فرمائے گا: دُور ہو جاؤ اور مجھ سے بات نہ کرو۔"

بہرحال یہ ایک بے بنیاد تقاضا ہے اور محال آرزو ہے۔ شاید وہ بھی کم و بیش یہ جانتے ہیں لیکن شدتِ بیچارگی کی وجہ سے اس تقاضے کو دہرائیں گے لہٰذا آج ہی جبکہ ہمیں موقع میسر ہے ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ انجام دینا چاہیئے۔

Marfat.com

(۳۹) هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ
فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ
وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ○
(۴۰) قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ
مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ
اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ
بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ○
(۴۱) اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ۬ وَلَئِنْ
زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ
حَلِيْمًا غَفُوْرًا ○

ترجمہ

(۳۹) وہ وہی ہے کہ جس نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا۔ اب جو شخص کافر ہوگا تو اس کا نقصان خود اُسی کو ہوگا اور کافروں کا کفر پروردگار کے ہاں ان کیلئے غضب کے سوا اور کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا اور ان کا کفر خسارے کے سوا اور کچھ نہیں بڑھاتا۔

(۴۰) کہو: کیا تم اپنے ان معبودوں کے بارے میں غور نہیں کرتے ہو جنہیں تم نے خدا کا شریک قرار دیا ہے۔ مجھے دکھاؤ تو سہی کہ انہوں نے زمین کی کس چیز کو پیدا کیا ہے یا یہ آسمانوں (کی خلقت اور مالکیت) میں کیا شرکت رکھتے ہیں؟ یا ہم نے

Marfat.com

انہیں کوئی ایسی (آسمانی) کتاب دی ہے کہ جس میں سے اپنے (شرک کے) لیے کوئی دلیل رکھتے ہیں؟ نہیں ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے بلکہ ظالم لوگ صرف ایک دوسرے سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں۔

(۴۱) خدا ہی آسمان و زمین کو روکے ہوئے ہے تاکہ وہ اپنے نظام سے منحرف نہ ہو جائیں اور اگر وہ منحرف ہو جائیں تو اُس کے علاوہ کوئی اور انہیں روک نہیں سکتا۔ وہ حلیم وغفور ہے۔

تفسیر

آسمان و زمین اس کی قدرت سے قائم ہیں

ان مباحث کے بعد کہ جو گزشتہ آیات میں کفار و مشرکین کے انجام کے بارے میں تھیں زیر بحث آیات میں ایک اور طریقے سے ان سے باز پرس کی گئی ہے اور ان کے طرز عمل کے بطلان کو کچھ اور واضح دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "وہ وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں جانشین بنایا" (ھو الذی جعلکم خلائف فی الارض)۔

یہاں پر "خلائف" یا ہے زمین میں خدا کے خلفاء اور خدائی نمائندوں کے معنی میں ہو اور خواہ گزشتہ اقوام کے جانشینوں کے معنی میں (اگرچہ یہاں پر دوسرا معنی ہی زیادہ صحیح نظر آتا ہے) انسانوں پر خدا کے انتہائی لطف و کرم کی دلیل ہے کہ اس نے زندگی کے تمام وسائل انہیں عطا فرمائے ہیں۔

اسی نے عقل و شعور اور فکر و ہوش دیئے ہیں اور اسی نے مختلف جسمانی قویٰ انسان کو عطا کیے ہیں۔ اسی نے روئے زمین کو طرح طرح کی نعمتوں سے بھر دیا ہے۔ اسی نے ان وسائل سے استفادہ کرنے کا طریقہ بھی انسان کو سکھایا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے ولی نعمت کو بھلا کر بے حقیقت اور بناوٹی خداؤں کے دامن سے کیسے وابستہ ہو جاتا ہے؟

درحقیقت یہ جملہ توحید و ربوبیت کا بیان ہے کہ جو توحید عبادت پر ایک دلیل ہے۔

ضمنی طور پر یہ جملہ تمام انسانوں کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے کہ وہ جان لیں کہ ان کی یہ زندگی ابدی و جاودانی نہیں ہے جس طرح سے یہ دوسری اقوام کے جانشین بنے ہیں، کچھ دنوں کے بعد چلے جائیں گے

Marfat.com

اور دوسری قومیں ان کی جانشین ہو جائیں گی۔ لہٰذا ٹھیک طرح سے سوچ لیں کہ وہ اس چند روزہ زندگی میں کیا کر رہے ہیں اور اپنے مستقبل کو کس طرح لکھ رہے ہیں اور اُن سے متعلق دُنیا میں کس طرح کی تاریخ باقی رہ جائے گی؟

اسی بنا پر ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے: "جو شخص کافر ہو جائے گا اس کا کفر خود اسی کے نقصان میں ہوگا" (فمن کفر فعلیہ کفرہ)۔

"نیز کافروں کا کفر پروردگار کے نزدیک غضب کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا" (ولا یزید الکافرین کفرھم عند ربھم الا مقتاً)۔

"اور ان کا کفر خسارے کے سوا ان کے لیے کچھ بھی زیادہ نہیں کرتا" (ولا یزید الکافرین کفرھم الا خسارًا)۔

درحقیقت آخری دو جملے "من کفر فعلیہ کفرہ" کی تفسیر ہیں کیونکہ یہ جملہ کہتا ہے کہ انسان کا کفر صرف اس کے اپنے نقصان پر تمام ہوتا ہے اس کے بعد اس مسئلے کے لیے دو دلیلیں قائم کرتا ہے:

پہلی دلیل یہ ہے کہ یہ کفران اور بے ایمانی ان کے پروردگار کے ہاں کہ جو تمام نعمتوں کا بخشنے والا ہے اس کے غضب کے سوا کوئی نتیجہ نہیں رکھتی۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ خشم الٰہی کے علاوہ یہ کفر گھاٹے کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتا، وہ اپنی ہستی کا سرمایہ اپنے ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں اور انحطاط اور ظلمت کو اپنے لیے خرید لیتے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا نقصان ہوگا؟

ان دونوں میں سے ہر ایک دلیل اس غلط روش کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے۔

"لا یزید" (زیادہ نہیں کرتا) کی تکرار وہ بھی فعل مضارع کی شکل میں کہ جو استمرار کی دلیل ہے، اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان طبعی طور پر افزائش کی جستجو میں ہوتا ہے۔ اگر وہ توحید کا راستہ اختیار کرلے تو سعادت وکمال میں افزائش ہوگی اور اگر کفر کی راہ میں قدم رکھے گا تو اسے پروردگار کے غضب اور خسارے میں اضافہ نصیب ہوگا۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ پروردگار کا غضب اور غصہ اس معنی میں نہیں ہے کہ جو انسانوں میں ہوتا ہے کیونکہ انسان میں تو غصہ ایک قسم کا ہیجان اور اندرونی برافروختگی ہے کہ جو تند و تیز اور شدید حرکات کا سرچشمہ ہوتی ہے اور انسانی قوتوں کو دفاع کے لیے یا انتقام لینے کے لیے مجتمع کرتی ہے۔ لیکن پروردگار میں ان مفاہیم میں سے کوئی بھی بات نہیں۔ اور یہ تو متغیر اور ممکن موجودات کے آثار ہیں بلکہ غضب الٰہی سے مراد ایسے لوگوں سے کہ جو بُرے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں رحمت کے دامن کو کھینچ لینا اور اپنے لطف کو روک لینا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

Marfat.com

بعد والی آیت ایک اور دو ٹوک جواب مشرکین کو دیتی ہے اور انہیں یہ بات سمجھاتی ہے کہ اگر انسان کسی کی پیروی کرتا ہے یا اس سے دل لگاتا ہے تو اسے چاہیئے کہ اس کے لیے کوئی عقلی دلیل رکھتا ہو یا منقولات میں سے کوئی قطعی دلیل اس کے پاس ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارے پاس تو ان دونوں میں سے کوئی بھی دلیل موجود نہیں ہے۔ اس صورت میں تو تم صرف دھوکے اور فریب میں مبتلا ہو۔

فرمایا گیا ہے: "اُن سے کہہ دے، کیا تم ان جعلی معبودوں کے بارے میں غور نہیں کرتے کہ جنہیں تم نے خدا کا شریک سمجھ لیا ہے۔ مجھے دکھاؤ تو سہی کہ انہوں نے زمین میں سے کس چیز کو پیدا کیا ہے" (قل ارءیتم شرکائکم الذین تدعون من دون الله ارونی ماذا خلقوا من الارض)[1]

"یا کیا وہ آسمانوں کی خلقت میں شریک ہیں" (ام لهم شرك فی السماوات)۔

اس حال میں ان کی پرستش کی کیا دلیل ہے؟ معبود ہونا خالق ہونے کی فرع ہے اور جبکہ تم جانتے ہو کہ آسمان و زمین کا خالق تو صرف خدا ہے تو اس کے سوا کوئی اور معبود بھی نہیں ہوگا کیونکہ ہمیشہ خالقیت میں توحید، عبودیت میں توحید کی دلیل ہے۔

اب جبکہ ثابت ہوگیا کہ کوئی عقلی دلیل تمہارے مُدعا کے لیے نہیں ہے تو کیا کوئی دلیلِ منقول تمہارے پاس موجود ہے؟ "کیا ہم نے کوئی (آسمانی) کتاب انہیں دی ہے اور اپنے اس کام کے لیے اس میں ان کے پاس کوئی واضح دلیل ہے"؟ (ام اٰتیناھم کتابًا فهم علٰی بینة منه)۔

نہیں کتابِ الٰہی میں سے اُن کے پاس کوئی واضح دلیل اور برہان نہیں ہے۔

پس ان کا سرمایہ مکر و فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہے "بلکہ یہ ستمگر ایک دوسرے سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں" (بل ان یعد الظالمون بعضهم بعضًا الا غرورًا)۔

دوسرے لفظوں میں اگر ہر گروہ کے بت پرست اور تمام مشرک یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ روئے زمین میں ان کے بُت ان کی مرادوں کو پورا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، تو انہیں چاہیئے کہ کوئی ایسی چیز نمونے کے طور پر پیش کریں کہ جو زمین میں اُن کے معبودوں نے خلق کی ہو۔

اگر اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ بت فرشتوں اور آسمان کی مقدس مخلوقات کے مظہر ہیں ـ جیسا کہ ان کی ایک جماعت کا عقیدہ تھا ـ تو انہیں چاہیئے کہ آسمانوں میں ان کی خلقت کی شرکت کی نشاندہی کریں۔

اور اگر ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خلقت میں تو شریک نہیں ہیں البتہ انہیں صرف مقام شفاعت حاصل ہے ـ جیسا کہ بعض کا دعویٰ تھا ـ تو انہیں چاہیئے کہ وہ کتبِ آسمانی سے کوئی سند اس مدعا کو ثابت کرنے

---

[1] "ارایتم" کا جملہ، کیا تم دیکھتے نہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟ کے معنی میں ہے لیکن بعض مفسرین نے اسے "اخبرونی" (مجھے خبر دو) کے معنی میں لیا ہے۔ ہم نے پانچویں جلد میں سورہ انعام کی آیہ ۴۰ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے۔

Marfat.com

کے لیے پیش کریں۔

اب جبکہ ان مدارک میں سے کوئی بھی مدرک ان کے پاس نہیں ہے تو یہ ستمگر ایسے فریب کار ہیں کہ جو جھوٹی باتیں ان سے کہتے رہتے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "زمین و آسمان" سے مراد یہاں زمینی اور آسمانی مخلوق کا مجموعہ ہے اور زمین کے بارے میں خلقت اور آسمان کے بارے میں شرکت کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آسمانوں میں شرکت بھی خلقت کے حوالے سے ہونا چاہیئے۔

اور "کتاباً" کی تعبیر "نکرہ" کی شکل میں اور وہ بھی پروردگار کی طرف استناد کے ساتھ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی بھی آسمانی کتاب میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی دلیل بھی ان کے دعویٰ پر نہیں ہے۔

"بینۃ" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ واضح و روشن دلیل آسمانی کتب سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

"ظالمون" کی تعبیر دوبارہ اس معنی پر ایک تاکید ہے کہ "شرک" واضح اور آشکار "ظلم" ہے۔

"غرور" کے وعدوں کی تعبیر اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ بت پرست یہ خرافات و اوہام کھوکھلے وعدوں کی شکل میں ایک دوسرے سے کرتے تھے اور مروج اور بے بنیاد تقلیدوں کی صورت میں ایک دوسرے کی طرف القا کرتے تھے۔

بعد والی آیت میں آسمانوں اور زمین پر خدا کی حاکمیت کے بارے میں گفتگو ہے۔ حقیقت میں بناوٹی معبودوں کی عالم ہستی میں دخالت کی نفی کے بعد خالقیت و ربوبیت میں توحید کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "خدا ہی آسمان اور زمین کو روکے ہوئے ہے تاکہ وہ اپنی راہ سے منحرف اور زائل نہ ہو جائیں" (ان اللّٰہ یمسک السمٰوٰت والارض ان تزولا)[1]

نہ صرف ابتدائی خلقت ہی خدا کی طرف سے ہے بلکہ ان کی نگہداری، تدبیر اور حفاظت بھی اسی کے دستِ قدرت میں ہے بلکہ ان میں ہر لحظہ جدید تخلیقات ہوتی رہتی ہیں اور ہر زمانے میں ایک نئی خلقت ہوتی ہے اور اس مبداء فیاض سے لحہ بہ لحہ فیض ہستی انہیں پہنچتا رہتا ہے کیونکہ اگر ایک لمحے کے لیے بھی ان کا رابطہ اس عظیم مبداء سے منقطع ہو جائے تو وہ فنا کی راہ اختیار کر لیں:

اگر نازی کند یکدم فرو ریزند قالبہا

"اگر وہ ایک لمحے کے لیے بھی ناز کرے تو تمام سانچے گر پڑیں"

---

[1] "ان تزولا" کا جملہ تقدیر میں اس طرح تھا:
لئلا تزولا - یا - کراھۃ ان تزولا۔

Marfat.com

یہ درست ہے کہ آیت عالم ہستی کے اعلیٰ نظام کی حفاظت کا ذکر کرتی ہے لیکن جیسا کہ فلسفیانہ مباحث میں ثابت ہو چکا ہے، ممکنات اپنی بقا میں بھی اسی طرح سے مبداء کے محتاج ہیں جس طرح سے کہ اپنے حدوث میں، لہٰذا اس طرح نظام کی حفاظت نئی تخلیقات کو جاری رکھنے اور فیض خداوندی کو جاری رکھنے کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آسمانی کُرے بغیر اس کے کہ کسی جگہ بندھے ہوئے ہوں، ہزاروں لاکھوں سال سے اپنے معین مدار پر حرکت کر رہے ہیں۔ بغیر اس کے کہ ذرہ برابر بھی انحراف کریں۔ اس کا نمونہ نظام شمسی میں دیکھتے ہیں۔ ہماری زمین کئی ملین بلکہ کئی ارب سال سے سورج کے گرد اپنے راستے پر دقیق نظم کے تحت چکر لگا رہی ہے کہ جس کا سرچشمہ قوتِ جاذبہ اور قوتِ دافعہ کا اعتدال ہے اور فرمانِ پروردگار پر سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔

پھر تاکید کے طور پر مزید فرمایا گیا ہے: "اگر وہ یہ چاہیں کہ اپنے مدار سے باہر نکل جائیں تو کوئی بھی خدا کے سوا انہیں روک نہیں سکتا" (ولئن زالتا ان امسکھما من احد من بعدہ)۔

نہ تمہارے گھڑے ہوئے بُت، نہ فرشتے اور نہ ہی ان کے علاوہ کوئی اور، کوئی بھی شخص اس کام پر قادر نہیں۔

آیت کے آخر میں اس بناء پر کہ گمراہ مشرکین کے سامنے توبہ کا دروازہ بند نہ کیا جائے اور ہر مرحلے میں انہیں بازگشت کا موقع میسر رہے، فرمایا گیا ہے: "خدا ہمیشہ حلیم و غفور ہے" (انہ کان حلیماً غفوراً)۔

اپنے حلم کی وجہ سے ان کی سزا میں جلدی نہیں کرتا اور اپنی غفوریت کی وجہ سے ان کی توبہ اس کی شرائط کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ اس بناء پر آیت میں مشرکین کی کیفیت اور توبہ و بازگشت کے وقت خدا کی رحمت ان کے شاملِ حال ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے ان دو اوصاف کو آسمان و زمین کی حفاظت کے ساتھ مربوط سمجھا ہے کیونکہ ان کا زوال عذاب و مصیبت ہے اور خدا اپنے حلم و غفران کی وجہ سے اس عذاب و مصیبت کو لوگوں کے دامن گیر نہیں ہونے دیتا اگرچہ اُن میں سے بہت سوں کے گفتار و اعمال کا تقاضا یہی ہے کہ یہ عذاب نازل ہو۔ جیسا کہ سورۂ مریم کی آیات ۸۸ تا ۹۰ میں بیان ہوا ہے:

وقالوا اتخذ الرحمٰن ولداً لقد جئتم شیئاً اداً تکاد السمٰوٰت یتفطرن منہ وتنشق الارض وتخر الجبال ھداً۔

"انہوں نے کہا کہ خدائے رحمٰن نے اپنے لیے بیٹا انتخاب کیا ہے۔ تم نے یہ کیسی بری اور تکلیف دہ بات کہی ہے؟ قریب ہے کہ آسمان اس بات کو سن کر منتشر ہو جائے اور زمین پھٹ پڑے اور پہاڑ شدت سے نیچے گر پڑیں۔"

Marfat.com

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ " ولئن زالتا ۔۔۔ " کا جملہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اگر وہ زائل ہو جائیں تو خدا کے سوا کوئی بھی انہیں نہیں روکے گا بلکہ اس معنی میں ہے کہ اگر وہ مائل بہ زوال ہوں تو خدا ہی ان کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ورنہ زوال کے بعد محفوظ رکھنے کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

پوری انسانی تاریخ میں بارہا یہ امر پیش آیا ہے کہ بعض ستارہ شناسوں نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ ممکن ہے کہ فلاں دُمدار ستارہ یا اس کے علاوہ کوئی ستارہ اپنے راستے اس کرۂ زمین کے قریب سے گزرے تو اس کے ٹکرا جانے کا احتمال ہے۔ ایسی پیش گوئیوں نے کئی دفعہ تمام دنیا والوں کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ ان حالات میں سب کو یہ احساس ہوتا تھا کہ ایسے میں کسی شخص سے کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر فلاں کرۂ آسمانی زمین کی طرف آجائے اور قوتِ جاذبہ کے زیرِ اثر دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں تو نوعِ بشر کے کئی ہزار سالہ تمدن کا نام ونشان مٹ جائے یہاں تک کہ دوسرے زندہ موجودات بھی صفحۂ زمین پر باقی نہ رہیں پروردگار کی قدرت کے سوا کوئی اس حادثے کو روکنے پر قادر نہیں۔

اس قسم کے حالات میں سب کے سب نیاز مطلق کا احساس بے نیازِ مطلق خدا کی طرف ہی کریں گے لیکن جب احتمالی خطرات برطرف ہو جائیں گے تو بھول اور نسیان انسانوں پر سایہ فگن ہو جائے گا۔

نہ صرف آسمانی کُروں اور سیاروں کا ٹکرانا ہولناک ہے بلکہ کسی ایک سیارے کا مختصر سا انحراف مثلاً زمین کا اپنے مدار سے ہٹ جانا کئی ہولناک حادثوں کا سبب ہو سکتا ہے۔

اس کی قدرت کے سامنے چھوٹا بڑا سب برابر ہے

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیات میں آسمانوں کے اپنی جگہ پر قائم رہنے کو خدا کی قدرت کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔ قرآن کی دوسری آیات میں یہی تعبیر امواجِ ہوا کے اوپر پرندوں کی موجودگی کے بارے میں آئی ہے:

الم یروا الی الطیر مسخرات فی جوّ السماء ما یمسکھن الّا اللہ ان فی ذالک لاٰیات لقوم یؤمنون ۔

"کیا انہوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ جو آسمان کی بلندیوں میں مسخر ہیں۔ خدا کے سوا کوئی بھی انہیں نہیں روکتا۔ اس چیز میں ایمان لانے والوں کے لیے خدا کی عظمت و قدرت کی نشانیاں ہیں"۔ (النحل ۔ ۷۹)

تعبیرات کی یہ ہم آہنگی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پروردگار کی بے انتہا قدرت کے لیے تمام آسمانوں کے کُروں اور زمین کی نگہداری امواجِ ہوا کے اوپر ایک پرندہ کی نگہداری کے مانند ہے۔

ایک مقام پر تو وہ وسیع آسمان کی خلقت کو اپنے وجود کی نشانی بتاتا ہے اور دوسری جگہ مچھر جیسے چھوٹے

Marfat.com

سے حشرہ کی خلقت کو اپنی قدرت کی نشانی قرار دیتا ہے۔

کبھی "سورج" کی قسم کھاتا ہے کہ جو عالم ہستی میں قوت و طاقت کا عظیم منبع ہے اور کبھی بہت ہی عام "انجیر" جیسے پھل کی قسم کھاتا ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی قدرت کے سامنے چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وما الجليل واللطيف والثقيل والخفيف، والقوى والضعيف فى خلقه الا سواء۔

چھوٹا اور بڑا، بھاری اور ہلکا، قوی اور ضعیف سب اس کی توانائی کے سامنے یکساں ہیں۔[1]

ان تمام مسائل کی دلیل ایک ہی چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کا وجود ایک ایسا وجود ہے کہ جو ہر جہت سے لامتناہی ہے اور "لامتناہی" کے مفہوم پر غور و خوض اس حقیقت کو اچھی طرح ثابت کر دیتا ہے کہ "سخت" اور "آسان"، "چھوٹا" اور "بڑا"، "پیچیدہ" اور "سادہ" جیسے مفاہیم صرف محدود موجودات کو پیش آتے ہیں جس وقت لامحدود قدرت کے بارے میں بات ہوتی ہے تو پھر یہ مفاہیم بالکل بدل جاتے ہیں اور سب کے سب بلا تفریق ایک ہی صف میں قرار پاتے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۵۔

Marfat.com

(۴۲) وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ
لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ
مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۙ ○

(۴۳) اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ
السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ
فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ
تَحْوِيْلًا ○

(۴۴) اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ
وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى
الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ○

ترجمہ

(۴۲) انہوں نے انتہائی تاکید کے ساتھ قسم کھائی کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا پیغمبر ان کے پاس آئے تو وہ سب سے زیادہ ہدایت یافتہ امت ہوں لیکن جب ان کے پاس پیغمبر آیا تو سوائے فرار اور (حق سے) دوری کے ان میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا۔

(۴۳) یہ سب کچھ اس بنا پر تھا کہ انہوں نے زمین میں استکبار کیا اور بُری سے بُری

Marfat.com

چالیں چلیں لیکن بُری چالبازیاں صرف اپنے چلنے والوں کا دامن ہی پکڑتی ہیں۔ کیا انہیں اپنے سے پہلے لوگوں کے ساتھ برتے جانے والے طرزِ عمل (اور اُن پر ہونے والے سخت عذاب) سے مختلف کی توقع ہے۔ تم ہرگز خدا کے طریقے میں کوئی تبدیلی نہ دیکھو گے۔ اور ہرگز خدا کی سنت میں کوئی تغیّر نہ پاؤ گے۔

(۴۴) کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو اُن سے پہلے تھے اُن کے ساتھ کیا ہوا؟ (جبکہ) وہ لوگ ان سے زیادہ قوی (اور زیادہ طاقتور تھے) آسمان اور زمین میں سے کوئی چیز اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں جائے گی۔ وہ دانا اور توانا ہے۔

شانِ نزول

تفسیر در المنثور، روح المعانی، مفاتیح الغیب اور دوسری تفسیروں میں ہے کہ مشرکینِ عرب جس وقت یہ سنتے تھے کہ بعض گزشتہ امتوں مثلاً یہود یوں نے خدائی پیغمبروں کی تکذیب کی تھی اور انہیں شہید کر دیا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ایسے نہیں ہیں، اگر خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر ہمارے پاس آئے تو ہم تمام امتوں کی نسبت زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں گے، لیکن وہی لوگ تھے کہ جب اسلام کا آفتاب عالم تاب ان کی سرزمین سے طلوع ہوا اور پیغمبرِ اسلامؐ سب سے عظیم کتاب لے کر اُن کے پاس آئے تو نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان کی دعوت قبول نہ کی بلکہ جھٹلایا، طرح طرح کے مکر و فریب بھی کیے اور آپؐ کے خلاف لڑے بھی۔

زیرِ نظر آیات اسی ضمن میں نازل ہوئیں اور انہیں ان کھوکھلے اور بے بنیاد دعووں پر ملامت و سرزنش کی[1]

تفسیر

استکبار اور سازشیں۔ ان کی بد بختی کا سبب

گزشتہ آیات میں مشرکین اور دنیا و آخرت میں اَن کے انجام کے بارے میں گفتگو تھی، زیرِ بحث

---

[1] اکثر تفاسیر، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

آیات میں بھی وہی بحث جاری ہے ۔

پہلی آیت کہتی ہے کہ : "انہوں نے انتہائی تاکید کے ساتھ قسم کھائی کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے پاس آئے تو یقیناً وہ تمام امتوں کی نسبت زیادہ ہدایت یافتہ ہوں" (و اقسموا باللّٰہ جھد ایمانھم لئن جاءھم نذیر لیکونن اھدٰی من احدی الامم) [1]

"ایمان" "یمین" کی جمع ہے اور قسم کے معنی میں ہے ۔ یمین اصل میں دائیں ہاتھ کے معنی میں ہے اور چونکہ قسم کھاتے اور عہد باندھتے وقت دایاں ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے اس بنا پر یہ لفظ آہستہ آہستہ قسم کے معنی میں استعمال ہونے لگا ۔

"جھد" "جہاد" کے مادہ سے سعی و کوشش کے معنی میں ہے ۔ اس بنا پر "جھد ایمانھم" کی تعبیر تاکیدی قسم کی طرف اشارہ ہے ۔

جی ہاں ! وہ جس وقت تاریخ کے صفحات کا مطالعہ کرتے تھے کہ جو گزشتہ امتوں ۔ خصوصاً یہودیوں ۔ کی اپنے پیغمبروں سے بے وفائیوں ، ناشکریوں ، وعدہ شکنیوں اور جرائم کی داستان بیان کرتی تھی تو بہت تعجب کرتے تھے اور اپنے بارے میں دعوے اور لاف زنی کیا کرتے تھے ۔

لیکن جب تجربے کی کسوٹی اور امتحان کی گرم بھٹی سے گزرے ، ان کی خواہش کے مطابق اللہ کی طرف سے رسول آگیا تو انہوں نے ثابت کیا کہ وہ بھی اُسی قماش کے ہیں ۔ جیسا کہ قرآن اسی آیت کے آخر میں کہتا ہے : "جس وقت خدا کی طرف سے خبردار کرنے والا اور ڈرانے والا ان کے پاس آیا تو فرار کرنے اور حق سے دور ہونے کے سوا ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوا" (فلما جاءھم نذیر ما زادھم الا نفورا) ۔

یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ پہلے بھی اپنے دعویٰ کے برخلاف حق کے طرفدار نہیں تھے ۔ دینِ ابراہیمی کا جو حصہ ان کے پاس تھا وہ اُسے محترم نہیں سمجھتے تھے ۔ ہر روز کسی بہانے سے اسے پاؤں کے نیچے روندتے تھے ۔ "مستقلاتِ عقلیہ" اور حکم عقل کی قدر و قیمت کے بھی قائل نہیں تھے ۔ جب پیغمبر اسلامؐ نے قیام کیا اور ان کے جاہلانہ تعصب اور ناجائز مفادات پر زد پڑی تو وہ حق سے اور زیادہ

---

[1] چونکہ احدی مفرد ہے لہٰذا آیت کا مفہوم پہلی نظر میں یہ ہوگا کہ وہ امتوں میں سے ایک امت سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے کہ جو احتمالاً قوم یہود کی طرف اشارہ ہے (کیونکہ اثباتیہ جملہ میں مفرد عموم کا معنی نہیں رکھتا) لیکن جیسا کہ بعض مفسرین نے اشارہ کیا ہے کہ قرائن حال اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کی مراد اس مفرد سے عموم تھا ۔ کیونکہ وہ مبالغہ اور تاکید کے مقام پر تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دعویٰ کریں کہ ان کے درمیان پیغمبر کے مبعوث ہونے کی صورت میں وہ سب امتوں سے آگے نکل جائیں گے ۔

Marfat.com

دُور ہو گئے ۔ ہاں ! وہ ہمیشہ سے حق سے دُور ہی تھے اور اب یہ دُوری ہر زمانے کی نسبت زیادہ ہو گئی تھی ۔

بعد والی آیت اسی بات کی تشریح ہے کہ جو گزشتہ آیت میں گزر چکی ہے ، یہ آیت کہتی ہے "حق سے ان کی دُوری اس بنا پر تھی کہ انہوں نے زمین میں تکبّر کی راہ اختیار کر رکھی تھی اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے تھے" (استکبارًا فی الارض) [1]

"اور اس بنا پر بھی تھا کہ انہوں نے قبیح اور بُری چالوں کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا" (ومکر السیئ) [2]

"لیکن یہ بُری چالیں صرف چالبازوں کے ہی دامن گیر ہوتی ہیں" (ولایحیق المکر السیئ الّا باھلہ) ۔

"لایحیق" "حاق" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے "نازل نہیں ہوتا ، درستی کو نہیں پہنچتا ، اور احاطہ نہیں کرتا" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہو سکتا ہے وقتی طور پر دوسرے لوگ ان کی چالوں کا شکار ہو جائیں لیکن آخر کار وہ حیلہ سازی خود حیلہ ساز کی طرف لوٹتی ہے ۔ اُسے مخلوقِ خدا کے سامنے رسوا اور بدنام کرتی ہے اور بارگاہِ خدا میں شرمسار کرتی ہے ۔ اور یہی رسوائی مشرکینِ مکہ نے حاصل کی ۔

درحقیقت یہ آیت کہتی ہے کہ انہوں نے صرف خدا کے عظیم پیغمبر سے دُوری اختیار کرنے پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ آپ پر ضرب لگانے کے لیے اپنی پوری طاقت سے مدد لی اور اس کا اصلی سبب اور محرک کبر و غرور اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنا تھا ۔

اس آیت کے آخر میں اس متکبر ، مکّار اور خیانت کار گروہ کو ایک پُرمعنی اور ہلا دینے والے جملے کے ساتھ تہدید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : "کیا انہیں گزشتہ لوگوں کے سے انجام کے علاوہ کسی اور کی توقع ہے" (فھل ینظرون الّا سنت الاوّلین) [3]

یہ مختصر سا جملہ تمام سرکش اقوام مثلاً قومِ نوح ، قومِ عاد ، قومِ ثمود اور قومِ فرعون کے بُرے اور منحوس انجام

---

[1] بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ "استکبارًا" ترکیب نحوی کے لحاظ سے "مفعول لہٗ" ہے اور "نفور" اور حق سے دور ہونے کی علت کا بیان ہے اور "مکر السیئ" کو اس پر عطف سمجھتے ہیں اور بعض نے اسے "نفورًا" پر عطف سمجھا ہے ۔

[2] "مکر السیئ" جنس کی نوع کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے جیسے علم الفقہ ۔ کیونکہ مکر ہر قسم کی چارہ جوئی اور تدبیر کے معنی میں ہے ، چاہے بُری ہو یا اچھی ، اسی لیے کبھی اس کی خدا کی طرف بھی نسبت دی گئی ہے مثلاً "ومکروا ومکر اللہ" (آل عمران ۵۴) لیکن "سیئ" مکر کی ایک خاص نوع ہے کہ جو حیلہ سازی اور چالبازی ہے ۔

[3] "نظر" اور "انتظار" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے کبھی ایک ہی معنی میں آتے ہیں ۔

Marfat.com

کی طرف اشارہ ہے۔ ان میں سے ہر قوم بلائے عظیم میں گرفتار ہوئی۔ قرآن نے بارہا ان کی دردناک سرنوشت کے بعض گوشوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں اسی ایک مختصر سے جملے کے ساتھ ان سب کو اس گروہ کی آنکھوں کے سامنے مجسم کر دیا ہے۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: "تو سنتِ الٰہی میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پائے گا اور سنتِ الٰہی میں تجھے ہرگز کوئی تغیّر نہ ملے گا" (فلن تجد لسنت اللہ تبدیلا ولن تجد لسنت اللہ تحویلا)۔

کیسے ممکن ہے کہ خدا ایک قوم کو تو کچھ اعمال کی بنا پر سزا دے لیکن کسی دوسرے گروہ کو کہ جس کا وہی طرزِ عمل ہو اسے معاف کر دے؟ کیا وہ حکیم و عادل نہیں ہے اور کیا وہ ہر کام حکمت اور عدل کی بنا پر انجام نہیں دیتا؟ سنتوں کی تبدیلی اُس کے بارے میں متصور ہوتی ہے کہ جو محدود آگاہی رکھتا ہے اور زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ایسے مسائل سے واقف ہوتا ہے کہ جو اُسے گزشتہ طریقے سے باز رکھتے ہیں یا وہ کہ جو آگاہ تو ہے لیکن حکمت و عدالت کی میزان کے مطابق عمل نہیں کرتا اور مخصوص میلانات اس کی فکر پر حاوی ہوں لیکن وہ پروردگار کہ جو ان تمام امور سے منزہ اور پاک ہے، اس کی سنت آئندہ کے لوگوں کے بارے میں بھی وہی ہے کہ جو گزشتہ لوگوں کے بارے میں تھی، اس کی سنتیں ثابت اور تغیر ناپذیر ہیں۔

قرآن نے متعدد آیات میں خدائی سنتوں کے تغیر ناپذیر ہونے کا ذکر کیا ہے اس کے بارے میں ہم نے جلد ۱۷ میں سورہ احزاب کی آیہ ۶۲ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

اجمالی طور پر یہ ہے کہ اس جہان کے عالم تکوین و تشریع میں ثابت اور غیر متغیر قوانین ہیں کہ جنہیں قرآن نے خدائی سنتوں کے ساتھ تعبیر کیا ہے جن میں ہرگز تبدیلی اور تغیّر کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ قوانین جس طرح سے گزشتہ ایام پر نافذ تھے اسی طرح آج بھی اور آئندہ کل پر بھی نافذ ہیں۔ بے ایمان متکبرین کی سزا جبکہ خدا کی طرف سے پند و نصیحت سود مند نہ ہو، اسی طرح راہروانِ راہِ حق کی مدد جبکہ وہ مخلصانہ کوشش سے دستبردار نہ ہوں۔ انہیں سنتوں میں سے ہے۔ اور یہ دونوں سنتیں گزشتہ زمانے میں بھی تغیر ناپذیر تھیں اور آج بھی تغیر ناپذیر ہیں۔[1]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات میں صرف خدائی سنتوں کے تبدیل نہ ہونے کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے (احزاب - ۶۲) اور بعض دوسری آیات میں ان کے عدمِ تحویل کی بات ہوئی ہے۔ (بنی اسرائیل - ۷۷)

لیکن زیرِ بحث آیت میں دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تاکید کی صورت میں لایا گیا ہے اور

---

[1] اس سلسلے میں جلد ۱۷ میں سورہ احزاب کی آیہ ۶۲ کے ذیل میں بحث کے علاوہ ہم نے جلد ۱۲ میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۷۷ کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

Marfat.com

ارشاد ہوتا ہے کہ "سنتِ الٰہی کے لیے تجھے نہ تبدیلی ملے گی اور نہ تحویل"۔

کیا ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں اور تاکید کے لیے دونوں الفاظ اکٹھے بیان ہوئے ہیں یا ان میں سے ہر ایک کسی مستقل معنی کی طرف اشارہ ہے؟

ان دونوں الفاظ کے بنیادی مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں دو مختلف معانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں "تبدیل" یہ ہے کہ کسی چیز کو بالکل بدل دیا جائے یعنی اسے لے جاکر کوئی دوسری چیز اس کی جگہ پر رکھ دی جائے لیکن "تحویل" یہ ہے کہ اُسی موجود کو "کیفیت" یا "کمیت" کے لحاظ سے تبدیل کر دیا جائے۔

اسی طرح سے خدائی سُنتیں نہ تو بالکل بدلتی ہیں اور نہ ہی کم و بیش اور ضعیف و شدید ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ خدا مشابہ گناہوں اور جرائم کے بارے میں ہر جہت سے مشابہ سزا دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک گروہ کے لیے تو سزا ہو اور دوسرے گروہ کو معاف کر دے یا کسی گروہ کی سزا کو کم یا ہلکا کر دے۔ وہ قانون کہ جو ایک ثابت بنیاد پر استوار ہے اس میں نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی تغیر و تبدل[1]

آخری نکتہ جو اس آیہ کے بارے میں نظر آتا ہے یہ ہے کہ ایک جگہ "سنت" کی اللہ کی طرف نسبت دی گئی ہے اور اسی آیت میں دوسری جگہ "سنت" کی گزرے ہوئے لوگوں کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلی نظر میں ان دونوں کے درمیان اختلاف کا خیال پیدا ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ پہلے موقع پر فاعل کی طرف اضافت ہے جبکہ دوسرے موقع پر مفعول کی طرف۔ پہلے موقع پر سنت گزار کے بارے میں گفتگو ہے، اور دوسرے موقع پر اس شخص کے بارے میں گفتگو ہے کہ جس کے بارے میں یہ سنتِ الٰہی جاری ہوگی۔

ٗ ٗ ٗ

بعد والی آیت، اس مشرک اور مجرم گروہ کو گزرے ہوئے لوگوں کے آثار اور ان کا انجام مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتی ہے تاکہ انہوں نے جو کچھ تاریخ میں ان کے بارے میں سنا ہے، ان کے علاقوں میں جاکر

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں "تحویل" کو "عذاب کے نقل مکانی" کے معنی میں تفسیر کیا ہے، اس معنی میں کہ خدا اپنی سزا ایک شخص سے اٹھا کر دوسرے کو دے دے — یہ تفسیر زیر بحث آیت سے ہم آہنگ نظر نہیں آتی۔ گفتگو یہ نہیں ہے کہ ایک شخص کو دوسرے کی جگہ سزا نہ دے بلکہ گفتگو یہ ہے کہ سزا کمی و زیادتی اور تغیر و تبدل پیدا نہیں کر سکتی۔ گویا ان مفسرین نے "تحول" کے مادہ کا "تحویل" کے ساتھ اشتباہ کیا ہے۔ بعض متون لغت مثلاً "مجمع البحرین" میں اس طرح آیا ہے:

التحویل، تغییر الشئ علی خلاف ما کان، والتحول: التنقل من موضع الی موضع۔

"کسی چیز کا اس حالت کے برخلاف ہو جانا کہ جس پر پہلے تھی تحویل ہے۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا تحول ہے"۔

Marfat.com

اور ان کے آثار کے اندر پہنچ کر خود اپنی آنکھ سے دیکھیں تاکہ بات عین الیقین میں بدل جائے۔

فرمایا گیا ہے: "کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہُوا کہ جو ان سے پہلے تھے" (اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم)۔

اگر یہ لوگ تصور کرتے ہیں کہ یہ ان سے زیادہ طاقتور ہیں تو انتہائی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ "وہ ان سے زیادہ قوی اور طاقتور تھے" (وکانوا اشد منھم قوۃ)۔

وہ فرعونی کہ جنہوں نے سرزمینِ مصر کو اپنے اقتدار کی جولان گاہ بنایا ہُوا تھا اور وہ نمرودی کہ جنہوں نے اپنی پوری طاقت و قوت کے ساتھ بابل کی وسیع سرزمین اور دوسرے ملکوں پر حکومت کی تھی اتنے قوی تھے کہ مکہ کے بُت پرست تو ان کے مقابلے میں کسی شمار و قطار میں بھی نہیں۔

علاوہ ازیں انسان خواہ جتنے بھی طاقتور اور قوی ہوں، ان کی طاقت خدا کی قدرت کے مقابلے میں صفر ہے کیونکہ "کوئی چیز آسمان میں سے اور نہ ہی زمین میں سے، اس کی قدرت کے احاطے سے نہیں نکل سکتی اور نہ ہی اسے عاجز و ناتواں کر سکتی ہے" (وما کان اللہ لیعجزہ من شیء فی السماوات ولا فی الارض) [1]

وہ دانا بھی ہے اور توانا بھی۔ نہ کوئی چیز اس کی نگاہ سے مخفی رہ سکتی ہے اور نہ ہی کوئی کام اس کی قدرت کے سامنے مشکل ہے اور نہ ہی کوئی شخص اس پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔

یہ دل کے اندھے متکبر اور مکار حیلہ گر اگر یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اس کی قدرت کے چنگل سے بھاگ کر نکل سکتے ہیں تو یہ ان کی کورچشمی ہے اور اگر وہ اپنے قبیح اور شرمناک اعمال سے دستبردار نہ ہوں گے تو وہ بھی آخرکار گزرے ہوئے سرکشوں کے سے ہولناک انجام میں گرفتار ہوں گے۔

قرآن مجید میں بارہا یہ مطلب ہمارے سامنے آیا ہے کہ خدا بے ایمان اور سرکش افراد کو "زمین میں سیر کرنے" اور ان اقوام کے آثار کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتا ہے جو عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے۔

سورہ روم کی آیہ ۹ میں ہے:

اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم ؕ کانوا اشد منھم قوۃ واثاروا الارض وعمروھا اکثر مما عمروھا وجآءتھم رسلھم بالبیّنٰت ؕ فما کان اللہ لیظلمھم ولٰکن کانوا انفسھم یظلمون۔

"کیا انہوں نے زمین میں سیر نہیں کی تاکہ وہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہُوا کہ جو

---

[1] "لیعجزہ" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اعجاز سے ہے اور عاجز کرنے کے معنی میں ہے اسی بنا پر بہت سے مواقع پر قلمرو قدرت سے فرار نہ کر سکنے یا کسی پر قابو نہ پانے کے معنی میں آیا ہے۔

Marfat.com

ان سے پہلے تھے — وہی کہ جو ان سے زیادہ قوت رکھتے تھے اور انہوں نے زمین کو دگرگوں کیا اور زمین پر اُن کی آبادی اِن سے زیادہ تھی اور ان کے پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ ان کے پاس آئے تھے مگر وہ اپنی خودسری پر قائم رہے اور خدا کے دردناک عذاب میں گرفتار ہوئے، خدا نے ہرگز ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔

یہی مطلب سورۂ یوسف کی آیہ ۱۰۹ میں،

سورۂ حج کی آیہ ۴۶ میں،

سورۂ مؤمن کی آیہ ۲۱ اور ۸۲ میں

اور سورۂ انعام کی آیہ ۱۱ میں اور قرآن کی بعض دوسری سورتوں میں بھی بیان ہوا ہے۔

یہ مکرر تاکیدیں انسانوں کے نفوس میں ان مشاہدات کے بہت اثرانداز ہونے کی دلیل ہیں۔ انہیں ان مقامات پر جانا چاہیئے اور جو کچھ انہوں نے تاریخ میں پڑھا ہے یا لوگوں سے سنا ہے اسے آنکھ سے دیکھنا چاہیئے۔

وہ جائیں اور فرعونوں کے الٹے ہوئے تخت، بادشاہان کسریٰ کے ویران محلات، قیصروں کی اکھڑی ہوئی قبروں اور نمرودوں کی بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیوں اور قوم لوط و ثمود کی تباہ شدہ سرزمینوں کو قریب سے دیکھیں، خاموش آثار کے پند و نصائح سنیں، مٹی کے اندر سونے والوں کی فریادوں پر کان دھریں اور جو کچھ انجام کار ان کے اوپر آنے والا ہے اسے اپنی آنکھ سے دیکھیں [1]

---

[1] ایک معاصر شاعر نے اس سلسلے میں بہت عمدہ اشعار کہے ہیں اور اس قرآنی حقیقت کو مصر کے سفر اور فراعنہ کے آثار دیکھنے کے بعد بہت ہی لطیف، پرکشش اور ہلا دینے والے اشعار میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

بہ مصر رفتم و آثار باستان دیدم — بہ مصر آنچہ شنیدیم ز داستان دیدم

بسی چنیں و چناں خواندہ بودم از تاریخ — بہ مصر از تو چہ پنہاں کہ بر عیاں دیدم

تو کاخ دیدی و من خفتگاں در دل خاک — ہنوز در طلب ملک جاوداں دیدم

تو تاج دیدی و من ملک رفتہ بر تاراج — تو عاج دیدی و من مشت استخواں دیدم

تو تخت دیدی و من بخت واژگوں از تخت — تو صخرہ دیدی و من سخرہ زماں دیدم

گزشتہ در دل آیندہ آنچہ پنہاں داشت — بہ مصر از تو چہ پنہاں کہ بر عیاں دیدم

ترجمہ: میں مصر گیا اور آثار قدیمہ دیکھے، مصر کی جو داستان سنی تھی اُسے خود دیکھا۔

بہت سی ایسی ویسی باتیں تاریخ میں پڑھی تھیں اور مصر میں بہت سی چیزیں جو تجھ سے پنہاں ہیں انہیں عیاں دیکھا۔

تُو نے محل دیکھا اور میں نے مٹی میں سونے والے دیکھے، جو ابھی تک ملک جاوداں کے طالب ہیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

(۴۵) وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى
ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ج
فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝

ترجمہ

(۴۵) اور اگر خدا لوگوں کو اُن کاموں کی وجہ سے کہ جو انہوں نے انجام دیئے ہیں سزا دے تو زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا جاندار باقی نہ چھوڑے، لیکن (وہ اپنے لطف سے) انہیں ایک معین مدت تک تاخیر میں ڈالے گا (اور انہیں مہلت دے گا تاکہ وہ اپنی اصلاح کر لیں) لیکن جب اُن کی اجل آجائے گی (تو پھر خدا ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا) کیونکہ وہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے (اور سب کے اعمال و نیات سے آگاہ ہے)۔

تفسیر

اس کا لطف نہ ہوتا تو کوئی جاندار زمین پر باقی نہ رہتا

زیرِ نظر آیت سورۂ فاطر کی آخری آیت ہے۔ اس سورہ کی گزشتہ آیات میں تند و تیز بحثیں اور شدید تہدیدیں تھیں اور آخری آیت میں پروردگار کے لطف و رحمت کا بیان ہے۔ جیسے اس سورہ کا آغاز لوگوں پر

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ): تُو نے تاج دیکھا اور مَیں نے تاراج شدہ ملک دیکھا، تو نے ہاتھی دانت دیکھے اور مَیں نے مُٹھی بھر ہڈیاں دیکھیں۔
تُو نے تخت دیکھا اور مَیں نے سرنگوں شدہ بخت دیکھا، تُو نے پتھر دیکھے اور مَیں نے زمانے کو ان کا مذاق اڑاتے دیکھا۔
ماضی نے ہر آنے والے کے دل میں جو کچھ چھپایا ہوا تھا وہ بہت کچھ مصر میں مَیں نے عیاں دیکھا ہے۔
زمین میں سیر کرنے اور خدا کے آثارِ تکوینی کا مطالعہ کرنے اور اسی طرح گزشتہ لوگوں کے آثار اور ان کے روحِ انسان کی تربیت کے لیے بے حد اثرات کے سلسلے میں ہم نے سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۱۳۷ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے۔

Marfat.com

اللہ کی وسیع رحمت کے ذکر سے ہوا تھا۔ اس طرح سے اس کے آغاز و اختتام پر رحمتِ الٰہی کا بیان ہے۔

گزشتہ آیت بے ایمان مجرموں کو گزشتہ لوگوں کی سرنوشت کے حوالے سے تہدید کرتی ہے۔ اس لیے بہت سے لوگوں کے سامنے یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اگر تمام سرکشوں کے بارے میں سنتِ الٰہی یہی ہے تو پھر مکہ کی اس مشرک اور سرکش قوم کو خدا سزا کیوں نہیں دیتا؟

اس سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے: "اگر خدا تمام لوگوں کو ان اعمال کی بناء پر کہ جو انہوں نے انجام دیئے ہیں سزا دے (اور اصلاح، تجدیدِ نظر اور خود سازی کے لیے انہیں کچھ بھی مہلت نہ دے) تو پھر کسی بھی جاندار کو زمین پر باقی نہ چھوڑے گا" (ولو یؤاخذ اللہ الناس بما کسبوا ما ترک علیٰ ظھرھا من دابّۃ)۔

ایسے پے در پے عذاب نازل ہوں اور بجلیاں، زلزلے اور طوفان ظالم گنہگاروں کی سرکوبی کریں کہ زمین کسی کے لیے زندہ رہنے کی جگہ نہ رہے۔

"لیکن خدا اپنے لطف و کرم سے انہیں معین زمانے تک تاخیر میں ڈالے گا اور انہیں توبہ و اصلاح کی مہلت دے گا" (ولکن یؤخرھم الیٰ اجل مسمّی)۔

لیکن یہ حلم اور خدائی مہلت ایک حساب سے ہوتی ہے۔ یہ اس وقت تک کے لیے ہے کہ ان کی اجل آن پہنچے گی تو ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا کیونکہ خدا اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے، وہ ان کے اعمال کو بھی دیکھ رہا ہے اور ان کی نیتوں سے بھی باخبر ہے" (فاذا جاء اجلھم فان اللہ کان بعبادہ بصیرًا) [1]

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں جن کا جواب اس سے کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے واضح ہو جاتا ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ یہ حکمِ عام کہ اگر خدا لوگوں کو ان کے اعمال کی وجہ سے سزا دے تو کوئی بھی صفحۂ زمین پر باقی نہ بچے گا، انبیاء و اولیاء اور صالحین کو بھی شامل کر لیتا ہے۔

---

[1] "اذا جاء اجلھم" کا جملہ شرط ہے اور اس کی جزا مقدر ہے۔ یہ واقع میں اس طرح تھا:

فاذا جاء اجلھم یجازی کل احد بما عمل۔

اس بناء پر "فان اللہ" کا جملہ جزا کی علت ہے کہ جو محذوف معلول کا جانشین ہوا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "لایستأخرون ساعۃ ولا یستقدمون" کی جزا ہو کہ جو قرآن کی دوسری آیات مثلاً سورہ نحل کی آیہ ۶۱ میں بیان ہوئی ہے۔

تو اس بناء پر "فان اللہ کان بعبادہ بصیرًا" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ سب کو پہچانتا اور جانتا ہے کہ کس کی اجل آن پہنچی ہے، تاکہ اسے اپنی قدرت کے ذریعے پکڑ لے۔

Marfat.com

اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ اس قسم کے احکام عامۃ الناس اور اکثریت قاطع سے متعلق ہوتے ہیں۔ انبیاء، وآئمہ اور صالحین کہ جو اقلیت میں ہیں مسلمہ طور پر اس سے خارج ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر حکم استثناء رکھتا ہے اور وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ بعینہٖ اس طرح ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں اہلِ جہان غافل ہیں، حریص ہیں اور مغرور ہیں اور اس سے مراد ان کی اکثریت ہے۔

سورہ روم کی آیہ ۴۱ میں ہے:

ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون

"لوگوں کے اعمال کی وجہ سے خشکی اور تری میں خرابی آشکار ہو گئی ہے، خدا چاہتا ہے کہ اُن کے اعمال کے بعض نتائج انہیں چکھائے تاکہ وہ پلٹ آئیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ خرابی تمام لوگوں کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اکثریت پر نظر ہے۔

اسی سورہ کی آیہ ۳۲ کہ جو انسانوں کو تین گروہوں۔ ظالم، درمیانے اور "سابق بالخیرات" میں تقسیم کرتی ہے، اس معنی پر ایک اور گواہ ہے۔

اس بناء پر زیرِ بحث آیت عصمتِ انبیاء سے کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا زیرِ بحث آیت میں "دابّۃ" (چلنے پھرنے والا) غیر انسانوں کے لیے بھی ہے؟ یعنی وہ بھی انسانوں کی سزا کی بناء پر ختم ہو جائیں گے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دوسرے جانداروں کے وجود کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان ان سے فائدہ اٹھائیں اور جب نسلِ بشر ہی ختم کر دی جائے تو پھر اُن کے وجود کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔[1]

آخر میں ہم اس بحث کو پیغمبرِ اکرمؐ کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں کہ جو آخری آیت کی تفسیر میں بیان ہوئی ہے۔

اس حدیث کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"خداوندِ عالم نے فرمایا ہے کہ اے آدم کے بیٹے تو میرے ارادے اور مشیت کے مطابق آزاد پیدا کیا گیا ہے کہ تو جو کچھ اپنے لیے چاہے، اختیار کر سکتا ہے اور تو میرے ارادے کے ساتھ صاحبِ ارادہ

---

[1] "دابّۃ"، "دبیب" کے مادہ سے آہستہ آہستہ چلنے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے کے معنی میں ہے لیکن لغوی معنی کے لحاظ سے عام طور پر چلنے پھرنے والے کو کہتے ہیں چاہے وہ جلدی جلدی چلے یا آہستہ آہستہ لیکن کبھی کبھی "دواب"، سواری کے جانوروں کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

Marfat.com

ہُوا ہے تُو جو کچھ اپنے لیے ارادہ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ ان نعمتوں کے ذریعے کہ جو مَیں نے تجھے دی ہیں تُو نے قوت حاصل کی ہے اور میری معصیت کا مرتکب ہُوا ہے اور میری عطا کردہ قدرت و عافیت کے ساتھ تُو میرے فرائض کو ادا کر سکتا ہے۔ اس بنا پر مَیں تیرے حسنات اور نیکیوں کے سلسلے میں خود تجھ سے اولیٰ ہوں اور تُو اپنے گناہوں کے سلسلے میں مجھ سے اولیٰ ہے۔ میری طرف سے ان نعمتوں کے ذریعے کہ جو مَیں نے تجھے دی ہیں ہمیشہ خیرات ہی پہنچی ہیں اور تیری طرف سے تیرے جرائم کی بنا پر ہمیشہ شر اور برائی تجھ تک پہنچتی ہے .... میں نے تجھے انذار کرنے اور پند و نصیحت کرنے میں ہرگز کوئی کسر نہیں چھوڑی اور غرور و غفلت کے موقع پر مَیں نے تجھے فوراً سزا نہیں دی (بلکہ مَیں نے توبہ و اصلاح کے لیے تجھے کافی مہلت دی)۔

اس کے بعد پیغمبرؐ نے فرمایا کہ یہ وہی چیز ہے کہ جس کے متعلق خدا فرماتا ہے کہ:

"ولو یؤاخذ اللہ الناس بما کسبوا ما ترک علی ظھرھا من دابۃ"[1]

پروردگارا! ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے کہ جو موقع نکل جانے سے پہلے بیدار ہو جاتے ہیں اور تیری طرف پلٹ آتے ہیں اور اپنے تاریک ماضی کو حسنات کے نور اور تیری رضا سے روشن کرتے ہیں۔

بارالٰہا! اگر تیری رحمت شاملِ حال نہ ہوتی تو وہ آگ کہ جو ہمارے بُرے اعمال کے اندر سے بھڑکتی ہمیں نگل جاتی اور اگر تیری بخشش کے نور اور روشنی کا ہمارے دل پر چھڑکاؤ نہ ہوتا تو شیطان کا لشکر اس پر قبضہ کر لیتا۔

خداوندا! ہمیں ہر قسم کے شرک سے محفوظ رکھ اور ایمان اور خالص توحید کا چراغ ہمارے دل میں روشن فرما اور ہماری گفتار و اعمال میں تقویٰ کی روشنی زیادہ کر دے۔

سورۂ فاطر کا اختتام

۱۲ر رجب ۱۴۰۴ ہجری

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۴ صفحہ ۳۷۰ بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم۔

Marfat.com

سورۂ یٰسٓ

* مکہ میں نازل ہوئی
* اس کی ۸۳ آیات ہیں

★

تاریخ آغاز ۱۳ ر رجب الخیر ۱۴۰۴ ہجری
روز ولادت باسعادت امام المتقین
امیر المومنین علی علیہ السلام

جعلنا اللہ من شیعتہ و محبّیہ
ورزقنا شفاعتہ

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ یٰسٓ کے مضامین

جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس بنا پر اس کے مضامین بالکل مکی سورتوں کے سے ہیں یعنی توحید، معاد، وحی، قرآن اور نذارت و بشارت سے متعلق گفتگو۔ اس سورہ میں چار حصے خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں:

۱۔ سب سے پہلے پیغمبرِ اسلام کی رسالت، قرآن مجید، اس آسمانی کتاب کے نازل کرنے کا مقصد اور اس کے گرویدہ ہونے والوں کا بیان ہے اور یہ بیان آیہ ۱۱ تک جاری رہتا ہے۔

۲۔ اس سورہ کے دوسرے حصے میں انبیاء الٰہی میں سے تین کی رسالت اور توحید کی طرف ان کی دعوت کی کیفیت اور شرک کے خلاف ان کے مسلسل اور زبردست معرکے کے بارے میں بیان ہے کہ جو درحقیقت پیغمبرِ اسلامؐ کو ایک قسم کی تسلی ہے اور انہیں اس عظیم ذمہ داری کی انجام دہی کی راہ دکھائی گئی ہے۔

۳۔ اس سورہ کا تیسرا حصہ آیہ ۳۳ سے شروع ہوتا ہے اور آیہ ۴۴ تک چلتا ہے یہ توحید کے پُرکشش نکات سے معمور ہے اور عالمِ ہستی میں پروردگار کی نشانیوں کا فصیح و بلیغ بیان ہے۔ اس کے بعد پھر اسی بحثِ توحید اور آیاتِ الٰہی کے بیان کی طرف بازگشت ہے۔

۴۔ اس سورہ کا ایک اہم حصہ معاد و قیامت سے مربوط مسائل، اس کے مختلف دلائل، حشر و نشر کی کیفیت قیامت کے دن سوال و جواب، عالم کے اختتام اور جنت و جہنم کے بارے میں بیان پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں بہت ہی اہم اور دقیق نکتے پوشیدہ ہیں۔

ان چاروں مباحث کے درمیان غافلوں اور بے خبروں کی بیداری کے لیے ہلا دینے والی آیات آئی ہیں کہ جو قلب و روح کے لیے بہت اثر آفریں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس سورہ میں انسان خلقت، قیامت، موت و حیات اور نذارت و بشارت کے مختلف مناظر کا سامنا کرتا ہے کہ جس سے مجموعی طور پر ایک بیدار کن اور شفا بخش نسخہ تیار ہوتا ہے۔

سورہ یٰسٓ کی فضیلت

متعدد احادیث کی گواہی کے مطابق یہ قرآن کی ایک نہایت اہم سورۃ ہے۔ اس طرح سے کہ احادیث میں اسے "قلبِ قرآن" کہا گیا ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے:

Marfat.com

ان لکل شیء قلبًا و قلب القراٰن یٰسٓ

"ہر چیز کا ایک دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل یٰسٓ ہے"۔[1]

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے بھی یہی مطلب منقول ہے۔ اس کے ذیل میں امامؑ مزید فرماتے ہیں:

فمن قرء یٰس فی نهاره قبل ان یمسی کان فی نهاره من المحفوظین والمرزوقین حتی یمسی۔ ومن قرأها فی لیله قبل ان ینام وکل به الف ملك یحفظونه من کل شیطان رجیم ومن کل اٰفة۔

"جو شخص سورۂ یٰسٓ کو غروب سے پہلے دن میں پڑھے تو سارا دن محفوظ اور روزی سے بھرا رہے گا اور جو اسے رات کو سونے سے قبل پڑھے تو خدا ایک ہزار فرشتے اس پر مامور کرتا ہے جو شیطان مردود اور ہر آفت سے اس کی حفاظت کرتے ہیں ..."[2]

اس کے علاوہ پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

سورة یٰسٓ تدعی فی التوراة المعمة قیل وما المعمة؟ قال تعم صاحبها خیر الدنیا والاٰخرة ...!

"سورہ یٰسٓ تورات میں "عمومیت آفرین" کے عنوان سے موسوم ہوئی ہے۔ پوچھا گیا کہ اسے عمومیت آفرین کیوں کہا جاتا ہے؟ فرمایا کہ اس بنا پر کہ جو شخص اس سورہ کا ہمدم اور ہمنشیں ہو اسے تمام خیر دنیا و آخرت سے نوازا جاتا ہے ..."[3]

اہل تشیع اور اہل سنت کی کتابوں میں دوسری روایات بھی اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ اگر ہم ان سب کو نقل کرنا چاہیں تو گفتگو طویل ہو جائے گی۔

اس طرح سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ شاید قرآن مجید میں بہت کم ایسی سورتیں ہوں گی کہ جو ان تمام فضائل کی حامل ہوں۔

جیسا کہ بارہا بیان کیا گیا ہے یہ فضیلت ان لوگوں کے لیے نہیں جو صرف الفاظ پڑھتے ہیں اور ان کے مفاہیم کو طاق نسیان پر رکھ دیتے ہیں بلکہ یہ عظمت اس سورہ کے عظیم مضامین اور مطالب کی بنا پر ہے۔

بیدار کرنے والے، ایمان بخشنے والے، ذمہ داریوں کا احساس دلانے والے اور تقویٰ بیدار کرنے والے مضامین کہ جب انسان ان پر غور و فکر کرتا ہے اور یہ غور و فکر اس کے اعمال میں سایہ فگن ہو جاتا ہے

۱، ۲، ۳ مجمع البیان آغاز سورہ یٰسٓ۔

Marfat.com

تو پھر دنیا و آخرت کی بھلائی کا سبب بن جاتا ہے۔

مثلاً اس سورہ کی آیہ ۶۰ میں ایک پیمان کے بارے میں ذکر ہے کہ جو خدا نے تمام اولادِ آدم سے لیا ہے کہ شیطان کی پرستش نہ کریں کیونکہ شیطان ایک کھلا دشمن ہے:

الم اعهد الیکم یا بنی اٰدم ان لا تعبدوا الشیطان انه لکم عدو مبین

یہ بات واضح ہے کہ جب انسان اس پیمانِ الٰہی کا پابند ہوگا۔ جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث میں بیان ہُوا ہے۔ تو وہ ہر شیطانِ رجیم سے امان میں ہوگا لیکن اگر اس آیہ کو سرسری طور پر پڑھے اور عمل میں وہ شیطان کا مخلص دوست اور یارِ وفادار ہے تو پھر وہ اس عظیم افتخار کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اس سورہ کی ہر ہر آیت اور کلمے کے پیشِ نظر انسان کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے۔

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱ يٰسٓ ۝

۲ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝

۳ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

۴ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

۵ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝

۶ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝

۷ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

۸ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ
فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝

۹ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا
فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

۱۰ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ

۱ یٰس

۲ قرآن حکیم کی قسم۔

Marfat.com

(۳) یقیناً تُو (خدا کے) رسولوں میں سے ہے۔

(۴) صراطِ مستقیم پر۔

(۵) (یہ قرآن) خدائے عزیز و رحیم کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

(۶) تاکہ تو اس قوم کو ڈرائے کہ جن کے آباؤ اجداد کو ڈرایا نہیں گیا تھا اسی لیے وہ غافل ہیں۔

(۷) ان میں سے اکثر کے بارے میں (اللہ کا) فرمان حق ہو کر آچکا ہے اسی بنا پر وہ ایمان نہیں لاتے۔

(۸) ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں کہ جو ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوتے ہیں اور اس لیے انہوں نے سروں کو اوپر کر رکھا ہے۔

(۹) ہم نے ان کے سامنے بھی ایک دیوار بنا دی ہے اور ان کے پیچھے بھی ایک دیوار بنا دی ہے اور ان کی آنکھوں کو ہم نے ڈھانپ دیا ہے۔ اس لیے وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے۔

(۱۰) ان کے لیے یکساں ہے چاہے تُو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر

"قلبِ قرآن" کا سرآغاز

یہ سورت قرآن مجید کی دوسری ۲۸ سورتوں کی طرح حروف مقطعات کے ساتھ شروع ہوتی ہے (یا اور سین)۔

ہم نے حروف مقطعہ کی تفسیر کے بارے میں سورۂ بقرہ، آلِ عمران اور اعراف کی ابتدا میں

Marfat.com

مفصل گفتگو کی ہے۔[1]

لیکن خصوصیت کے ساتھ سورہ یٰسین میں ان حروف مقطعہ کے لیے کچھ اور تفسیریں بھی ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لفظ مرکب ہے "یا" حرف ندا اور "سین" سے یعنی ذاتِ پیغمبرِ اسلامؐ سے اور اس طرح سے پیغمبرِ اکرمؐ کو بعد والے مطالب کے بیان کرنے کے لیے مخاطب کیا گیا ہے۔

مختلف احادیث میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ یہ لفظ پیغمبرِ گرامیٔ اسلامؐ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔[2]

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہاں مخاطب انسان ہے "سین" اس کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ احتمال بعد والی آیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ ان آیات میں روئے سخن صرف پیغمبرِ اکرمؐ کی طرف ہے۔

اسی لیے ایک روایت میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

یٰسٓ اسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم والدلیل علیٰ ذٰلک قولہ تعالیٰ انّک لمن المرسلین علیٰ صراط مستقیم۔

"یٰسین رسولِ خدا کا نام ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تو مرسلین میں سے ہے اور صراطِ مستقیم پر ہے" (نور الثقلین جلد ۴ ص۳۷۵)۔

☆ ☆ ☆

ان حروف مقطعہ کے بعد۔ بہت سی ان سورتوں کی طرح کہ جو حروفِ مقطعہ سے شروع ہوتی ہیں۔ قرآن مجید کے بارے میں گفتگو ہے۔ البتہ یہاں قرآن کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے "والقرآن الحکیم" (قرآن حکیم کی قسم)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "قرآن" کی "حکیم" کے ساتھ توصیف کی گئی ہے جبکہ حکمت عام طور پر زندہ اور عاقل شخص کی صفت ہے۔ گویا قرآن کا زندہ و عاقل اور رہبر و پیشوا کے طور پر تعارف کروایا جا رہا ہے کہ جو حکمت کے دروازے انسانوں کے سامنے کھول سکتا ہے اور اس صراطِ مستقیم کی طرف کہ جس کی طرف بعد والی آیات میں اشارہ کیا ہے، رہنمائی کر سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

البتہ خدا قسم کھانے کا محتاج نہیں ہے لیکن قرآن کی قسمیں ہمیشہ دو اہم فوائد کی حامل ہوتی ہیں، پہلا کسی مطلب کی تاکید کے لیے اور دوسرا اس چیز کی عظمت بیان کرنے کے لیے کہ جس کی قسم کھائی جا رہی ہے۔

---

[1] تفسیرِ نمونہ کی جلد اول، جلد دوم اور جلد ششم میں مذکورہ سورتوں کے آغاز کی طرف رجوع فرمائیں۔

[2] نور الثقلین، جلد ۴ ص۳۷۴ و ص۳۷۵۔

Marfat.com

کیونکہ کوئی بھی شخص کم قدر وقیمت موجودات کی قسم نہیں کھاتا ۔

۞ ۞ ۞

بعد والی آیت اس چیز کو کہ جس کی خاطر پہلی آیت میں قسم کھائی گئی تھی بیان کرتی ہے ، فرمایا گیا ہے :
"یقیناً تو خدا کے رسولوں میں سے ہے" (انک لمن المرسلین) ۔
"ایسی رسالت کہ جو حقیقت اور تیرے صراطِ مستقیم پر ہونے سے منسلک ہے" (علیٰ صراط مستقیم)[1]
پھر مزید ارشاد ہوتا ہے : "یہ وہ قرآن ہے جو خدائے عزیز و رحیم کی طرف سے نازل ہوا ہے"
(تنزیل العزیز الرحیم)[2]
خدا کے "عزیز" ہونے کا ذکر اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ وہ اس قسم کی عظیم اور شکست ناپذیر کتاب پر قدرت رکھتا ہے کہ جو تمام زمانوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک معجزہ کی صورت میں باقی رہے گی اور کوئی طاقت اس کی عظمت کو دلوں سے محو نہیں کر سکتی ۔
خدا کی "رحیمیت" کا ذکر یہ حقیقت بیان کرنے کے لیے ہے کہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ اس قسم کی عظیم نعمت انسانوں کو دے ۔
بعض مفسرین نے ان دو اوصاف کو دو قسم کے ردّ عمل کا بیان سمجھا ہے جو ممکن ہے اس کتاب آسمانی کے نزول اور اس رسول کے بھیجنے پر لوگوں کی طرف سے ظاہر ہو ۔
اگر وہ انکار پر تُل جائیں تو خدا نے انہیں اپنی عزت و قدرت کے ساتھ تہدید کی ہے اور اگر اسے دل سے تسلیم اور قبول کرلیں تو خدا نے انہیں اپنی رحمت کی بشارت دی ہے ۔[3]
اس بنا پر اس نے اپنی عزت و رحمت کو باہم ملا دیا ہے ۔ جن میں سے عزت ڈراوے کی مظہر ہے اور

---

[1] "علیٰ صراط مستقیم" کی ترکیب کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے ۔ بعض "جار و مجرور" کو "مُرسلین" سے متعلق جانتے ہیں ، جس کا مفہوم یہ ہے کہ "تیری رسالت جادۂ مستقیم پر ہے" ۔ بعض نے اسے خبر کے طور پر خبر جانا ہے ، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تُو صراطِ مستقیم پر قائم ہے ۔ بعض نے اسے موضع نصب میں "حال" ہونے کے معنی میں لیا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تُو مرسلین میں سے ہے جبکہ تُو صراطِ مستقیم پر ہے (البتہ معنی کے لحاظ سے ان تینوں احتمالوں میں چنداں فرق نہیں ہے) ۔

[2] "تنزیل" کا منصوب ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ فعل مقدر کا مفعول ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا :
نزل تنزیل العزیز الرحیم
اس جملے کی ترکیب کے بارے میں دوسرے احتمال بھی ذکر کیے گئے ہیں ۔

[3] تفسیر کبیر ، فخر رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

Marfat.com

رحمت بشارت کی مظہر ہے گویا اُس نے اپنی عزت و رحمت کی بنا، پر عظیم آسمانی کتاب انسانوں کو دی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی پیغمبر یا آسمانی کتاب کی حقانیت کو قسم اور تاکید کے ذریعے ثابت کیا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب خود زیر نظر آیات میں چھپا ہوا ہے کیونکہ ایک طرف تو قرآن کی حکیم ہونے کے ساتھ توصیف کی گئی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی حکمت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اور اپنی حقانیت کی دلیل آپ ہے۔

دوسری طرف یہ کہ پیغمبر کی صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کے ساتھ توصیف کی گئی ہے یعنی ان کی دعوت کے مطالب خود یہ بات بیان کرتے ہیں کہ ان کی راہ سیدھی ہے۔ ان کی سابقہ زندگی کے حالات بھی اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ صراطِ مستقیم کے سوا ان کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

ہم نے انبیاء کی حقانیت کے دلائل میں اس مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کی حقانیت کو معلوم کرنے کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی دعوت کے مضامین و مطالب کا بڑے غور کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ اگر وہ فطرت، عقل اور وجدان کے ساتھ ہم آہنگ ہوں اور ایسی سطح پر ہوں کہ جو ایک انسان سے بشری قوت کے ساتھ ممکن نہ ہوں، اس کے علاوہ خود پیغمبر کی زندگی کے سابقہ حالات بھی ایسے ہوں کہ جو اس بات کی نشاندہی کریں کہ وہ امین و صادق ہے اور اس میں دروغ و فریب نہیں ہے تو یہ امور اس بات کے زندہ قرائن ہوں گے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا ہے اور زیر بحث آیات حقیقت میں ان ہی دو مطالب کی طرف اشارہ ہیں۔ اس بنا، پر یہ قسم اور دعویٰ ہرگز بے دلیل نہیں ہے۔

اس سے قطع نظر، فنِ مناظرہ کے لحاظ سے، ہٹ دھرم منکرین کے دلوں میں نفوذ کے لیے جس قدر زیادہ محکم، زیادہ قاطع اور بیشتر تاکید کے ساتھ عبارتیں آئیں گی اتنا ہی وہ اُن پر اثر انداز ہوں گی۔

پھر ایک اور سوال سامنے آتا ہے کہ اس جملے میں ذاتِ پیغمبرؐ کو کیوں مخاطب کیا گیا ہے اور مشرکین اور عام لوگوں کو کیوں نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مقصد یہ تھا کہ اس بات کی تاکید کی جائے کہ تُو حق پر اور صراطِ مستقیم پر ہے، چاہے وہ قبول کریں یا نہ کریں۔ بنا بریں تو اپنی عظیم ذمہ داری کی ادائیگی میں کوشاں رہ اور مخالفین کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے فعالیت میں ہرگز کمی نہ آنے دے۔

بعد والی آیت نزولِ قرآن کے اصل مقصد کو اس طرح پیش کرتی ہے:

"ہم نے تجھ پر قرآن نازل کیا ہے تاکہ تُو اس قوم کو خبردار کرے کہ جن کے آباء و اجداد کو خبردار نہیں کیا گیا۔ اس بنا، پر وہ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں" (لتنذر قوماً ما

Marfat.com

انذر اباؤھم فھم غافلون)[1]

یقیناً اس قوم سے مراد وہی مشرکین عرب ہیں ہو سکتا ہے یہ کہا جائے کہ کوئی قوم انذار کرنے والے کے بغیر نہیں تھی اور زمین کبھی بھی حجتِ خدا سے خالی نہیں رہی ، اس کے علاوہ سورہ فاطر کی آیہ ۲۴ میں یہ بیان ہوا ہے کہ :

وان من امّة الّا خلا فیھا نذیر

"کوئی امت ایسی نہیں تھی کہ اس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں ایسا عظیم اور آشکار ڈرانے والا پیغمبر مراد ہے کہ جس کی شہرت ہر جگہ پہنچی ہوئی ہو۔ ورنہ مشتاق اور طالبانِ حق کے لیے ہر زمانے میں حجتِ الٰہی موجود ہوتی ہے اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے دور اور پیغمبر اسلامؐ کے درمیانی عرصہ کو فترت کا زمانہ شمار کرتے ہیں تو یہ اس معنی میں نہیں کہ اُن کے لیے حجتِ خدا مطلقاً موجود ہی نہیں تھی ، بلکہ یہ عظیم اور اولوالعزم پیغمبروں کے لحاظ سے فترت کا زمانہ تھا ۔

امیرالمومنین علیؑ اس سلسلے میں فرماتے ہیں :

ان اللہ بعث محمداً ولیس احد من العرب یقرء کتاباً ولا یدعی نبوة ۔

---

[1] اس بارے میں کہ اوپر والی آیت میں "ما" نافیہ ہے یا کوئی اور، مختلف احتمال ذکر کیے گئے ہیں ، بہت سے مفسرین نے اسے "نافیہ" قرار دیا ہے اور ہم نے بھی مذکورہ بالا تفسیر میں یہی معنی اپنایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً " فھم غافلون " اس معنی پر گواہ ہے کیونکہ انذار کرنے والے کا نہ ہونا غفلت کا سبب بنتا ہے ۔ سورہ سجدہ کی آیہ ۳ بھی اسی بات پر شاہد ہے ، جہاں قرآن کہتا ہے :

لتنذر قوماً ما اتاھم من نذیر من قبلک لعلھم یھتدون

مقصد یہ ہے کہ "تو ایسی قوم کو انذار کرے کہ جس کے لیے تجھ سے پہلے کوئی انذار کرنے والا نہیں آیا ، شاید کہ وہ ہدایت حاصل کریں ۔"

بعض "ما" کو موصولہ سمجھتے ہیں کہ جس سے اس کا مفہوم یہ ہوگا :

"وہ انہیں اسی طرح انذار کرتا ہے کہ جس طرح ان کے آباؤ اجداد کو انذار کیا گیا تھا ۔"

بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ "ما" مصدریہ ہے اور اس لحاظ سے اس جملہ کا معنی اس طرح ہوگا :

"تاکہ تو اس قوم کو انذار کرے اسی مقدار میں کہ جتنا ان کے آباؤ اجداد ڈرائے گئے تھے ۔"

لیکن یہ دونوں احتمال ضعیف ہیں ۔

Marfat.com

"خدا نے ایسے وقت میں محمدؐ کو مبعوث فرمایا کہ جس وقت عرب میں کوئی بھی کتابِ آسمانی نہیں پڑھتا تھا اور نہ ہی کسی کو دعویٰ نبوت تھا۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۳۳ و ۱۰۴)۔

بہرحال نزولِ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ غافل اور سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کیا جائے، جن خطرات نے اُن کا احاطہ کیا ہوا ہے انہیں اُن کی طرف متوجہ کیا جائے اور جن گناہوں اور شرک و فساد میں وہ آلودہ ہیں انہیں اُن سے نکلنے کی دعوت دی جائے۔

ہاں! قرآن تو آگاہی و بیداری کی ایک بنیاد ہے اور قلب و روح کو پاک کر دینے والی کتاب ہے۔

اس کے بعد قرآن کفر و شرک کے سرغنوں کے بارے میں ایک پیشگوئی کے طور پر کہتا ہے: "ان میں سے اکثر کے اوپر وعدہٴ الٰہی حق بن کر نافذ ہو چکا ہے، پس وہ ایمان نہیں لائیں گے" (لقد حق القول علی اکثرھم فھم لا یؤمنون)۔

"قول" سے یہاں کیا مراد ہے، اس ضمن میں مفسرین نے مختلف احتمال ذکر کیے ہیں لیکن ظاہراً اس سے مراد شیطان کے پیروکاروں کے لیے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہی ہے۔ جیسا کہ سورہ سجدہ کی آیہ ۱۳ میں ہے کہ:

ولٰکن حق القول منی لاملئن جھنم من الجنة والناس اجمعین

"لیکن میری بات ان کے لیے نافذ ہو چکی ہے کہ مَیں دوزخ کو جن و انس سے بھر دوں گا۔"

سورہٴ زمر کی آیہ ۷۱ میں بھی ہے:

ولٰکن حقت کلمة العذاب علی الکافرین

"لیکن عذاب کا حکم اور وعدہ کافروں کے بارے میں حق ہو کر نافذ ہو چکا ہے۔"

بہرحال یہ ایسے افراد کے بارے میں ہے کہ جنہوں نے خدا سے ہر قسم کا ربط منقطع کر لیا تھا، ہر قسم کے رشتے توڑ لیے تھے اور اپنے لیے ہدایت کے تمام دریچے بند کر لیے تھے اور ہٹ دھرمی اور عناد کو آخری حد تک پہنچا دیا تھا۔ ہاں! یہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور ان کے لیے بازگشت کی کوئی راہ نہیں ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے پیچھے کے تمام پُل خود تباہ کر دیئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اسی صورت میں اصلاح پذیر اور قابلِ ہدایت ہے جبکہ اس نے بُرے اعمال اور اپنے پست اخلاق کے ذریعے اپنی فطرتِ توحیدی کو بالکل پامال نہ کر دیا ہو۔ ورنہ مطلق تاریکی اس کے دل پر غالب آجائے گی اور امید کے سارے دریچے اس پر بند ہو جائیں گے۔

ضمنی طور پر اس بات سے واضح ہو گیا کہ اس اکثریت سے مراد کہ جو ہرگز ایمان نہیں لائے گی شرک و کفر کے سرغنے ہیں کہ جن میں سے کچھ تو اسلامی جنگوں میں شرک اور بُت پرستی کی حالت میں مارے گئے اور کچھ جو باقی رہ گئے تھے آخر عمر تک دل سے ایمان نہ لائے ورنہ مشرکین مکہ کی اکثریت تو فتح مکہ

Marfat.com

کے بعد :

یدخلون فی دین اللہ افواجاً (نصر۔ ۲)

کے مطابق گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہو گئی تھی۔

اس کے بعد کی آیات کے مطابق ان کے سامنے اور پیچھے دیوار موجود ہے اور وہ نابینا ہیں اور آیہ یہ تصریح بھی کرتی ہے کہ ان کے لیے انذار کرنا اور نہ کرنا یکساں ہے۔ یہ آیت بھی اسی مذکورہ معنی کی شاہد ہے [1]

بہر حال بعد والی آیت اس اثر ناپذیر گروہ کے تعارف میں ہے: ان کے پہلے تعارف میں کہتی ہے: "ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں کہ جو اُن کی ٹھوڑیوں تک آئے ہوئے ہیں اور ان کے سروں کو اوپر کیا ہوا ہے" (انا جعلنا فی اعناقهم اغلالاً فهی الی الاذقان فهم مقمحون)۔

"اغلال" "غل" کی جمع ہے اور اصل میں مادہ "غل" سے ایسی چیز کے معنی میں ہے کہ جو چند چیزوں کے درمیان موجود ہو، مثلاً وہ جاری پانی کہ جو درختوں کے درمیان سے گزرتا ہے اُسے "غلل" (بروزن "عمل") کہتے ہیں اور "غل" وہ حلقہ تھا کہ جسے گردن یا ہاتھ میں ڈالتے تھے پھر اُسے زنجیر کے ساتھ باندھ دیتے تھے اور چونکہ گردن یا ہاتھ اس کے درمیان ہوتا تھا لہٰذا یہ لفظ اُس کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ کبھی وہ طوق کہ جو گردن میں ہوتے تھے انہیں علیحدہ زنجیر کے ساتھ باندھا جاتا تھا اور ہاتھ کے حلقے علیحدہ ہوتے تھے، لیکن کبھی کبھی ہاتھوں کو حلقوں میں ڈال کر اس حلقے کے ساتھ کہ جو گردن میں ہوتا تھا باندھ دیتے تھے اور قیدی کو انتہائی اذیت دی جاتی تھی۔

نیز پیاس یا شدتِ غم اور غصے کی حالت کو "غلہ" (بروزن "قلہ") کہا جاتا ہے تو یہ بھی اس حالت کے انسان کے دل اور جسم پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے ہے۔ اصولاً مادہ "غل" (بروزن "جد") بھی داخل ہونے اور داخل کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ اسی لیے گھر کے اناج اور زراعت وغیرہ کو بھی "غلہ" کہتے ہیں [2]

ہر صورت میں جب طوق "غل" گردن میں ڈالا جاتا تھا تو وہ ٹھوڑی تک پہنچا ہوا ہوتا تھا اور سر کو اوپر کر دیتا تھا اور جب قیدی اور اسیر اس کی وجہ سے بہت سختی میں ہوتا تھا تو اپنے گردوپیش کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

---

[1] جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ "اکثرھم" کی ضمیر "قوم" کی طرف کہ جو اس سے پہلے ہے نہیں لوٹتی، بلکہ قوم کے سرغنوں کی طرف لوٹتی ہے اور اس کی شاہد اس کے بعد کی آیات ہیں۔

[2] مفردات راغب اور قطر المحیط اور مجمع البحرین (مادہ "غلل")۔

Marfat.com

ہٹ دھرم بُت پرستوں کی حالت کی یہ تشبیہ کتنی عمدہ ہے کہ جو ایسے انسانوں کے ساتھ دی گئی ہے کہ جنہوں نے "تقلید" کا طوق اور بیہودہ عادات و رسوم کی زنجیر و طوق کو اپنی گردن اور ہاتھ پاؤں میں باندھ لیا ہے، اور ان کے وہ طوق ایسے ہیں کہ انہوں نے اُن کے سروں کو اوپر کر رکھا ہے اور حقائق کو دیکھنے سے محروم کر دیا ہے وہ ایسے قیدی ہیں کہ نہ تو حرکت کر سکتے ہیں اور نہ ہی دیکھ سکتے ہیں [1]

بہر حال زیرِ بحث آیت اس بے ایمان گروہ کے حالاتِ دنیا کی ایک تصویر ہے اور آخرت میں اُن کے حالات کا ایک بیان بھی ہے، جو اس جہان کی کیفیت کا ایک مرقع ہے۔ اور اگر یہ لفظ ماضی کی شکل میں ذکر ہوا ہے تو اس سے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں آئندہ ہونے والے مسلمہ اور یقینی واقعات صیغہ ماضی میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے کہ جو ادبا کی زبان میں معروف ہے کہ "متحقق الوقوع مضارع، ماضی کی شکل اختیار کر لیتا ہے" اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں معانی کی طرف اشارہ ہو، ان کی اس عالم میں حالت کے بارے میں بھی اور دوسرے جہان کے بارے میں بھی۔

مفسرین کی ایک جماعت نے زیرِ بحث آیت اور اس کے بعد کی آیت کی کئی شانِ نزول بیان کی ہیں، ان کے مطابق یہ "ابوجہل" کے بارے میں یا قبیلہ بنی مخزوم یا قریش کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے قتل کا بارہا مصمم ارادہ کیا لیکن خدا نے انہیں معجزانہ طور پر اس کام سے باز رکھا اور اس حساس لمحے میں جب کہ وہ پیغمبر اکرمؐ کے نزدیک پہنچ کر یہ چاہتے تھے کہ آپؐ پر ضرب کاری لگائیں تو ان کی آنکھیں بے کار ہو گئیں یا حرکت کی طاقت اُن سے سلب ہو گئی [2]

لیکن یہ تمام بیان کردہ شانِ نزول آیت کے مفہوم کی عمومیت اور اس کے معنی کی وسعت سے مانع نہیں ہے اور یہ کفر کے تمام سرغنوں اور ہٹ دھرم متعصب لوگوں کے بارے میں ہے۔ ضمنی طور پر ہم نے جو کچھ "فھم لا یؤمنون" کی تفسیر میں بیان کیا ہے یہ اس کی ایک تائید ہے کہ اس سے مراد مشرکین کی اکثریت نہیں ہے بلکہ شرک، کفر اور نفاق کے سرغنوں کی اکثریت مراد ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں انہیں افراد کی ایک اور صفت بیان کی گئی ہے اور ان کی اثر ناپذیری کے عوامل کی ایک بولتی ہوئی تصویر ہے۔ فرمایا گیا ہے: "ہم نے ایک دیوار تو ان کے سامنے بنا دی ہے اور ایک دیوار اُن

---

[1] ہم نے جو کچھ سطور بالا میں بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ "ھی" کی ضمیر (فھی الی الاذقان) میں "اغلال" کی طرف لوٹتی ہے کہ وہ ان کی ٹھوڑی تک کھنچے ہوئے ہیں اور "فھم مقمحون" اس پر تفریع ہے اور یہ جو ایک جماعت نے خیال کیا ہے کہ "ھی" کی ضمیر (ایدی) "ہاتھوں" کی طرف لوٹتی ہے کہ جس کا آیہ میں ذکر نہیں، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

[2] تفسیر آلوسی، جلد ۲۲ ص ۱۹۹۔

Marfat.com

کے پیچھے" (وجعلنا من بین ایدیھم سدًا ومن خلفھم سدًا)۔

وہ ان دونوں دیواروں کے درمیان اس طرح سے محصور ہو کر رہ گئے ہیں کہ نہ تو آگے جانے کے لیے ان کے پاس کوئی راستہ ہے اور نہ ہی واپس لوٹنے کے لیے " اور اس حالت میں ہم نے ان کی آنکھوں کو ڈھانپ دیا ہے، لہٰذا وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے" (فاغشیناھم فھم لا یبصرون)۔

کیسی عجیب بولتی ہوئی تصویر ہے۔ ایک طرف سے تو وہ ایسے قیدیوں کی مانند ہیں کہ جو طوق و زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور دوسری طرف سے گردن میں پڑے ہوئے طوق کا حلقہ اتنا بڑا ہے کہ اس نے اُن کے سروں کو آسمان کی طرف اٹھا رکھا ہے اور وہ اپنے اطراف کی کوئی چیز نہیں دیکھ پاتے۔

ایک دیوار نے ان کا آگے سے اور ایک نے پیچھے سے محاصرہ کیا ہوا ہے اور آگے اور پیچھے کا راستہ ان کے لیے بند کر دیا ہے۔

نیز ان کی آنکھیں بھی بند کر دی گئی ہیں اور دیکھنے کی بصارت بے کار ہو گئی ہے۔

خوب غور کریں کہ جو شخص ایسی کیفیت سے دوچار ہو وہ کیا کر سکتا ہے، کیا سمجھ سکتا ہے، کیا دیکھ سکتا ہے اور کس طرح قدم بڑھا سکتا ہے؟۔ خودغرض و خود بین متکبرین اندھے، بہرے مقلدین اور ہٹ دھرم متعصبین کی کیفیت حقائق کے سامنے ایسی ہی ہے۔

اسی بنا پر آخری زیر بحث آیت میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے: "ان کے لیے برابر ہے چاہے تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ ایمان نہیں لائیں گے" (وسواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون)۔

تیری گفتگو چاہے جتنی بھی پُر تاثیر ہو اور وحی آسمانی چاہے جس قدر بھی مؤثر ہو، جب تک دلوں کی زمین اہل اور تیار نہ ہو اثر نہ کرے گی۔ اگر آفتاب عالم تاب ہزاروں سال شورہ زار پر چمکتا رہے اور پُر برکت بارشیں اس پر برستی رہیں اور نسیم بہار مسلسل اس کے اوپر سے گزرتی رہے، خس و خاشاک کے سوا اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا کیونکہ فاعل کی فاعلیت کے ساتھ ساتھ قابل کی قابلیت بھی شرط ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ آلاتِ شناخت کا بیکار ہو جانا: انسان اس بنا پر کہ اپنے وجود سے باہر کے عالم سے بھی آگاہ ہو سکے کچھ وسائل و آلات سے فائدہ اٹھاتا ہے، جنہیں آلاتِ شناخت کہا جاتا ہے۔

ان میں سے ایک حصہ تو "ذات کے اندر" ہوتا ہے اور دوسرا حصہ "ذات سے باہر"۔ عقل و خرد اور وجدان و فطرت تو ذات کے اندر والے شناخت کے آلات ہیں اور انسان کے حواس ظاہری۔ جیسے بینائی و شنوائی۔ ذات۔ سے باہر کے آلاتِ شناخت ہیں۔

Marfat.com

ان خداداد وسائل سے اگر صحیح طور پر استفادہ کیا جائے تو روز بروز زیادہ قوی اور زیادہ طاقتور ہوتے جائیں گے اور مزید بہتر اور مزید دقیق حقائق کی شناخت کریں گے ۔

لیکن اگر وہ ایک مدت تک انحرافی راہوں میں چلتے رہیں یا اُن سے بالکل استفادہ نہ کیا جائے تو آہستہ آہستہ کمزور پڑ جائیں گے یا بالکل بگڑ جائیں گے اور حقائق کی برعکس نشاندہی کریں گے ، ٹھیک ایک صاف و شفاف آئینہ کی مانند کہ جسے ایک دبیز و ضخیم گرد و غبار ڈھانپ لے یا زیادہ اور گہری خراشیں اس پر لگ جائیں تو پھر اس میں کوئی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی اور اگر دکھائی دے بھی تو ہرگز حقیقت کے مطابق نہیں ہوگی ۔

انسان کے یہی غلط اعمال اور انحرافی فائدے اٹھانا ، آلاتِ شناخت کی اس عظیم نعمت کو اس سے چھین لیتے ہیں ۔ اسی بنا پر قصور وار وہ خود ہے اور اس کا گناہ بھی خود اسی کی گردن پر ہے ۔

اوپر والی آیات اس اہم اور سرنوشت ساز مسئلہ کی بولتی ہوئی تصویر ہیں ۔ متکبر ہوس بازوں اور متعصب خود خواہوں کو ان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو طوق و زنجیر میں گرفتار ہیں ۔ یہ وہی ہوا و ہوس ، کبر و غرور اور اندھی تقلید کی زنجیریں ہیں کہ جو خود انہوں نے اپنے ہاتھ اور گردن میں ڈالی ہیں اور یہ اُن لوگوں کے مشابہ ہیں کہ جو ایک قوی اور ناقابلِ عبور چار دیواری کے محاصرے میں آگئے ہیں ۔

اور دوسری طرف سے اُن کی آنکھیں بند اور نابینا ہیں ۔

صرف طوق و زنجیر ہی ان کو حرکت سے روکنے کے لیے کافی ہیں جبکہ دو عظیم دیواریں بھی ان کی فعالیت میں مانع ہیں اور ان کی آنکھیں بھی کچھ دیکھنے کے قابل نہیں ہیں ۔

یہ دونوں دیواریں گویا اس قدر بلند اور نزدیک ہیں کہ جو انہیں کچھ دیکھنے نہیں دیتیں اور انہیں حرکت سے بھی محروم کر دیتی ہیں ۔

ہم نے بارہا بیان کیا ہے کہ انسان کا ہدایت قبول کرنا اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ اس مرحلے تک نہ پہنچ گیا ہو لیکن جب وہ اس مرحلے تک پہنچ جائے تو پھر تمام انبیاء و اولیاء بھی جمع ہو جائیں اور تمام کتب آسمانی اس کے سامنے پڑھی جائیں تو بھی اس پر مؤثر نہ ہوں گی ۔

اور یہ جو روایاتِ اسلامی اور اسی طرح آیاتِ قرآنی میں تاکید کی گئی ہے کہ اگر کسی انسان سے کوئی لغزش ہو جائے اور کوئی گناہ اس سے سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کرلے اور خدا کی طرف لوٹ آئے اور لیت و لعل ، تاخیر اور اصرار و تکرار سے پرہیز کرے ، تو یہ اس لیے ہے کہ معاملہ اس حد تک نہ پہنچ جائے کہ جو زنگ لگ چکا ہے اُترنے ہی نہ پائے ۔ چھوٹی چھوٹی رکاوٹوں کو ایک بڑی رُکاوٹ میں تبدیل ہونے سے پہلے ہی ختم کر دے اور پیش رفت اور حرکت کی گنجائش باقی رکھے اور غبار کو اپنی آنکھوں سے ہٹا دے تاکہ راستے کو واضح طور پر دیکھ سکے ۔

٭ ٭ ٭

Marfat.com

۲۔ آگے اور پیچھے حائل دیواریں : بعض مفسرین نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ حرکت کو جاری رکھنے میں اصل رکاوٹ تو آگے اور سامنے کی رکاوٹیں ہوتی ہیں، پیچھے کی دیوار کے کیا معنی ہیں؟

بعض نے تو یہ جواب دیا ہے کہ انسان دو قسم کی ہدایت کا حامل ہے:

۱۔ نظری اور استدلالی ہدایت اور

۲۔ فطری و وجدانی ہدایت

سامنے کی دیوار اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ہدایت نظری سے محروم ہوگا، وہ چاہے گا کہ پیچھے کی طرف لوٹ جائے اور ہدایت فطری کی طرف نظر کرے تو پیچھے کی دیوار اسے فطرت کی طرف بازگشت سے روکے گی[۱]

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ آگے والی دیوار ان رکاوٹوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو اُسے آخرت اور سعادتِ جاودانی تک پہنچنے سے روکتی ہیں اور پیچھے والی دیوار وہ چیز ہے کہ جو اسے دنیا کی سعادت اور آرام و سکون تک پہنچنے نہیں دیتی[۲]

یہ احتمال بھی آیت کی تفسیر میں موجود ہے کہ انسان جس وقت مقصد تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ کا سامنا کرتا ہے تو وہ پیچھے کی طرف لوٹتا ہے تاکہ مقصد تک پہنچنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے لیکن جب دونوں طرف ایک ایک دیوار بن چکی ہو تو وہ ہر حالت میں مقصد کی طرف جانے سے محروم ہو جائے گا۔

ضمنی طور پر اس سوال کا جواب واضح ہوگیا کہ دائیں اور بائیں طرف دیوار کا کوئی بیان کیوں نہیں ہوا کیونکہ دائیں بائیں چلنا کبھی بھی انسان کو مقصد تک نہیں پہنچاتا، اسے تو کوئی راستہ آگے کی طرف ہی نکالنا چاہیے۔

علاوہ ازیں عام طور پر دیوار ایسی جگہ پر بنائی جاتی ہے کہ جب دائیں اور بائیں طرف راستہ بند ہو اور دونوں کے درمیان صرف ایک ہی گزرگاہ موجود ہو تو دیوار تعمیر ہو جانے سے وہ گزرگاہ بھی بند ہو جاتی ہے اور عملی طور پر انسان محاصرے میں آجاتا ہے۔

۳۔ انفس و آفاق کی دنیا میں سیر سے محرومی : خدا کی شناخت کے لیے عام طور پر دو راستے موجود ہیں۔ ایک تو خدا کی اُن نشانیوں کا مطالعہ کہ جو انسان کے جسم و روح میں موجود ہیں اور انہیں "آیاتِ انفس" کہا جاتا ہے۔

دوسرا ان آیات اور نشانیوں کا مطالعہ کہ جو اس کے وجود سے باہر زمین و آسمان، ثوابت و سیارات اور کوہ و دریا میں پائی جاتی ہیں۔ انہیں "آیاتِ آفاق" کہتے ہیں کہ جن کی طرف قرآن مجید سورہ حٰم السجدہ کی

---

[۱] تفسیر کبیر، فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[۲] تفسیر قرطبی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

آیہ ۵۳ میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق و فی انفسھم حتّٰی یتبیّن لھم انہ الحق

ہم عنقریب انہیں آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر ثابت ہو جائے کہ خدا حق ہے ۔

جس وقت انسان کی قوتِ شناخت بے کار ہو جاتی ہے تو آیاتِ انفس کا مشاہدہ بھی اس پر بند ہو جاتا ہے اور آیاتِ آفاق کا مشاہدہ بھی ۔

زیرِ بحث آیات میں " انّا جعلنا فی اعناقھم اغلالاً فھی الی الاذقان فھم مقمحون " کا جملہ پہلے معنی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ طوق ان کے سروں کو اس طرح سے اوپر کیے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بھی دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے اور آگے اور پیچھے کی دیواریں ان کی آنکھ کو اس طرح سے اپنے اطراف کے مشاہدہ سے باز رکھتی ہیں وہ دیکھنے کی جتنی بھی کوشش کرتے ہیں اس دیوار کے سوا انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا اور آفاقی آیات کے مشاہدہ سے بھی محروم رہ جاتے ہیں ۔

Marfat.com

(۱۱) اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكۡرَ وَخَشِىَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَيۡبِ‌ۚ فَبَشِّرۡهُ بِمَغۡفِرَةٍ وَّاَجۡرٍ كَرِيۡمٍ ○

(۱۲) اِنَّا نَحۡنُ نُحۡىِ الۡمَوۡتٰى وَنَكۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَاٰثَارَهُمۡ‌ؕ وَكُلَّ شَىۡءٍ اَحۡصَيۡنٰهُ فِىۡۤ اِمَامٍ مُّبِيۡنٍ ○

ترجمہ

(۱۱) تُو تو صرف اس شخص کو ڈرا سکتا ہے کہ جو اس خدائی نصیحت کی پیروی کرتا ہے اور خدائے رحمٰن سے پوشیدہ طور سے ڈرتا ہے ایسے شخص کو بخشش اور بہترین اجر و ثواب کی بشارت دے دے۔

(۱۲) ہم ہی مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے اور ان کے تمام آثار کو ہم لکھتے ہیں اور ہم نے ہر چیز کا واضح "کتاب" میں احصاء کر دیا ہے۔

تفسیر

کس قسم کے لوگ تیری تنبیہ کو قبول کرتے ہیں

گزشتہ آیات میں ایسے گروہ کے بارے میں گفتگو تھی کہ جو کسی طرح بھی خدائی تنبیہوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور ان کو ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ زیر بحث آیات ایک اور گروہ کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ یہ لوگ مذکورہ گروہ کے بالکل مدِّمقابل قرار پاتے ہیں۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ایک کا دوسرے سے موازنہ کرکے۔ مسئلہ زیادہ واضح ہو جائے اور یہی قرآن کا طریق کار ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "تُو تو صرف اُسی کو خدا سے ڈرا سکتا ہے جو اس کے ذکر کی پیروی کرے اور خداوند رحمان سے پوشیدہ طور پر اور غیب میں ڈرے" (انما تنذر من اتبع الذکر وخشی الرحمٰن بالغیب)۔

Marfat.com

"اور جو ایسا ہے اسے مغفرت اور بہترین اجر و ثواب کی بشارت دے" (فبشرہ بمغفرۃ واجر کریم)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ اس آیت میں ایسے اشخاص ۔ کہ جن پر پیغمبرؐ کا "انذار" اور پند و نصیحت مؤثر ہے کے دو اوصاف بیان ہوئے ہیں:

۱۔ نصیحت کی پیروی۔

۲۔ پوشیدہ طور پر خدا سے ڈرنا۔

البتہ ان دو اوصاف سے مراد آمادگی اور صلاحیت ہے۔ یعنی انذار صرف ان افراد پر مؤثر ہوتا ہے جو سننے والا کان اور آمادہ دل رکھتے ہیں۔ انذار ان میں دو اثر پیدا کرتا ہے، پہلا ذکر و قرآن کی پیروی اور دوسرا پروردگار اور اس کی طرف سے عائد ذمہ داریوں کی ادائیگی کا احساس۔

دوسرے لفظوں میں ان دو اوصاف کی صلاحیت ان میں موجود ہے لیکن انذار کے بعد وہ عملی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہٹ دھرم، دل کے اندھوں اور غافل لوگوں کے برخلاف کہ جو نہ تو سننے والے کان رکھتے ہیں اور نہ ہی خشیت و خوفِ الٰہی کے لیے آمادگی۔

یہ آیت سورۂ بقرہ کی پہلی آیات کے مانند ہے کہ جن میں فرمایا گیا ہے:

ذٰلک الکتاب لاریب فیہ ھدًی للمتقین

"اس کتابِ آسمانی میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اور یہ پرہیزگاروں کے لیے باعثِ ہدایت ہے"۔

٭ ٭ ٭ ٭

۲۔ بہت سے مفسرین کے نظریہ کے مطابق "ذکر" سے مراد قرآن مجید ہے۔ کیونکہ یہ لفظ قرآن میں بارہا اسی شکل میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔[۱]

لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اس سے مراد اس کا لغوی معنی یعنی ہر قسم کا تذکرہ اور نصیحت ہو اور اس میں آیاتِ قرآن اور پیغمبر اکرمؐ اور خدائی رہبروں کے تمام انذار اور پند و نصائح بھی اس کے مفہوم میں شامل ہوں۔

---

[۱] سورہ نحل ۔ ۴۴، حٰم السجدہ ۔ ۴۱، زخرف ۔ ۴۴ اور قمر ۔ ۲۵ ۔ جبکہ "ذکر" قرآن میں بارہا مطلق ذکر کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

Marfat.com

۳۔ "خشیت" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اس خوف کے معنی میں ہے کہ جس کے ساتھ احساس عظمت موجود ہو نیز "رحمٰن" کی تعبیر کہ جو خدا کی رحمتِ عامہ کی مظہر ہے، یہاں ایک لطیف نکتے کی حامل ہے اور وہ یہ کہ عظمتِ خدا کے خوف کے ساتھ ساتھ وہ اس کی رحمت کی امید بھی رکھتے ہوں تاکہ خوف و رجاء کے دونوں پلڑے ۔ کہ جو تکامل و ارتقاء کی طرف مسلسل حرکت کے حامل ہیں ۔ متوازن رہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بعض آیاتِ قرآنی میں رجاء و اُمید کے بارے میں تو "اللہ" کے نام کا ذکر ہوا ہے جو کہ ہیبت و عظمت کا مظہر ہے:

لمن کان یرجوا اللّٰہ والیوم الاٰخر (احزاب - ۲۱)

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رجاء بھی خوف کے ساتھ ہونا چاہیئے اور خوف رجاء کے ساتھ۔ (غور کیجئے گا)۔

۴۔ "بالغیب" کی تعبیر یہاں پر استدلال و بُرہان کے ذریعے خدا کی شناخت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کی پاک ذات انسانی حواس سے پنہاں ہے۔ صرف دل کی آنکھ سے اور اس کے آثار کے ذریعے اس کے اجلال و جمال کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "غیب" یہاں پر لوگوں کی آنکھ سے پنہاں کے معنی میں ہو یعنی اس کا مقام خشیّت و خوف، یا کے پہلو سے اور لوگوں کی موجودگی میں ہی نہ ہو بلکہ وہ تنہائی میں بھی خشیّت کا حامل ہو۔

بعض نے اسے "قیامت" کے معنی میں تفسیر کیا ہے کیونکہ اس کے واضح مصادیق میں سے وہ امور بھی ہیں کہ جو ہماری حس سے پنہاں ہیں لیکن پہلا معنی سب سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

۵۔ "فبشرہ" کا لفظ درحقیقت "انذار" کی تکمیل ہے کیونکہ خدا کا پیغمبرؐ ابتداء میں انذار کرتا ہے اور جس وقت فرمانِ خدا کی پیروی اور احساسِ عظمت کے ساتھ خوف پیدا ہو جائے اور اس کے اثرات انسان کے قول و فعل میں ظاہر ہوں، تو وہ بشارت دیتا ہے۔

کس بات کی بشارت دیتا ہے؟ پہلے تو اس بات کی کہ جو انسانی فکر کو ہر دوسری چیز سے زیادہ اپنی طرف مشغول رکھتی ہے اور پھر اُن لغزشوں کے بارے میں کہ جو کبھی کبھار اس سے سرزد ہوتی ہیں۔ کہ خدائے بزرگ و برتر نے وہ سب بخش دی ہیں۔ اس کے بعد اجرِ کریم اور بہترین جزاء کی بشارت دیتا ہے کہ جس کے مختلف پہلوؤں کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ لفظ "مغفرت" بھی نکرہ کی شکل میں بیان ہوا ہے اور "اجرِ کریم" بھی۔ ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کے مواقع پر نکرہ کی صورت میں لفظ کا آنا عظمت کے بیان کے لیے ہے۔

٭ ٭ ٭

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ "فبشرہ" میں "فاء" کہ جو تفریع کے لیے ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے

Marfat.com

کہ مغفرت اور اجر کریم ترتیب وار نصیحت کی پیروی اور پروردگار کے خوف کا نتیجہ ہیں۔

٭ ٭ ٭

گزشتہ آیات میں مومنین اور انبیاء کے انذار کو قبول کرنے والوں کے اجر و ثواب کا ذکر ہے۔ اسی مناسبت سے بعد والی آیت میں مسئلہ معاد و قیامت اور حساب و کتاب اور جزاء کے لیے ثبت اعمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "ہم مُردوں کو زندہ کرتے ہیں" (انا نحن نحی الموتیٰ)۔

"نحن" (ہم) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس عظیم قدرت کے ہوتے ہوئے کہ جس کا تم سب کو ہمارے متعلق علم ہے مزید کسی بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں ہے کہ بوسیدہ اور گلی سڑی ہڈیاں نئے سرے سے کس طرح زندہ ہوں گی اور لباس حیات کس طرح زیبِ تن کریں گی۔

نہ صرف یہ کہ ہم مُردوں کو زندہ کریں گے بلکہ "ہم وہ تمام کچھ کہ جو انہوں نے آگے بھیجا ہے اور اُس کے تمام آثار بھی لکھ رہے ہیں" (ونکتب ما قدّموا و اٰثارھم)۔

اس بناء پر کوئی چیز فروگزاشت نہیں ہوگی اور ہر چیز نامۂ اعمال میں روزِ حساب کے لیے محفوظ ہو جائے گی۔

"ما قدّموا" (جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے) ان اعمال کی طرف اشارہ ہے کہ جو انہوں نے انجام دیئے ہیں اور اُن کا کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ لیکن "واٰثارھم" کی تعبیر انسان کے ان اعمال کی طرف اشارہ ہے کہ جو باقی رہ جاتے ہیں اور ان کے آثار معاشرے میں منعکس ہوتے ہیں۔ مثلاً صدقات جاریہ (انسان کی تعمیرات، اوقاف اور ایسے مراکز کہ جو بعد ازاں باقی رہ جاتے ہیں اور لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں)۔

یہ احتمال بھی آیت کی تفسیر میں موجود ہے کہ "ما قدّموا" تو ان اعمال کی طرف اشارہ ہو کہ جو شخصی جنبہ رکھتے ہیں اور "اٰثارھم" ان کاموں کی طرف کہ جو رواج پا جاتے ہیں اور انسان کے بعد بھی موجب خیر و برکت یا موجب شر و زیاں اور سببِ گناہ بنتے ہیں۔

البتہ آیت کا مفہوم وسیع ہے اور ممکن ہے کہ دونوں تفاسیر اس کے مفہوم میں جمع ہوں۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے اضافہ کیا گیا ہے: "ہم نے تمام چیزوں کا واضح اور آشکار کتاب میں احصاء کر دیا ہے" (وکل شیٍ احصیناہ فی امامٍ مبین)۔

اکثر مفسرین نے یہاں "امام مبین" سے "لوح محفوظ" مراد لی ہے۔ یعنی وہ کتاب کہ جس میں اس جہان کے تمام موجودات، واقعات اور اعمال ثبت و محفوظ ہیں۔

نیز "امام" کی تعبیر ممکن ہے کہ اس نظر سے ہو کہ یہ کتاب قیامت میں ثواب و عقاب کے تمام مامورین کے لیے رہبر اور پیشوا ہے اور انسانوں کے اعمال کی قدر و قیمت پرکھنے کے لیے ان کی جزا و سزا کا

Marfat.com

ایک معیار ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ لفظ "امام" قرآن کی بعض دوسری آیات میں "تورات" کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

افمن کان علیٰ بینۃ من ربہ و یتلوہ شاھد منہ ومن قبلہ کتاب موسیٰ اماماً ورحمۃ (ہود - ۱۷)

"کیا وہ شخص کہ جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہو اور اسی کی طرف سے اس کے پیچھے ایک شاہد بھی ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب کہ جو امام اور رحمت تھی اس پر گواہی دیتی ہے (اس شخص کی مانند ہے کہ جو ایسا نہیں ہے)"۔

اس آیہ میں لفظ "امام" کا اطلاق تورات پر اس کے معارف و احکام کی بنا پر ہے۔ اسی طرح اس میں بیان شدہ پیغمبر اسلامؐ کی ان نشانیوں کی وجہ سے ہے اور ان تمام امور میں وہ مخلوق کے لیے رہبر و پیشوا بن سکتی ہے۔ اس بنا پر مذکورہ لفظ "امام" ہر موقع پر اس موقع کی مناسبت سے مفہوم دیتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ ثبتِ اعمال کی مختلف کتابیں: قرآن مجید کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال چند کتابوں میں ثبت ہوتے ہیں تاکہ حساب و کتاب کے وقت کسی شخص کے لیے بھی کسی قسم کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔

پہلی کتاب تو "شخصی نامۂ اعمال" ہے کہ جو ایک فرد کی ساری عمر کے اعمال ثبت کرتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص سے کہا جائے گا:

اقرأ کتابک کفیٰ بنفسک الیوم علیک حسیباً

"تُو خود ہی اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے، تُو خود ہی اپنے نفس کا حساب کرنے کے لیے کافی ہے" (بنی اسرائیل - ۱۴)۔

یہ وہ مقام ہے کہ مجرمین کی فریاد بلند ہوگی:

یقولون یاویلتنا مال ھٰذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا

"وہ کہیں گے کہ وائے ہو ہم پر یہ کیسی کتاب ہے کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا گناہ ایسا نہیں ہے کہ جو اس میں ثبت نہ ہو" (کہف - ۴۹)۔

"یہ وہی کتاب ہے کہ جو نیکوکاروں کے دائیں ہاتھ میں اور بدکاروں کے بائیں ہاتھ میں ہوگی" (حاقہ - ۱۹ و ۲۵)۔

Marfat.com

دوسری کتاب "امتوں کا نامۂ اعمال" ہے، اور ان کی اجتماعی زندگی کے اعمال بیان کرتی ہے جیساکہ قرآن کہتا ہے:

کل امة تدعٰی الیٰ کتابها

"قیامت کے دن ہر امت کو اس کے نامۂ اعمال کی طرف بلایا جائے گا" (جاثیہ - ۲۸)

تیسری کتاب اعمال نامۂ جامع و عمومی یعنی لوح محفوظ ہے کہ جس میں نہ صرف اولین و آخرین کے تمام انسانوں کے اعمال بلکہ عالم کے تمام واقعات یکجا ثبت ہیں۔ یہ قیامت کے اس عظیم موقع پر آدمی کے اعمال پر ایک اور گواہ ہے اور حقیقت میں یہ کتاب حساب و کتاب کے فرشتوں اور جزا و سزا کے ملائکہ کے لیے امام و رہبر ہے[1]

* * *

۲۔ ہر چیز ثبت ہوتی ہے: ایک گویا اور بیدار کرنے والی حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

ان رسول الله نزل بارض قرعاء فقال لاصحابه: ائتوا بحطب، فقالوا: یارسول الله نحن بارض قرعاء! قال فلیأت کل انسان بما قدر علیه، فجاءوا به حتی رموا بین یدیه، بعضه علیٰ بعض، فقال رسول الله (ص) هکذا تجمع الذنوب ثم قال ایاکم والمحقرات من الذنوب، فان لکل شیء طالبًا الاوان طالبها یکتب ما قدموا و اٰثارهم و کل شیء احصیناه فی امام مبین۔

رسول خداؐ ایک بے آب و گیاہ علاقے میں پہنچے تو آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: لکڑیاں اور ایندھن اکٹھا کر کے لاؤ۔

انہوں نے عرض کیا: اے خدا کے رسولؐ! یہ خشک سرزمین ہے کہ جس میں، کوئی لکڑی اور ایندھن نہیں ہے۔

آپؐ نے فرمایا: تم جاؤ اور تم میں سے جس سے جتنا ہو سکتا ہے جمع کرے۔

ان میں سے ہر ایک تھوڑا سا ایندھن اور خشک لکڑی لے آیا اور اسے پیغمبر خداؐ کے سامنے ایک دوسرے پر ڈال دیا (اسے آگ لگائی گئی تو اس سے بڑے بڑے شعلے

---

[1] "لوح محفوظ" کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۰ میں سورہ رعد کی آیہ ۳۹ کے ذیل میں اور اسی طرح جلد ۵ میں سورۂ انعام کی آیہ ۵۹ کے ذیل میں بحث کی ہے۔

Marfat.com

بھڑکنے لگے)۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: اس طرح سے (چھوٹے چھوٹے) گناہ ایک دوسرے میں جمع ہوتے جاتے ہیں (اور تم ان کو فرداً فرداً ایک سمجھ کر اہمیت نہیں دیتے)۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: چھوٹے چھوٹے گناہوں سے ڈرو کیونکہ ہر چیز کا ایک حساب کنندہ ہے اور جو کچھ تم نے آگے بھیجا ہے اور جو کچھ اس کے آثار باقی رہ گئے ہیں اس کا حساب کنندہ اُسے لکھتا ہے اور اس نے ہر چیز کو کتاب مبین میں ثبت کیا ہے[1]

یہ ہلا دینے والی حدیث اس امر کی منہ بولتی تصویر ہے کہ جب چھوٹے چھوٹے گناہ جمع ہوتے ہیں تو ان کا مجموعہ ایک بہت بڑی آگ کا سامان بن جاتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ قبیلہ "بنو سلمہ" مدینہ سے کچھ فاصلے پر رہتا تھا۔ انہوں نے مسجد نبوی کے قریب نقل مکانی کرنے کا ارادہ کیا تو زیر بحث آیت نازل ہوئی (انا نحن نحی الموتٰی ......) تو پیغمبر اکرمؐ نے ان سے فرمایا: "ان اٰثارکم تکتب" تمہارے آثار (مسجد کی طرف آنے کے لیے تمہارے قدم) تمہارے نامۂ اعمال میں لکھے جائیں گے (اور ان کا اجر و ثواب تمہیں ملے گا) جب بنی سلمہ نے یہ سنا تو انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اپنی اسی جگہ پر رہ گئے[2]

واضح رہے کہ یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور ان امور میں سے ہر ایک اس کا ایک مصداق ہے۔

وہ چیز کہ جو ممکن ہے ابتدائی نظر میں اوپر والی تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ متصور نہ ہو، اہل بیتؑ سے مروی وہ روایات ہیں کہ جن میں "امام مبین" سے امیرالمؤمنین مراد لیے گئے ہیں۔

ان میں سے ایک حدیث امام باقرؑ سے مروی ہے۔ آپؑ نے اپنے والد گرامی سے اور انہوں نے اپنے دادا سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جس وقت یہ آیہ: "وکل شیء احصیناہ فی امام مبین" نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر و عمر کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! کیا اس سے مراد تورات ہے؟ فرمایا نہیں! عرض کیا: انجیل ہے؟ فرمایا نہیں! عرض کیا: قرآن ہے؟ فرمایا نہیں اسی حالت میں امیرالمؤمنین علیؑ رسول اللہؐ کی طرف آئے جس وقت آپؐ کی نگاہ ان پر پڑی تو فرمایا:

ھو ھذا! انہ الامام الذی احصی اللہ تبارک و تعالٰی فیہ علم کل شیء۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۷۸۔

[2] تفسیر قرطبی میں یہ حدیث ابوسعید خدری سے صحیح ترمذی سے نقل ہوئی ہے اور اس کے مشابہ حدیث صحیح مسلم میں جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے بھی منقول ہے، دوسرے مفسرین مثلاً آلوسی فخر رازی طبرسی اور علامہ طباطبائی نے بھی اسے کچھ فرق کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

Marfat.com

"امام مبین یہ شخص ہے یہی ہے وہ امام کہ جس میں خداوند تعالٰے نے ہر چیز کے علم کا احصار کر دیا ہے"[1]

تفسیر علی بن ابراہیم میں ابن عباس کے واسطہ سے خود امیرالمومنین سے بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

انا واللّٰه الامام المبين ابين الحق من الباطل ورثته من رسول اللّٰه

"خدا کی قسم! میں وہ امام مبین ہوں کہ جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے۔ یہ علم میں نے رسول اللہؐ سے ورثہ میں حاصل کیا ہے اور اُن سے سیکھا ہے"[2]

اگرچہ بعض مفسرین ۔ جیسے آلوسی ۔ نے شیعہ حوالوں سے ایسی روایات نقل کرنے سے خوف کھایا ہے اور اسے تفسیر آیہ سے بے خبری اور نادانی کی طرف منسوب کیا ہے لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس قسم کی روایات "امام مبین" کی "لوح محفوظ" کے ساتھ تفسیر کے منافی نہیں ہیں کیونکہ پیغمبرؐ کا پاک دل پہلے درجہ میں اور ان کے جانشین کا دل دوسرے درجہ میں ایسے آیئنے ہیں کہ جو لوح محفوظ کو منعکس کرتے ہیں اور ان علوم کا ایک عظیم حصّہ کہ جو "لوح محفوظ" میں ہے خدا کی طرف سے ان کی طرف الہام ہوتا ہے۔ اس طرح سے وہ "لوح محفوظ" کا ایک نمونہ ہیں۔ اس بنا پر "امام مبین" کا اطلاق اس مطلب پر کوئی عجیب بات نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ایسی شاخ ہے کہ جو اسی جڑ کی طرف لوٹتی ہے۔

اس سے قطع نظر جیسا کہ ہم جانتے ہیں انسان کامل کا وجود ایک "عالم صغیر" ہے کہ جس میں عالم کبیر سمایا ہوا ہے اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کی طرف یہ شعر منسوب ہے:

اتزعم انک جرم صغیر؟ وفیک انطوى العالم الاکبر!

"کیا تُو یہ گمان کرتا ہے کہ تُو ایک چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ عالم کبیر تجھ میں سمو دیا گیا ہے"۔

نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عالم ہستی ایک لحاظ سے علم خدا اور لوح محفوظ کا ایک صفحہ ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ آلوسی نے باوجودیکہ مذکورہ روایات کا شدت سے انکار کیا ہے تاہم آخری تفسیر کو چنداں بعید نہیں سمجھا۔

بہرحال اس بات میں کہ "امام مبین" سے مراد "لوح محفوظ" ہی ہے کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ مذکورہ روایات بھی اس پر قابلِ تطبیق ہیں۔ (غور کیجئے گا)۔

[1] "معانی الاخبار صدوق" باب معنی الامام المبین ص۹۵۔

[2] نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۷۹۔

Marfat.com

(۱۳) وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ
جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝
(۱۴) اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ
فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ۝
(۱۵) قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ
شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ۝
(۱۶) قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۝
(۱۷) وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝
(۱۸) قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ
وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝
(۱۹) قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ
قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝

ترجمہ

(۱۳) اُن سے بستی والوں کی مثال بیان کیجئے کہ جس وقت خدا کے رسول
ان کی طرف آئے۔

(۱۴) جبکہ ہم نے دو رسول ان کی طرف بھیجے لیکن انہوں نے (ہمارے) رسولوں
کی تکذیب کی۔ اس لیے ہم نے ان دونوں کی تقویت کے لیے تیسرے کو بھیجا

Marfat.com

اُن سب نے کہا کہ ہم تمہاری طرف (خدا کے) بھیجے ہوئے ہیں ۔

(۱۵) لیکن انہوں نے (جواب میں کہا) کہ تم تو ہم جیسے بشر کے سوا اور کچھ نہیں ہو اور خداوند رحمٰن نے کوئی چیز نازل نہیں کی ہے تم صرف جھوٹ بولتے ہو ۔

(۱۶) انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار آگاہ ہے کہ ہم یقینی طور پر تمہاری طرف اس کے بھیجے ہوئے ہیں ۔

(۱۷) اور ہمارے ذمہ تو واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔

(۱۸) انہوں نے کہا کہ ہم تو تمہیں اپنے لیے فالِ بد سمجھتے ہیں (اور تمہارا وجود منحوس ہے) اور اگر تم ان باتوں سے دستبردار نہ ہوگے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک سزا ملے گی ۔

(۱۹) انہوں نے کہا کہ تمہاری نحوست تو خود تمہاری ہی طرف سے ہے، اگر تم اچھی طرح سے غور کرو، بلکہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو ۔

تفسیر

بستی والوں کی سرگزشت ایک عبرت ہے

قبل ازیں قرآن، پیغمبر اسلامؐ کی نبوت، سچے مومنین اور ہٹ دھرم منکرین کے بارے میں بحث گزری ہے۔ زیر بحث آیات میں اس ضمن میں گزشتہ امتوں کی کیفیت کا ایک نمونہ بیان ہو رہا ہے۔ ان آیات اور بعد والی چند آیات کے ضمن میں کہ جو مجموعی طور پر ۱۸ آیات بنتی ہیں، چند گزشتہ پیغمبروں کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ یہ انبیاء ایک مشرک اور بت پرست قوم کی ہدایت کے لیے مامور ہوئے تھے۔ قرآن نے انہیں "اصحاب القریۃ" کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ لوگ مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے اور انجام کار عذاب میں گرفتار ہوئے ۔ یہ سرگزشت اس لیے بیان کی گئی ہے تاکہ مشرکین مکہ کے لیے تنبیہ ہو اور پیغمبر اکرمؐ اور اس وقت کے تھوڑے سے مومنین کے لیے تسلی کا باعث ہو۔

Marfat.com

بہر حال اس سورہ کے قلب میں کہ جو خود قرآن کا دل ہے اس سرگزشت کا ذکر اس زمانے کے مسلمانوں سے اس کی کامل شباہت کی بنا پر ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "تم ان سے بستی والوں کی مثال بیان کرو کہ جس وقت خدا کے رسول ان کی طرف آئے" (واضرب لھم مثلاً اصحاب القریة اذ جاءھا المرسلون)[1]

"قریة" اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں کہ جہاں لوگ جمع ہوں اور کبھی خود انسانوں کو بھی "قریة" کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جو شہروں کے لیے بھی ہے اور دیہات کے لیے بھی اگرچہ فارسی زبان میں عام طور پر صرف دیہات کے لیے بولا جاتا ہے لیکن عربی زبان میں اور قرآن مجید میں بارہا اہم شہروں اور علاقوں مثلاً مصر اور مکہ وغیرہ پر اطلاق ہوا ہے۔

اس بارے میں کہ شہروں میں سے یہ کونسا شہر تھا، چنانچہ مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ وہ شامات کے شہروں میں سے "انطاکیہ" تھا اور یہ قدیم روم کے مشہور شہروں میں سے تھا اور اب بھی جغرافیائی لحاظ سے ترکی کا حصہ ہے۔ اس کے بارے میں مزید تفصیل ہم نکات میں بیان کریں گے۔

بہر حال اس سورہ کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شہر کے رہنے والے بت پرست تھے اور یہ رسول انہیں توحید کی دعوت دینے اور شرک کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے ان کے پاس آئے تھے۔

٭ ٭ ٭

قرآن اس اجمالی بیان کے بعد ان کے قصے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ وقت کہ جب ہم نے دو رسولوں کو اُن کی طرف بھیجا لیکن انہوں نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی، لہٰذا ہم نے ان دو کی تقویت کے لیے تیسرا رسول بھیجا، ان تینوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف خدا کے بھیجے ہوئے ہیں" (اذ ارسلنا الیھم اثنین فکذبوھما فعززنا بثالث فقالوا انّا الیکم مرسلون)[2]

اس طرح پروردگار کے تین رسول اس گمراہ قوم کی طرف آئے (دو پہلے آئے اور ایک بعد ازاں ان کی تقویت کے لیے)۔

اس بارے میں کہ یہ رسول کون تھے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان دو

---

[1] بعض کا نظریہ ہے کہ "اصحاب القریة" "اضرب" کا پہلا مفعول ہے اور "مثلاً" اس کا دوسرا مفعول ہے کہ جو پہلے مفعول پر مقدم ہوا ہے اور بعض نے اسے "مثلاً" کا بدل مراد لیا ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

[2] بعض مفسرین نے لفظ "اذ" کو یہاں "اصحاب القریة" کا بدل مراد لیا ہے اور بعض — اسے فعل محذوف یعنی "اذکر" سے متعلق سمجھتے ہیں۔

Marfat.com

کے نام "شمعون" اور "یوحنا" تھے اور تیسرے کا نام "یولس" تھا اور بعض نے ان کے دوسرے نام ذکر کیے ہیں۔

اس بارے میں بھی مفسرین میں اختلاف ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر اور رسول تھے یا حضرت مسیحؑ کے بھیجے ہوئے اور ان کے نمائندے تھے (اور اگر خدا یہ فرماتا ہے کہ ہم نے انہیں بھیجا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیح کے بھیجے ہوئے بھی خدا ہی کے رسول ہیں)۔ زیر بحث آیات کا ظاہر پہلی تفسیر کے موافق ہے اگرچہ اُس نتیجہ میں کہ جو قرآن لینا چاہتا ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

٭ ٭ ٭

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس گمراہ قوم نے ان رسولوں کی دعوت پر کیا ردِعمل ظاہر کیا؟ قرآن کہتا ہے:
انہوں نے بھی وہی بہانہ کیا کہ جو بہت سے سرکش کافروں نے گزشتہ خدائی پیغمبروں کے جواب میں کیا تھا:
"انہوں نے کہا، تم تو ہم ہی جیسے بشر ہو اور خدائے رحمٰن نے کوئی چیز نازل نہیں کی ہے۔ تمہارے پاس جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہے" (قالوا ما انتم الا بشر مثلنا وما انزل الرحمٰن من شیء ان انتم الا تکذبون)۔

اگر خدا کی طرف سے کوئی بھیجا ہوا ہی آنا تھا تو کوئی مقرب فرشتہ ہونا چاہیئے تھا، نہ کہ ہم جیسا انسان اور اسی امر کو انہوں نے رسولوں کی تکذیب اور فرمانِ الٰہی کے نزول کے انکار کی دلیل خیال کیا۔
حالانکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ پوری تاریخ میں سب رسول نسلِ آدمؑ ہی سے ہوئے ہیں ان میں حضرت ابراہیمؑ بھی تھے کہ جن کی رسالت سب مانتے تھے۔ یقیناً وہ انسان ہی تھے۔ اس سے قطع نظر کیا انسانوں کی ضروریات، مشکلات اور تکلیفیں انسان کے علاوہ کوئی اور سمجھ سکتا ہے [۱]
آیت میں خدا کی صفتِ رحمانیت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ ممکن ہے کہ یہ اس لحاظ سے ہو کہ خدا ان کی بات کو نقل کرتے ہوئے خصوصیت سے اس صفت کا ذکر کرتا ہے تاکہ ان کا جواب خود ان کی بات ہی سے حل ہو جائے۔ کیونکہ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ وہ خدا کہ جس کی رحمتِ عامہ نے سارے عالم کو گھیر رکھا ہے وہ انسانوں کی تربیت اور رشد و تکامل کی طرف دعوت دینے کے لیے پیغمبر نہ بھیجے؟
یہ احتمال بھی ہے کہ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ وصفِ رحمٰن کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ خداوند مہربان اپنے بندوں کا کام پیغمبروں کے بھیجنے اور مشکل ذمہ داریاں عائد کرنے سے نہیں کرتا وہ تو آزاد رکھتا ہے۔ یہ کمزور اور بے بنیاد منطق اس گروہ کے انکار کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔

---

[۱] پیغمبروں اور امتوں کے ہم نوع ہونے کے فلسفہ کے بارے میں ہم جلد ۱۲ صفحہ ۲۶ (سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۹۴ کے ذیل میں) تفصیل سے بحث کر چکے ہیں (اردو ترجمہ دیکھیے)۔

Marfat.com

بہر حال یہ پیغمبر اس گمراہ قوم کی شدید اور سخت مخالفت کے باوجود مایوس نہ ہوئے اور انہوں نے کمزوری نہ دکھائی اور ان کے جواب میں کہا: ہمارا پروردگار جانتا ہے کہ یقیناً ہم تمہاری طرف اس کے بھیجے ہوئے ہیں" (قالوا ربنا یعلم انّا الیکم لمرسلون)۔

"اور ہمارے ذمہ تو واضح اور آشکار طور پر ابلاغ رسالت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے" (وما علینا الّا البلاغ المبین)۔

مسلّمہ طور پر انہوں نے صرف دعویٰ ہی نہیں کیا اور قسم پر ہی قناعت نہیں کی، بلکہ "بلاغ مبین" کی تعبیر سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے دلائل و معجزات بھی پیش کیے تھے ورنہ ان کا ابلاغ "بلاغ مبین" کا مصداق نہ ہوتا کیونکہ "بلاغ مبین" تو اس طرح ہونا چاہیئے کہ حقیقت سب تک پہنچ جائے اور یہ بات یقینی اور محکم دلائل اور واضح معجزات کے سوا ممکن نہیں ہے۔

بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کی طرح بعض ناقابلِ علاج بیماروں کو حکم خدا سے، شفا بخشی۔

لیکن یہ دل کے اندھے واضح منطق اور معجزات کے سامنے نہ صرف جھکے نہیں بلکہ انہوں نے اپنی خشونت اور سختی میں اضافہ کر دیا اور تکذیب کے مرحلے سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے تہدید اور شدتِ عمل کے مرحلے میں داخل ہو گئے "انہوں نے کہا: ہم تو تمہیں فالِ بد سمجھتے ہیں تمہارا وجود منحوس ہے اور تم ہمارے شہر کے لیے بدبختی کا سبب ہو" (قالوا انّا تطیرنا بکم)[1]

ممکن ہے کہ ان انبیاء الٰہی کے آنے کے ساتھ ہی اس شہر کے لوگوں کی زندگی میں ان کے گناہوں کے زیر اثر یا خدائی تنبیہ کے طور پر بعض مشکلات پیش آئی ہوں۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے نقل بھی کیا ہے کہ ایک مدت تک بارش کا نزول منقطع رہا[2] لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ کوئی عبرت حاصل نہیں کی بلکہ اس امر کو پیغمبروں کی دعوت کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

پھر اس پر بس نہیں کی بلکہ کھلی دھمکیوں کے ساتھ اپنی قبیح نیتوں کو ظاہر کیا اور کہا، "اگر تم ان باتوں سے دستبردار نہ ہوئے تو ہم یقینی طور پر تمہیں سنگسار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک سزا ملے گی" (لئن لم تنتھوا لنرجمنکم ولیمسنکم منّا عذاب الیم)۔

کیا دردناک سزا (عذاب الیم) سنگسار کرنے کے بارے میں تاکید ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور

---

[1] "تطیّر" کے بارے میں اور فال بد لینے اور اس لفظ کے بنیادی مفہوم کے متعلق ہم نے جلد ششم میں سورہ اعراف کی آیہ ۱۳۱ کے ذیل میں اور جلد ۱۵ میں سورہ نمل کی آیہ ۴۷ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

[2] تفسیر قرطبی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

سزا ہے؟ یہ دو احتمال ہیں۔

دوسرا احتمال ہمیں زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔ کیونکہ سنگسار کرنا سزا کی بد ترین قسم ہے جو کبھی کبھی موت پر بھی منتج ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ "عذاب الیم" کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہم تمہیں یہاں تک سنگسار کریں گے کہ وہ تمہاری موت کا سبب بن جائے یا یہ کہ سنگسار کرنے کے علاوہ دوسری قسم کی سختیاں ہوں کہ جو گزشتہ زمانے کے ظالم لوگ کیا کرتے تھے۔ مثلاً سلائیاں گرم کرکے آنکھوں میں داخل کرنا یا پگھلی ہوئی دھات حلق میں ڈالنا اور اسی قسم کے دوسرے عذاب بھی ہم تمہیں دیں گے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ سنگسار کرنا تو جسمانی عذاب تھا لیکن "عذاب الیم" روحانی عذاب تھا۔[1]

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ہاں! باطل کے طرفدار اور ظلم و فساد کے حامی چونکہ کوئی منطق پیش کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے لہٰذا ہمیشہ دھمکیوں، دباؤ اور تشدد کا سہارا لیتے ہیں، وہ اس بات سے غافل ہیں کہ راہِ خدا کے راہرو اس قسم کی دھمکیوں کے آگے نہیں جھکتے بلکہ اُن کی استقامت میں اور اضافہ ہوتا ہے جس دن انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا ہے اسی روز اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ایثار و قربانی کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں۔

☸ ☸ ☸

یہ وہ مقام تھا کہ خدا کے پیغمبر اپنی منہ بولتی منطق کے ساتھ ان کی فضول ہذیانی باتوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہو گئے اور "انہوں نے کہا: تمہاری بدبختی اور نحوست خود تمہاری ہی طرف سے ہے اور اگر تم ٹھیک طرح سے غور کرو تو اس حقیقت سے واقف ہو جاؤ گے" (قالوا طائرکم معکم ائن ذکرتم)۔

اگر بدبختی اور منحوس حوادث تمہارے معاشرے کو گھیرے ہوئے ہیں اور برکاتِ الٰہیہ تمہارے درمیان میں سے اُٹھ گئی ہیں تو اس کا عامل اپنے اندر اپنے پست افکار اور قبیح اعمال میں تلاش کرو نہ کہ ہماری دعوت میں۔ یہ تمہیں تو ہو کہ جنہوں نے بُت پرستی، خود غرضی، ظلم اور شہوت پرستی سے اپنی زندگی کی فضا کو تیرہ و تاریک بنا ڈالا ہے اور خدا کی برکات کو اپنے آپ سے منقطع کر کے رکھ دیا ہے۔

بعض مفسرین نے "ائن ذکرتم" کو ایک مستقل مطلب کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر خدا کے نبی آئیں اور تمہیں نصیحت کریں اور ڈرائیں تو کیا اس کی جزا یہ ہے کہ تم انہیں عذاب اور سزا کی دھمکیاں دو اور ان کے وجود کو منحوس خیال کرو؟ وہ تو تمہارے لیے نور و

---

[1] اور یہ اس صورت میں ہے کہ "لنرجمنکم" "رجم" کے مادہ سے گالیاں دینے، ناسزا کہنے اور تہمت لگانے کے معنی میں ہو۔

Marfat.com

ہدایت اور خیر و برکت کا تحفہ لائے ہیں تو کیا اس خدمت کا جواب وہ دھمکیاں اور بد کلامیاں ہیں جو رات دن تم انہیں دیتے رہتے ہو۔[1]

آخر کار پروردگار کے ان بھیجے ہوئے افراد کی آخری گفتگو ان سے یہ تھی کہ "تم حد سے بڑھے ہوئے اور تجاوز کرنے والے لوگ ہو" (بل انتم قوم مسرفون)۔

تمہاری اصلی بیماری وہی تمہارا حد سے تجاوز ہے اگر تم توحید کا انکار کرتے ہوئے شرک کی طرف رُخ کرتے ہو تو اس کی وجہ حق سے تجاوز ہے اور اگر تمہارا معاشرہ بُرے انجام میں گرفتار ہوا ہے تو اس کا سبب بھی گناہ میں زیادتی اور شہوات میں آلودگی ہے خلاصہ یہ کہ اگر خیر خواہوں کی خیر خواہی کے جواب میں تم انہیں موت کی دھمکی دیتے ہو تو یہ بھی تمہارے تجاوز کی بنا پر ہے۔

ہم ان رسولوں کے تاریخی واقعہ اور ان حوادث کے وقوع کے مقام کے بارے میں اس داستان کی باقی ماندہ آیات کی تفسیر کے بعد تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

* * *

---

[1] بہرحال جملہ شرطیہ کی جزا محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: ا ئِن ذکرتم قابلتمونا بھذہ الامور- یا- ائن ذکرتم علمتم صدق ما قلنا۔

Marfat.com

(٢٠) وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ
اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۙ

(٢١) اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○

(٢٢) وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

(٢٣) ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا
تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ۚ

(٢٤) اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

(٢٥) اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ۭ

(٢٦) قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۙ

(٢٧) بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ○

(٢٨) وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ
وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ○

(٢٩) اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ○

(٣٠) يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا
بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○

ترجمہ

(٢٠) ایک (باایمان) مرد شہر کے دور دراز مقام سے دوڑتا ہوا آیا (اور) اُس

Marfat.com

نے کہا : اے میری قوم ! رسولانِ خدا کی پیروی کرلو ۔

(۲۱) ایسے لوگوں کی پیروی کرلو کہ جو تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے اور وہ خود ہدایت یافتہ ہیں ۔

(۲۲) مَیں کیوں اس ہستی کی پرستش نہ کروں کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے ۔

(۲۳) کیا مَیں اسے چھوڑ کر دوسرے معبود اپنا لوں جبکہ خدائے رحمٰن چاہے کہ مجھے نقصان پہنچے تو اُن کی شفاعت میرے لیے کچھ بھی فائدہ مند نہ ہو اور نہ ہی وہ مجھے (اس کے عذاب سے) نجات دلاسکیں ۔

(۲۴) اگر مَیں ایسا کردوں تو پھر تو مَیں کھلی گمراہی میں ہوں گا ۔

(۲۵) (اسی بنا پر) میں تمہارے رب پر ایمان لایا ہوں ، میری باتیں کان لگا کر سنو ۔

(۲۶) (آخرکار انہوں نے اُسے شہید کردیا) اس سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہوجا تو اس نے کہا کہ اے کاش میری قوم کو علم ہوتا ۔

(۲۷) کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا ہے اور مکرم و محترم لوگوں میں سے قرار دیا ہے ۔

(۲۸) ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر کوئی لشکر آسمان سے نہیں بھیجا اور نہ ہی ہماری یہ سنت تھی ۔

(۲۹) صرف ایک آسمانی للکار تھی ، پس اچانک سب خاموش ہوگئے ۔

Marfat.com

(۳۰) افسوس ہے ان بندوں پر کہ جن کی ہدایت کے لیے جو بھی پیغمبر آیا وہ اس کا مذاق اُڑاتے رہے۔

تفسیر

ایک جان بکف مجاہد

زیرِ بحث آیات میں ان رسولوں کی جد و جہد کا ایک اور حصّہ بیان کیا گیا ہے۔ اس حصے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے تھوڑے سے مومنین نے بڑی شجاعت سے ان انبیاء کی حمایت کی اور وہ کافر و مشرک اور ہٹ دھرم اکثریت کے مقابلے میں کھڑے ہوئے اور جب تک جان باقی رہی انبیاء الٰہی کا ساتھ دیتے رہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "ایک (باایمان) مرد شہر کے دور دراز مقام سے بڑی تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا کافر گروہ کے پاس آیا اور کہا: اے میری قوم! مرسلینِ خدا کی پیروی کرو" (وجاء من اقصا المدینة رجل یسعٰی قال یاقوم اتبعوا المرسلین)۔

اس شخص کا نام اکثر مفسرین نے "حبیب نجار" بیان کیا ہے۔ وہ ایسا شخص تھا کہ جو پروردگار کے پیغمبروں کی پہلی ہی ملاقات میں ان کی دعوت کی حقانیت اور ان کی تعلیمات کی گہرائی کو پا گیا تھا وہ ایک ثابت قدم اور مصمم کار مومن ثابت ہوا۔ جس وقت اُسے خبر ملی کہ وسطِ شہر میں لوگ ان انبیاء الٰہی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور شاید انہیں شہید کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس نے خاموش رہنے کو جائز نہ سمجھا، چنانچہ "یسعٰی" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی تیزی اور جلدی کے ساتھ مرکزِ شہر تک پہنچا اور جو کچھ اس کے بس میں تھا حق کی حمایت اور دفاع میں فرو گزاشت نہ کی۔

"رجل" کی تعبیر ناشناختہ شکل میں شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک عام آدمی تھا، کوئی قدرت و شوکت نہیں رکھتا تھا اور اپنی راہ میں یکہ و تنہا تھا لیکن اس کے باوجود ایمان کے نور و حرارت نے اس کا دل اس طرح سے روشن اور مستعد کر رکھا تھا کہ راہِ توحید کے مخالفین کی سخت مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میدان میں کود پڑا۔ اس کا واقعہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ آغازِ اسلام میں مومنین کہ جو بہت تھوڑی سی تعداد میں تھے اسے اپنے لیے نمونۂ عمل سمجھیں اور جان لیں کہ تنہا ایک مومن بھی پوری طرح ذمہ دار ہوتا ہے اور اس کے لیے خاموش رہنا جائز نہیں ہے۔

"اقصی المدینة" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ان رسولوں کی دعوت شہر کے دور دراز کے مقامات تک پہنچ گئی تھی اور آمادہ دلوں میں اثر کر چکی تھی۔ اس سے قطع نظر کہ شہر کے دور دراز

Marfat.com

کے علاقے ہمیشہ ایسے مستضعفین کے مرکز ہوتے ہیں کہ جو حق کو قبول کرنے کے لیے زیادہ آمادہ و تیار ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس شہروں میں نسبتاً خوشحال لوگ زندگی بسر کرتے ہیں جن کو حق کی طرف راغب کرنا آسانی کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔

" یا قوم "، (اے میری قوم) کی تعبیر اس شخص کی اہل شہر کے بارے میں ہمدردی کو بیان کرتی ہے اور رسولوں کی پیروی کی دعوت ایک مخلصانہ دعوت ہے جس میں اس کی ذات کے لیے کوئی فائدہ اور نفع نہیں ہے۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ یہ مومن مجاہد اپنے شہر والوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کس منطق اور دلیل کو اختیار کرتا ہے۔

اس نے پہلے یہ دلیل اختیار کی کہ: " ایسے لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے اپنی دعوت کے بدلے میں کوئی اجر طلب نہیں کرتے" (اتبعوا من لا یسئلکم اجرًا)۔

یہ ان کی صداقت کی پہلی نشانی ہے کہ ان کی دعوت میں کسی قسم کی مادی منفعت نہیں ہے۔ وہ تم سے کوئی مال چاہتے ہیں اور نہ ہی جاہ و مقام، یہاں تک کہ وہ تو تشکر و سپاس گزاری بھی نہیں چاہتے اور نہ ہی کوئی اور صلہ۔

عظیم انبیاء کے خلوص، بے غرضی اور اُن کی صفائے قلب کی نشانی کے طور پر بارہا آیات قرآنی میں اس بات کا ذکر آیا ہے۔ صرف سورۂ شعراء میں پانچ مرتبہ " وما اسئلکم علیه من اجر" کی تکرار ہے[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: (علاوہ ازیں) یہ رسول جیسا ان کی دعوت کے مطالب اور ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے " کہ وہ ہدایت یافتہ افراد ہیں" (وھم مھتدون)۔

یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ کسی کی دعوت کو قبول نہ کرنا یا تو اس بناء پر ہوتا ہے کہ اس کی دعوت حق نہیں ہے اور وہ بے راہ روی اور گمراہی کی طرف کھینچ رہا ہے یا یہ کہ ہے تو حق لیکن اس کو پیش کرنے والے اس کے ذریعے کوئی خاص مفاد حاصل کر رہے ہیں کیونکہ یہ بات خود اس قسم کی دعوت کے بارے میں بدگمانی کا ایک سبب ہے لیکن جب نہ وہ بات ہو اور نہ یہ، تو پھر تامل و تردد کے کیا معنی؟

⁂ ⁂ ⁂

اس کے بعد قرآن ایک اور دلیل پیش کرتا ہے اور اصل توحید کے بارے میں بات کرتا ہے کیونکہ یہی انبیاء کی دعوت کا اہم ترین نکتہ ہے۔ کہتا ہے: " میں اس ہستی کی پرستش کیوں نہ کروں کہ جس نے مجھے پیدا

---

[1] سورہ شعراء آیہ ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴ و ۱۸۰۔

Marfat.com

کیا ہے" (وما لی لا اعبد الذی فطرنی) [1]

وہ ہستی پرستش کے لائق ہے کہ جو خالق و مالک ہے اور نعمات بخشنے والی ہے، نہ کہ یہ بُت کہ جن سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ فطرت سلیم کہتی ہے کہ خالق کی عبادت کرنا چاہیئے نہ کہ اس بے قدر و قیمت مخلوق کی۔ "فطرنی" (جس نے مجھے پیدا کیا ہے) ممکن ہے اس نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو کہ میں جس وقت اپنی فطرت اصلی اور سرشت حقیقی پر غور کرتا ہوں تو اچھی طرح سے محسوس کرتا ہوں کہ میرے اندر سے ایک ایسی رَسا آواز بلند ہوتی ہے کہ جو مجھے میرے خالق کی پرستش کی طرف دعوت دے رہی ہے۔ وہ دعوت کہ جو عقل و خرد کے ساتھ ہم آہنگ ہے، مَیں "فطرت" اور "عقل و خرد" کی اس دُہری دعوت کو کس طرح اہمیت نہ دوں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ شخص یہ نہیں کہتا کہ "مالکم لا تعبدون الذی فطرکم" (تم اس خدا کی عبادت کیوں نہیں کرتے کہ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے) بلکہ کہتا ہے کہ "مَیں کیوں اس طرح نہ کروں" یعنی خود اپنے آپ سے شروع کرتا ہے تاکہ بات زیادہ مؤثر ہو۔

اس کے بعد خبردار کرتا ہے کہ یاد رکھو "تم سب کے سب آخر کار اکیلے ہی اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے" (والیہ ترجعون)۔

یعنی نہ صرف تمہارا اس جہان کی زندگی میں اس کے ساتھ تعلق ہے بلکہ دوسرے جہان میں بھی تمہاری ساری سرنوشت اسی کے دستِ قدرت میں ہو گی، ہاں! اسی کی طرف رُخ کرو کہ دونوں جہانوں میں تمہاری سرنوشت جس کے اختیار میں ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

اپنے تیسرے استدلال میں بُتوں کی کیفیت بیان کرتا ہے اور خدا کے لیے عبودیت کے اثبات کو، بتوں کی عبودیت کی نفی کے ذریعے تکمیل کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا مَیں خدا کے سوا اور معبود اپنالوں جبکہ خدائے رحمٰن مجھے کچھ نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے معمولی سا فائدہ بھی نہ دے گی اور وہ مجھے اس کے عذاب سے نہ بچا سکیں گے" (ءاتخذ من دونہ اٰلھۃ ان یردن الرحمٰن بضر لا تغن عنی شفاعتھم شیئًا ولا ینقذون)۔

اس مقام پر پھر اپنے بارے میں بات کرتا ہے تاکہ تحکم اور آمریت کا لہجہ نہ ہو اور دوسرے اپنا حساب

---

[1] "وما لی لا اعبد ...." میں کچھ محذوف ہے اور وہ تقدیر میں اس طرح تھا:

ای شی لی اذا لم اعبد خالقی (مجمع البیان)۔

بعض مفسرین نے "مالی" کو "لم" "کیوں" کے معنی میں لیا ہے۔ (تبیان زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

Marfat.com

خود کریں ۔

وہ دراصل بُت پرستوں کے بہانے کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم تو ان کی اس بنا پر پرستش کرتے ہیں کہ وہ بارگاہِ خدا میں ہمارے شفیع ہوں. کہتا ہے : کونسی شفاعت اور کونسی مدد و نجات ؟ وہ تو خود تمہاری مدد کے محتاج ہیں، حوادث کی تنگنائے میں وہ تمہارا کیا کام دے سکتے ہیں ۔

"الرحمٰن" کی تعبیر یہاں پر خدا کی رحمت کی وسعت اور تمام نعمتوں کی اسی کی طرف بازگشت ہونے کی جانب اشارہ ہے اور یہ خود توحید عبادت کی دلیل ہے اس کے علاوہ یہ اس نکتہ کو بھی بیان کرتی ہے کہ خدائے رحمٰن کسی کے لیے ضرر اور نقصان نہیں چاہتا مگر یہ کہ انسان کی غلط روش اپنے انتہائی درجہ کو پہنچ جائے جو اس کو خدا کی وسیع رحمت سے دور کرکے اس کے غضب کی وادی میں گرفتار کر دے ۔

اس کے بعد یہ مجاہد مومن مزید تاکید و توضیح کے لیے کہتا ہے: "اگر میں اس قسم کے بتوں کی پرستش کروں اور انہیں پروردگار کا شریک قرار دوں تو میں کھلی گمراہی میں ہوں گا" (انی اذًا لفی ضلال مبین) ۔

اس سے بڑھ کر کھلی گمراہی کیا ہوگی کہ عاقل و باشعور انسان ان بے شعور موجودات کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور انہیں زمین و آسمان کے خالق کے برابر جانے ۔

اس مجاہد مومن نے ان استدلالات اور مؤثر و وسیع تبلیغات کے بعد ایک پُر تاثیر آواز کے ساتھ سارے مجمع کے سامنے اعلان کیا سب لوگ جان لو کہ میں "ان رسولوں کی دعوت پر ایمان لایا ہوں اور میں نے ان رسولوں کی دعوت کو قبول کر لیا ہے" (انی اٰمنت بربکم) ۔

"اس بنا پر میری باتوں کو سنو" اور جان لو کہ میں ان رسولوں کی دعوت پر ایمان رکھتا ہوں اور تم میری بات پر عمل کرو کہ یہی تمہارے فائدہ کی بات ہے (فاسمعون) ۔

اس جملے میں اور اسی طرح "انی اٰمنت بربکم" میں، مخاطب کون ہے ؟ اس بارے میں یہ عرض ہے کہ گزشتہ آیات کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہی مشرکین اور بت پرستوں کا گروہ ہے کہ جو اس شہر میں رہتا تھا، "ربکم" (تمہارا پروردگار) کی تعبیر بھی اس معنی سے تضاد نہیں رکھتی کیونکہ یہ تعبیر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں انہی استدلالات توحید بیان کرتے ہوئے آئی ہے [1]

نیز "فاسمعون" (میری بات پر کان دھرو) بھی اس بات کے ساتھ کہ جو بیان ہوئی کوئی مخالفت نہیں رکھتا کیونکہ وہ یہ لفظ انہیں اپنی گفتگو کی پیروی کرنے کی دعوت کے لیے کہتا ہے۔ جیسا کہ مومن، آل فرعون کی داستان میں آیا ہے ۔ وہ فرعونیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے :

یاقوم اتبعون اھدکم سبیل الرشاد

---

[1] آیہ ۳، ۳۲ یونس - ۳ ہود - ۵۲ ہود، ۲۴ نحل - ۲۹ کہف وغیرہ کی طرف رجوع کریں ۔

Marfat.com

"اے میری قوم! میری پیروی کرو تاکہ میں تمہیں سیدھے راستے کی ہدایت کروں"۔ (مومن - ۳۸)

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس جملے میں وہ رسول مخاطب ہیں کہ جو خدا کی طرف سے اس قوم کو دعوت دینے کے لیے آئے تھے اور "ربکم" کی تعبیر اور "فاسمعون" کو اس پر قرینہ قرار دیا ہے، اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

٭ ٭ ٭

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس پاکباز مومن کے جواب میں اس ہٹ دھرم قوم کا ردِ عمل کیا تھا۔ قرآن نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کہی لیکن بعد والی آیات کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے شہید کر دیا۔

ہاں! اس کی پُرجوش اور ولولہ انگیز گفتگو قوی اور طاقتور استدلالات اور ایسے عمدہ و دلنشین نکات کے ساتھ تھی۔ مگر اس سے نہ صرف یہ کہ ان سیاہ دلوں اور مکر و غرور سے بھرے ہوئے سروں پر کوئی مثبت اثر نہیں ہوا بلکہ کینہ و عداوت کی آگ ان کے دلوں میں ایسی بھڑکی کہ وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور انتہائی سنگدلی اور بے رحمی سے اس شجاع مردِ مومن کی جان کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے اسے پتھر مارنے شروع کیے اور اس کے جسم کو اس طرح سے پتھروں کا نشانہ بنایا کہ وہ زمین پر گر پڑا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اس کے لبوں پر مسلسل یہ بات تھی کہ "خداوندا! میری اس قوم کو ہدایت فرما کہ وہ جانتے نہیں ہیں"۔[1]

ایک اور روایت کے مطابق اسے اس طرح پاؤں کے نیچے روندا کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔[2]

لیکن قرآن اس حقیقت کو ایک عمدہ اور سربستہ جملہ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اُسے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا" (قیل ادخل الجنة)۔

یہ وہی تعبیر ہے کہ جو راہِ خدا کے شہیدوں کے بارے میں قرآن کی دوسری آیات میں بیان ہوئی ہے:

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل الله امواتا بل احیاء عند ربهم یرزقون

"یہ گمان نہ کرو کہ جو لوگ راہِ خدا میں قتل کیے گئے ہیں وہ مُردہ ہیں بلکہ وہ تو زندۂ جاوید ہیں اور اپنے پروردگار سے رزق پاتے ہیں"۔ (آل عمران - ۱۶۹)

جاذبِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ مردِ مومن شہادت پاتے ہی جنت میں داخل ہو گیا۔ ان دونوں کے درمیان اس قدر کم فاصلہ تھا کہ قرآن مجید نے اپنی لطیف تعبیر میں اس

---

[1] تفسیر قرطبی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر مجمع البیان، تبیان، تفسیر ابو الفتوح رازی وغیرہ۔

Marfat.com

کی شہادت کا ذکر کرنے کے بجائے اس کے بہشت میں داخل ہونے کو بیان کیا۔ شہیدوں کی منزل یعنی بہشت سعادت کس قدر نزدیک ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں بہشت سے مراد برزخ والی بہشت ہے کیونکہ قرآنی آیات سے بھی اور روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہشت جاوداں مومنین کو قیامت میں نصیب ہوگی اور دوزخ بھی بدکاروں کے لیے اسی طرح ہے۔

اس بنا پر عالم برزخ میں ایک دوسری جنت و دوزخ ہے کہ جو قیامت کی جنت و دوزخ کا ایک نمونہ ہے جیسا کہ امیرالمومنین علیؑ کی ایک روایت میں قبر کے بارے میں منقول ہوا ہے:

القبر اما روضة من ریاض الجنة او حفرة من حفر النیران۔

"قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔[1]"

بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ جملہ اس خطاب کی طرف اشارہ ہے کہ جو قیامت کے دن اس مجاہد اور ایثار پیشہ مومن سے کیا جائے گا اور یہ مستقبل کا پہلو رکھتا ہے نہ کہ حال کا۔ یہ احتمال ظاہر آیہ کے خلاف ہے۔

بہرحال اس شخص کی پاک روح آسمانوں کی طرف، رحمت الٰہی کے قرب اور بہشت نعیم کی طرف پرواز کر گئی اور وہاں اسے صرف یہ آرزو تھی کہ: "اے کاش میری قوم جان لیتی" (قال یالیت قومی یعلمون)۔

"اے کاش وہ جان لیتے کہ میرے پروردگار نے مجھے اپنی بخشش اور عفو سے نوازا ہے اور مجھے مکرم لوگوں کی صف میں جگہ دی ہے"۔ (بما غفر لی ربی وجعلنی من المکرمین)[2]

اے کاش ان کی آنکھ حق بین ہوتی۔ ایسی آنکھ کہ جس پر مادی دنیا کے ضخیم پردے پڑے ہوئے نہ ہوتے اور جو کچھ اس پردے کے پیچھے ہے اسے دیکھ لیتے۔ یعنی وہ ان سب نعمتوں اور خدا کے اکرام و الطاف کو دیکھ لیتے اور جان لیتے کہ ان کی اہانتوں کے بدلے خدا نے میرے حق میں کیا لطف فرمایا ہے، اے کاش! وہ دیکھتے اور ایمان لے آتے لیکن افسوس!

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر گرامی اسلامؐ نے فرمایا:

انه نصح لهم فی حیاته وبعد موته۔

---

[1] بحار الانوار، جلد ۶ ص ۲۱۸۔

[2] "ما" "بما غفر لی ربی" میں مصدریہ ہے یا موصولہ ہے یا استفہامیہ؟ تین احتمال ذکر کیے گئے ہیں لیکن استفہامیہ والا احتمال بعید نظر آتا ہے۔ دوسرے دو احتمالوں میں سے موصولہ والا احتمال زیادہ ترجیح معلوم ہوتا ہے اگرچہ معنی کے لحاظ سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔

Marfat.com

"اس با ایمان شخص نے اپنی زندگی میں بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور موت کے بعد بھی ان کی ہدایت کی آرزو رکھتا تھا"[۱]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وہ پہلے غفرانِ الٰہی کی نعمت کا ذکر کرتا ہے اور پھر اس کے اکرام کا۔ کیونکہ پہلے انسان کی روح کو گناہوں کی آلودگی سے مغفرت کے پانی کے ساتھ پاک ہونا چاہیئے اور جب پاک ہو جائے تو پھر بساطِ قرب اور اکرام الٰہی کا مقام پاتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ خدا کا اکرام و اعزاز اور بزرگی — بہت سے بندوں کو نصیب ہوتی ہے اور اصولاً "تقویٰ" اور "اکرام" دوش بدوش آگے بڑھتے ہیں جیساکہ فرمایا گیا ہے:

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (حجرات - ۱۳)۔

لیکن "اکرام" بطور کامل اور کسی شرط کے بغیر قرآن مجید میں دو گروہوں کے بارے میں آیا ہے۔

پہلا گروہ خدا کے مقرب فرشتے ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ:

بل عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول وھم بامرہ یعملون

"وہ خدا کے مکرم بندے ہیں کہ جو بات کرنے پر اس پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے فرمان پر کاربند رہتے ہیں۔" (انبیاء - ۲۶-۲۷)

اور دوسرے کامل الایمان بندے کہ جنہیں قرآن نے "مخلصین" کے نام سے یاد کیا ہے اور ان کے بارے میں کہتا ہے:

اولٰئک فی جنات مکرمون

"وہ جنت کے باغوں میں مکرم ہوں گے قدر ہوں گے۔" (معارج - ۳۵)[۲]

٭ ٭ ٭

بہرحال یہ تو اس مرد مومن اور سچے مجاہد کا انجام تھا کہ جس نے اپنی ذمہ داری کی انجام دہی اور خدا کے پیغمبروں کی حمایت میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور آخر کار شربتِ شہادت نوش کیا اور خدا کے جوارِ رحمت میں جگہ پائی۔

لیکن آیئے دیکھیں کہ اس ظالم اور سرکش قوم کا انجام کیا ہوا؟

اگرچہ قرآن میں ان تین پیغمبروں کے انجام کار کے متعلق۔ کوئی بات نہیں کی گئی کہ جو اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔ لیکن بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس قوم نے، اس مرد مومن کو شہید کرنے کے علاوہ اپنے

---

[۱] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۴۶۴۔

[۲] المیزان، جلد ۱۷، ص ۸۲ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

پیغمبروں کو بھی شہید کر دیا جبکہ بعض نے تصریح کی ہے کہ اس مردِ مومن نے لوگوں کو اپنے ساتھ مشغول رکھا تاکہ وہ پیغمبر اس سازش سے بچ جائیں ۔ کہ جو اُن کے خلاف کی گئی تھی ۔ اور کسی پُر امن جگہ منتقل ہو جائیں لیکن اس قوم پر خدا کا دردناک عذاب نازل ہُوا کہ جس کی طرف بعد والی آیات میں ارشاد ہوا ہے۔ یہ امر پہلے قول کی ترجیح کے لیے قرینہ ہے ۔ اگرچہ " من بعدہ " (اس مردِ مومن کی شہادت کے بعد) کی تعبیر نزولِ عذاب کے بارے میں اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ دوسرا قول صحیح ہے ۔ (غور کیجئے گا)

٭ ٭ ٭

ہم نے دیکھا کہ شہر انطاکیہ کے لوگوں نے خدا کے پیغمبروں کی کیسے مخالفت کی ۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہُوا ۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے : "ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر کوئی لشکر آسمان سے نہیں بھیجا اور اصولاً ہمارا یہ طریقہ ہی نہیں ہے کہ ایسی سرکش اقوام کو نابود کرنے کے لیے ان امور سے کام لیں" (وما انزلنا علیٰ قومہ من بعدہ من جند من السماء و ماکنا منزلین) ۔

ہم ان امور کے محتاج نہیں ہیں ۔ صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ جس سے ہم ان سب کو خاموش کر دیں اور انہیں دیارِ عدم کی طرف بھیج دیں اور ان کی زندگی کو درہم برہم کر دیں ۔

صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ ان کے حیات کے عوامل ہی ان کی موت کے عامل میں بدل جائیں اور مختصر سے وقت میں ان کی زندگی کا دفتر لپیٹ کر رکھ دیں ۔

پھر قرآن مزید کہتا ہے : "صرف ایک آسمانی چیخ پیدا ہوئی ، ایسی چیخ کہ جو ہلا دینے والی اور موت کا پیغام تھی اچانک سب پر موت کی خاموشی طاری ہو گئی" (ان کانت الا صیحة واحدة فاذا ھم خامدون) ۔

کیا یہ چیخ بجلی کی کڑک تھی کہ جو بادل سے اٹھی اور زمین پر جا پڑی اور ہر چیز کو لرزہ بر اندام کر دیا اور تمام عمارتوں کو تباہ کر دیا اور وہ سب خوف کی شدت سے موت کی آغوش میں چلے گئے ؟

یا یہ ایسی چیخ تھی کہ جو زمین کے اندر سے ایک شدید زلزلے کی صورت میں اٹھی اور فضا میں دھماکہ ہُوا اور اس دھماکے کی لہر نے انہیں موت کی آغوش میں سلا دیا ۔

ایک چیخ وہ جو کچھ بھی تھی ، لحہ بھر سے زیادہ نہ تھی ۔ وہ ایک ایسی آواز تھی کہ جس نے سب آوازوں کو خاموش کر دیا اور ایسی ہلا دینے والی تھی کہ جس نے تمام حرکتوں کو بے حرکت کر دیا اور خدا کی قدرت ایسی ہی ہے اور ایک گمراہ اور بے ثمر قوم کا انجام یہی ہوتا ہے ۔

بسوزند چوب درختان بی بر سزا خود ہمیں است مر بی بری را

"بے ثمر درختوں کی لکڑی جلانے ہی کے کام آتی ہے کیونکہ بے ثمر چیز کی سزا یہی ہے"

Marfat.com

آخری زیرِ بحث آیت میں بہت ہی جامع اور مؤثر انداز میں تاریخ کے تمام سرکشوں کے دعوت انبیاءؑ سے ٹکراؤ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے : "افسوس ہے ان بندوں پر کہ کوئی ایسا پیغمبر ان کی ہدایت کے لیے نہیں آیا جس کا انہوں نے مذاق نہ اڑایا ہو" (یا حسرة علی العباد ما یأتیھم من رسول الّا کانوا بہ یستھزءون) ۔

وائے ہے ان لوگوں پر کہ جنہوں نے خدا کی رحمت کا دریچہ خود سے بند کر لیا ۔

افسوس ان پر کہ جنہوں نے اپنی ہدایت کے چراغ توڑ ڈالے ۔

ہائے سعادت سے محروم وہ لوگ کہ جو نہ صرف پیغمبروں کی ندا پر کان نہیں دھرتے بلکہ ان کا مذاق اڑانے لگتے ہیں اور پھر انہیں تہ تیغ کر دیتے ہیں حالانکہ گزشتہ بے ایمان سرکشوں کا بُرا انجام دیکھ چکے ہیں اور ان کے دردناک انجام کے بارے میں سُن چکے ہیں یا تاریخ کے صفحات میں پڑھ چکے ہیں لیکن انہوں نے کچھ بھی تو عبرت حاصل نہیں کی اور انہوں نے بھی اسی وادی میں قدم رکھ دیا اور اسی انجام میں گرفتار ہو گئے ۔

واضح رہے کہ یہ جملہ خدا کی گفتار ہے چونکہ یہ تمام آیات اس کی طرف سے بیان ہو رہی ہیں ۔ البتہ "حسرت" کا لفظ ۔ ان واقعات پر کہ جن کے بارے میں انسان سے کچھ ہو نہ سکے اندرونی پریشانی کے معنی میں ہوتا ہے ۔ خدا کے بارے میں یہ لفظ کوئی معنی نہیں رکھتا جیسا کہ "خشم" اور "غضب" اور اس قسم کے دیگر امور بھی اس کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتے ، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان بدبختوں کا حال ایسا تھا کہ جو انسان بھی ان کی کیفیت سے آگاہ ہوتا ، وہ متاسف و متاثر ہوتا کہ وہ نجات کے ان تمام وسائل کے ہوتے ہوئے اس ہولناک گرداب میں کیوں غرق ہو گئے ۔[1]

"عباد" (خدا کے بندے) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تعجب اس چیز پر ہے کہ خدا کے بندے کہ جو اس کی نعمتوں میں مستغرق ہیں اس قسم کا جرم کرتے ہیں ۔

چند اہم نکات

۱۔ انطاکیہ کے رسولوں کی داستان : انطاکیہ ، شام کے علاقہ کا ایک قدیم شہر ہے بعض کے قول کے مطابق یہ شہر مسیح علیہ السلام سے تین سو سال پہلے تعمیر ہوا ۔ یہ شہر قدیم زمانے میں دولت و ثروت اور علم و تجارت کے لحاظ سے مملکتِ روم کے تین بڑے شہروں میں سے ایک شمار ہوتا تھا ۔

شہر انطاکیہ حلب سے ایک سو کلومیٹر سے کچھ کم اور اسکندریہ سے تقریباً ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے ۔

---

[1] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "حسرت" اس چیز پر غم کے معنی میں ہے کہ جو انسان کے ہاتھ سے نکل جائے ۔

Marfat.com

یہ شہر خلیفہ ثانی کے زمانہ میں ابو عبیدہ جراح کے ہاتھوں فتح ہوا اور رومیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اس میں رہنے والے لوگ عیسائی تھے۔ انہوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا اور اپنے مذہب پر باقی رہ گئے [۱]

پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ شہر فرانسیسیوں کے قبضہ میں آگیا۔ اہل انطاکیہ زیادہ تر عیسائی اور فرانسیسیوں کے ہم مذہب تھے اس لیے جب فرانسیسیوں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو اس بات کے پیش نظر کہ ان کے شام سے نکلنے کے بعد اس ملک میں ہونے والے فتنہ و فساد سے عیسائیوں کو کوئی گزند نہ پہنچے انہوں نے اُسے ترکی کے حوالے کر دیا۔

انطاکیہ عیسائیوں کی نگاہ میں اسی طرح سے دوسرا مذہبی شہر شمار ہوتا ہے جس طرح سے مسلمانوں کی نظر میں مدینہ ہے اور ان کا پہلا شہر بیت المقدس ہے کہ جس سے حضرت عیسیٰؑ نے اپنی دعوت کی ابتداء کی اور اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانے والوں میں سے ایک گروہ نے انطاکیہ کی طرف ہجرت کی اور پولس اور برنابا [۲] شہروں کی طرف گئے۔ انہوں نے لوگوں کو اس دین کی طرف دعوت دی۔ وہاں سے دینِ عیسوی نے وسعت حاصل کی۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں اس شہر کے بارے میں (زیر بحث آیات میں) خصوصیت کے ساتھ گفتگو ہوئی ہے [۳]

مفسر عالی قدر طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں: حضرت عیسیٰؑ نے حوارین میں سے اپنے دو نمائندے انطاکیہ کی طرف بھیجے جس وقت وہ شہر کے پاس پہنچے تو انہوں نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ جو چند بھیڑیں چرانے کے لیے لایا تھا۔ یہ "حبیب" صاحبِ یٰس تھا۔ انہوں نے اسے سلام کیا۔ بوڑھے نے جواب دیا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم عیسیٰؑ کے نمائندے ہیں، ہم اس لیے آئے ہیں کہ تمہیں بُتوں کی عبادت کے بجائے خدائے رحمان کی طرف دعوت دیں۔

بوڑھے نے کہا کہ کیا تمہارے پاس کوئی معجزہ یا نشانی بھی ہے؟

انہوں نے کہا: ہاں! ہم بیماروں کو شفا دیتے ہیں اور مادر زاد اندھوں اور برص میں مبتلا لوگوں کو حکم خدا سے صحت و تندرستی بخشتے ہیں۔

---

[۱] فرہنگ قصص قرآن مادہ "انطاکیہ" ص۳۲۰۔

[۲] "پولس" مشہور عیسائی مبلغ ہے۔ اس نے حضرت عیسیٰؑ کے بعد عیسائیت پھیلانے میں بہت کوشش کی ہے اور "برنابا" کا اصلی نام "یوسف" ہے، اور وہ "پولس" اور "مُرقس" کے اصحاب میں سے تھا۔ اس کی ایک انجیل ہے جس میں پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کی بہت زیادہ بشارتیں نظر آتی ہیں لیکن عیسائی اسے غیر قانونی شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایک مسلمان نے لکھی ہے۔

[۳] تفسیر ابوالفتوح رازی حاشیہ از مرحوم عالم بزرگوار شعرانی۔

Marfat.com

بوڑھے نے کہا: میرا ایک بیمار بیٹا ہے کہ جو سالہا سال سے بستر پر پڑا ہے۔

انہوں نے کہا: ہمارے ساتھ چلو تاکہ ہم تمہارے گھر جاکر اس کا حال معلوم کریں۔

بوڑھا ان کے ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے اس کے بیٹے پر ہاتھ پھیرا تو وہ صحیح و سالم اپنی جگہ پر اُٹھ کھڑا ہوا۔

یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی اور خدا نے اس کے بعد بیماروں میں سے ایک کثیر گروہ کو اُن کے ہاتھ سے شفا بخشی۔

ان کا بادشاہ بُت پرست تھا۔ جب اس تک خبر پہنچی تو اس نے انہیں بُلا بھیجا اور اُن سے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟

انہوں نے کہا: کہ ہم عیسیٰؑ کے فرستادہ ہیں، ہم اس لیے آئے ہیں کہ یہ موجودات جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں ان کی عبادت کے بجائے ہم تمہیں اس کی عبادت کی طرف دعوت دیں جو سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے۔

بادشاہ نے کہا: کیا ہمارے خداؤں کے علاوہ کوئی اور معبود بھی موجود ہے؟

انہوں نے کہا: ہاں! وہی کہ جس نے تجھے اور تیرے معبودوں کو پیدا کیا ہے۔

بادشاہ نے کہا: اُٹھ جاؤ کہ میں تمہارے بارے میں کچھ سوچ بچار کروں۔

یہ ان کے لیے ایک دھمکی تھی۔ اس کے بعد لوگوں نے ان دونوں کو بازار میں پکڑ کر مارا پیٹا۔

لیکن ایک دوسری روایت میں ہے کہ عیسیٰؑ کے ان دونوں نمائندوں کو بادشاہ تک رسائی حاصل نہ ہوئی اور ایک مدت تک وہ اس شہر میں رہے۔ ایک دن بادشاہ اپنے محل سے باہر آیا ہوا تھا تو انہوں نے تکبیر کی آواز بلند کی، اور "اللہ" کا نام عظمت کے ساتھ لیا۔ بادشاہ غضب ناک ہوا اور انہیں قید کرنے کا حکم دے دیا اور ہر ایک کو سو کوڑے مارے۔

جس وقت عیسیٰؑ کے ان دونوں نمائندوں کی تکذیب ہوگئی اور انہیں زدوکوب کیا گیا تو حضرت عیسیٰؑ نے شمعون الصفا کو ان کے پیچھے روانہ کیا۔ وہ حواریوں کے بزرگ تھے۔

شمعون اجنبی صورت میں شہر میں پہنچے اور بادشاہ کے اطرافیوں سے دوستی پیدا کر لی۔ انہیں ان کی دوستی بہت بھائی اور ان کے بارے میں بادشاہ کو بھی بتایا۔ بادشاہ نے بھی ان کو دعوت دی اور انہیں اپنے ہمنشینوں میں شامل کر لیا۔ بادشاہ ان کا احترام کرنے لگا۔

شمعون نے ایک دن بادشاہ سے کہا: مَیں نے سنا ہے کہ دو آدمی آپ کی قید میں ہیں اور جس وقت انہوں نے آپ کو آپ کے دین کے بجائے کسی دوسرے دین کی دعوت دی تو آپ نے انہیں مارا پیٹا؟ کیا کبھی آپ نے ان کی باتیں سنی بھی ہیں؟

Marfat.com

بادشاہ نے کہا: کہ مجھے ان پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے ان کی کوئی بات نہیں سنی۔

شمعون نے کہا: اگر بادشاہ مصلحت سمجھیں تو انہیں بلالیں تاکہ ہم دیکھیں تو سہی کہ ان کے پلے ہے کیا۔

بادشاہ نے انہیں بلالیا۔ شمعون نے یوں ظاہر کیا جیسے انہیں پہچانتے ہی نہ ہوں اور ان سے کہا: تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ انہوں نے کہا: اس خدا نے کہ جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

شمعون نے کہا: تمہارا معجزہ اور نشانی کیا ہے؟

انہوں نے کہا، جو کچھ تم چاہو!

بادشاہ نے حکم دیا اور ایک اندھے غلام کو لایا گیا جسے انہوں نے حکم خدا سے شفا بخشی۔ بادشاہ کو بہت تعجب ہوا۔ اس مقام پر شمعون بول اٹھے اور بادشاہ سے کہا: اگر آپ اس قسم کی درخواست اپنے خداؤں سے کرتے تو کیا وہ بھی اس قسم کے کام کی قدرت رکھتے تھے؟

بادشاہ نے کہا: تم سے کیا چھپا ہوا ہے۔ ہمارے یہ خدا کہ جن کی ہم پرستش کرتے ہیں نہ تو کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں، نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی اور خاصیت رکھتے ہیں۔

اس کے بعد بادشاہ نے ان دونوں سے کہا: اگر تمہارا خدا مُردے کو زندہ کر سکتا ہے تو ہم اس پر اور تم پر ایمان لے آئیں گے۔

انہوں نے کہا: ہمارا خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

بادشاہ نے کہا: یہاں ایک مُردہ ہے جسے مرے ہوئے سات دن گزر چکے ہیں ابھی تک ہم نے اُسے دفن نہیں کیا۔ ہم اس انتظار میں ہیں کہ اس کا باپ سفر سے آجائے۔ اُسے زندہ کر دکھاؤ۔

مُردہ کو لایا گیا تو وہ دونوں تو آشکار دعا کر رہے تھے اور شمعون دل ہی دل میں۔ اچانک مُردے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ میں سات روز سے مرچکا ہوں۔ میں نے جہنم کی آگ اپنی آنکھ سے دیکھی ہے اور میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ تم سب خدائے یگانہ پر ایمان لے آؤ۔

بادشاہ نے تعجب کیا۔ جس وقت شمعون کو یقین ہوگیا کہ اس کی باتیں اس پر اثر کرگئی ہیں تو اسے خدائے یگانہ کی طرف دعوت دی اور وہ ایمان لے آیا اور اس کے ملک کے باشندے بھی اس کے ساتھ ایمان لے آئے۔ اگرچہ کچھ لوگ اپنے کفر پر باقی رہے۔

اس روایت کی نظیر تفسیر عیاشی میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے بھی نقل ہوئی ہے۔ اگرچہ ان کے درمیان کچھ فرق ہے [1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۸ ص۴۱۹ زیر بحث آیات کے ذیل میں (تلخیص کے ساتھ)۔

Marfat.com

لیکن گزشتہ آیات کے ظاہر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس شہر والوں کا ایمان لانا بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ وہ صیحۂ آسمانی کے ذریعہ ہلاک ہو گئے۔

ممکن ہے کہ روایت کے اس حصہ میں راوی سے اشتباہ ہوا ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیات میں "مرسلون" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ پیغمبر اور خدا کے بھیجے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں قرآن کہتا ہے کہ شہر کے لوگوں نے اُن سے کہا کہ تم ہم جیسے بشر ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو اور خدا نے کوئی چیز نازل نہیں فرمائی۔

قرآن مجید میں اس قسم کی تعبیرات عام طور پر خدائی پیغمبروں کے بارے میں آئی ہیں، یہ کہنا پیغمبروں کے بھیجے ہوئے بھی تو خدا کے بھیجے ہوئے ہیں تو یہ توجیہ یہاں بعید نظر آتی ہے۔

۲۔ اس داستان کے تربیتی اور اصلاحی نکات: زیرِ بحث آیات میں اس داستان کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے بہت سے مسائل سیکھے جا سکتے ہیں کہ جن میں سے کچھ حسبِ ذیل ہیں:

(ا) صاحبِ ایمان افراد راہِ خدا میں کبھی بھی تنہائی سے نہیں گھبراتے۔ جیسا کہ ایک مردِ مومن حبیب نجار شہر کے مشرکین کے انبوہ سے وحشت زدہ نہیں ہوا۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ایها الناس لاتستوحشوا فی طریق الهدی لقلة اهله

اے لوگو! ہدایت کی راہ میں افراد کی کمی سے کبھی بھی وحشت نہ کرو[1]

(ب) مومن لوگوں کی ہدایت کا عاشق ہوتا ہے اور ان کی گمراہی سے اسے دُکھ پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی شہادت کے بعد بھی یہ آرزو رکھتا ہے کہ اے کاش! دوسرے لوگ اس کے مقامات کو دیکھ لیتے اور ایمان لے آتے۔

(ج) انبیاء کی دعوت کے مطالب خود اس کی ہدایت و حقانیت کے بہترین گواہ ہوتے ہیں (و هم مهتدون)۔

(د) اللہ کی طرف دعوت میں کسی بھی اجر پر نگاہ نہیں ہونی چاہیئے ورنہ وہ اثر انداز نہ ہو سکے گی۔

(ہ) بعض اوقات گمراہی کا عامل پوشیدہ نہیں ہوتا بلکہ یہ عامل ضلالِ مبین اور آشکار ہوتا ہے اور بت پرستی شرک "ضلالِ مبین" کا واضح مصداق ہیں۔

(و) مردانِ حق حقیقتوں پر تکیہ کرتے ہیں اور گمراہ لوگ موہومات و خیالات پر۔

(ز) اگر نحوست و بدبختی موجود ہو تو اس کا سرچشمہ خود انسان اور اس کے اعمال ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۱۔

Marfat.com

(ح)۔ "اسراف" اور تجاوز بہت سی بدبختیوں اور انحرافات کا عامل ہے۔
(ط)۔ پیغمبروں اور ان کے راستے پر چلنے والوں کا فریضہ "بلاغ مبین" اور ہر میدان میں واضح و آشکار دعوت دینا ہے۔ چاہے لوگ اُسے قبول کریں یا نہ کریں۔
(ی)۔ اجتماع و جمعیت کامیابی، عزت اور قوت کے اہم عوامل میں سے ایک ہے (فعززنا بثالث)۔
(ک)۔ خدا سرکش لوگوں کی سرکوبی کے لیے آسمان و زمین کے عظیم لشکر جمع نہیں کرتا بلکہ ایک ہی اشارے سے اُن کی ہر چیز درہم برہم کر دیتا ہے۔
(ل)۔ شہادت اور بہشت کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے اور شہید اپنی سواری سے زمین پر آنے سے پہلے ہی حور العین کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔
(م)۔ خدا انسان کو پہلے تو گناہ کی آلودگی سے پاک کرتا ہے اور پھر اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیتا ہے (بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین)۔
(ن)۔ دشمنانِ حق کی مخالفت اور سختی سے گھبرانا نہیں چاہیئے کیونکہ پوری تاریخ میں یہ ان کا ہمیشہ سے طریقہ رہا ہے (یٰحسرۃ علی العباد ما یاتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزءون)۔
اس سے بڑھ کر اور کونسی حسرت کی بات ہوگی کہ انسان ہدایت کے دروازوں کو تعصب، ہٹ دھرمی اور غرور کی بنا پر اپنے اوپر بند کر دے اور حق کے آفتاب عالمتاب کو نہ دیکھے۔
(س)۔ انبیاء پر سب سے پہلے ایمان لانے والے معاشرے کے مستضعفین ہوا کرتے تھے (وجاء رجل من اقصی المدینۃ)۔
(ع)۔ وہی لوگ تھے کہ جو راہِ طلب میں کبھی تھکے نہیں تھے اور ان کی سعی و کوشش ہمیشہ جاری رہتی تھی (یسعیٰ)۔
(ف)۔ تبلیغ کا طریقہ انبیاء الٰہی سے ہی سیکھنا چاہیئے کہ جو بے خبر دلوں پر تاثیر کرنے کے لیے تمام مؤثر طریقوں سے استفادہ کرتے تھے کہ جن کا ایک نمونہ زیرِ نظر آیات اور ان روایات میں کہ جو ان کی تفسیر میں آئی ہیں، مشاہدے میں آتا ہے۔

۳۔ برزخ کی سزا و جزا:

زیر بحث آیات میں ہے کہ مذکورہ "مومن" نے شہادت کے بعد خدائی بہشت میں جگہ پائی اور وہ یہ آرزو رکھتا تھا کہ اے کاش! پیچھے رہ جانے والے اس کی قسمت سے آگاہ ہو جاتے۔ یقیناً یہ آیات شہداء سے مربوط آیات کی طرح قیامت والی ابدی و جاودانی جنت سے مربوط نہیں ہیں جس میں آیاتِ قرآنی کے مطابق مُردوں کے قیامت میں اٹھنے اور محشر کے حساب و کتاب کے بعد داخلہ ہوگا۔

Marfat.com

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے لیے برزخ میں بھی ایک طرح کی جنت و دوزخ ہے کہ جس میں شہید تو نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور "آلِ فرعون" جیسے سرکش صبح و شام اس کی آگ میں معذب ہوتے ہیں۔ اس مطلب کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت سے ایسے مسائل حل ہو جاتے ہیں کہ جو بہشت و دوزخ کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ معراج کی روایات اور اس جیسے دیگر واقعات کے بارے میں پیدا ہونے والے سوالات۔

۴۔ اُمتوں میں سب سے سبقت کرنے والے: تفسیر ثعلبی میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہے:

سباق الامم ثلاثة لم يكفروا بالله طرفة عين علی بن ابی طالب وصاحب يٰس و مؤمن اٰل فرعون، فهم الصديقون وعلی افضلهم۔

"امتوں میں سب سے سبقت کرنے والے تین افراد ہیں کہ جنہوں نے ایک چشم زدن کے لیے ہرگز خدا سے کفر نہیں کیا، علی بن ابی طالبؑ اور صاحب یٰس (حبیب نجار) اور مؤمن آلِ فرعون۔ انہوں نے اپنے زمانے کے پیغمبر کی (قولاً اور عملاً) تصدیق کی ہے اور علی اُن سب سے افضل و برتر ہیں[۱]"

یہی معنی و مفہوم تفسیر درمنثور میں ایک دوسری عبارت سے رسول اللہؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

الصديقون ثلاثة: حبيب النجار مؤمن اٰل يٰس الذی قال يا قوم اتبعوا المرسلين، وحزقيل مؤمن اٰل فرعون الذی قال اتقتلون رجلًا ان يقول ربی الله، وعلی بن ابی طالب (ع) وهو افضلهم

"انبیاء کی تصدیق کرنے والے تین آدمی تھے حبیب نجار مومن آل یٰس کہ جس نے پکار کر یہ کہا کہ اے میری قوم! خدا کے رسولوں کی پیروی کرو اور حزقیل مومن آلِ فرعون (کہ جس نے موسیٰ کا دفاع کیا اور ان کی حمایت کرتے ہوئے ان کے قتل کی سازش کے مقابلے میں جو فرعونیوں کی طرف سے ترتیب دی گئی تھی) کہا: کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے؟ اور علی بن ابی طالب کو جو ان سب سے افضل و برتر ہیں[۲]"

---

[۱] مجمع البیان، تفسیر قرطبی، المیزان اور نور الثقلین۔

[۲] المیزان، جلد ۱۷ ص ۸۶ بحوالہ تفسیر درمنثور۔

Marfat.com

(۳۱) اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ
اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝
(۳۲) وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝

ترجمہ

(۳۱) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی اقوام کو (ان کے گناہوں کی بنا پر) ہلاک کیا ہے۔ وہ ہرگز ان کی طرف واپس نہیں لوٹیں گے۔

(۳۲) اور وہ سب کے سب قیامت کے دن ہمارے پاس حاضر ہوں گے۔

تفسیر

دائمی غفلت

گزشتہ آیات زمانۂ ماضی میں دنیا کے لوگوں کے ایک بڑے حصے کی مسلسل غفلت کے بارے میں گزری ہے۔ اب ان آیات میں فرمایا گیا ہے: "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے پہلی اقوام میں سے بہت سے افراد کو ان کے ظلم اور سرکشی کے سبب ہلاک کر ڈالا" (الم یروا کم اهلکنا قبلهم من القرون) [1]

یہ کوئی پہلا گروہ نہیں ہے کہ جس نے روئے زمین پر قدم رکھا ہے بلکہ ان سے پہلے دوسری سرکش قومیں بھی اس جہان میں زندگی بسر کرتی رہی ہیں، ان کا دردناک انجام کہ جو تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے اور ان کے غم انگیز آثار کہ جو ان کے شہروں کے ویرانوں میں باقی رہ گئے ہیں، ان کی آنکھوں کے

---

[1] زیرِ نظر آیت میں استفہام، تقریری استفہام ہے اور "کم" خبریہ ہے اور یہاں کثرت کے معنی میں آیا ہے اور (یروا) کا مفعول ہے اور "من القرون" اس کا بیان ہے۔ "قرون" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے، "قرن" کی جمع ہے کہ جو طویل زمانے کے معنی میں بھی بولا گیا ہے اور ایسے لوگوں کے معنی میں بھی کہ جو ایک ہی زمانے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

Marfat.com

سامنے موجود ہیں۔ کیا اتنا کچھ درس عبرت کے لیے کافی نہیں ہے؟

اس بارے میں کہ "الم یروا" (کیا انہوں نے دیکھا نہیں) میں جمع کی ضمیر کس کی طرف لوٹتی ہے مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر "اصحاب القریۃ" کی طرف لوٹتی ہے کہ جن کے بارے میں گزشتہ آیات میں گفتگو ہوئی ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد اہل مکہ ہیں کہ جنہیں یہ آیات تنبیہ کرنے اور خبردار کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں۔

لیکن گزشتہ آیت (یا حسرة علی العباد ....) اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس سے مراد تمام انسان ہیں کیونکہ مذکورہ آیت میں لفظ "عباد" پوری تاریخ کے اُن تمام انسانوں کے لیے ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے افراد کی تکذیب کرتے اور مذاق اڑاتے تھے بہرحال یہ عالم کے تمام لوگوں کو ایک دعوت ہے کہ وہ گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا غور کے ساتھ مطالعہ کریں اور ان کے باقی ماندہ آثار کو دیکھیں اور انہیں عبرت حاصل کرنے کے لیے دل کی نگاہوں سے دیکھیں اور سرکشوں کے ویران محلوں کے ایوانوں کو آئینۂ عبرت سمجھیں۔

آیت کے آخر میں قرآن مزید کہتا ہے: "وہ کبھی بھی ان کی طرف نہیں لوٹیں گے" (انھم الیھم لا یرجعون)[1]

سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ دنیا کی طرف بازگشت اور گزشتہ گناہوں اور بدبختیوں کی تلافی کا امکان باقی نہیں رہا۔ ان کے گزشتہ سفر کے تمام پُل تباہ ہو چکے ہیں اور اب ان کا لوٹ کر جانا ممکن ہی نہیں رہا۔

یہ تفسیر اُس بات کے مانند ہے کہ جو علی علیہ السلام نے مُردوں سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہوئے نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں ارشاد فرمائی ہے:

لا عن قبیح یستطیعون انتقالًا ولا فی حسن یستطیعون ازدیادًا

"نہ تو اس بات ہی کا امکان ہے کہ وہ اپنے قبیح اعمال سے نکل سکیں گے اور نہ ہی وہ اس بات کی طاقت رکھتے ہیں کہ اپنی نیکیوں میں اضافہ کر سکیں (کیونکہ واپس لوٹنے کی راہ

---

[1] یہ جملہ "کم اھلکنا" کا بدل ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے:

الم یروا انھم الیھم لا یرجعون۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ حالیہ ہے (ہلاک ہونے والوں کا حال)۔

Marfat.com

بند ہو چکی ہے اور تلافی کا امکان نہیں رہا"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۸)

بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے: "وہ سب کے سب بلا استثناء قیامت کے دن ہمارے پاس حاضر ہوں گے" (وان کل لمّا جمیع لدینا محضرون) [1]

یعنی اس طرح نہیں ہے کہ اگر وہ ہلاک ہو گئے اور اس جہان میں واپس نہ پلٹ سکے تو مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ موت حقیقت میں نہ تو ابتدائے کار ہے اور نہ ہی انتہائے کار، بلکہ وہ سب کے سب بہت جلد عرصۂ محشر میں حساب کتاب کے لیے جمع ہوں گے اور اس کے بعد دردناک عذابِ الٰہی، کہ جو ایک مسلسل اور دائمی سزا ہوگی اُن کا منتظر ہے۔

تو ان حالات میں کیا یہ عبرت حاصل کرنے کا مقام نہیں ہے؟ چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اُن کے سے انجام میں مبتلا نہ کریں اور جب تک کچھ بھی موقع باقی ہے اس ہولناک گرداب سے دُور رہیں۔

ہاں! اگر موت پر ہر چیز کا خاتمہ ہو جانا ہوتا تو یہ بات ممکن تھی کہ وہ کہتے کہ یہ زندگی تو ہمارے سکون و راحت کی ابتداء ہے لیکن افسوس کہ اس طرح نہیں ہے اور بقول شاعر:

ولو انا اذا متنا ترکنا لکان الموت راحة کل حیّ

ولکنا اذا متنا بعثنا ونسئل بعده عن کل شیٔ

"اگر ہمیں مرجانے کے بعد اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو موت تمام زندوں کے لیے راحت و آرام کا باعث ہوتی"۔

"لیکن جب ہم مرجائیں گے تو ہم دوبارہ زندہ ہوں گے اور اس کے بعد ہم سے ہر چیز کے متعلق سوال ہوگا"۔

✧ ✧ ✧

---

[1] اس آیت کی ترکیب کے بارے میں مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ "ان" نافیہ ہے (اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مخففہ ہے۔ اسی بناء پر اس نے اپنے مابعد کو نصب نہیں دیا) اور "لمّا" "الا" کے معنی میں ہے کیونکہ "لمّا" کا "الا" کے معنی میں آنا عرب ادباء کے کلام میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس بنا پر "کسائی" کی مخالفت سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور "جمیع" "مجموع" کے معنی میں "کل" کی خبر ہے (کل" کی تنوین مضاف الیہ محذوف کا بدل ہے اور اصل میں یہ "کلھم" تھا، اور "محضرون" یا تو خبر کے بعد خبر ہے یا جمیع کی صفت ہے۔ اس طرح سے اس جملے کا معنی کچھ اس طرح ہوگا:

وما کلھم الا مجموعون یوم القیامة محضرون لدینا۔

"اور نہیں ہیں وہ سب کے سب مگر قیامت کے دن اکٹھے مجموعی طور پر ہمارے پاس حاضر ہوں گے"۔

Marfat.com

(۳۳) وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚۖ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا
حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ○
(۳۴) وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا
فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ○ۙ
(۳۵) لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ
اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ○
(۳۶) سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ
وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

(۳۳) مُردہ زمین بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے۔ ہم نے اسے زندہ کیا اور
اس سے دانے نکالے۔ اسی میں سے وہ کھاتے ہیں۔
(۳۴) اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات اُگائے اور اس
میں چشمے جاری کیے۔
(۳۵) تاکہ وہ اس کے پھل کھائیں جبکہ اس کے بنانے میں ان کے ہاتھ کا کوئی
عمل دخل نہیں ہے۔ کیا وہ خدا کا شکر ادا نہیں کرتے۔
(۳۶) منزہ ہے وہ ذات کہ جس نے زمین سے اُگنے والی چیزوں کے اور خود
انہی لوگوں کے اور ان چیزوں کے جنہیں یہ نہیں جانتے سب کے جوڑے

Marfat.com

پیدا کیے ہیں۔

تفسیر

کچھ اور نشانیاں

گزشتہ آیات میں فرستادگانِ الٰہی کی شرک و بُت پرستی کے خلاف جدوجہد کے بارے میں گفتگو تھی۔ نیز گزشتہ آخری آیت میں مسئلہ معاد کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ اب زیرِ بحث آیات توحید و معاد کی نشانیوں کو یکجا بیان کرتی ہیں تاکہ یہ نشانیاں منکرین کے لیے بیداری اور مبدا و معاد پر ایمان لانے کا ذریعہ بن جائیں۔

ان آیات میں پہلے مُردہ زمینوں کے زندہ کرنے اور ان برکات سے کہ جن سے انسان فائدہ اٹھاتے ہیں بحث کی گئی ہے فرمایا گیا ہے: "مردہ زمین بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے (مبدا و معاد کی) ہم نے اسے زندہ کیا اور اس سے دانے نکالے اور اسی میں سے وہ کھاتے ہیں" (وآیة لهم الارض المیتة احییناها واخرجنا منها حبًّا فمنه یأکلون)[1]

وجودِ حیات توحید کے اہم ترین دلائل میں سے ہے۔ یہ بہت زیادہ پیچیدہ اور حیرت انگیز مسئلہ ہے کہ جس نے تمام علماء اور دانشوروں کی عقل کو حیرت میں ڈال دیا ہے اور تمام ترقیوں کے باوجود کہ جو علم و دانش میں نوعِ بشر کو نصیب ہوئی ہیں ابھی تک کسی نے اس کے معمے کو حل نہیں کیا۔ ابھی تک کوئی بھی شخص ٹھیک طرح سے نہیں جانتا کہ کن عوامل کے زیرِ اثر پہلے دن بے جان موجودات زندہ خلیوں میں تبدیل ہوئیں۔

ابھی تک کوئی نہیں جانتا کہ نباتات کے بیج اور ان کے مختلف طبقات کس طرح بنے ہیں اور کون سے قوانین و رموز ان پر حکم فرما ہیں۔ موافق حالات فراہم ہوتے ہی یہ بیج حرکت میں آجاتے ہیں اور نشوونما کا آغاز کر دیتے ہیں اور مردہ زمین کے ذرات کو اپنے وجود میں جذب کر لیتے ہیں اور اس طریقے سے مُردہ موجودات کو زندہ موجود کی بافت و بُن میں تبدیل کر دیتے ہیں، تاکہ ہر روز حیات کا ایک نیا جلوہ دکھائیں۔

---

[1] زیرِ بحث آیت کے سلسلے میں علماء نے بہت سے احتمال ذکر کیے ہیں لیکن جو چیز سب سے زیادہ واضح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ "اٰیة لهم" خبرِ مقدم ہے اور "الارض المیتة" مبتدائے مؤخر ہے اور "احییناها" مستانفہ ہے کہ جو گزشتہ لفظ کی توضیح و تفسیر ہے۔

Marfat.com

عالم نباتات وحیوانات میں حیات کا مسئلہ اور مُردہ زمینوں کا زندہ ہونا، ایک طرف تو اس بات کی ایک واضح و روشن دلیل ہے کہ اس جہان کی خلقت میں ایک عظیم علم و دانش سے کام لیا گیا ہے اور دوسری طرف سے یہ قیامت کی ایک واضح نشانی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ "لھم" کی ضمیر "عباد" کی طرف لوٹتی ہے کہ جو گزشتہ آیات میں ہے اور یہاں "عباد" سے مراد وہ تمام بندے ہیں جو مبدا، و معاد سے مربوط مسائل میں انحراف یا غلط فہمی میں گرفتار ہیں اور قرآن ان کی کیفیت کو حسرت وتاسف کا سبب شمار کرتا ہے۔

"اٰیۃ" کی تعبیر نکرہ کی صورت میں اس توحیدی نشانی کی عظمت و اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔

"فمنه یأکلون" ایک طرف تو اس بات کا اشارہ ہے کہ انسان نباتات کے کچھ دانوں سے غذا حاصل کرتا ہے اور کچھ انسان کی غذا کے قابل نہیں ہیں لیکن ان کے دوسرے فوائد ہیں مثلاً جانوروں کی غذا، رنگ کرنے کے مادے، دوائیاں اور دوسرے امور کہ جن سے انسانی زندگی میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

دوسری طرف "منه" کو "یأکلون" پر مقدم رکھنا کہ جو عام طور پر حصر کے لیے آتا ہے، اس نکتے کو بیان کرتا ہے کہ انسان کے لیے زیادہ تر اور بہترین غذا نباتات سے حاصل ہوتی ہے بلکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ تمام تر غذا گویا اسی سے حاصل ہوتی ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

بعد والی آیت گزشتہ آیت کی توضیح وتشریح ہے اور مُردہ زمینوں کی حیات کی کیفیت بیان کرتی ہے فرمایا گیا ہے: "ہم نے زمین میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات اُگائے ہیں اور اس میں سے چشمے نکالے ہیں" (وجعلنا فیھا جنّات من نخیل واعناب وفجرنا فیھا من العیون)۔

گزشتہ آیت میں اناج کے متعلق گفتگو تھی لیکن یہاں قوت بخش اور غذائی پھلوں کے متعلق بات کی گئی ہے۔ ان کے دو عمدہ اور کامل نمونے "کھجور" اور "انگور" ہیں کہ جن میں سے ہر ایک مکمل غذا شمار ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی مفصل طور سے بیان کر چکے ہیں کہ ماہرین کے مطالعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ دونوں پھل انواع واقسام کے ضروری وٹامن اور انسانی بدن کے لیے درکار مختلف حیاتی مواد کے حامل ہیں۔ علاوہ ازیں یہ دونوں پھل سال بھر تازہ اور خشک شکل میں غذا کیلئے محفوظ رکھنے اور استفادہ کرنے کے قابل ہیں[1]

---

[1] ان دونوں حیات بخش پھلوں (انگور وخرما) کے بارے میں اور ان کی غذائی اہمیت کے متعلق ماہرین کی گواہی کے سلسلے میں ہم بالترتیب جلد ۱۱ اور جلد ۱۳ (سورہ نحل آیہ ۱۱۔ اور سورہ مریم آیہ ۲۶) میں بحث کر چکے ہیں۔

Marfat.com

راغب کے بقول "اعناب" جمع ہے "عنب" کی اور "نخیل" جمع ہے "نخل" کی۔ فرق یہ ہے کہ "عنب" خود انگور کو کہا جاتا ہے اور انگور کے پودے کے لیے یہ لفظ شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا ہے لیکن "نخل" اس درخت کا نام ہے اور اس کے پھل کو "رطب" "تمر" (تازہ اور خشک کھجور) کہتے ہیں۔

بعض کا نظریہ ہے کہ تعبیر کا یہ فرق کہ ایک جگہ تو درخت کی بات ہے اور دوسری جگہ پھل کی، اس وجہ سے ہے کہ کھجور کے درخت کی جیساکہ مشہور ہے ہر چیز قابل استفادہ ہے اس کا تنا، شاخیں اور پتے سب مختلف امور میں کام آتے ہیں اور اس کا پھل ان سب کا سردار ہے۔ جبکہ انگور کا پودا عام طور پر اس کے پھل کی وجہ سے مطلوب ہے اور اس کا تنا، شاخیں اور اس سے جدا شدہ اجزاء کا کوئی زیادہ مصرف نہیں ہے۔

نیز یہ بات کہ یہ دونوں صیغے جمع کی صورت میں آئے ہیں تو ممکن ہے کہ یہ ان دونوں پھلوں کی مختلف انواع و اقسام کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی دسیوں قسمیں ہیں جن کی مختلف خصوصیات اور ذائقے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ گزشتہ آیت میں صرف مُردہ زمینوں کے زندہ کرنے کا ذکر تھا کہ جو قرآن مجید میں عام طور پر بارش کے نزول کے ساتھ آیا ہے لیکن اس آیت میں جاری پانی کے چشموں کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے کیونکہ بہت سی زراعتوں کے لیے تو اکیلا بارش کا پانی ہی کافی ہے جبکہ پھلدار درختوں کو عام طور پر جاری پانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

"فجرنا" "تفجیر" کے مادہ سے، یہ لفظ وسیع اور کھلا شگاف پیدا کرنے کے معنی میں ہے۔ چشمے چونکہ زمین کو شگافتہ کرکے پھوٹتے ہیں، اس لیے یہ تعبیر چشموں کے زمین سے باہر نکلنے کے بارے میں استعمال ہوئی ہے[1]

بعد والی آیت ان پُر بار درختوں کے مقصد خلقت کو یوں بیان کرتی ہے: "مقصد یہ ہے کہ وہ اس کے پھل کھائیں، حالانکہ ان کے بنانے میں ان کے ہاتھ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ کیا وہ خدا کا شکر بجا نہیں لاتے" (لیأکلوا من ثمره وما عملته ایدیهم افلا یشکرون)۔

ہاں! وہ پھل کہ جو درختوں کی شاخوں پر ایک کامل غذا کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، انہیں پکانے یا دوسری کسی قسم کی تبدیلی کی معمولی سے معمولی ضرورت بھی نہیں ہوتی، وہ درختوں سے توڑتے

---

[1] قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس کا ثلاثی مجرد کا صیغہ بھی شگاف کرنے کے معنی میں ہے لیکن جب اسے باب "تفعیل" کی طرف لے جاتے ہیں (جیساکہ زیر بحث آیت میں ہے) تو پھر تکثیر اور تشدید کا معنی دیتا ہے۔

Marfat.com

ہیں قابلِ استعمال ہوتے ہیں اور یہ بات پروردگار کی انسانوں کے لیے انتہائی لطف اور عظمت کی نشاندہی کرتی ہے۔

یہاں تک کہ اس نے اس تیار اور لذیذ غذا کی اس طرح سے پیکنگ کی ہے کہ وہ ایک مدت تک محفوظ رہ سکتی ہے اور ان کی غذائی قدر و قیمت بھی ضائع نہیں ہوتی، ان غذاؤں کے برخلاف کہ جنہیں انسان خداداد موادِ غذائی سے اپنے ہاتھ سے بناتا ہے کہ جو زیادہ تر جلدی خراب ہو جاتی ہیں۔

آیت کے معنی میں ایک دوسری تفسیر بھی موجود ہے اور وہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن چاہتا ہے کہ ایسے پھلوں کی طرف بھی اشارہ کرے کہ جو بغیر کسی تبدیلی کے استعمال کے قابل ہوتے ہیں اور ایسی مختلف غذاؤں کی طرف بھی کہ جو ان پھلوں پر کچھ عمل انجام دینے سے حاصل ہوتی ہیں (پہلی تفسیر کی رُو سے "ما عملته ایدیھم" میں "ما" نافیہ ہے اور دوسری تفسیر کی رُو سے موصولہ)

بہرصورت مقصد یہ ہے کہ انسانوں میں حق شناسی اور شکر گزاری کی حس کو بیدار کیا جائے تاکہ وہ شکر گزاری کے ذریعے معرفت پروردگار کے مرحلے میں قدم رکھیں کیونکہ شکرِ منعم معرفت کردگار کا پہلا قدم ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت پروردگار کی تسبیح و تنزیہ کے بارے میں بات کرتی ہے اور مشرکین کے شرک پر کہ جس کے بارے میں گزشتہ آیات میں گفتگو تھی خطِ بطلان کھینچتی ہے اور سب کو راہِ توحید اور یکتا پرستی کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتی ہے: "منزہ ہے وہ ذات کہ جس نے زمین سے اُگنے والی چیزوں کے اور خود انہی لوگوں کے اور ان چیزوں کے جنہیں یہ نہیں جانتے سب کے جوڑے پیدا کیے ہیں"

(سبحان الذی خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض ومن انفسھم و مما لا یعلمون)[1]

ہاں! وہ خدا کہ جس نے ان تمام جوڑوں کو اس وسیع عالمِ ہستی میں پیدا کیا ہے، اس کا علم و قدرت بے انتہا ہے۔ اس میں کوئی نقص اور عیب موجود نہیں ہے، اس لیے اس کا کوئی شریک و شبیہ و نظیر بھی نہیں ہے۔

یہ جو بعض نے بے جان پتھروں، لکڑیوں اور دوسری مخلوقات کو اس کا شبیہ قرار دے رکھا ہے ایسی

---

[1] بعض مفسرین اور علماء ادب کے قول کے مطابق "سبحان" ۔ "علم" ہے "تسبیح" کا کیونکہ علم (مخصوص نام) کبھی تو اشخاص کے لیے ہوتا ہے اور اس کو "علم شخص" کہتے ہیں اور کبھی جنس کے لیے ہوتا ہے اور اسے "علم جنس" کہتے ہیں اور کبھی کسی معنی کے لیے ہوتا ہے اور اس کو "علم معنی" کہتے ہیں۔ اس بنا پر اس کا مفہوم خدا کی تنزیہ اور اسے ہر اس چیز سے پاک شمار کرنا ہے کہ جو عیب و نقص ہو۔ ایسی تنزیہ کہ جو عظمتِ پروردگار کے شایانِ شان ہو اور علم معنی کے سوا "علم" کی کبھی بھی اضافت نہیں ہوتی۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "سبحان" مصدری معنی رکھتا ہے اور فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے اور ہر صورت میں خدائی تنزیہ کو نہایت پُر زور طریقے سے بیان کرتا ہے۔

Marfat.com

ناروانسبتوں سے اس کے دامن کبریائی پر کوئی گرد نہیں پڑتی ۔
یہ بات واضح ہے کہ خدا اس چیز کا محتاج نہیں ہے کہ وہ خود اپنی تسبیح و تنزیہ کرے، بلکہ یہ تو بندوں کے لیے ایک تعلیم ہے اور تکامل و ارتقاء کا سفر طے کرنے کے لیے ایک دستور العمل ہے ۔
اس بارے میں کہ یہاں "ازواج" سے کیا مراد ہے مفسرین نے بہت اختلاف کیا ہے ۔
جو بات مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ "ازواج"، "زوج" کی جمع ہے ۔ یہ لفظ عام طور پر مذکر و مؤنث دونوں کے لیے بولا جاتا ہے، چاہے وہ حیوانات ہوں یا ان کے علاوہ ۔ بعد ازاں اس لفظ کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی اور ہر ان دو موجود پر کہ جو ایک دوسرے سے نزدیک ہوں یہاں تک کہ ایک دوسرے کی ضد ہی ہوں، "زوج" کا اطلاق ہونے لگا ۔ یہاں تک کہ ایک گھر کے دو مشابہ کمروں کے لیے یا دروازے کے دو کواڑوں کے لیے یا دو اکٹھے کام کرنے والے ساتھیوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس طرح سے عالم ہستی کے ہر موجود کے لیے ایک زوج (جوڑا) متصور ہوتا ہے ۔
بہرحال بعید نہیں ہے کہ یہاں پر "زوجیت" اسی خاص معنی یعنی صنفِ مذکر و مؤنث میں ہو اور قرآن مجید اس آیت میں تمام عالم نباتات، انسانوں اور دوسرے موجودات میں کہ جن سے لوگ مطلع نہیں ہیں، زوجیت کی خبر دے رہا ہو ۔
ممکن ہے یہ موجودات نباتات ہوں ۔ اُس زمانہ میں ان میں زوجیت کے دائرے کی وسعت ابھی تک ظاہر نہ ہوئی تھی ۔
یا ہو سکتا ہے سمندروں کی گہرائیوں میں پائے جانے والے حیوانات کی طرف اشارہ ہو کہ جن سے اس زمانے میں کوئی آگاہ نہیں تھا اور موجودہ زمانے میں ان کا کچھ حصہ انسان کے لیے ظاہر ہوا ہے ۔
یا دوسری موجودات کی طرف اشارہ ہو کہ جو دوسرے آسمانی کروں میں زندگی بسر کرتے ہیں ۔
یا خوردبینی زندہ موجودات مراد ہوں، اگرچہ اس زمانے کے ماہرین ان کے نر اور مادہ کو ابھی تک معلوم نہیں کر سکے لیکن اس زندہ موجودات کی بنا اس قدر پوشیدہ معموں میں سے ہے کہ ممکن ہے کہ انسانوں کے علم و دانش نے ابھی تک اس کے اس حصہ تک رسائی حاصل نہ کی ہو، یہاں تک کہ عالم نباتات میں نر اور مادہ ہونے کا وجود بھی ۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے قرآن کے نزول کے زمانے میں ۔ سوائے خاص خاص مواقع مثلاً کھجور وغیرہ کے درختوں کے ۔ پہچانا نہیں گیا تھا اور قرآن نے اس سے پردہ اٹھایا تھا اور آج کے زمانے میں سائنسی طریقوں سے یہ مطلب پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ عالم نباتات میں مسئلہ زوجیت ایک عمومی اور مشترک امر ہے ۔
یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ یہاں "زوجیت" تمام ایٹموں کے اندر مثبت اور منفی ذرات کے وجود کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس جہان کی تمام چیزیں ایٹم سے بنی ہیں اور ایٹم حقیقت میں عالم

Marfat.com

مادہ کے اس عظیم محل کی عظیم تعمیر کے لیے اینٹ کے مانند ہے ۔

جس وقت تک "ایٹم" کو توڑا نہیں گیا تھا اس وقت تک اس زوجیت کا کوئی پتہ نہیں تھا لیکن اس کے بعد ایٹم میں اور ان الیکٹرانوں کی صورت میں کہ جو اس کے گرد گھومتے ہیں اور ان پروٹونوں کی صورت میں کہ جو اُن کے اندر موجود ہیں ازواج (جوڑوں) کا وجود پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے ۔

بعض نے اسے اشیاء کی مادہ وصورت یا جوہر وعرض سے ترکیب کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور بعض دوسرے اسے نباتات، انسانوں، حیوانوں اور دوسری موجودات کی مختلف انواع و اقسام کیلئے کنایہ سمجھتے ہیں۔

لیکن یہ بات واضح ہے کہ جب ہم ان الفاظ کو حقیقی معنی (صنف مذکر و مونث) پر محمول کر سکتے ہیں اور اس کے برخلاف کوئی قرینہ بھی موجود نہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم کنائی معانی کی طرف جائیں اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ زوجیت کے حقیقی معنی کی کئی عمدہ تفاسیر یہاں پر موجود ہیں ۔

بہرحال یہ آیت بھی ان آیات میں سے ایک ہے کہ جو انسانی علم کا محدود ہونا بیان کرتی ہیں اور اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس جہان میں بہت سے حقائق ایسے ہیں، کہ جو ہمارے علم و دانش سے پوشیدہ ہیں [1]

---

[1] موجودات عالم کی زوجیت کے بارے میں اور خصوصاً عالم نباتات میں مذکر و مونث کی موجودگی سے متعلق ہم جلد دہم ص ۱۱۱ (اُردو ترجمہ) اور جلد ۱۵ سورہ شعراء کی آیہ ۷ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں ۔

Marfat.com

(۳۷) وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا
هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۙ○
(۳۸) وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ
الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۗ○
(۳۹) وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ
الْقَدِيْمِ ○
(۴۰) لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ
سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○

ترجمہ

(۳۷) رات بھی ان کے لیے (عظمتِ خدا کی) ایک نشانی ہے ہم اس سے دن کو لے جاتے ہیں تو اچانک تاریکی انہیں ڈھانپ لیتی ہے۔

(۳۸) اور سورج (بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے) کہ جو ہمیشہ اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت میں ہے، یہ خدائے قادر و دانا کی تقدیر ہے۔

(۳۹) اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں قرار دی ہیں (اور جب وہ ان منازل کو طے کر لیتا ہے تو) آخرکار کھجور کی پرانی شاخ (زرد کمان) کے مانند ہو جاتا ہے۔

(۴۰) نہ تو سورج چاند تک پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔

Marfat.com

تفسیر

سورج اور چاند بھی آیتِ الٰہی ہیں

زیرِ بحث آیات عالمِ ہستی میں عظمتِ خدا کی نشانیوں کے ایک اور حصے کو بیان کرتی ہیں۔ گزشتہ آیات میں قیامت، مُردہ زمینوں کے زندہ ہونے اور نباتات اور درختوں کی پرورش کے بارے میں بات ہوئی تھی۔ اب توحید کا ایک اور پہلو بیان کیا جا رہا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "رات بھی ان کے لیے عظمتِ خدا کی ایک آیت اور نشانی ہے" (وایة لهم الّیل)۔

"جب آفتاب کی روشنی ہر جگہ پھیلی ہوتی ہے اور اس نے تاریکی کے لشکر کو پیچھے دھکیلا ہوتا ہے اس وقت ہم دن کی روشنی کو اٹھا لیتے ہیں اور ان سب کو اچانک تاریکی ڈھانپ لیتی ہے" (نسلخ منه النهار فاذا هم مظلمون)۔

"نسلخ" کی تعبیر مادۂ "سلخ" (بروزن "بلخ") سے ہے۔ اصل میں یہ لفظ جانور کا چمڑہ اتارنے کے معنی میں ہے۔ یہ ایک لطیف تعبیر ہے، گویا دن کی روشنی سفید لباس کے مانند ہے کہ جو رات کے بدن پر پہنایا گیا ہے۔ غروبِ آفتاب کے وقت یہ لباس اس سے اتار لیا جاتا ہے تاکہ اس کا باطن اور اندر کا حصہ آشکار ہو جائے۔

اس تعبیر کے بارے میں غور و خوض کرنے سے یہ نکتہ عیاں ہو جاتا ہے کہ کرۂ زمین کی اصل فطرت تاریکی اور ظلمت ہے۔ نور اور روشنی اس کی ایک عارضی صفت ہے کہ جو ایک دوسرے منبع سے اُسے دی جاتی ہے۔ اس لباس کی طرح کہ جو کسی کے بدن پر پہناتے ہیں کہ جس وقت وہ اس لباس کو اتار دے تو بدن کا فطری اور اصلی رنگ ظاہر ہو جاتا ہے۔[1]

یہاں قرآن مجید نے رات کی تاریکی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ گویا گزشتہ آیات میں آیت الٰہی کے طور

---

[1] "راغب" مفردات میں کہتا ہے کہ "سلخ" کا معنی جانور کی کھال اتارنا ہے اور بدن سے زرہ اتارنے اور مہینے کے اختتام کے لیے بھی بولا جاتا ہے لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ اس صورت میں ہے کہ جب سلخ "عن" کے ساتھ متعدی ہو اور اگر "من" کے ساتھ متعدی ہو تو پھر باہر نکالنے کے معنی میں ہے لیکن اس فرق کی کوئی واضح دلیل ہمیں کتب لغت میں نہیں ملی اگرچہ لسان العرب میں یہ ہے کہ:

انسلخ النهار من الّیل خرج منه خروجاً

دن رات سے نسلخ ہوا یعنی اس سے نکلا۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ پہلے ہی معنی سے لیا گیا ہے۔

Marfat.com

پر مُردہ زمینوں کو زندہ کرنے کے ذکر کے بعد ــــ دن کی روشنی کے رات کی تاریکی میں تبدیل ہوجانے کو زندگی کے بعد موت کے نمونے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

بہرحال جس وقت انسان رات کی تاریکی میں ڈوب جاتا ہے تو وہ نور اور اس کی برکات، ہیجانات اور اس کے منبع وجود کو یاد کرتا ہے اور ایک موازنے کے ذریعے "نور وظلمت" کے خالق سے آشنا ہوتا ہے۔

تیسری نشانی کہ جس کی طرف رات کی نشانی کے بعد اشارہ ہُوا ہے نور، روشنی اور سورج کی نشانی ہے۔ قرآن کہتا ہے: "خورشید بھی ان کے لیے ایک نشانی ہے کہ جو ہمیشہ اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت میں ہے" (والشمس تجری لمستقرلها) [1]

یہ آیت سورج کی مسلسل اور دائمی حرکت کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے لیکن اس بارے میں کہ اس حرکت سے کیا مراد ہے، مفسرین نے بہت بحث کی ہے۔

بعض اسے زمین کے گرد سورج کی ظاہری حرکت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ یہ حرکت اس عالم کے اختتام تک جاری و ساری ہے ــ کہ جو درحقیقت سورج کا ٹھکانا اور اس کی زندگی کا اختتام ہے۔

بعض نے گرمیوں اور سردیوں میں، زمین کے شمال و جنوب کی طرف، سورج کے جھکنے کی طرف اشارہ سمجھا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ سورج موسم بہار کے آغاز سے خطِ اعتدال سے شمال کی طرف جھکنے لگتا ہے اور ۲۳ درجہ شمال کے مدار تک جاتا ہے اور گرمیوں کے آغاز سے پیچھے کی طرف لوٹتا ہے یہاں تک کہ آغازِ خزاں تک خطِ اعتدال تک پہنچ جاتا ہے اور اسی خط پر وہ اپنا سفر سردیوں کے آغاز تک جنوب کی طرف جاری رکھتا ہے اور سردیوں کے آغاز سے خطِ اعتدال کی طرف حرکت کرتا ہے اور آغازِ بہار میں وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔

البتہ یہ تمام حرکتیں حقیقت میں زمین کی حرکت اور اس کے محور کے اس کے مدار کی نسبت جھکاؤ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ ظاہر میں سورج کی حرکت محسوس ہوتی ہے۔

بعض دوسروں نے اسے "کرۂ آفتاب" کی حرکتِ وضعی کی طرف اشارہ جانا ہے کیونکہ ماہرین اور سائنسدانوں کی تحقیق نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ سورج خود اپنے محور کے گرد گردش کرتا ہے [2]

زیر بحث آیت کی آخری اور جدید ترین تفسیر وہی ہے جو ماہرین نے کشف کی ہے اور وہ سورج کا،

---

[1] اس جملے کی ترکیب میں دو احتمال ہیں، پہلا یہ کہ "اللیل" پر عطف ہے۔ اس صورت میں معنی اس طرح ہوگا "و اٰیة لهم الشمس" (اور سورج ان کے لیے آیت ہے) اور دوسرا یہ کہ الشمس مبتدا ہے اور تجری اس کی ضمیر ہے۔ ہم نے پہلے احتمال کو اختیار کیا ہے۔

[2] اس تفسیر کے مطابق "لمستقرلها" میں "لام" "فی" کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

ہماری کہکشاؤں کے وسط میں، تمام نظامِ شمسی کے ساتھ ایک معین سمت اور دور دراز کے ستارے کی طرف کہ جسے "وگا" کہتے ہیں، حرکت کرتا ہے۔

یہ سب معانی ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تضاد نہیں رکھتے اور ممکن ہے کہ "تجری" ان تمام حرکات اور بعض دوسری حرکات کی طرف بھی اشارہ ہو کہ جن تک ہمارا علم نہیں پہنچا اور شاید آئندہ زمانے میں وہ معلوم ہو جائیں۔

بہرحال سورج کے اتنے بڑے عظیم کرّے کو حرکت دینا کہ جو ہماری زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے اور وہ بھی اس فضائے بیکراں میں پورے حساب کتاب کے ساتھ حرکت دینا، کسی کے بس میں نہیں ہے سوائے اس خدا کے کہ جس کی قدرت تمام قدرتوں سے مافوق ہے اور جس کا علم غیر متناہی ہے۔ اسی بنا پر آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "یہ خدائے قادر و دانا کی تقدیر ہے" (ذٰلک تقدیر العزیز العلیم)۔

اس آیہ کے سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ اس کی تعبیرات میں شمسی سال کے پُرمعنی نظام کی طرف اشارہ ہے کہ جو مختلف برج میں سورج کے حرکت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسا نظام کہ جو انسانی زندگی کو نظم و ضبط اور پروگرام دیتا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو منظم کرتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

اس لیے بعد والی آیت میں اس بحث کی تکمیل کے لیے، چاند کی حرکت اور اس کی منازل کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے کہ جس سے مہینے کے دنوں کا نظام بنتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: "ہم نے چاند کے لیے منزلیں قرار دی ہیں اور جس وقت وہ ان منزلوں کو طے کر لیتا ہے تو آخر کار کھجور کی پرانی شاخ کی مانند، کمان کی صورت اور زرد رنگ اختیار کر لیتا ہے" (والقمر قدرناہ منازل حتیٰ عاد کالعرجون القدیم)۔

"منازل" سے مراد وہی اٹھائیس منزلیں ہیں کہ جنہیں چاند "محاق" اور مطلق تاریکی سے پہلے طے کرتا ہے۔ کیونکہ جس وقت مہینے کے تیس دن پورے ہوں تو وہ اٹھائیس راتوں تک آسمان پر دیکھا جا سکتا ہے لیکن اٹھائیسویں رات بہت ہی باریک، زرد رنگ، کم نور ہلال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور باقی دو راتوں میں نظر بھی نہیں آتا۔ کہ جسے "محاق" کا نام دیتے ہیں لیکن وہ مہینے جو انتیس دن کے ہوتے ہیں ان میں ستائیسویں رات تک چاند آسمان پر نظر آتا ہے اور باقی دو راتیں "محاق" کی ہیں۔

یہ منزلیں مکمل طور پر حساب شدہ ہیں اس طرح سے کہ منجمین سینکڑوں سال پہلے اپنے دقیق حساب کتاب کے مطابق پیش گوئی کر سکتے ہیں۔

یہ عجیب و غریب نظام انسانوں کی زندگی کو نظم و ضبط بخشتا ہے اور یہ ایک طبیعی آسمانی تقویم ہے کہ جسے ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ نجومی پڑھ سکتا ہے۔ اس طرح سے کہ اگر انسان مختلف راتوں میں چاند کی کیفیت میں تھوڑا سا غور کرے تو اسے دیکھنے سے ہی صحیح صحیح یا قریب قریب جان سکتا ہے کہ یہ رات مہینے کی کون سی

Marfat.com

رات ہے (ہم نے خود اس بات کو آزمایا ہے)۔

کیونکہ ابتدائے ماہ میں چاند کی نوکیں اوپر کی طرف ہوتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ چاند کے حجم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ساتویں تک پورے چاند کا آدھا دائرہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ پھر اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ چودھویں رات کو بدر کامل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے بعد چاند نیچے کی سمت سے گھٹنا اور کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اکیسویں تک (گھٹتے گھٹتے) پھر آدھے دائرے کی شکل میں ہو جاتا ہے اور اسی طرح اس میں کمی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اٹھائیسویں شب کو ضعیف اور کم رنگ ہلال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس رات اس کی نوکیں نیچے کی طرف ہوتی ہیں۔

ہاں! انسانوں کی زندگی کی بنیاد تنظیم سے ہی درست رہتی ہے اور نظم وضبط، زمانہ اور وقت کے دقیق تعین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ خدا نے آسمان میں یہ ماہانہ اور سالانہ دقیق تقویم اسی مقصد کے لیے قرار دی ہے۔

یہیں سے "کالعرجون القدیم"[1] کی لطیف تعبیر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ "عرجون" جیسا کہ اکثر مفسرین اور ارباب لغت نے بیان کیا ہے، کھجور کے خوشے کے اس حصے کو کہتے ہیں کہ جو درخت سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ خرمے خوشے کی شکل میں درخت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس خوشے کا نچلا حصہ زرد رنگ کمان کی شکل میں ہوتا ہے کہ جو درخت کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور اس کی نوک جارو کی طرح ہوتی ہے اور خرمے کے دانے انگور کے دانوں کی طرح اس کے دھاگوں کے ساتھ متصل ہوتے ہیں۔ جس وقت کھجور کے خوشے کو کاٹتے ہیں تو وہ قوسی شکل کا نچلا حصہ درخت پر باقی رہ جاتا ہے اور جس وقت وہ خشک اور پژمردہ ہو جاتا ہے تو مکمل طور پر "محاق" سے پہلے والے ہلال کی طرح ہوتا ہے کیونکہ جس طرح آخری ماہ میں ہلال آسمان کے مشرق کی طرف صبح کے وقت یوں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خمیدہ، پژمردہ اور زرد رنگ ہوتا ہے اور اس کی نوکیں نیچے کی طرف ہوتی ہیں "عرجون القدیم" بھی اسی طرح ہوتا ہے۔

حقیقت میں یہ مشابہت مختلف جہات میں ظاہر ہوتی ہے۔ کھجور کے خوشے کی لکڑی کے ہلالی نما ہونے کے لحاظ سے، زرد رنگ ہونے کے لحاظ سے، پژمردگی کے لحاظ سے، اس کی قوس کی نوک کے نچلی طرف مائل ہونے کے لحاظ سے اور کھجور کے درخت کی سبز رنگ شاخوں کے درمیان ہونے کے لحاظ سے کہ جو سیاہ رنگ آسمان پر آخری رات کے ہلال کے قرار پانے

---

[1] "عرجون" بعض ارباب لغت کے مطابق "انعراج" کے مادہ سے "اعوجاج" اور "انعطاف" (ٹیڑھ پن اور جھکاؤ) کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اس بنا پر اس کی نون زائد ہے اور "فعلون" کے وزن پر ہے لیکن بعض دیگر کے نزدیک یہ لفظ "عرجن" کے مادہ سے لیا گیا ہے اور اس کی نون اصلی ہے اور یہ شاخ کے نچلے حصے کے معنی میں ہے کہ جو ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور کھجور کے درخت پر باقی رہ جاتا ہے اور "قدیم" ہر اس کہنہ اور پرانی چیز کے معنی میں ہے کہ جسے ایک زمانہ گزر گیا ہو۔

Marfat.com

کے ساتھ غیر مشابہ نہیں ہے۔

نیز اسے "قدیم" کہنا اس کی کہنگی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جس قدر یہ شاخیں، زیادہ کہنہ ہو جاتی ہیں اسی قدر زیادہ باریک اور زیادہ زرد رنگ ہو جاتی ہیں' آخر ماہ کے ہلال سے زیادہ مشابہ ہو جاتی ہیں سبحان اللہ ایک چھوٹی سی تعبیر میں کتنی لطافتیں اور کیسی کیسی زیبائیاں پنہاں ہیں۔

٭ ٭ ٭

آخری زیر بحث آیت میں سال، ماہ اور شب و روز کے اس نظام کے ثبات و دوام کے بارے میں گفتگو ہے۔ پروردگار نے ان کے لیے اس طرح سے پروگرام منظم کیا ہے کہ ان کی کیفیت میں معمولی سا اختلاف بھی پیدا نہیں ہوتا اور تاریخ بشر اسی ثبات کی بنا پر مکمل طور سے منظم رہتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "نہ تو سورج کے بس میں ہے کہ چاند تک پہنچ جائے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں" (لا الشمس ینبغی لھا ان تدرك القمر ولا اللیل سابق النھار وکل فی فلك یسبحون)۔

ہم جانتے ہیں کہ سورج اپنا دورہ بارہ برجوں میں ایک سال میں مکمل کرتا ہے، جبکہ چاند اپنی منزلوں کو ایک مہینے میں طے کرتا ہے۔

اس بنا پر چاند کا اپنے مدار میں گردش کرنا، سورج کی اپنے مدار میں گردش سے بارہ گنا زیادہ تیز ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ سورج اپنی گردش میں ہرگز چاند تک نہیں پہنچتا اور وہ اپنی ایک سالہ حرکت کو ایک ماہ میں انجام نہیں دیتا اور سالانہ نظام درہم برہم نہیں ہوتا۔

اسی طرح رات دن پر سبقت حاصل کر کے اس کا ایک حصہ اپنے اندر داخل نہیں کر لیتی کہ موجودہ نظام ٹوٹ جائے بلکہ یہ سب کے سب اپنا سفر ہزاروں سال سے بغیر کسی تبدیلی کے جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس بحث میں سورج کی حرکت سے مراد اس کی وہ حرکت ہے کہ جو ہماری حس کے مطابق ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ تعبیر اس امر کے پایۂ ثبوت کو پہنچ جانے کے بعد بھی ــ کہ سورج اپنی جگہ پر ساکن ہے اور زمین ایک سال کی مدت میں اس کے گرد چکر لگاتی ہے ــ کارآمد ہے، مثلاً آج بھی ہم یہ کہتے ہیں کہ سورج برج حمل میں داخل ہو گیا ہے یا سورج دائرۂ نصف النہار پر پہنچ گیا ہے یا اس کا میل کلی تک پہنچنا ہے (میل کلی سے مراد گرمیوں کی ابتداء میں نصف کرہ شمالی میں سورج کا اپنے آخری نقطہ ارتفاع تک پہنچ جانا یا اس کے برعکس سردیوں کی ابتداء میں آخری نچلی حد تک پہنچنا ہے)۔

یہ سب کی سب تعبیریں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ زمین کے سورج کے گرد گردش کرنے اور

Marfat.com

سورج کے ساکن ہونے کے انکشاف کے بعد بھی سورج کی حرکت سے متعلق گزشتہ تعبیرات ہی استعمال ہوتی ہیں کیونکہ حسی طور پر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ سورج حرکت میں ہے۔

سورج اور چاند کا اپنے اپنے افلاک میں تیرنے (کل فی فلک یسبحون) کا مفہوم بھی یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ سورج کے اپنے فلک میں تیرنے سے مراد نظام شمسی اور اس کہکشاں کے ساتھ اس کا حرکت کرنا ہے کہ جس میں ہم موجود ہیں۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ ہمارا نظام شمسی اس عظیم کہکشاں کا ایک جزء ہے کہ جو خود اپنے گرد گردش کر رہی ہے[1]

کیونکہ "فلک" جیسا کہ ارباب لغت نے بیان کیا ہے اصل میں لڑکیوں کے پستان اُبھرنے اور گول شکل اختیار کرنے کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ زمین کے ان قطعات کے لیے کہ جو گول ہیں یا دوسری گول چیزوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اسی بنا پر سیاروں کی گردش کے راستوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

"کل فی فلک یسبحون" کا جملہ بہت سے مفسرین کے نظریے کے مطابق سورج، چاند اور ستاروں میں سے ہر ایک کی طرف اشارہ ہے کہ جو اپنا اپنا راستہ اور مدار رکھتے ہیں، اگرچہ آیات میں ستاروں کا نام نہیں آیا لیکن "لیل" (رات) کے ذکر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور ستاروں کا چاند اور سورج کے مانند ہونے کو دیکھتے ہوئے مذکورہ جملے سے اس معنی کو سمجھنا بعید نظر نہیں آتا۔ خاص طور پر جبکہ "یسبحون" صیغہ جمع کی شکل میں بیان ہوا ہے۔

یہ تفسیر بھی موجود ہے کہ ممکن ہے یہ جملہ سورج، چاند اور رات اور دن کی طرف اشارہ ہو کیونکہ رات اور دن میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک مدار رکھتے ہیں اور کرۂ زمین کے گرد گردش کرتے ہیں۔ تاریکی کرۂ زمین کے نصف حصہ کو ہمیشہ چھپائے رکھتی ہے اور روشنی دوسرے نصف حصہ پر رہتی ہے اور یہ دونوں چوبیس گھنٹوں میں ایک پورا دور زمین کے گرد لگاتے ہیں۔

"یسبحون"، "سباحت" کے مادہ سے ہے۔ مفردات میں راغب کے مطابق اصل میں یہ لفظ پانی اور ہوا میں سریع اور تیز حرکت کے معنی میں ہے[2] یہاں یہ لفظ آسمانی کُروں کی سریع حرکت کی طرف اشارہ کر رہا

---

[1] یہ حرکت اس حرکت کے علاوہ ہے کہ جو پورے نظام شمسی کی کہکشاں کے اندر ہے کہ جو ستارہ "وگا" کی طرف حرکت میں ہے اور اس کی طرف ہم نے اشارہ بھی کیا ہے۔

[2] یہ جو خدا کے ذکر اور اس کی عبادت کو "تسبیح" کہتے ہیں تو وہ بھی اسی وجہ سے ہے کہ وہ بھی پروردگار کی اطاعت و عبادت کی راہ میں ایک تیز حرکت ہے۔ (مفردات راغب مادۂ "سبح")

Marfat.com

ہے اور انہیں ایسی عاقل موجودات سے تشبیہ دے رہا ہے کہ جو تیزی کے ساتھ اپنی گردش جاری رکھے ہوئے ہوں. موجودہ زمانے میں بھی یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ اجرام سماوی بہت ہی حیران کن تیزی کے ساتھ اپنے مدار میں حرکت کرتے ہیں ۔

چند اہم نکات

۱۔ سورج کی "دورانی" اور جریانی حرکت : عربی زبان میں "دوران" دائرہ کی صورت میں حرکت کو کہتے ہیں جبکہ "جریان" طولی حرکت کی طرف اشارہ ہے ۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ زیر بحث آیات میں قرآن سورج کے لیے جریانی حرکت کا بھی قائل ہے اور دورانی حرکت کا بھی ۔ ایک جگہ کہتا ہے : " والشمس تجری ...." اور دوسری جگہ سورج کے فلک میں تیرنے (دائرے کی صورت میں حرکت) کی بات کرتا ہے : "کل فی فلک یسبحون "

جس زمانے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں ، ہیئت بطلیموس کا مفروضہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ محافل علمی میں تسلیم شدہ تھا ۔ اس مفروضے کے مطابق اجرام فلکی کی اپنی کوئی حرکت نہیں بلکہ وہ افلاک کے اندر میخوں کی طرح گڑے ہوئے ہیں جبکہ افلاک پیاز کے چھلکوں کے مانند ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ بلوریں اجسام کی صورت میں ہیں اور اجرام فلکی کی حرکت ان کے افلاک کی حرکت کے تابع ہے ۔ اس بنا پر اُس زمانے میں نہ سورج کا تیرنا کوئی مفہوم رکھتا تھا اور نہ ہی اس کی طولی و جریانی حرکت ۔

لیکن حالیہ صدیوں کے انکشافات نے بطلیموس کے مفروضے کو ختم کر دیا اور اجرام آسمانی کے بلوریں افلاک سے آزاد قرار دے دیا ۔ اس کے بعد اس نظریے نے قوت پکڑی کہ سورج نظام شمسی کے مرکز میں ثابت اور غیر متحرک ہے اور سارا نظام شمسی پروانہ وار اس کے گرد گھومتا ہے ۔

اس مقام پر پہنچ کر بھی زیر بحث آیات کی تعبیروں کا مفہوم واضح نہیں تھا کیونکہ یہ تو سورج کی طرف طولی اور جریانی حرکت کی نسبت دے رہی تھیں ۔

یہاں تک کہ سائنس نے اپنی پیش رفت مزید جاری رکھی اور آخر کار سورج کی چند ایک حرکات ثابت ہو گئیں :

(۱) اس کی خود اپنے گرد وضعی حرکت ۔

(۲) نظام شمسی کے ساتھ آسمان کے ایک مشخص نقطے کی طرف اس کی طولی حرکت ۔

(۳) اس کی دورانی حرکت اس کہکشاں کے مجموعے کے ساتھ کہ جس کا یہ سورج حصہ ہے ۔

اس طرح سے قرآن کا ایک اور علمی معجزہ ثبوت کو پہنچ گیا ۔

اس مسئلے کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ہم اس بحث کا ایک حصہ یہاں پیش کرتے ہیں کہ جو ایک دائرۃ المعارف

Marfat.com

میں سورج کی حرکت کے بارے میں بیان ہوا ہے :

سورج "ظاہری" حرکات (یومیہ حرکت اور سالانہ حرکت) اور "واقعی" حرکات کا حامل ہے۔

سورج کرۂ آسمانی کی یومیہ اور ظاہری حرکت میں شریک ہے۔ ہمارے آدھے کرہ میں مشرق سے طلوع کرتا ہے، جنوب کی طرف نصف النہار کے مقام سے گزرتا ہے اور مغرب میں غروب کرتا ہے۔ نصف النہار سے اس کا عبور حقیقی ظہر کو مشخص کرتا ہے۔

سورج کی ایک سالانہ "ظاہری" حرکت زمین کے گرد بھی ہے کہ جو اس کو ہر "روز" مغرب سے مشرق کی طرف تقریباً ایک درجہ لے جاتی ہے۔ اس حرکت میں سورج سال میں ایک مرتبہ بُرجوں کے سامنے سے گزرتا ہے۔ اس حرکت کا مدار "دائرۃ البروج" میں واقع ہے۔ یہ حرکت علم نجوم کی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے "اعتدالین" و "انقلاب" اور "میل کلی" اسی کے ساتھ مربوط ہے اور شمسی سال اسی سے وجود پاتا ہے۔

ان ظاہری حرکات کے علاوہ کہکشاں کی حرکت دورانی سورج کو قریباً گیارہ لاکھ تیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار کے ساتھ فضا میں گردش دیتی ہے لیکن کہکشاں کے اندر بھی سورج ثابت و ساکن نہیں ہے بلکہ قریباً بہتر ہزار چار سو کلومیٹر کی رفتار سے صورت فلکی (جاثی علی رکبتیہ)[1] کی جانب حرکت کرتا ہے۔

اور یہ جو ہم فضا میں سورج کی اس تیز حرکت سے بے خبر ہیں، تو یہ اجرام فلکی کے دُوری ہونے کی وجہ سے ہے، کہ جو اس خاص حرکت وضعی کی تشخیص کا ماخذ بھی ہے۔

سورج کی حرکت وضعی اس کے استوار میں تقریباً پچیس دن میں ہوتی ہے۔[2] و[3]

۲۔ "تدرک" اور "سابق" کی تعبیر : قرآنی تعبیرات اس قدر جچی تُلی ہوتی ہیں کہ جن کی باریکیاں شمار نہیں ہوسکتیں۔ زیر بحث آیات میں جس وقت سورج اور چاند کی ماہانہ اور سالانہ گردش کے سلسلے میں ظاہری حرکت کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے، تو قرآن یہ کہتا ہے کہ "سورج کے لیے سزاوار نہیں ہے کہ وہ چاند تک پہنچ جائے" (کیونکہ چاند اپنے سفر کو ایک ماہ میں طے کرتا ہے اور سورج ایک سال میں، تیز رفتاری کا

---

[1] "جاثی علی رکبتیہ" ستاروں کا ایک مجموعہ ہے کہ جو ایک فلکی صورت تشکیل دیتا ہے۔ یہ اس شخص سے مشابہ ہے کہ جو گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا اور کھڑا ہونے کے لیے تیار ہو اور یہ تعبیر اس معنی سے لی گئی ہے۔

[2] یعنی سورج ہمارے پچیس شب و روز میں ایک مرتبہ اپنے گرد گردش کرتا ہے: یہ امر ماہرین نے سورج کے سطحی ٹکڑوں کے مطالعے سے اخذ کیا ہے کیونکہ انہوں نے دیکھا ہے کہ یہ ٹکڑے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں اور پچیس دنوں کے بعد پھر مکمل طور پر اپنی جگہ پر واپس آجاتے ہیں۔

[3] دائرۃ المعارف "دھخدا" مادہ خورشید، جلد ۲۲۔

Marfat.com

یہ فرق اس قدر ہے کہ یہ ہرگز اس تک نہیں پہنچ سکتا (لا الشمس ینبغی لھا ان تدرك القمر)۔
لیکن دن رات کے بارے میں وہ آپس میں چنداں فاصلہ نہیں رکھتے اور بالکل ایک دوسرے کے پیچھے موجود ہیں۔

۳۔ انسانی زندگی میں نور وظلمت کا نظام: آیات زیر بحث میں دو ایسے موضوعات کی طرف اشارہ ہے کہ جو انسانی زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور انہیں آیات الٰہی قرار دیا گیا ہے اور وہ ہیں رات کی تاریکی اور دوسرا سورج اور اس کی روشنی۔

اس سے پہلے بھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ نور، عالم مادہ کے موجودات میں سے لطیف ترین اور پُربرکت ترین موجود ہے۔ نہ صرف روشنی اور ہماری زندگی بلکہ ہر حرکت سورج کے نور کے ساتھ وابستگی رکھتی ہے۔ بارش کے قطروں کا نزول، نباتات کی نشوونما، غنچوں کا چٹخنا، پھلوں کا پکنا، ندی نالوں کا زمزمہ، انسانوں کے دسترخوان پر انواع واقسام کی غذائیں۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے کارخانوں کے پہیوں کا چلنا، بجلی اور طرح طرح کی صنعتی پیداوار سب کا تعلق توانائی (ENERGY) کے اسی عظیم منبع ـ یعنی سورج کی روشنی سے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کرۂ زمین کی تمام توانائیاں (سوائے اس توانائی کے جو ایٹم کے ذرے کو توڑنے سے پیدا ہوتی ہے) سورج کے نور سے مدد لیتی ہیں اور اگر وہ نہ ہوتا تو ہر جگہ خاموشی ہوتی اور ہر چیز بے روح، بے نور، بے حرکت اور مُردہ ہوتی۔

رات کی تاریکی اگرچہ موت اور فنا کی بُو دیتی ہے لیکن نورِ آفتاب کی تبدیلی کے لحاظ سے اور جسم و رُوح کے آرام و سکون نیز سورج کی روشنی کی ایک ہی طرح کی تپش کے خطرات سے بچانے میں اس کا کردار انسانوں کے لیے حیات بخش شمار ہوتا ہے کیونکہ اگر رات اور دن باری باری نہ آتے تو کرۂ زمین میں حرارت اتنی بڑھ جاتی کہ تمام چیزوں کو آگ لگ جاتی۔ جیسا کہ چاند میں طولانی راتیں اور دن ہیں (ہر ایک کرۂ زمین کے پندرہ رات دن کے برابر ہے) اگر یوں ہوتا تو دنوں میں تباہ کن گرمی ہوتی اور راتوں کو ہولناک سردی ہوتی۔

اس بنا پر ان دونوں (نور وظلمت) میں سے ہر ایک آیاتِ الٰہیہ میں سے ایک عظیم آیت ہے۔

اس سے قطع نظر ایک بہت ہی دقیق نظام کہ جو ان دونوں پر حاکم ہے، انسانوں کی زندگی کی منظم تاریخ کو وجود میں لانے والا ہے۔ ایسی تاریخ کہ اگر وہ نہ ہوتی تو اجتماعی روابط ختم ہو کر رہ جاتے اور انسان کے لیے زندگی بہت مشکل ہو جاتی۔ اس لحاظ سے بھی یہ دونوں آیاتِ الٰہی میں سے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن ان آیات میں کہتا ہے کہ: "رات دن پر سبقت حاصل نہیں کرتی" یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ دن کو رات سے پہلے خلق کیا گیا ہے اور رات اس کے بعد میں۔ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اگر کوئی شخص کرۂ زمین کے باہر سے نگاہ کرے تو وہ ان دونوں کو دو سیاہ وسفید موجودات کے

Marfat.com

مانند دیکھے گا کہ جو مسلسل کرۂ زمین کے گرد گردش کر رہے ہیں، اور اس دائرے کی حرکت میں پہلے اور بعد کا تصور نہیں ہو سکتا۔

لیکن ہمیں اس حقیقت پر توجہ دینا چاہیئے کہ ہماری زمین کا یہ کرہ پہلے سورج کا ہی ایک جز تھا اور اس وقت ہر جگہ دن ہی دن تھا اور رات کا کوئی وجود ہی نہیں تھا، لیکن جونہی زمین اس سے جُدا ہوئی تو اس کا مخروطی شکل کا سایہ نورِ آفتاب کی مخالف سمت میں پڑا تو رات پیدا ہو گئی، وہ رات کہ جو دن کے پیچھے حرکت کر رہی ہے۔ اس پہلو پر نظر کرنے سے یہاں اس تعبیر کی دقت دگہرائی اور لطافت واضح ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، نہ صرف سورج اور چاند اس فضائے بیکراں میں تیر رہے ہیں بلکہ رات اور دن بھی اس فضا میں کرۂ زمین کے گرد تیر رہے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک مدار اور گردش کی رہگذر رکھتا ہے۔

ایسی بہت سی روایات میں بھی کہ جو اہلِ بیت علیہم السلام سے منقول ہیں، اس معنی کی تصریح ہوئی ہے کہ خدا نے دن کو رات سے پہلے پیدا کیا ہے۔

ایک روایت میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

خلق النہار قبل اللیل

"دن کو رات سے پہلے خلق کیا گیا ہے"۔[۱]

ایک دوسری روایت میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے:

النہار خلق قبل اللیل

"دن رات سے پہلے خلق ہوا"۔

پھر امامؑ نے "لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النہار" کی آیت سے اس سلسلے میں استدلال فرمایا۔[۲]

اسی مطلب کی ایک حدیث امام باقرؑ سے بھی بصورت ذیل منقول ہے:

ان اللّٰہ عزوجل خلق الشمس قبل القمر وخلق النور قبل الظلمۃ۔

"خدائے بزرگ نے سورج کو چاند سے پہلے اور نور کو ظلمت سے پہلے خلق کیا"۔[۳]

---

[۱] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[۲] نور الثقلین، جلد ۴ ص ۳۸۷، بحوالہ احتجاج طبرسی۔

[۳] نور الثقلین، جلد ۴ ص ۳۸۷، بحوالہ روضۃ الکافی۔

Marfat.com

(۴۱) وَاٰیَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَهُمْ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ

(۴۲) وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا یَرْكَبُوْنَ ۝

(۴۳) وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِیْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ یُنْقَذُوْنَ ۙ

(۴۴) اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ ۝

ترجمہ

(۴۱) یہ بھی ان کے لیے (عظمتِ پروردگار کی) ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی ذریت کو (وسائل زندگی اور سازوسامان سے) بھری ہوئی کشتیوں میں سوار کیا۔

(۴۲) اور ہم نے ان کے لیے اُس جیسی دوسری سواریاں بھی پیدا کیں۔

(۴۳) اور اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کر دیں، اس طرح سے کہ نہ تو کوئی ان کا فریادرس ہو اور نہ ہی کوئی انہیں دریا سے نکال سکے۔

(۴۴) مگر یہ کہ پھر دوبارہ ہماری رحمت ہی ان کے شامل حال ہو اور ایک معین وقت تک وہ اس زندگی سے بہرہ ور ہوں۔

تفسیر

کشتیوں کا دریاؤں میں چلنا بھی آیتِ الٰہی ہے

اگرچہ قرطبی اور بعض دوسرے مفسرین نے زیرِ بحث پہلی آیت کو اس سورہ کی پیچیدہ ترین آیت شمار

Marfat.com

کیا ہے لیکن ان آیات میں غور کرنے اور گزشتہ آیات سے ان کا تعلق دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ ان آیات کی تفسیر میں کوئی خاص پیچیدگی نہیں ہے کیونکہ گزشتہ آیات میں سورج، چاند، رات، دن اور اسی طرح زمین اور زمین کی برکات کی خلقت میں پروردگار کی نشانیوں کے بارے میں گفتگو تھی جبکہ زیر بحث آیات میں دریاؤں اور سمندروں کی نعمتوں یعنی ان میں تجارتی اور مسافر بردار کشتیوں اور جہازوں کے چلنے کے بارے میں گفتگو ہے۔

علاوہ ازیں کشتیوں کا سمندر کے اندر چلنا، آسمانی ستاروں کی فضا کے سمندر میں حرکت کرنے کے ساتھ غیر مشابہ نہیں ہے۔

اس لیے پہلے فرمایا گیا ہے کہ: "یہ بھی ان کے لیے عظمتِ پروردگار کی ایک نشانی ہے کہ ہم ان کی اولاد و ذریت کو ان کشتیوں میں کہ جو وسائلِ زندگی سے پُر ہیں سوار کرتے ہیں" (و اٰیۃ لھم انا حملنا ذریتھم فی الفلک المشحون)۔

"لھم" کی ضمیر نہ صرف مشرکینِ مکہ کی طرف بلکہ ان تمام عباد اور بندگانِ خدا کی طرف لوٹتی ہے کہ جن کے بارے میں گزشتہ آیات میں گفتگو تھی۔

"ذریۃ" جیسا کہ راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے اصل میں چھوٹی اولاد کے معنی میں ہے اگرچہ بعض اوقات تمام چھوٹی بڑی اولاد پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ لفظ مفرد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور جمع کے معنی میں بھی۔

قرآن کہتا ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو (یا چھوٹی اولاد کو) ان کشتیوں میں سوار کیا۔ گویا اولاد کے بارے میں گفتگو ہے اور خود ان کے بارے میں کوئی بات نہیں۔ شاید یہ اس مناسبت سے ہے کہ بچے اس سواری کی زیادہ احتیاج رکھتے ہیں کیونکہ بڑی عمر کے لوگ تو دریاؤں کے ساحل کے ساتھ ساتھ چل کر بھی راستہ طے کر لیتے ہیں۔

اس سے قطع نظر یہ تعبیر ان کے احساسات و میلانات کی تحریک کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

لفظ "مشحون" (مملو اور پُر) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نہ صرف وہ خود کشتی میں سوار ہوتے ہیں بلکہ ان کے مال تجارت اور ضروریاتِ زندگی کی نقل و حمل بھی اس کے ذریعے ہوتی ہے۔ بعض نے اس آیت میں "فلک" سے خاص طور پر حضرت نوحؑ کی کشتی مراد لی ہے اور "ذریۃ" کی آباؤ اجداد کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ "ذرا" کے مادہ سے خلقت کے معنی میں ہے۔

یہ تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے ہاں اگر اس سے مراد ایک واضح مصداق بیان کرنا ہو تو پھر ٹھیک ہے۔

بہرحال کشتیوں کا چلنا کہ جو بشر کے لیے نقل و حمل کا ایک عظیم اور اہم ترین ذریعہ ہے اور ان سے

Marfat.com

جو کام لیا جاتا ہے وہ دوسرے ذرائع نقل وحمل کی نسبت ہزاروں گنا زیادہ ہے ۔ یہ سب نتیجہ ہے پانی کے اپنے خواص کا، ان اجسام کے مخصوص وزن کہ جن سے کشتی بنتی ہے ، بادبانی کشتیوں کے لیے ہواؤں کی خاصیت کا ——— انجن والی کشتیوں کے بخارات کی قوت کا اور ان کشتیوں میں کہ جو ایٹمی طاقت سے کام کرتی ہیں ایٹمی توانائی کا ۔

یہ سب ایسی قوتیں اور طاقتیں ہیں کہ جنہیں خدا نے انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک (علیحدہ علیحدہ بھی) اور مجموعی طور پر بھی آیاتِ الٰہی میں سے ہیں ۔

نیز اس بنا پر کہ یہ وہم نہ ہو کہ خداداد سواریاں صرف کشتیاں ہی ہیں اس کے بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے: "ہم نے ان کے لیے دوسری سواریاں بھی ان کے مانند خلق کی ہیں" (و خلقنا لھم من مثلہ ما یرکبون) ۔ وہ سواریاں کہ جو خشکی یا ہوا اور فضا میں چلتی ہیں اور انسانوں اور ان کے سازوسامان کو اپنے دوش پر اٹھاتی ہیں ۔

اگرچہ بعض نے خصوصیت کے ساتھ یہاں اونٹ مراد لیا ہے جس کا نام "صحرائی کشتی" یا "صحرا کا جہاز" پڑ گیا ہے ۔ بعض نے تمام چوپائے مراد لیے ہیں اور بعض نے ہوائی جہاز اور فضائی کشتیاں مراد لی ہیں جو ہمارے زمانے میں بنی ہیں (اور ان کے بارے میں "خلقنا" کی تعبیر اس لحاظ سے ہے کہ ان کا مواد اور وسائل پہلے سے خلق شدہ ہیں)۔

لیکن آیت کی تعبیر کا اطلاق ایک وسیع مفہوم کی تصویر پیش کرتا ہے کہ جس میں یہ سب اور ان کے علاوہ اور دوسری سواریاں بھی موجود ہیں ۔

البتہ قرآن کی متعدد آیات میں "انعام" (چوپائے کا) "فلک" (کشتیوں) کے ساتھ ذکر ہوا ہے مثلاً :

وجعل لکم من الفلك والانعام ما ترکبون

کشتیوں پر بھی اور چوپاؤں میں سے بھی اس نے ایسے پیدا کیے ہیں کہ جن پر تم سوار ہوتے ہو (زخرف - ۱۲) ۔

اور سورہ مؤمن کی آیت ۸۰ میں ہے :

وعلیھا وعلی الفلك تحملون

اور تم چوپاؤں اور کشتیوں پر بوجھ لادتے (اور سوار ہوتے) ہو ۔

لیکن یہ آیات بھی زیر بحث آیت کے مفہوم کی عمومیت کے ساتھ تضاد نہیں رکھتیں ۔

بعد والی آیت میں، اس عظیم نعمت کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ، ایک حالت بیان کی گئی ہے — کہ جو اس نعمت کے دگرگوں ہونے سے پیدا ہوتی ہے ۔ فرمایا گیا ہے: "اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کر دیں اس طرح کہ نہ تو کوئی ان کا فریادرس ہو اور نہ ہی کوئی ایسا آدمی کہ جو انہیں دریا سے باہر نکال سکے" (و ان

Marfat.com

نشأ نغرقهم فلا صريخ لهم ولا هم ينقذون)۔

ہم کسی عظیم لہر کو حکم دے دیں گے کہ وہ ان کی کشتی کو اُلٹ دے یا ایک بھنور کو مامور کر دیں گے کہ وہ انہیں نگل لے یا ایک طوفان کو حکم دے دیں گے کہ وہ انہیں ایک تنکے کی طرح اٹھا کر موجوں کے اندر پھینک دے۔

اگر ہم چاہیں تو پانی اور کشتی کی خاصیت اور ہوا چلنے کے نظام اور دریا کے سکون کو درہم برہم کر دیں تاکہ ان کی ہر چیز تباہ ہو جائے یہ ہم ہی ہیں کہ جو اس نظام کو دوام بخشتے ہیں تاکہ وہ بہرہ ور ہوں اور اگر ہم کبھی کبھی اس قسم کے حادثات بھیجتے ہیں تو یہ اس بنا پر ہے کہ وہ اس نعمت کی اہمیت کو سمجھیں کہ جس میں وہ مستغرق ہیں۔

"صریخ"، "صراخ"، کے مادہ سے، فریاد رس کے معنی میں ہے اور "ینقذون"، "انقاذ" کے مادہ سے پکڑ لینے اور نجات دینے کے معنی میں ہے۔

٭ ٭ ٭

آخر میں آخری زیر بحث آیت — اس گفتگو کی تکمیل کے لیے مزید کہتی ہے: "مگر یہ کہ پھر بھی ہماری رحمت ہی ان کے شامل حال ہو اور وہ ایک معین زمانے تک اس زندگی سے فائدہ اٹھائیں" (الا رحمة منا ومتاعا الى حين)۔

ہاں! وہ کسی بھی ذریعے سے نجات نہیں پا سکتے مگر یہ کہ ہماری ہی رحمت کی بادِ نسیم چلے اور ہمارا ہی لطف و کرم ان کی مدد کے لیے آئے۔

"حین" وقت کے معنی میں ہے اور اس آیت میں انسان کی زندگی کے اختتام اور اس کی اجل کی طرف اشارہ ہے بعض نے اس سے اس جہان کا اختتام مراد لیا ہے۔

ہاں وہ لوگ کہ جو کشتی پر سوار ہوتے ہیں (خواہ وہ قدیم زمانے کی چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیاں ہوں یا موجودہ زمانے کے کوہ پیکر سمندری جہاز) انہوں نے اچھی طرح سے اس آیت کی تعبیر کی گہرائی کو سمجھا ہے کہ دنیا بھر کے عظیم بحری جہاز، دریاؤں کی عظیم موجوں اور سمندروں کے ہولناک طوفانوں کے مقابلے میں ایک تنکے کے مانند ہیں اور اگر رحمتِ الٰہی انسانوں کے شاملِ حال نہ ہو تو ان کی نجات ممکن نہیں ہے۔

وہ چاہتا ہے کہ اس مختصر سے وقفے میں کہ جو موت اور زندگی کے درمیان ہے، اپنی عظیم قدرت کی انسانوں کو نشاندہی کرائے کہ شاید راستے سے بھٹکے ہوئے انسان ہوش میں آجائیں اور اس طریقے سے اس کے راستے پر آجائیں۔

٭ ٭ ٭

Marfat.com

(۴۵) وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّقُوۡا مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡكُمۡ وَمَا خَلۡفَكُمۡ
لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ○
(۴۶) وَمَا تَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ اٰيَةٍ مِّنۡ اٰيٰتِ رَبِّهِمۡ اِلَّا كَانُوۡا عَنۡهَا
مُعۡرِضِيۡنَ ○
(۴۷) وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيۡنَ
كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗ ۖ
اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِيۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ○

ترجمہ

(۴۵) اور جس وقت ان سے یہ کہا جائے کہ جو کچھ (عذابِ الٰہی میں سے) تمہارے آگے اور پیچھے ہے اس سے ڈرو تاکہ رحمتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال ہو (تو وہ پرواہ نہیں کرتے)۔

(۴۶) اور ان کے پروردگار کی آیات میں سے کوئی آیت نہیں آتی مگر یہ کہ وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔

(۴۷) اور جس وقت ان سے یہ کہا جائے کہ خدا نے جو تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے (خدا کی راہ میں) خرچ کرو، تو کفار مومنین سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے شخص کو کھانا کھلائیں کہ جسے خدا چاہتا تو کھلا دیتا (لہٰذا خدا نے یہی چاہا ہے کہ وہ بھوکا رہے) تم تو محض کھلی گمراہی میں ہو۔

Marfat.com

تفسیر

وہ تمام آیاتِ الٰہی کو نظر انداز کر دیتے ہیں

گزشتہ آیات میں، وسیع عالم ہستی سے متعلق پروردگار کی آیات کے بارے میں گفتگو تھی، اب زیر بحث آیات میں ہٹ دھرم کفار کا طرزِ عمل بیان کیا گیا ہے کہ جو وہ آیاتِ الٰہی اور دعوتِ پیغمبر اور عذاب الٰہی سے ڈرانے کے جواب میں پیش کرتے ہیں۔

زیر نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: "جس وقت ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ عذاب الٰہی میں سے جو کچھ تمہارے آگے اور تمہارے پیچھے ہے اس سے ڈرو تاکہ رحمتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال ہو تو وہ پہلو تہی کرتے ہیں اور روگردان ہو جاتے ہیں" (واذا قیل لھم اتقوا ما بین ایدیکم وما خلفکم لعلکم ترحمون)[1]

"ما بین ایدیکم" (جو کچھ تمہارے سامنے ہے) "وما خلفکم" (اور جو کچھ تمہارے پیچھے ہے) سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے بہت سی تفسیریں بیان کی ہیں۔

ان میں ایک یہ ہے کہ "ما بین ایدیکم" سے مراد دنیا کی سزائیں اور عذاب ہیں کہ جن کا ایک نمونہ گزشتہ آیات میں بیان ہوا ہے اور "وما خلفکم" سے مراد آخرت کے عذاب ہیں کہ جو ان کے پیچھے ہیں۔ پیچھے کی تعبیر اس بنا پر ہے، کہ ابھی ان کی نوبت نہیں آئی، گویا وہ انسان کے پیچھے چل رہے ہیں اور انجام کار کسی دن اس تک پہنچ جائیں گے اور اس کا دامن پکڑ لیں گے اور ان عذابوں سے پرہیز کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے عوامل مہیا نہ کیے جائیں دوسرے لفظوں میں ایسے کام نہ کیے جائیں کہ جن کی وجہ سے انسان ان عقوبتوں کے مستحق بنیں۔

اس گفتگو کا شاہد یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی میں "اتقوا" کی تعبیر یا تو خدا کے بارے میں استعمال ہوئی ہے یا قیامت کے دن اور خدائی عذاب کے متعلق۔ جبکہ حقیقت میں دونوں کی بازگشت ایک ہی معنی کی طرف ہے کیونکہ خدا سے ڈرنا اس کے عذاب سے ڈرنا ہے۔

یہ بات خود اس امر کی دلیل ہے کہ زیر بحث آیت میں بھی اس جہان اور دوسرے جہان میں خدائی عذاب اور سزا سے پرہیز ہی مراد ہے۔

---

[1] "واذا قیل لھم..." جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے کہ جس کا بعد والی آیت سے استفادہ ہوتا ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا:

واذا قیل لھم اتقوا .... اعرضوا عنہ۔

جب ان سے کہا جائے کہ ڈرو تو وہ اعراض کرتے ہیں۔

Marfat.com

بعض نے اس معنی کے برعکس تعبیر کی ہے۔ انہوں نے "مابین ایدیکم" سے عذابِ آخرت اور "ماخلفکم" سے عذابِ دنیا مراد لیا ہے کیونکہ آخرت ہمارے سامنے قرار پائی ہے (یہ تفسیر نتیجے کے لحاظ سے پہلی تفسیر سے چنداں مختلف نہیں)۔

لیکن بعض نے کہا ہے کہ "سامنے" سے مراد وہ گناہ ہیں کہ جو "پہلے" انجام پائے ہیں اور ان سے پرہیز توبہ و تلافی کے معنی میں ہے اور "پیچھے" سے مراد وہ گناہ ہیں کہ جو بعد میں انجام پائیں گے۔

بعض دوسرے مفسرین کا نظریہ ہے کہ "سامنے" سے مراد آشکار اور ظاہری گناہ ہیں اور "پیچھے" پوشیدہ پنہاں گناہوں کے معنی میں ہے۔

بعض دوسرے "مابین ایدیکم" کو طرح طرح کے عذابِ دنیا کی طرف اشارہ اور "ماخلفکم" کو موت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں (جبکہ موت کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس سے پرہیز کیا جا سکے)۔

بعض مفسرین جیسے "فی ظلال" کے مؤلف نے ان دونوں تعبیروں کو موجباتِ غضب اور عذابِ الٰہی کے احاطہ کے لیے کنایہ سمجھا ہے کہ جنہوں نے کافروں کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔

آلوسی نے "روح المعانی" میں اور فخر رازی نے "تفسیر کبیر" میں یعنی ہر دو نے متعدد احتمال ذکر کیے ہیں کہ جن میں سے کچھ بیان ہو چکے ہیں۔ علامہ طباطبائی تفسیر "المیزان" میں "مابین ایدیکم" کو دنیا کے شرک و معاصی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور "ماخلفکم" کو عذابِ آخرت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں[1]

حالانکہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ دونوں جملے ایک ہی چیز کی طرف اشارہ ہیں صرف زمانے کا فرق ہے نہ کہ ایک شرک و گناہ کی طرف اور دوسرا عذاب و سزا کی طرف اشارہ ہو۔

بہرحال اس جملے کی بہترین تفسیر وہی ہے کہ جو ابتدا میں بیان ہو چکی ہے اور قرآن کی مختلف آیات بھی اس پر گواہ ہیں اور وہ یہ کہ "مابین ایدیکم" سے مراد دُنیا کا عذاب ہیں اور "ماخلفکم" سے مراد آخرت کا عذاب۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت میں اسی مطلب پر تاکید کی گئی ہے اور دل کے ان اندھوں کی آیاتِ الٰہی اور پیغمبروں کی تعلیمات کو نظر انداز کرنے میں ہٹ دھرمی کو واضح کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے: "ان کے پروردگار کی آیات میں سے کوئی آیت ان کے پاس نہیں آتی مگر یہ کہ وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں" (وما تأتیھم من اٰیة من اٰیات ربھم الا کانوا عنھا معرضین)۔

نہ تو آیات انفس کا بیان ان پر مؤثر ہے اور نہ ہی آیات آفاق کا ذکر، نہ تہدید و انذار اور نہ ہی رحمت

---

[1] المیزان جلد ۱۷، ص ۹۶ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

الٰہی کی بشارت و نوید۔ نہ ہی وہ عقل و خرد کی منطق کو قبول کرتے ہیں اور نہ ہی فرمانِ فطرت کو۔ وہ ان اندھوں کے مانند ہیں کہ جو اپنے اطراف کی نزدیک ترین چیزوں کو بھی نہیں دیکھ سکتے یہاں تک کہ وہ تو سورج کی روشنی اور رات کی تاریکی میں بھی فرق نہیں کر سکتے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد قرآن ان کی ہٹ دھرمی اور روگردانی کی ایک اہم صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "جس وقت ان سے یہ کہا جائے کہ خدا نے تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے اس کی راہ میں خرچ کرو تو کفار مومنین سے کہتے ہیں کہ کیا ہم اسے کھانا کھلائیں کہ جسے خدا چاہتا تو سیر کر دیتا تم تو واضح گمراہی میں ہو" (و اذا قیل لهم انفقوا مما رزقکم الله قال الذین کفروا للذین اٰمنوا انطعم من لو یشاء الله اطعمه ان انتم الّا فی ضلالٍ مبین)۔

یہ وہی ایک عامیانہ منطق ہے کہ جو ہر زمانے میں خود غرض اور بخیل افراد کی طرف سے پیش ہوتی رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر فلاں شخص فقیر ہے تو ضرور اس نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس کی وجہ سے خدا چاہتا ہے کہ وہ فقیر رہے اور اگر ہم تونگر اور مالدار ہیں تو ضرور ہم نے کوئی ایسا عمل انجام دیا ہے کہ ہم لطفِ خداوندی کے حامل ہو گئے ہیں۔ اس بنا پر ان کا فقر اور ہماری تونگری حکمت و مصلحت کے بغیر نہیں ہے۔

وہ اس بات سے غافل ہیں کہ یہ جہان آزمائش و امتحان کا میدان ہے، خدا ایک کی تنگدستی کے ساتھ آزمائش کرتا ہے اور دوسرے کو غنا و تونگری سے اور بعض اوقات ایک ہی انسان کو دو زمانوں میں ان دونوں کے ساتھ امتحان کی بھٹی میں سے گزارتا ہے کہ کیا وہ فقر و فاقہ کے موقع پر امانت، قناعت طبع اور شکر گزاری کے مراتب بجا لاتا ہے یا سب کو پاؤں تلے روند ڈالتا ہے؟ اور تونگری کے موقع پر جو کچھ اس کے پاس ہے اُسے اس کی راہ میں خرچ کرتا ہے یا نہیں؟

اگر چہ بعض نے اس آیت کو کسی مخصوص گروہ پر منطبق کیا ہے مثلاً یہود یا مشرکین عرب، یا دین و آئینِ انبیاً کے منکرین و ملحدین۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت عمومی مفہوم رکھتی ہے کہ جس کے مصداق ہر زمانے میں مل سکتے ہیں اگر چہ نزولِ آیت کے زمانے میں اس کے مصداق یہود یا مشرکین کے کچھ افراد تھے۔

یہ تو ہمیشہ سے ایک بہانہ تھا اور ہے کہ ایسے اشخاص کہتے ہیں: اگر خدا رازق ہے تو پھر ہم سے کیوں چاہتے ہو کہ ہم فقیروں کو کھانا کھلائیں اور خدا نے یہ چاہا ہے کہ وہ محروم رہیں تو پھر ہم کیوں کسی ایسے کو بہرہ مند کریں جسے خدا نے محروم کر رکھا ہے؟

وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ نظامِ تکوین ایک چیز کا تقاضا کرتا ہے اور نظامِ تشریع کسی دوسری چیز کا۔

نظامِ تکوین کا تقاضا ہے کہ خدا زمین کو اس کی تمام نعمتوں کے ساتھ بشر کو دے دے اور اسے تکامل و

Marfat.com

ارتقار کی راہ طے کرنے کے لیے ان کے اعمال میں آزاد چھوڑ دے۔اس کے ساتھ ہی اس میں کچھ جبلتیں بھی خلق کی ہیں کہ جو اسے اپنے تقاضوں کے مطابق چلنے کو کہتی ہیں۔

نظامِ تشریع کا تقاضا ہے کہ کچھ قوانین، ایثار و قربانی، فداکاری و درگذر اور انفاق کے ذریعے سے انسانوں کی جبلت کو کنٹرول کیا جائے اور اس طریقے سے تہذیب نفوس کی جائے اور انسان کو کہ جو خلیفہ الٰہی کے مقام تک پہنچنے کی استعداد رکھتا ہے، اس طریقہ سے اس بلند مقام تک پہنچایا جائے۔زکوٰۃ کے ذریعے نفوس کی تطہیر کی جائے، راہِ خدا میں خرچ کے ذریعے بخل کو دلوں سے دُور کیا جائے اور طبقاتی فاصلہ کہ جو انسان کی زندگی میں ہزارہا مفاسد کے پیدا ہونے کا سبب ہے، اس کو ختم کیا جائے۔

یہ بات بالکل ایسے ہے کہ کچھ افراد یہ کہیں کہ کیا ضرورت ہے جو ہم درس پڑھیں یا دوسرے کو درس پڑھائیں؟ اگر خدا چاہتا تو ہم سب کو علم دیتا تاکہ کسی شخص کو علم حاصل کرنے کی احتیاج نہ رہتی۔کیا کوئی بھی عاقل اس منطق کو قبول کرلے گا؟[1]

"قال الذین کفروا" کا جملہ کہ ان کے کفر کا ذکر کر رہا ہے، حالانکہ اس کے بجائے ضمیر سے بھی استفادہ ہو سکتا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان بہانہ سازوں کی اس خرافاتی منطق کا سرچشمہ کفر ہے۔

یہ جو مومنین سے کہا گیا ہے کہ "انفقوا مما رزقکم اللّٰہ" (انفاق کرو اس رزق سے کہ جو خدا نے تمہیں دیا ہے) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت اصلی مالک خدا ہے اگرچہ یہ امانت چند دنوں کے لیے انسانوں کے سپرد ہوئی ہے، کتنے بخیل ہیں وہ لوگ کہ جو کسی کے مال کو اسی کے حکم سے بھی دوسرے کو دینے کے لیے تیار نہیں ہیں؟

"ان انتم الّا فی ضلال مبین" (تم واضح گمراہی میں ہو) کی تفسیر کے بارے میں تین احتمال ہیں:

پہلا احتمال: یہ ہے کہ یہ کفار کی مومنین کے ساتھ گفتگو کا تتمہ ہے۔

دوسرا احتمال: یہ ہے کہ یہ خدا کا کفار سے خطاب ہے۔

تیسرا احتمال: یہ ہے کہ یہ کفار کے مقابلے میں مومنین کی گفتگو ہے۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہ کفار کے کلمات کے ساتھ متصل اور مربوط ہے۔ درحقیقت وہ یہ چاہتے تھے کہ مومنین کو بالمثل جواب دیں اور ان کی طرف "ضلل مبین" کی نسبت دیں۔

⁂ ⁂ ⁂

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ عرب اس زمانے میں مہمان نوازی میں مشہور تھے اور خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ کافروں کا مقصد یہ تھا کہ وہ مومنین کا مذاق اڑائیں کیونکہ وہ سب چیزوں کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے۔ انہوں نے بھی استہزاء کے طور پر کہا کہ اگر خدا چاہتا اور اس کی مشیت ہوتی تو فقرار کو بے نیاز کر دیتا لہٰذا ہمارے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے وہ زیادہ مناسب نظر آتی ہے (تفسیر تبیان، تفسیر قرطبی، تفسیر روح المعانی کی طرف زیر بحث آیات کے ذیل میں رجوع کریں)۔

Marfat.com

(۴۸) وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○
(۴۹) مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ
يَخِصِّمُوْنَ ○
(۵۰) فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَا اِلٰى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ○
(۵۱) وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى
رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ○
(۵۲) قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ
الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ○
(۵۳) اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ
لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ○

ترجمہ

(۴۸) وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ (قیامت کا) وعدہ کب پورا ہو گا۔
(۴۹) انہیں اس کے علاوہ اور کوئی انتظار نہیں ہے کہ ایک عظیم (آسمانی) چیخ
انہیں آگھیرے جبکہ وہ (دنیاوی امور میں) جھگڑ رہے ہوں۔
(۵۰) (وہ ایسے غافل ہوں گے کہ) وہ وصیت بھی نہ کر سکیں گے اور نہ ہی اپنے گھر
والوں کی طرف لوٹ کر جا سکیں گے۔
(۵۱) (پھر دوبارہ) صور پھونکا جائے گا تو وہ یکایک (اپنی قبروں سے (نکل کر) دوڑتے

Marfat.com

ہوئے اپنے پروردگار کی (عدالت کی) طرف جائیں گے۔

(۵۲) وہ کہیں گے: وائے ہو ہم پر، ہمیں ہماری خوابگاہوں سے کس نے اٹھا دیا؟ (ہاں) یہ وہی چیز ہے کہ جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور (اس کے) رسولوں نے سچ کہا تھا۔

(۵۳) وہ ایک چیخ سے زیادہ نہیں ہوگی (ایک زور دار آواز بلند ہوگی) ناگہاں سب کے سب ہمارے پاس حاضر ہو جائیں گے۔

تفسیر

قیامت کی چیخ

گزشتہ آیات میں خرچ کرنے کے سلسلے میں کفار کی کمزور اور بہانہ ساز منطق کا ذکر کرنے کے بعد اب زیر بحث آیات میں قیامت کے بارے میں ان کے استہزاء سے بات شروع کی گئی ہے۔ نیز انکار معاد کے بارے میں ان کی بوسیدہ منطق کو دو ٹوک جواب کے ساتھ توڑ دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں گزشتہ آیات میں توحید کے بارے میں جو گفتگو آئی ہے معاد کی گفتگو کر کے اس سلسلۂ کلام کی تکمیل کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ وعدہ جس کا تم ذکر کر رہے ہو کب پورا ہو گا" (ویقولون متیٰ هٰذا الوعد ان کنتم صادقین)۔ یہی بات کہ تم قیام قیامت کی تاریخ کا تعین نہیں کر سکتے اس امر کی دلیل ہے کہ تم اپنی گفتگو میں سچے نہیں ہو۔

بعد والی آیت میں استہزاء کے طور پر کئے گئے اس سوال کا ایک محکم اور سنجیدہ جواب دیا گیا ہے، فرمایا گیا ہے: قیام قیامت اور اس جہان کا اختتام خدا کے لیے کوئی پیچیدہ مسئلہ اور مشکل کام نہیں ہے "وہ اس کے علاوہ کسی اور چیز کے منتظر نہیں ہیں کہ ایک عظیم صیحۂ آسمانی انہیں اپنی گرفت میں لے لے اور انہیں اچانک اس حالت میں گھیر لے کہ وہ دنیاوی امور کے بارے میں جھگڑ رہے ہوں" (ما ینظرون الا صیحة واحدة تأخذهم وهم یخصمون)۔

ایک زور دار آسمانی چیخ ہی کافی ہے کہ سب لوگوں کی روح قبض کر لے ۔۔ ایک ہی لمحے میں ہر ایک کو اسی مکان میں اور اسی حالت میں کہ جس میں وہ ہے اچک لے ۔۔ اور ان کی پُر غوغا مادی زندگی ایک

Marfat.com

خاموش اور بے صدا دنیا میں بدل دے۔ وہی دنیا کہ جو ہمیشہ سے ان کا میدانِ جنگ بنا ہوا ہے۔
روایاتِ اسلامی میں پیغمبر گرامی اسلام سے منقول ہے :

تقوم الساعة والرجلان قد نشرا ثوبهما يتبايعانه فما يطويانه حتى تقوم! والرجل يرفع اكلته الى فيه فما تصل الى فيه حتى تقوم! والرجل يليط حوضه ليسقى ماشيته فما يسقيها حتى تقوم [1]

صیحۂ آسمانی اس طرح غفلت کی حالت میں ہوگی کہ دو آدمیوں نے کپڑے کا تھان کھولا ہوگا اور وہ معاملہ کرنے میں مشغول ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ معاملہ ختم ہو اور وہ اس کو لپیٹیں دنیا ختم ہو جائے گی۔ کچھ لوگ ایسے ہوں گے کہ انہوں نے کھانے کا لقمہ لپیٹ سے اٹھایا ہوگا لیکن اس سے پہلے کہ ان کے منہ تک پہنچے صیحۂ آسمانی آن پہنچے گی اور دنیا ختم ہو جائے گی۔ کچھ لوگ حوض کی تعمیر میں مشغول ہوں گے کہ چوپایوں کو اس سے سیراب کریں اس سے پہلے کہ چوپائے سیراب ہوں قیامت برپا ہو جائے گی۔

"ماینظرون" یہاں "انتظار نہیں کریں گے" کے معنی میں آیا ہے، کیونکہ "نظر" کا مادہ جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے، کسی چیز کے مشاہدے یا ادراک کے لیے غور و فکر کرنے کے معنی میں ہے اور کبھی تامل اور جستجو کرنے کے معنی میں ـــ اور جستجو کرنے سے حاصل شدہ معرفت کے معنی میں بھی آیا ہے۔

بنیادی طور پر "صیحہ" لکڑی یا کپڑے کو چیرنے یا پھاڑنے سے بلند ہونے والی آواز کے معنی میں ہے بعد ازاں ہر بلند صدا اور چیخ جیسی آواز کے لیے استعمال ہوا ہے۔ بعض اوقات طولِ قامت کے لیے بھی آیا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ :

بارض فلان شجر قد صاح

"فلاں زمین میں ایک درخت ہے کہ جو چیخ رہا ہے"۔

یعنی اس قدر لمبا ہوگیا ہے کہ گویا چیخ و پکار کر رہا ہے اور لوگوں کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔

"یخصمون" خصومیت کے مادہ سے نزاع اور جنگ کے معنی میں ہے۔

لیکن وہ کس چیز کے بارے میں جنگ و جدال کرتے ہیں، آیت میں اس کا ذکر نہیں ہوا۔ البتہ واضح

---

[1] "مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں، یہی روایت مختصر سے فرق کے ساتھ دوسری تفاسیر مثلاً تفسیر قرطبی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی آئی ہے۔

Marfat.com

ہے کہ اس سے مراد امر دینا اور مادی زندگی کے امور میں جدال کرنا ہے۔ البتہ بعض نے اسے امر معاد میں جدال کے معنی میں لیا ہے جبکہ پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ اگرچہ ایسے جامع معنی مراد لینا بھی بعید نہیں جو دونوں معانی پر محیط ہو اور ہر قسم کے جنگ و جدال اور مخاصمت کو اپنے اندر لے لے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت میں موجود تمام ضمیریں مشرکین مکہ کی طرف لوٹتی ہیں کہ جو امر معاد میں شک رکھتے تھے اور استہزاء کے طور پر کہتے تھے کہ قیامت کب برپا ہوگی؟

لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس سے ان کی ذات مراد نہیں ہے بلکہ ان کی نوع ہے (معاد سے غافل اور بے خبر انسانوں کی نوع) کیونکہ وہ تو مر گئے اور انہوں نے اس صیحہ آسمانی کو ہرگز نہیں سنا ... (غور کیجئے گا)۔

بہرحال قرآن اس مختصر اور دوٹوک تعبیر کے ساتھ انہیں تنبیہ کرتا ہے کہ اوّل تو قیامت ناگہانی طور پر اور غفلت کی حالت میں برپا ہوگی اور دوسرے یہ کوئی ایسا پیچیدہ موضوع نہیں ہے کہ وہ اس کے امکان کے بارے میں بحث و مخاصمت کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اس ایک ہی چیخ کے ساتھ ہر چیز ختم ہو جائے گی اور دنیا تمام ہو جائے گی۔

اسی لیے بعد والی آیت میں قرآن کہتا ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر تیز رفتار بجلی کی طرح غافلانہ ہوگا کہ "انہیں وصیت کرنے تک کی بھی طاقت نہیں ہوگی اور انہیں اپنے گھر اور گھر والوں کی طرف واپس لوٹنے کی بھی مہلت نہیں ملے گی" (فلا یستطیعون توصیة ولا الیٰ اھلھم یرجعون)۔

عام طور پر جب کوئی حادثہ انسان کو پیش آتا ہے تو وہ یہ احساس کرتا ہے کہ اس کی زندگی قریب الاختتام ہے لہٰذا کوشش کرتا ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے اپنے گھر اور ٹھکانے تک جا پہنچے اور اپنے بیوی اور بچوں کے پاس چلا جائے اور پھر اپنے ادھورے پڑے ہوئے کاموں اور اپنے پسماندگان کی سرنوشت وصیت کے ذریعے کسی نہ کسی کے ذمہ لگائے اور دوسروں کو ان کے بارے میں سفارش کر جائے۔

مگر کیا دنیا کے خاتمہ کی چیخ کسی کو مہلت دے گی یا بالفرض مہلت ہو بھی تو کیا کوئی زندہ بچے گا کہ وہ کسی انسان کی وصیت کو سنے یا کیا مثلاً بیوی اور اولاد اپنے شوہر اور باپ کے سرہانے بیٹھیں گے اور اس کا سر اپنی آغوش میں لیں گے تاکہ وہ آرام و سکون کے ساتھ جان دے دے؟ ان امور میں سے کوئی چیز بھی ممکن نہیں ہے۔

اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "توصیة" نکرہ کی صورت میں آیا ہے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں ایک وصیت اور چھوٹی سی سفارش کرنے تک کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔

* * *

اس کے بعد ایک دوسرے مرحلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو موت کے بعد حیات کا مرحلہ ہے۔

Marfat.com

ارشاد ہوتا ہے: "(پھر دوبارہ) صور پھونکا جائے گا تو وہ یکایک (اپنی) قبروں سے (نکل کر) دوڑتے ہوئے اپنے پروردگار کی (عدالت کی) طرف جائیں گے" (و نفخ فی الصور فاذا ھم من الاجداث الٰی ربھم ینسلون)۔

مٹی اور بوسیدہ ہڈیاں حکم پروردگار سے لباس حیات زیب تن کرلیں گی اور قبر سے نکل آئیں گی اور حساب و کتاب کے لیے سب کے سب اس عجیب عدالت میں حاضر ہو جائیں گے۔ جس طرح سے ایک ہی "صیحہ" کے ساتھ سب مر گئے تھے اسی طرح سے ایک ہی "نفخہ (صور پھونکنے)" سے سب کے سب زندہ ہو جائیں گے۔ نہ ان کا مارنا خدا کے لیے کوئی مشکل کام ہے اور نہ ہی ان کا زندہ کرنا۔ ٹھیک اس بگل کے مانند کہ جو لشکر کو جمع کرنے اور تیار کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے تو ایک ہی لمحے میں وہ سب کے سب نیند سے بیدار ہو جاتے ہیں اور خیموں سے باہر دوڑ پڑتے ہیں اور صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خدا کے لیے مُردوں کو زندہ کرنا بھی اسی طرح آسان اور سریع ہے۔

"اجداث" "جدث" (بروزن "قفس") کی جمع ہے اور قبر کے معنی میں ہے' یہ تعبیر اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے کہ معاد و قیامت جنبۂ روحانی کے علاوہ جنبۂ جسمانی بھی رکھتی ہے اور اسی پہلے والے جسم کے مواد سے ہی جدید جسم تیار ہوگا۔

"نفخ" (پھونکا جائے گا) کی تعبیر فعل ماضی کی شکل میں اس بنا پر ہے چونکہ عرب آئندہ کے یقینی مسائل کو عام طور پر فعل ماضی کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے، گویا یہ کام پہلے سے ہو چکا ہے۔

"ینسلون" "نسل" (بروزن "فصل") کے مادہ سے سریع اور تیزی کے ساتھ چلنے کے معنی میں ہے۔ راغب مفردات میں کہتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں کسی چیز سے جدا ہونے کے معنی میں ہے اور یہ جو انسان کی اولاد کو "نسل" کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے ماں باپ سے جدا ہوئے ہوتے ہیں (اس بنا پر جب انسان سرعت کے ساتھ دور ہوتا ہے اور جدا ہو جاتا ہے تو یہ تعبیر استعمال ہوتی ہے)۔

"ربھم" (ان کا پروردگار) کی تعبیر گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی ربوبیت' مالکیت اور پرورش ظاہر کرتی ہے کہ حساب و کتاب اور معاد و قیامت ہونا چاہیئے۔

بہر حال آیات قرآنی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا اختتام اور دوسرے جہان کا آغاز دونوں ایک ہی جنبش انقلابی کے ساتھ اچانک صورت پذیر ہوگا اور ان میں سے ہر ایک کو نفخہ (صور پھونکنے) سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس کی مکمل تشریح انشاء اللہ سورہ زمر کی آیہ ۶۸ کے ذیل میں آئے گی۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: "اس وقت قیامت اور معاد کے منکر یہ کہیں گے کہ وائے ہو ہم پر ہمیں کس نے ہماری خوابگاہ سے اٹھا دیا ہے" (قالوا یا ویلنا من بعثنا من مرقدنا)۔

Marfat.com

"یہ تو وہی چیز ہے کہ جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور اس کے رسولوں نے سچ کہا تھا" (ھٰذا ما وعد الرحمٰن وصدق المرسلون)۔

ہاں! یہ منظر ایسا ہی منہ بولتا اور دہشت انگیز ہوگا کہ انسان تمام باطل اور لغو مسائل کو بھول جائے گا اور حقیقتوں کے صریح اعتراف کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ نہ ہوگا۔ قبروں کو خوابگاہ سے تشبیہ دے گا اور قیامت کو نیند سے بیدار ہونا قرار دے گا جیسا کہ ایک مشہور حدیث میں بھی آیا ہے:

کما تنامون تموتون وکما تستیقضون تبعثون

"جس طرح سے تم سوتے ہو اسی طرح مرو گے اور جس طرح نیند سے بیدار ہوتے ہو اسی طرح زندہ ہو جاؤ گے"۔

یہاں وہ پہلے وحشت زدہ ہو کر فریاد کریں گے کہ وائے ہو ہم پر ہمیں کس نے اس نیند سے بیدار کر دیا ہے اور کس نے ہماری خوابگاہ سے ہمیں اٹھا دیا ہے۔

لیکن بہت جلد وہ متوجہ ہو جائیں گے اور انہیں یاد آجائیں گے کہ سچے پیغمبروں نے خدا کی طرف سے انہیں اسی دن کا وعدہ کیا تھا لہٰذا وہ خود اپنے آپ کو یہ جواب دیں گے کہ یہ تو خدائے رحمٰن کا وعدہ ہے۔ وہ خدا کہ جس کی رحمتِ عامہ نے سب کو گھیر رکھا ہے اور اس کے پیغمبروں نے سچ کہا ہے اور ہمیں اس دن سے آگاہ کیا ہے لیکن افسوس کہ ہم نے ان سب کا مذاق اور تمسخر اڑایا ہے۔

اس بنا پر "ھٰذا ما وعد الرحمٰن وصدق المرسلون" کا جملہ قیامت کے انہیں منکرین کی گفتگو کا آخری حصہ ہے لیکن بعض نے اسے فرشتوں یا مومنین کا کلام سمجھا ہے جو کہ آیت کے ظاہر کے برخلاف ہے اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ اس دن منکرین کا حقائق کا اعتراف کرنا کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جو اسی آیت میں آئی ہو جیسا کہ سورہ انبیاء کی آیہ ۹۷ میں بیان ہوا:

واقترب الوعد الحق فاذا ھی شاخصۃ ابصار الذین کفروا یٰویلنا قد کنا فی غفلۃ من ھٰذا بل کنا ظالمین

"وعدۂ حق (قیامت کے بارے میں) نزدیک ہو جائے گا، اس وقت کافروں کی آنکھیں شدت وحشت سے پتھرا جائیں گی (اور وہ کہیں گے:) وائے ہو ہم پر کہ ہم اس امر سے غافل تھے، بلکہ ہم تو ظالم تھے"۔

بہرحال "مرقد" کی تعبیر کہ جو "خوابگاہ" اور "نیند" کے معنی میں آتی ہے[۱] اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ وہ لوگ عالم برزخ میں ایک ایسی حالت میں ہوں گے کہ جو نیند کے مشابہ ہوگی۔ نیز جیسا کہ ہم نے سورہ

۱۔ پہلی صورت میں اسم مکان اور دوسری صورت میں "مصدر میمی" ہے۔

Marfat.com

مومنون کی آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ جو ایمان و کفر کی ایک درمیانی حالت میں ہوں گے ان کیلئے عالم برزخ نیند کی حالت سے غیر مشابہ نہیں ہے، جبکہ اچھے مومنین اور حد سے بڑھے ہوئے بدکار کافر وہاں پورے طور پر ایک طرح کی بیداری کے عالم میں ہوں گے اور مومن نعمتوں سے فیضیاب ہوں گے اور کافر طرح طرح کے عذاب میں گرفتار ہوں گے[1]

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ قیامت کا ہول اور وحشت اس قدر ہے کہ اس کے مقابلے میں برزخ کا عذاب آرام دہ اور نیند سے زیادہ نہیں ہے۔

اس کے بعد اس نفخ صور کے وقوع کی سرعت کے بارے میں وضاحت کے لیے فرمایا گیا ہے: "وہ ایک چیخ سے زیادہ کچھ نہیں ہے ایک زوردار آواز بلند ہوگی اور وہ سب کے سب ہمارے پاس حاضر ہو جائیں گے" (ان کانت الا صیحة واحدة فاذا ھم جمیع لدینا محضرون)۔

اس بنا پر مُردوں کے زندہ ہونے اور ان کے قبروں سے باہر نکلنے اور پروردگار کی عدالت میں حاضر ہونے کے لیے زیادہ وقت اور زمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ لوگوں کو مارنے کے لیے زیادہ وقت کی ضرورت نہیں تھی۔ پہلی چیخ موت کی پکار ہے اور دوسری چیخ پھر سے زندگی ملنے اور پروردگار کی عدالت میں حاضر ہونے کی پکار ہے۔

"صیحة" (ایک چیخ) کی تعبیر اور "واحدة" کے ساتھ اس کی تاکید اور پھر "اذا" کہ جو اس قسم کے موقعوں پر کسی چیز کے ناگہانی اور اچانک وقوع کی خبر دیتا ہے اور جملہ اسمیہ کی صورت میں "ھم جمیع لدینا محضرون" کی تعبیر سب قیامت کے تیزی کے ساتھ واقع ہونے کی دلیل ہیں۔

ان آیات کا دو ٹوک لب و لہجہ اور ان کا پُر تاثیر انداز انسانوں کے دل میں اس طرح سے اتر جاتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اس آواز کو دل کے کانوں سے سن رہے ہیں کہ اے سوئے ہوئے انسانو! اے بکھری ہوئی مٹی! اور اے بوسیدہ ہڈیو! اکھٹی ہو جاؤ اور حساب و کتاب اور جزا و سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ نے دیکھا کہ کس قدر زیبا ہیں قرآنی آیات اور کس قدر ناطق ہیں اس کی تنبیہیں؟

---

[1] ہم "برزخ" کے بارے میں اور وہاں لوگوں کی کیفیت کے متعلق جلد ۱۴ میں گفتگو کر چکے ہیں۔

Marfat.com

٥٤ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○
٥٥ اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ○
٥٦ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ○
٥٧ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ○
٥٨ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ○

ترجمہ

٥٤ آج کے دن کسی پر ظلم نہیں ہوگا اور سوائے اس عمل کے کہ جو تم کیا کرتے تھے تمہیں اور کوئی جزا نہیں دی جائے گی ۔

٥٥ بہشت والے آج کے دن خدا کی نعمتوں میں مشغول و مسرور ہوں گے (اور بے آرام کرنے والی ہر فکر سے دُور ہوں گے) ۔

٥٦ وہ اور ان کی بیویاں (بہشت کے محلوں اور درختوں کے) سایوں کے نیچے تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے ۔

٥٧ ان کے لیے جنت میں بہت ہی لذت بخش پھل ہیں اور جو کچھ وہ چاہیں گے انہیں میسر ہوگا ۔

٥٨ ان کے لیے (خدائی درود و) سلام ہے یہ قول ہے مہربان پروردگار کی طرف سے ۔

Marfat.com

تفسیر

اہلِ بہشت مادّی و روحانی نعمتوں سے سرشار ہونگے

قرآن یہاں میدانِ حشر میں حساب وکتاب کی کیفیت کے بارے میں بحث کو سربستہ چھوڑتے ہوئے گزر جاتا ہے اور صالح مومنین اور بد اعمال کافروں کے انجام کار کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

"آج کے دن کسی پر ظلم نہیں ہوگا" (فالیوم لا تظلم نفس شیئًا)۔

نہ توکسی کے اجر و ثواب میں کمی ہوگی اور نہ ہی کسی کی سزا میں اضافہ ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک سوئی کی نوک کے برابر بھی کمی، زیادتی، ناانصافی اور ظلم وستم نہیں ہوگا۔

اس کے بعد ایک ایسے امر کو بیان کیا گیا ہے کہ جو حقیقت میں اس عظیم عدالت میں ظلم وستم کے نہ ہونے کی ایک واضح اور روشن دلیل ہے۔ فرمایا گیا ہے: "تمہیں سوائے اس عمل کے کہ جو تم کیا کرتے تھے اور کوئی جزا نہیں دی جائے گی" (ولا تجزون الّا ما کنتم تعملون)۔

اس تعبیر کا ظاہر، بغیر اس کے کہ اس میں کوئی چیز مقدر ہو' یہ ہے کہ تم سب کی جزا وہی تمہارے اعمال ہی ہیں۔ غور کیجئے کونسی عدالت اس سے بہتر و برتر ہوسکتی ہے؟

دوسرے لفظوں میں، جو نیک و بد اعمال تم اس دنیا میں انجام دیتے ہو وہی وہاں تمہارے ہمراہ ہوں گے۔ وہی اعمال مجسم ہو جائیں گے اور محشر کے تمام مواقف میں اور حساب وکتاب کے اختتام کے بعد تمہارے ہمدم وہمنشیں ہوں گے۔ کیا کسی کے اعمال کا حاصل اس کے حوالے کرنا عدالت کے خلاف ہے اور کیا خود اعمال کو مجسم کرنا اور اس کا ساتھی بنانا ظلم ہے؟

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ بنیادی طور پر "ظلم" کا اس جگہ کوئی مفہوم ہی نہیں ہے اور اگر ہماری اس دنیا میں انسانوں کے درمیان کبھی عدالت ہوتی ہے اور کبھی ظلم، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ توانائی نہیں رکھتے کہ ہر شخص کے اعمال خود اس کی تحویل میں دے دیں۔

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ تصور کر لیا ہے کہ آخری جملہ بد اعمالوں اور کفار کے لیے مخصوص ہے کہ جو اپنے اعمال کے مطابق سزا بھگتیں گے اور مومن اس میں شامل نہیں ہیں کیونکہ خدا انہیں ان کے اعمال سے زیادہ اجر و ثواب دے گا۔

لیکن ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے یہ اشتباہ دور ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں جزا و سزا میں عدالت اور استحقاق کی بنیاد پر صلہ حاصل کرنے سے متعلق گفتگو ہے اور یہ چیز اس سے تضاد نہیں رکھتی کہ خدا مومنین کے لیے اپنے فضل و رحمت سے ہزاروں گنا اضافہ کر دے اور یہ "تفضل" کا مسئلہ ہے اور وہ استحقاق کا مسئلہ ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد مومنین کی جزا کے ایک گوشے کو بیان کیا گیا ہے سب سے پہلے سکونِ قلب اور راحت و آرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "اہلِ بہشت اس دن خدا کی نعمتوں میں ایسے مشغول ہوں گے کہ ہر قسم کی بے آرام کرنے والی فکر سے دور ہوں گے" (انّ اصحاب الجنۃ الیوم فی شغل)۔

"اور وہ انتہائی خوشی و سرور میں ہوں گے" (فاکھون)۔

"شغل" (بروزن "شتر") اور "شغل" (بروزن "قفل") دونوں ایسے امور و حالات کے معنی میں ہیں کہ جو انسان کو پیش آتے ہیں اور اسے اپنے ساتھ مشغول رکھتے ہیں چاہے وہ مسرت بخش ہوں یا غم انگیز۔

لیکن چونکہ اس کے بعد بلا فاصلہ لفظ "فاکھون" لایا گیا ہے اور یہ لفظ "فاکہ" کی جمع ہے کہ جو مسرور و شاداب کے معنی میں ہے اس لیے ہوسکتا ہے یہ ایسے امور کی طرف اشارہ ہو کہ جو انسان کو فرطِ مسرت سے اس طرح مشغول رکھتے ہیں کہ جو پریشان کن امور سے بالکل غافل کر دیتے ہیں گویا وہ سرور و نشاط میں اس طرح محو ہو گا کہ اس پر کوئی غم و اندوہ غالب نہ آسکے گا۔ یہاں تک کہ وہ وحشت جو قیامِ قیامت اور عدالتِ الٰہی میں حاضر ہوتے وقت اسے ہوئی تھی وہ بھی بھول جائے گا کیونکہ اگر سچ مچ وہ نہ بھولے تو ہمیشہ پریشانی اور غم و اندوہ کا سایہ اس کے دل پر بوجھ بنا رہے گا۔ اس بنا پر اس اشغال ذہنی کا ایک اثر محشر کی ہولناکیوں کو بھول جانا ہے[1]

بہرحال اطمینانِ قلب کی نعمت جو تمام نعمتوں کی بنیاد ہے اور تمام نعمتوں سے استفادہ کی شرط ہے' اس کے بعد دوسری نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "وہ اور ان کی بیویاں لذت بخش سایوں کے نیچے (خلوت گاہوں میں) تختوں کے اوپر تکیہ لگائے ہوں گے" (ھم و ازواجھم فی ظلال علی الارائک متکئون)[2]

"ازواج" بہشتی بیویوں یا ان مومن بیویوں کے معنی میں ہے کہ جو اس دنیا میں ان کی شریکِ حیات تھیں۔ بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ ہمراز و ہم فکر افراد کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ سورہ صافات کی آیہ ۲۲ میں بیان ہوا ہے:

احشروا الذین ظلموا و ازواجھم

"ظالموں اور ان کے ہمراز لوگوں کو حاضر کرو"۔

---

[1] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "فاکھۃ" ہر قسم کے پھل کے معنی میں ہے اور "فکاہ" ان باتوں کو کہا جاتا ہے کہ جو انسان کو مانوس و مشغول رکھیں اور ابن المنظور لسان العرب میں کہتا ہے کہ "فکاہ" مزاج کے معنی میں ہے اور "فاکہ" خوش مزاج انسان کو کہا جاتا ہے۔

[2] اس آیت کی ترکیب میں علماء نے بہت سے احتمال ذکر کیے ہیں لیکن ان سب میں سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ "ھم" مبتداء اور "متکئون" خبر ہے اور "علی الارائک" اس کے متعلق ہے اور "فی ظلال" بھی اسی کے متعلق ہے یا ایک محذوف کے متعلق ہے۔

Marfat.com

یہ خیال یہاں بہت بعید نظر آتا ہے خاص طور پر جبکہ مفسرین اور اربابِ لغت کی ایک کثیر جماعت کے مطابق "ارائک" "اریکہ" کی جمع ہے کہ جو اُن تختوں کے معنی میں ہے جو حجلہ گاہ میں ہوتے ہیں [1]

"ظلال" (سائے) کی تعبیر جنت کے درختوں کے سایوں کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے نیچے اہل جنت کے تخت بچھے ہوں گے یا بہشتی محلوں کے سائے کی طرف اشارہ ہے اور یہ سب امور اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہاں بھی ایک سورج ہوگا لیکن وہ آزار و تکلیف دینے والا سورج نہیں ہوگا۔ ہاں! انہیں جنت کے دل پسند سایوں میں ایک اور ہی نشاط و سرور حاصل ہوگا۔

٭ ٭ ٭

علاوہ ازیں "اُن کے لیے بہت ہی لذت بخش میوے اور پھل ہوں گے اور وہ جو کچھ چاہیں گے انہیں میسر ہوگا" (لھم فیھا فاکھۃ ولھم ما یدعون)۔

قرآن مجید کی دوسری آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جنت کی غذا صرف پھل ہی نہیں ہیں لیکن زیر بحث آیت کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس کے پھل بھی ۔ جو ایک خاص قسم کے پھل ہیں جو اس جہان کے پھلوں سے ذائقے میں بہت زیادہ لطیف ہیں ۔ بہشت کی افضل ترین غذا ہیں، یہاں تک کہ اس جہان میں بھی غذا شناس ماہرین کی گواہی کے مطابق پھل انسان کے لیے بہترین اور مناسب ترین غذا ہیں۔

"یدعون" "دعایہ" کے مادہ سے طلب کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ جو کچھ طلب کریں گے اور جس چیز کی تمنا کریں گے وہ انہیں حاصل ہو جائے گی اور ان کے دل میں کوئی ایسی آرزو نہ ہوگی جو پوری نہ ہو۔

مرحوم طبرسی "مجمع البیان" میں کہتے ہیں کہ عرب یہ تعبیر "تمنا" کے موقع پر استعمال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں :

ادع علی ماشئت

"جو تیرا دل چاہے مانگ اور مجھ سے تمنا کر"۔

اس طرح سے آج جو کچھ انسان سوچ سکتا ہے وہ بھی اور جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے وہ بھی طرح طرح کی نعمتیں وہاں مہیا ہیں اور خدا اپنے مہمانوں کی بہت اچھی پذیرائی کرے گا۔

٭ ٭ ٭

لیکن سب نعمتوں سے زیادہ اہم وہی روحانی نعمتیں ہیں کہ جن کی طرف آخری زیر بحث آیت میں اشارہ

---

[1] لسان العرب، مفرداتِ راغب، مجمع البیان، قرطبی، روح المعانی اور دوسری تفاسیر۔

Marfat.com

کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "ان کے لیے سلام اور خدائی تہنیت ہے، یہ قول ہے ان کے رحیم اور مہربان پروردگار کی طرف سے" (سلام قولاً من رب رحیم) [1]

اس کی یہ روح افزا و نشاط بخش اور مہر و محبت سے پُر ندا، انسان کی روح کو اس طرح سے اپنے اندر جذب کرے گی اور اسے لذت و خوشی اور روحانی سرور بخشے گی کہ کوئی نعمت اس کے برابر نہیں ہوگی — ہاں! محبوب کی ندا سننا، ایسی ندا جو محبت بھری ہو اور لطف و کرم سے پُر ہو، اہلِ بہشت کو سرتاپا سرور و خوشی میں غرق کر دے گی کہ جس کا ایک ہی لمحہ دنیا و مافیہا سے برتر ہے۔

ایک روایت میں پیغمبرِ گرامی اسلامؐ سے منقول ہوا ہے کہ جس وقت بہشتی لوگ جنت کی نعمتوں سے متمتع ہو رہے ہوں گے تو ایک نور ان کے سروں کے اوپر ظاہر ہوگا۔ یہ لطفِ خدا کا نور ہے کہ جو اُن کے اوپر سایہ فگن ہوگا اور اس سے ندا آئے گی کہ سلام ہو تم پر اے بہشت میں رہنے والو اور یہ وہی ہے کہ جو قرآن میں آیا ہے "سلام قولاً من رب رحیم" یہ وہ مقام ہے کہ لطفِ خدا کا احساس انہیں اس طرح مشغول کر دے گا کہ وہ سوائے اس کے ہر چیز سے غافل ہو جائیں گے اور اس حالت میں جنت کی تمام نعمتوں کو فراموش کر دیں گے اور یہ وہ منزل ہے کہ فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے اور کہیں گے تم پر درود ہو [2]

ہاں! محبوب کے شہود کا جذبہ اور لطفِ دوست کا دیدار اس قدر لذت بخش اور شوق انگیز ہے کہ اس کا ایک لمحہ بھی کسی نعمت کے یہاں تک کہ سارے جہان کے برابر نہیں ہے۔ اس کے دیدار کے عاشق اس طرح ہیں کہ اگر فیض روحانی ان سے منقطع ہو جائے تو ان کی روح جسم سے پرواز کر جائے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں امیرالمومنینؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لو حجبت عنه ساعة لمت

"اگر میں گھڑی بھر کے لیے اس کے دیدار سے محجوب رہ جاؤں تو جان دے دوں" [3]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ پروردگار کا یہ سلام کہ جو بہشتی مومنین پر نچھاور ہوگا مستقیم و بلاواسطہ سلام ہے۔ ایک ایسا سلام کہ جو پالنے والے اور پروردگار کی طرف سے ہے۔ ایسا سلام کہ جو اس کی رحمتِ خاصہ یعنی مقامِ رحیمیت کے سرچشمہ سے حاصل ہوتا ہے کہ جس میں تمام الطاف و کرامات جمع ہیں اور یہ کتنی عمدہ نعمت ہے؟

---

[1] "قولاً" کے اعراب کے محل کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے اور سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے کہ وہ "مفعول مطلق" ہے فعل محذوف کا اور تقدیر میں "یقول قولاً" تھا۔

[2] تفسیر روح المعانی جلد ۲۳ ص ۳۵ زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

[3] روح البیان جلد ۷، ص ۴۱۶۔

Marfat.com

سلام کہ جو اہلِ بہشت پر نچھاور ہوں گے

اصولی طور پر بہشت " دار السلام " ہے جیسا کہ سورۂ یونس کی آیہ ۲۵ میں بیان ہوا ہے کہ :

واللہ یدعوا الی دار السّلام

" خدا لوگوں کو دار السلام اور سلامتی و آرام کی طرف دعوت دیتا ہے "۔

بہشتی کہ جو اس سرزمین کے ساکن ہیں کبھی تو انہیں فرشتے سلام کریں گے کہ جو ان کے جنت میں داخل ہونے کے وقت ہر دروازے سے آئیں گے اور کہیں گے :

" جو صبر تم نے کیا ہے اس کی وجہ سے تم پر سلام ہو اور یہ گھر کیسا اچھا نتیجہ ہے کہ جو تمہیں نصیب ہوا ہے "

والملائکۃ یدخلون علیھم من کل باب سلام علیکم بما صبر تم فنعم عقبی الدار (رعد - ۲۳، ۲۴)

اور کبھی اعراف میں رہنے والے انہیں پکاریں گے اور کہیں گے :

" تم پر سلام ہو "۔

و نادوا اصحاب الجنۃ ان سلام علیکم (اعراف - ۴۶)

اور کبھی جنت میں داخل ہونے کے بعد فرشتوں کے سلام و درود پہنچیں گے اور کبھی قبض روح کے وقت یہ سلام موت کے فرشتوں کی جانب سے نذر ہوگا اور وہ کہیں گے :

" تم پر سلام ہے، جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کی وجہ سے جو تم انجام دیتے تھے "۔

الذین تتوفّٰھم الملائکۃ طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون (نحل - ۳۲)

کبھی وہ خود ایک دوسرے پر سلام و درود بھیجیں گے اور اصولاً :

" وہاں پر ان کا تحیۃ وہی سلام ہے "۔

تحیتھم فیھا سلام (ابراہیم - ۲۳) -

بالآخر " ان سب سے برتر اور بالاتر پروردگار کا سلام ہے "

(سلام قولاً من رب رحیم) -

خلاصہ یہ ہے کہ :

" نہ تو وہاں پر کوئی لغو بات سنی جائے گی اور نہ ہی کوئی بیہودہ کلام، صرف سلام ہی سلام ہے -

لا یسمعون فیھا لغوًا ولا تأثیمًا الّا قیلًا سلامًا سلامًا (واقعہ - ۲۵، ۲۶)-

لیکن یہ ایسا سلام نہیں ہوگا کہ جو صرف لفظوں ہی سے عبارت ہو، بلکہ یہ ایسا سلام ہوگا کہ اس کا آرام بخش اور سلامت آفرین اثر انسان کی روح اور دل کی گہرائیوں میں اتر جائے گا اور سب کو آرام و سکون اور سلامتی میں شرابور کر دے گا۔

Marfat.com

(۵۹) وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ○
(۶۰) اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ○
(۶۱) وَّاَنِ اعْبُدُوْنِىْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○
(۶۲) وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا
تَعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

(۵۹) اے گنہگارو! آج کے دن الگ ہو جاؤ۔
(۶۰) اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے؟
(۶۱) اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا کیونکہ صراطِ مستقیم یہی ہے؟
(۶۲) اس نے تم میں سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟

تفسیر

شیطان کی پرستش کیوں کرتے ہو؟

گزشتہ آیات میں اہلِ بہشت کے شوق انگیز اور پُر افتخار انجام کا کچھ ذکر تھا۔ زیر بحث آیات میں اہلِ دوزخ اور شیطان کے بندوں کے انجام کا کچھ تذکرہ ہے۔

پہلے تو یہ کہ اس دن انہیں تحقیر آمیز انداز سے خطاب کیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا: "اے گنہگارو!

Marfat.com

آج کے دن تم الگ ہو جاؤ" (وامتازوا الیوم ایھا المجرمون)۔

تمہی تو تھے کہ جو دنیا میں اپنے آپ کو مومنین کی صفوں میں رکھ کر ان کے رنگ میں سامنے آتے تھے اور ان کی حیثیت اور اعتبار سے استفادہ کرتے تھے۔ آج تم ان سے الگ ہو جاؤ اور اپنے اصلی چہرے میں ظاہر ہو جاؤ۔ یہ حقیقت میں اسی وعدۂ الٰہی پر عملدرآمد ہے کہ جو سورۂ ص کی آیہ ۲۸ میں بیان ہوا ہے:

ام نجعل الذین اٰمنوا و عملوا الصّالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجّار

"کیا ہم ان لوگوں کو کہ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیئے ہیں زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح قرار دے دیں؟ یا پرہیز گاروں کو بداعمالوں کی طرح کا قرار دے دیں"؟

بہر حال زیرِ بحث آیت کا ظاہری مفہوم مجرموں کی صفوں کا مومنین سے جدا کرنا ہی ہے اگرچہ مفسرین نے کئی دوسرے احتمال بھی ذکر کیے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ مجرموں کی صفوں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا اور ان میں سے ہر گروہ کا ایک صنف میں قرار پانا۔

۲۔ یا ان کا اپنے شفیعوں اور معبودوں سے جدا ہونا۔

۳۔ یا ان کے ہر فرد کا ایک دوسرے سے جدا ہونا اس طرح سے کہ دوزخ کے عظیم رنج و غم کے علاوہ ہر شخص اور ہر چیز سے جدائی کا غم بھی ان پر اپنا سایہ ڈالے۔

لیکن خطاب چونکہ سب سے ہے لہٰذا "وامتازوا" کا مفہوم پہلے معنی کو ہی تقویت دیتا ہے کہ جو ہم نے بیان کیا ہے۔

بعد والی آیت قیامت کے دن خدا کی طرف سے مجرموں کے لیے معنی خیز ملامتوں اور سرزنشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: "اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پرستش اور اطاعت نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے" (الم اعھد الیکم یابنی اٰدم الّا تعبدوا الشیطان انہ لکم عدو مبین)۔

یہ خدائی پیمان مختلف طریقوں سے انسان سے لیا گیا ہے اور بارہا یہ مفہوم اسے گوش گزار کرایا گیا ہے۔ سب سے پہلے اُس دن کہ جب آدم کی اولاد نے زمین میں پھلنا پھولنا شروع کیا تو انہیں یہ خطاب ہوا:

یابنی اٰدم لا یفتننکم الشیطان کما اخرج ابویکم من الجنة ینزع عنھما لباسھما لیریھما سواتھما انہ یرٰکم ھو و قبیلہ من حیث لا ترونھم

Marfat.com

اناّ جعلنا الشیاطین اولیاء للذین لا یؤمنون ۔

"اے اولادِ آدم! شیطان تمہیں دھوکا نہ دے جس طرح سے کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا تھا اوران کا لباس ان کے بدن سے اتروا دیا تھا تاکہ ان کی شرمگاہ کو ان پر ظاہر کردے ۔ وہ اور اس کے پیرو تو تمہیں دیکھتے ہیں لیکن تم انہیں نہیں دیکھتے ۔ (اچھی طرح) جان لو کہ ہم نے شیاطین کو ایسے لوگوں کے (دوست اور) اولیاء قرار دیا ہے کہ جو ایمان نہیں لاتے"۔ (اعراف - ۲۷)

اس کے بعد بھی تنبیہ بارہا انبیاء کی زبان پر جاری ہوئی ۔جیسا کہ سورۂ زخرف کی آیہ ۶۲ میں ہے :

ولا یصد نکم الشیطان انه لکم عدو مبین

"شیطان تمہیں راہ حق سے روک نہ دے کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔

نیز سورہ بقرہ کی آیہ ۱۶۸ میں ہے :

ولا تتبعوا خطوات الشیطان انه لکم عدو مبین

"تم شیطان کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔

دوسری طرف یہ پیمان عالم "تکوین" میں انسان سے اعطائے عقل کے حوالے سے بھی لیا گیا ہے کیونکہ عقلی دلائل وضاحت کے ساتھ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انسان کو کبھی ایسے کا حکم نہیں ماننا چاہیئے جس نے پہلے ہی دن سے اس کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے ۔جس نے اُسے جنت سے باہر نکلوایا ہے اور اس کی اولاد کو گمراہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے ۔

تیسری طرف تمام انسانوں کو خدا کی دی ہوئی سرشت اور فطرتِ توحید اور ذاتِ الٰہی کے لیے اطاعت کے منحصر ہونے سے بھی عملی طور پر انسان سے یہ عہد لیا ہے ۔اس طرح سے صرف ایک زبان سے نہیں بلکہ یہ خدائی تنبیہ کئی زبانوں سے ہو چکی ہے اور یہ سرشت ساز عہد قبول ہو چکا ہے ۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "لا تعبدوا الشیطان" میں "عبادت" "اطاعت" کے معنی میں ہے کیونکہ عبادت ہمیشہ پرستش اور رکوع و سجود کے معنی میں نہیں آتی بلکہ اس کی ایک صورت اطاعت کرنا ہے ۔جیسا کہ سورۂ مومنون کی آیہ ۴۷ میں ہے کہ فرعون اور اس کے اطرافیوں نے موسٰیؑ اور ہارونؑ کے مبعوث ہونے کے بعد کہا :

انؤمن لبشرین مثلنا و قومهما لنا عابدون

"کیا ہم ایسے دو انسانوں پر کہ جو ہم ہی جیسے ہیں ایمان لے آئیں حالانکہ ان کی قوم ہماری عبادت (اطاعت) کرتی ہے"۔

نیز سورۂ توبہ کی آیہ ۳۱ میں ہے کہ خدا یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرماتا ہے :

Marfat.com

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابًا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الٰھًا واحدًا

"انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو خدا کے مقابلے میں معبود قرار دے لیا اور اسی طرح مسیح ابن مریمؑ کو بھی۔ حالانکہ انہیں خدائے یگانہ کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے کی عبادت کے سوا کسی اور کی عبادت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا"

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک روایت میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے اس آیہ کے ذیل میں منقول ہے:

اما واللہ ما دعوھم الی عبادۃ انفسھم ولو دعوھم ما اجابوھم ولکن احلوا لھم حراما وحرموا علیھم حلالاً فعبدوھم من حیث لا یشعرون

خدا کی قسم! انہوں نے (علماء اور راہبوں نے) یہود و نصاریٰ کو اپنی عبادت کی طرف دعوت نہیں دی تھی اور اگر وہ اس بات کی دعوت دیتے تو یہود و نصاریٰ کبھی بھی ان کی اس دعوت کو قبول نہ کرتے لیکن انہوں نے تو ان کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیا تھا (اور انہوں نے اُسے قبول کر لیا تھا) اور اسی طرح سے لاشعوری طور پر ان کی عبادت کی تھی [1]

اسی مفہوم کی نظیر کچھ فرق کے ساتھ دوسری روایات میں بھی موجود ہے۔ ان میں سے ایک روایت میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

من اطاع رجلا فی معصیۃ فقد عبدہ

جس شخص نے کسی انسان کی پروردگار کی معصیت میں اطاعت کی تو اس نے اس کی پرستش کی [2]

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

من اصغی الی ناطق فقد عبدہ، فان کان الناطق یؤدی عن اللہ فقد عبد اللہ، وان کان الناطق یؤدی عن الشیطان فقد عبد الشیطان۔

"جو شخص کسی بولنے والے کی بات پر کان دھرے (اور اس کی باتوں کو قبول کرے)

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۸۹ (ابواب صفات القاضی باب ۱۰ حدیث ۔ ۱)۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۹۱ (ابواب صفات القاضی باب ۱۰ حدیث ۸، ۹)۔

Marfat.com

تو اس نے اس کی پرستش کی اگر بولنے والا حکمِ خدا کو بیان کرتا ہے تو اس نے خدا کی عبادت کی ہے اور اگر وہ شیطان کی طرف سے بات کر رہا ہے تو اس نے شیطان کی عبادت کی ہے [1]

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں مزید تاکید اور اولادِ آدم کی ذمہ داریوں اور فرائض کو بیان کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ: "میری ہی عبادت کرنا اور میری اطاعت کرنا کیونکہ سیدھا راستہ یہی ہے" (وان اعبدونی ھٰذا صراط مستقیم)۔

ایک طرف تو یہ عہد لیا کہ شیطان کی اطاعت نہ کرنا کیونکہ اس نے اپنی دشمنی اور عداوت کو پہلے ہی دن سے آشکار کر دیا تھا لہٰذا کونسا عقلمند ایسا ہے کہ جو اپنے دیرینہ اور کھلے ہوئے دشمن کا حکم مانے گا۔

اس کے مقابلے میں یہ عہد لیا کہ صرف اسی کی اطاعت کریں اور اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ صراطِ مستقیم یہی ہے۔ یہ بات حقیقت میں انسانوں کے لیے بہترین محرک ہے کیونکہ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص خشک اور جلا دینے والے بیابان میں پھنس جاتے اور اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی جان اور اپنے مال و متاع کو چوروں اور بھیڑیوں کے خطرے میں دیکھے تو سب سے اہم چیز کہ جس کے بارے وہ غور و فکر کرے گا وہ یہ ہے کہ منزل کی طرف سیدھی راہ کونسی ہے ایسی راہ کہ جو زیادہ جلدی اور زیادہ آسانی کے ساتھ اسے منزلِ نجات تک پہنچا دے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہان قیام کرنے کا مقام نہیں ہے۔ کیونکہ راستہ ایسے شخص کو دکھایا جاتا ہے کہ جو کسی گزرگاہ سے عبور کر رہا ہو او اسے کسی منزلِ مقصود تک پہنچنا ہو۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اس دیرینہ خطرناک دشمن سے زیادہ سے زیادہ آگاہی کے لیے مزید فرمایا گیا ہے: "اس نے تم میں سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے" (ولقد اضل منکم جبلاً کثیرًا افلم تکونوا تعقلون)۔

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ شیطان اپنے پیروکاروں پر کیسی کیسی بدبختیاں لایا ہے؟ کیا تم نے گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا تاکہ تم دیکھتے کہ اس کے بندے اور غلام کس بُرے اور دردناک انجام میں گرفتار ہوئے ہیں؟ اُن کے اُن دیکھے شہروں کے ویرانے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ان کا غم انگیز انجام ہر اُس شخص کے لیے واضح ہے کہ جو تھوڑی سی بھی عقل رکھتا ہو۔

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ١٨ ص ٩١ (ابواب صفات القاضی باب ١٠) حدیث ٨، ٩)۔

Marfat.com

پھر تم سنجیدگی کے ساتھ اس دشمن کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے ۔ کہ جو بارہا اپنی عداوت و دشمنی ثابت کر چکا ہے؟ پھر اس سے دوبارہ دوستی گانٹھتے ہو، یہاں تک کہ اسے اپنا رہبر، ولی اور رہنما بناتے ہو۔

مفرداتِ راغب کے مطابق "جبلّ" اس جماعت اور گروہ کے معنی میں ہے کہ جو عظمت و بزرگی کے لحاظ سے جَبَل، (بروزن "عَمَل") جو پہاڑ کے معنی میں ہے سے مشابہت رکھتا ہو اور "کثیرًا" کی تعبیر شیطان کے پیروکاروں کے بارے میں زیادہ تاکید کے لیے ہے کہ جو ہر معاشرہ کا ایک بہت بڑا حصہ ہوتے ہیں۔

بعض نے "جبل" کی تعداد دس ہزار یا اس سے زیادہ لکھی ہے اور اس سے کمتر کے لیے یہ تعبیر مناسب نہیں سمجھی [1]

لیکن بعض اس تعداد کو ضروری نہیں سمجھتے [2]

بہرحال عقلِ سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس قسم کے خطرناک دشمن سے خوب ڈرتا رہے کہ جو کسی انسان پر رحم نہیں کرتا اور اس کے ہاتھوں برباد ہونے والے ہر جگہ خاکِ ہلاکت پر پڑے ہوتے ہیں۔ ایسے دشمن سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہمارے آگاہ و بیدار پیشوا امیرالمومنین حضرت علیؑ اپنے ایک خطبے میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فاحذروا عباد الله! عدو الله، ان یعدیکم بدائه، وان یستفزکم بندائه، وان یجلب علیکم بخیله ورجله، فلعمری لقد فوق لکم سهم الوعید، واغرق الیکم بالنزع الشدید، ورماکم من مکان قریب، فقال رب بما اغویتنی لا زینن لهم فی الارض ولا غوینهم اجمعین۔

"اے خدا کے بندو! خدا کے اس دشمن سے ڈرتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں اپنی بیماری (غرور و تکبر) میں مبتلا کر دے اور آواز دے کر تمہیں حرکت میں لے آئے اور اپنے سوار اور پیادہ لشکر کے ذریعے تمہیں اپنا بنا لے۔ مجھے اپنی جان کی قسم! اُس نے تمہیں شکار کرنے کے لیے ایک خطرناک تیر کمان میں رکھا ہوا ہے اور اپنی پوری توانائی سے شدت کے ساتھ کھینچا ہوا ہے اور اس نے نزدیک ترین جگہ سے تمہیں نشانہ بنا رکھا ہے۔ اس نے

---

[1] تفسیر روح المعانی و قرطبی زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر فخر رازی زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

یہ اعلان بھی کر رکھا ہے کہ اے پروردگار! مجھے تو تُو نے گمراہ کیا ہی ہے لہٰذا میں بھی زندگی کے زرق و برق اور ٹھاٹھ باٹھ کی ان کی آنکھوں میں چکا چوند کر دوں گا اور ان سب کو اغوا اور گمراہ کر دوں گا، (حالانکہ خدا اس کی گمراہی کا سبب نہیں تھا بلکہ ہوائے نفس نے اسے گمراہ کیا تھا) [۱]

واقعاً عجیب بات ہے کہ ہم اس قسم کے دشمن کو اپنا دوست بنائیں۔

بقولِ شاعر ؎

کجا بر سر آیم ازیں عار و ننگ
کہ با او بہ صلحیم و با حق بہ جنگ

"ہم اس عار و ننگ سے کس طرح باہر نکل سکتے ہیں' کہ اس (شیطان) سے تو ہماری صلح ہے اور حق کے خلاف جنگ ہے"۔

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲ (خطبہ قاصعہ)۔

Marfat.com

(۶۳) هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○
(۶۴) اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○
(۶۵) اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَ
تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ○
(۶۶) وَ لَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰۤى اَعْیُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ
فَاَنّٰى یُبْصِرُوْنَ ○
(۶۷) وَ لَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا
مُضِیًّا وَّ لَا یَرْجِعُوْنَ ○ؑ
(۶۸) وَ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِی الْخَلْقِؕ اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

(۶۳) یہ وہی دوزخ ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔
(۶۴) آج تم اس میں داخل ہو جاؤ اور اس کی آگ میں جلو اس کفر کی بنا پر کہ
جو تم کیا کرتے تھے۔
(۶۵) آج ہم ان کے منہ پر مُہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے
خود کردہ کاموں کی گواہی دیں گے۔
(۶۶) اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں موند دیں پھر اگر وہ چاہیں راستہ طے کرنے
میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں تو وہ دیکھ کیسے سکیں گے۔

Marfat.com

(۶۷) اور اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کی جگہ پر ہی مسخ کر دیں (اور انہیں بے جان مجسموں میں بدل کے رکھ دیں) کہ نہ تو وہ آگے کو سفر جاری رکھ سکیں اور نہ ہی پیچھے کی طرف پلٹ سکیں۔

(۶۸) جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں اُسے خلقت کے اعتبار سے پلٹ دیتے ہیں (اور اُسے بچپن کی ناتوانی کی طرف پلٹا دیتے ہیں) کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے؟

تفسیر

جب زبان چپ ہوگی، اعضا گواہی دیں گے

گزشتہ آیات میں قیامت میں مجرموں کے لیے خدا کی سرزنش کا ذکر ہے اور اس کے علاوہ ان کے بارے میں کچھ دیگر باتوں کا بیان ہے۔ زیرِ بحث آیات میں بھی وہی سلسلۂ کلام جاری ہے۔

ہاں! اس دن کہ جب کہ جہنم کی جلانے والی بھڑکتی ہوئی آگ مجرموں کی آنکھوں کے سامنے ہوگی تو اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجرموں کو مخاطب کیا جائے گا: "یہ وہی دوزخ ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا" (ھٰذہ جھنم التی کنتم توعدون)۔

٭ ٭ ٭

خدا کے نبی یکے بعد دیگرے آتے رہے اور تمہیں اس دن اور ایسی آگ سے ڈراتے رہے لیکن تم نے ان سب کا تمسخر اُڑایا: "آج اس میں داخل ہو جاؤ اور اس کی آگ میں جلو۔ کیونکہ یہ اس کفر کی جزا ہے کہ جو تم کرتے تھے" (اصلوھا الیوم بما کنتم تکفرون)۔[1]

٭ ٭ ٭

اس کے بعد قیامت کے دن کے گواہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ گواہ کہ جو خود انسان کے جسم کا حصہ ہیں اور ان کی باتوں کے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے: "آج ہم ان کے منہ پر

---

[1] "اصلو"، "صلی" کے مادہ سے آگ جلانا یا آگ میں جلانا اور بھونا، یا آگ میں داخل ہونا، اور اس کو لازم کر لینے کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

مُہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور اُن کے پاؤں اُن کاموں کی کہ جو انہوں نے انجام دیئے تھے ہمارے حضور شہادت دیں گے" (الیوم نختم علیٰ افواھھم وتکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون)۔

ہاں! اس دن انسان کے اعضاء اس کی مرضی کے تابع نہیں ہوں گے، وہ اپنا حساب انسان کے پورے وجود سے جدا کرکے پروردگار کا حکم مانیں گے اور اس کے آستانۂ مقدس پر سر جھکا دیں گے اور اپنی شہادت کے ذریعے حقائق آشکار کردیں گے۔ وہ کتنی عجیب عدالت ہے کہ جس کے گواہ خود انسان کے بدن کے اعضاء ہیں، وہی آلات کہ جن کے ذریعے اس نے گناہ انجام دیا تھا۔

شاید اعضاء کی گواہی اس بناء پر ہو کہ ان مجرموں کو جس وقت یہ کہا جائے گا کہ جو عمل تم انجام دیا کرتے تھے اس کی سزا جہنم ہے، تو وہ یہ گمان کرتے ہوئے کہ شاید یہ دنیاوی عدالت ہے کہ جس میں حقائق سے پیٹھ پھیر کر انکار کیا جا سکتا ہے، ان کا انکار کردیں گے۔ اس پر اعضاء کی گواہی شروع ہو جائے گی۔ ایسے میں اُن پر تعجب اور وحشت چھا جائے گی اور بھاگنے کے تمام راستے ان پر بند ہو جائیں گے۔

اعضاء کے بولنے کی کیفیت کیا ہو گی، اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں:

۱۔ خدا اس دن ایک ایک عضو میں بات کرنے کا ادراک و شعور پیدا کر دے گا اور اعضاء سچ سچ باتیں کریں گے اور اس میں تعجب کی کونسی بات ہے کہ وہی ذات جس نے گوشت کے ایک ٹکڑے کو جسے زبان کہتے ہیں، یا انسان کے دماغ میں یہ قدرت پیدا کی ہے، وہ دوسرے اعضاء میں بھی یہ قدرت پیدا کر سکتا ہے۔

۲۔ وہ ادراک و شعور سے بہرہ مند نہیں ہوں گے، لیکن خدا انہیں بات کرنے کا حکم دے گا اور حقیقت میں اعضاء گفتگو کے ظہور کا محل ہوں گے، اور حقائق کو خدا کے فرمان اور حکم سے آشکار کریں گے۔

۳۔ ہر انسان کے بدن کے اعضاء کے ساتھ ان اعمال کے آثار بھی یقیناً ہوں گے جو انہوں نے عمر بھر میں انجام دیئے ہیں کیونکہ اس جہان میں کوئی عمل بھی نابود نہیں ہوتا۔ یقیناً اس کے آثار بدن کے ایک ایک حصے پر اور فضائے محیط میں باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ دن کہ جو ظاہر و آشکار ہونے کا دن ہے یہ آثار بھی ہاتھ پاؤں اور باقی اعضاء پر ظاہر ہو جائیں گے اور ان آثار کا ظہور ان کی شہادت شمار ہو گا۔

یہ تعبیر روزمرہ کی باتوں اور ادبا کی تعبیر میں بھی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:

عینك تشھد بسھرك

"تیری آنکھ تیرے جاگتے رہنے کی گواہ ہے"۔

یا ہم کہتے ہیں:

الحیطان تبکی علیٰ صاحب الدار

Marfat.com

"دیواریں اس گھر کے مالک پر گریہ کرتی ہیں"۔

ایک فارسی شاعر بھی کہتا ہے :

رنگ رخسارہ خبر می دھد از سر درون

"رخسار کا رنگ اندرونی راز کی خبر دے رہا ہے"۔

بہر حال قیامت میں اعضاء کی گواہی مسلّم ہے ۔ اب رہی یہ بات کہ کیا ہر خاص عضو اسی کام کو بیان کرے گا کہ جو اس نے انجام دیا ہے یا تمام کاموں کو ؟ تو بلاشک وشبہ احتمالِ اوّل ہی مناسب ہے ۔ لہٰذا قرآن کی دوسری آیات میں کان ، آنکھ اور جلدِ بدن کے بات کرنے کا ذکر ہوا ہے ۔

جیسا کہ سورۂ حٰم السجدہ کی آیہ ۲۰ میں ہے :

حتّٰی اذا ما جاءوھا شھد علیھم سمعھم و ابصارھم و جلودھم بما کانوا یعملون

"جس وقت وہ جہنم کی آگ کے کنارے آکھڑے ہوں گے ، تو ان کے کان ، آنکھ اور بدن کی جلد ان اعمال کی گواہی دے گی کہ جو وہ انجام دیتے تھے"۔

نیز سورۂ نور کی آیہ ۲۴ میں آیا ہے :

یوم تشھد علیھم السنتھم و ایدیھم و ارجلھم بما کانوا یعملون

"اس دن ان کی زبان ، ہاتھ اور پاؤں ان اعمال کی گواہی دیں گے کہ جنہیں وہ انجام دیتے تھے"۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ایک جگہ تو یہ فرمایا گیا ہے :

"ان کی زبانیں گواہی دیں گی "۔

جیسا کہ سورۂ نور میں ہے اور زیرِ بحث آیات میں فرمایا گیا ہے : "ہم ان کی زبان پر مُہر لگا دیں گے"۔

ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس بناء پر ہو کہ پہلے تو انسان کی زبان پر مُہر لگا دی جائے گی اور اس کے دوسرے اعضاء کلام کریں گے ۔ جب وہ دیکھے گا کہ دوسرے اعضاء شہادت دے رہے ہیں تو اس کی زبان کھُل جائے گی اور اب انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی لہٰذا زبان بھی اعتراف کرے گی ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ زبان کی شہادت سے مراد عام تکلم نہ ہو بلکہ باقی اعضاء کی طرح کا تکلم ہو کہ جو اس کے اندر سے ابھرے نہ کہ باہر سے (اس عظیم عدالت کے گواہوں کی تعداد اور ان کی گواہی کی کیفیت کے سلسلے میں ہم انشاء اللہ سورۂ حٰم السجدہ کی آیات ۱۹ - ۲۳ کے ذیل میں اس سے زیادہ تفصیلی گفتگو کریں گے)۔

آخری بات یہ ہے کہ اعضاء کی گواہی کفار اور مجرموں کے ساتھ مربوط ہے ، ورنہ مومنین کا مسئلہ تو واضح ہے اس لیے امام باقر علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے :

Marfat.com

لیست تشهد الجوارح علیٰ مؤمن، انما تشهد علیٰ من حقت علیه لمة العذاب، فاما المؤمن فیعطی کتابه بیمینه، قال الله عزوجل فمن اوتی کتابه بیمینه فاولئك یقرءون کتابهم ولا یظلمون فتیلاً ۔

"اعضاء جسمانی مومن کے خلاف گواہی نہیں دیں گے بلکہ اس شخص کے برخلاف گواہی دیں گے جس پر فرمانِ عذاب مسلّم ہو چکا ہوگا، باقی رہا مومن تو اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا (اور وہ خود ہی اُسے پڑھے گا) جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"جن کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے (وہ سرفرازی اور افتخار کے ساتھ) اپنا نامۂ اعمال پڑھیں گے اور ان پر معمولی سا ظلم بھی نہیں ہوگا[۱]"

⁂ ⁂ ⁂

بعد والی آیت میں ایک عذاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ممکن ہے کہ خدا اس مجرم گروہ کو اسی دنیا میں اس عذاب میں مبتلا کر دے، ایک ایسا عذاب کہ جو دردناک بھی ہے اور وحشت انگیز بھی، ارشاد ہوتا ہے: "اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں ملیامیٹ کر دیں" (ولو نشاء لطمسنا علیٰ اعینهم)[۲]

اس حالت میں انہیں انتہائی وحشت گھیر لے گی "وہ چاہیں گے کہ جیسے وہ پہلے کیا کرتے تھے اسی طرح ایک دوسرے پر سبقت حاصل کریں لیکن وہ کس طرح سے دیکھ سکتے ہیں" (فاستبقوا الصراط فانّی یبصرون)۔

وہ تو اپنے گھر کا راستہ تک بھی تلاش نہ کر پائیں گے چہ جائیکہ وہ راہِ حق کو تلاش کر سکیں اور صراطِ مستقیم پر چل سکیں۔

دوسری دردناک سزا یہ ہے کہ "اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کی اپنی جگہ پر ہی مسخ کر دیں (بے روح اور بے حس و حرکت مجسموں یا مفلوج جانوروں کی طرح) اس طرح سے کہ نہ تو وہ آگے کو سفر جاری رکھ سکیں اور نہ ہی پیچھے کی طرف مڑ سکیں" (ولو نشاء لمسخناهم علیٰ مکانتهم فما استطاعوا مضیًّا ولا یرجعون)[۳]

۱۔ تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ "طمسنا" "طمس" (بروزن شمس) کے مادہ سے محو کرنے اور کسی چیز کے آثار ختم کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں آنکھ کے نور یا خود آنکھ کو اس طرح محو کرنے کی طرف اشارہ ہے کہ اس میں سے کوئی چیز باقی نہ رہ جائے اور وہ بالکل محو ہو جائے۔

۳۔ "مکانة" "ٹھہرنے کی جگہ" کے معنی میں ہے اور یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا انہیں ان کی اسی جائے قیام میں، انسانی شکل سے محروم کر دے گا، ان کی شکل بھی بدل جائے گی اور چلنے پھرنے کی توانائی بھی ان میں باقی نہ رہے گی بالکل بے روح مجسموں کی طرح۔

Marfat.com

"فاستبقوا الصراط" ممکن ہے کہ اس راستے کی تلاش میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے معنی میں ہو جس پر وہ عام طور پر جایا کرتے تھے۔ یا راستے سے بھٹک جانے اور اسے نہ پا سکنے کے معنی میں ہو۔ کیونکہ بعض اربابِ لغت نے کہا ہے کہ: "فاستبقوا الصراط" "جاوزوہ و ترکوہ حتی ضلوا" کے معنی میں ہے۔ یعنی راستے سے آگے نکل گئے اور اسے پیچھے چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو گئے۔[1]

بہرحال اس تفسیر کے مطابق کہ جسے اکثر مفسرین نے قبول کیا ہے یہ دونوں آیات عذابِ دنیا کے ساتھ مربوط ہیں اور کفار و مجرمین کو اس بات کی تنبیہ و تہدید کرتی ہیں کہ خدا انہیں اس جہان میں ایسے دردناک انجام میں مبتلا کر سکتا ہے لیکن اس نے اپنے لطف و رحمت کی بنا پر ایسا نہیں کیا کہ شاید یہ ہٹ دھرم بیدار ہو جائیں اور راہِ حق کی طرف پلٹ آئیں۔

لیکن ایک احتمال اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ آیات روزِ قیامت کے عذاب سے متعلق ہیں نہ کہ دنیا کے۔ درحقیقت گزشتہ آیت کہہ رہی تھی کہ ہم ان کے منہ پر مُہر لگا دیں گے۔ ان آیات میں دو دوسری سزاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا چاہے تو یہ سزائیں ان پر لاگو کر دے۔

پہلی یہ کہ ان کی آنکھوں کو نابینا کر دے تاکہ وہ "صراط" جنت کے راستے کو نہ پا سکیں اور دوسری یہ کہ ان لوگوں کو کہ جو دنیا میں راہِ سعادت پر نہیں چلتے تھے اس دن انہیں بے روح مجسموں کی صورت میں ظاہر کر دے تاکہ وہ عرصۂ محشر میں حیران و پریشان ہو کر رہ جائیں۔ نہ تو انہیں آگے کی طرف کوئی راستہ سجھائی دے اور نہ ہی پیچھے کی طرف۔ البتہ جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے آیات کی مناسبت اس تفسیر کے لیے ایک تائید ہے۔ اگرچہ اکثر مفسرین نے پہلی تفسیر کو قبول کیا ہے۔[2]

⁂

زیرِ بحث آخری آیت میں، عقل و جسم کے ضعف و ناتوانی کے لحاظ سے، عمر کے آخر میں انسان کی حالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ ان لوگوں کے لیے کہ جو راہِ ہدایت اختیار کرنے میں آج اور کل کرتے رہتے ہیں، ایک تنبیہ بھی ہو اور ان لوگوں کا جواب بھی ہو کہ جو اپنی کوتاہیوں کو عمر کی کمی کے سر ڈال دیتے ہیں اور یہی بات خدا کی قدرت کی دلیل بھی ہو کہ وہ جس طرح ایک قوی اور طاقتور انسان کو ایک نومولود کی ناتوانی کی طرف پلٹا سکتا ہے کچھ ایسے ہی وہ معاد پر بھی قادر ہے اور اسی طرح مجرموں کو نابینا کرنے اور چلنے پھرنے

---

[1] لسان العرب، قطر المحیط، المنجد (مادہ "سبق")۔

[2] اس تفسیر کو "فی ظلال" نے اکیلی تفسیر کی صورت میں ذکر کیا ہے جبکہ پہلی تفسیر کو مجمع البیان، تبیان، المیزان، صافی، روح المعانی، روح البیان، قرطبی اور تفسیر کبیر از فخرالدین رازی میں اختیار کیا گیا ہے۔

Marfat.com

سے باز رکھنے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: "جس شخص کو ہم طول عمر دیتے ہیں اسے خلقت کے اعتبار سے پلٹ دیتے ہیں، کیا وہ عقل سے کام نہیں لیتے" (ومن نعمرہ ننکسہ فی الخلق افلا یعقلون)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ "ننکسہ"۔ "تنکیس"۔ کے مادہ سے کسی چیز کو اس طرح سرنگوں کر دینا ہے کہ سر پاؤں کی جگہ اور پاؤں سر کی جگہ آجائیں اور یہاں انسان کے بالکل بچپن کی حالت کی طرف پلٹ جانے کے لیے کنایہ ہے کیونکہ انسان ابتدائے خلقت میں ضعیف ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ رشد و کمال کی طرف جاتا ہے۔ شکم مادر کے دور میں ہر روز نئی خلقت اور جدید رُشد سے گزرتا ہے۔ پیدا ہونے کے بعد بھی جسم و روح میں اپنے تکامل و ارتقار کو تیزی کے ساتھ جاری و ساری رکھتا ہے اور خداداد قوتیں اور صلاحیتیں کہ جو اس کے وجود کے اندر چھپی ہوئی ہیں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ جوانی کا دور اور اس کے بعد پختگی کا وقت آن پہنچتا ہے اور انسان جسمانی و روحانی تکامل و ارتقار کی بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں بعض اوقات جسم و روح اپنے سفر کو ایک دوسرے سے جدا کر لیتے ہیں۔ روح تو اسی طرح سے اپنے تکامل و ارتقا کو جاری رکھتی ہے جبکہ جسم پیچھے کی طرف پلٹنا شروع کر دیتا ہے لیکن انجام کار عقل میں بھی تنزل شروع ہو جاتا ہے اور یہ آہستہ آہستہ اور کبھی تیزی کے ساتھ بچپن کے مراحل کی طرف لوٹ آتی ہے۔ بچوں جیسی حرکتیں، بچوں جیسی سوچ، یہاں تک کہ بہانہ تراشیاں بھی بچوں کی طرح ہی ہو جاتی ہیں اور جسمانی کمزوری بھی اس کے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ بچوں کی یہ حرکتیں اور پیاری لگتی ہیں اور امید بخش و مسرت آفریں مستقبل کی خوشخبری ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے بالکل قابلِ برداشت ہوتی ہیں لیکن بوڑھوں کی طرف سے ناپسندیدہ اور کبھی نفرت خیز یا ترحم انگیز ہوتی ہیں۔

سچ مچ ایسے دن آن پہنچتے ہیں کہ جو بہت ہی دردناک ہوتے ہیں اور جن کی تکلیف کی گہرائی کا بڑی مشکل سے تصور کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید سورۂ حج کی آیہ ۵ میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے:

ومنکم من یرد الی ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئًا

"تم میں سے بعض اس قدر عمر رسیدہ ہو جاتے ہیں کہ وہ بدترین زندگی اور بڑھاپے کے مرحلے کو پہنچ جاتے ہیں اس طرح سے کہ جو علم انہوں نے حاصل کیا ہے وہ بھی یاد نہیں رہتا (یہاں تک کہ اپنے گھر کے افراد میں سے قریب ترین افراد کو بھی نہیں پہچان سکتے)۔

لہٰذا بعض روایات میں ستر سالہ افراد کو "اسیر اللہ فی الارض" (زمین میں خدا کے قیدی) کے نام سے یاد کیا گیا ہے[1]

[1] یہ جملہ حدیث نبوی (کتاب سفینہ مادہ "عمر") میں آیا ہے جبکہ دوسری روایات میں نوّے سال کا ذکر ہے۔

Marfat.com

بہر حال "افلا یعقلون" اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب تنبیہ ہے اور انسانوں سے کہتی ہے کہ اگر یہ قدرت و توانائی کہ جو تم رکھتے ہو عاریتاً نہ ہوتی تو اتنی آسانی کے ساتھ تم سے نہ چھین لی جاتی۔ جان لو کہ کسی اور کا دستِ قدرت تمہارے سر پر ہے کہ جو ہر چیز پر قادر ہے۔

جب تک تم اس مرحلے تک نہیں پہنچتے اپنی خبر لو اور اس سے پہلے کہ نشاط و زیبائی پژمردگی میں تبدیل ہو اس چمن کے پھول چُن لو اور آخرت کے طولانی سفر کا توشہ اس جہان سے لے لو۔ کیونکہ ناتوانی، بڑھاپے اور درماندگی کے وقت تم سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔

اسی لیے جن پانچ چیزوں کی پیغمبرِ اکرمؐ نے ابوذرؓ کو وصیت کی تھی ان میں سے ایک یہ تھی کہ بڑھاپے سے پہلے دورِ جوانی کو غنیمت جانو:

اغتنم خمسًا قبل خمس: شبابك قبل هرمك، صحتك قبل سقمك، وغناك قبل فقرك، وفراغك قبل شغلك وحياتك قبل موتك

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو۔ اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، اپنی صحت کو بیماری سے پہلے، اپنی تونگری کو فقر و فاقہ سے پہلے، اپنی فراغت کو مشغولیت سے پہلے اور اپنی زندگی کو موت سے پہلے۔[1]

یا بقول شاعر:

چنیں گفت روزی بہ پیری جوانی — کہ چوں است با پیریت زندگانی
بگفتا دریں نامہ حرفی است مبہم — کہ معنیش جز وقت پیری ندانی
تو بہ کز توانائی خویش گوئی — چہ می پرسی از دورۂ ناتوانی
متاعی کہ من رائیگاں دادم از کف — تو گر می توانی مدہ رائگانی

"ایک دن ایک نوجوان نے ایک بوڑھے سے پوچھا کہ تیرے بڑھاپے کے دن کیسے گزر رہے ہیں؟
اُس نے جواب دیا کہ اس خط میں ایک مبہم بات ہے کہ جس کا معنی تُو بڑھاپے سے پہلے نہیں جان سکتا۔
بہتر ہے کہ تُو اپنی قوت و توانائی کی بات کرے، ناتوانی اور عجز کے دور کے متعلق کیا پوچھتا ہے۔
"وہ متاع کہ جو میں اپنے ہاتھ سے مفت میں دے چکا ہوں اگر تجھ سے ہو سکے تو اسے رائیگاں اور مفت میں نہ جانے دے۔"

---

[1] بحار، جلد ۷۷، ص ۷۷۔

Marfat.com

(۶۹) وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ
وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝
(۷۰) لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ

(۶۹) ہم نے ہرگز اُسے شعر نہیں سکھایا اور وہ اس کے لائق بھی نہیں ہے۔ یہ (کتاب آسمانی تو) صرف ذکر اور قرآن مبین ہے۔

(۷۰) مقصد یہ ہے کہ تُو ان لوگوں کو ڈرائے کہ جو زندہ ہیں اور کفار پر اتمام حجت ہو جائے اور عذاب کا حکم ان کے لیے مسلّم ہو جائے۔

تفسیر

رسولؐ شاعر نہیں بلکہ وہ زندوں کو ڈرانے والا ہے

ہم نے بیان کیا تھا کہ اس سورہ میں اصول دین میں سے توحید، معاد اور نبوت کے بارے میں زندہ اور جامع مباحث بیان کیے گئے ہیں اور گفتگو کے مختلف حصے یکے بعد دیگرے ایک خاص انداز سے آتے چلے جاتے ہیں۔

گزشتہ آیات میں توحید و معاد کے سلسلے میں مختلف بحثیں آئی ہیں۔ زیر نظر دونوں آیات میں نبوت کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ پر جو اتہامات لگائے جاتے تھے ان میں سے جو اتہام سب سے زیادہ تھا اسے عنوان بنا کر انہیں دنداں شکن اور سبق آموز جواب دیا گیا ہے اور وہ ہے شعر گوئی کا الزام۔ فرمایا گیا ہے:

"ہم نے اُسے شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی اس کے لیے مناسب اور لائق ہے کہ وہ شاعر ہو" (وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ)۔

Marfat.com

وہ پیغمبر اکرمؐ پر ایسے الزامات کیوں لگاتے تھے حالانکہ آپؐ نے کبھی بھی شعر نہیں کہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب لوگ دلوں میں قرآن کی تاثیر اور کشش محسوس کرتے تھے اور اس کے لفظ و معنی کی زیبائی اور فصاحت و بلاغت انکار کے قابل نہیں تھی۔ یہاں تک کہ خود مشرکین بھی قرآن کی آواز اور بیان سے اتنے متاثر ہوتے تھے کہ بعض اوقات رات کے وقت چھپ چھپ کر پیغمبر اکرمؐ کی منزل کے قریب آتے تھے تاکہ رات کی تاریکی میں آپؐ کی تلاوت کا زمزمہ سُن سکیں۔

کتنے ہی لوگ ایسے تھے جو قرآن کی چند آیات سنتے ہی اس کے شیفتہ اور فریفتہ ہو گئے اور ایک ہی مجلس میں اسلام قبول کرلیا اور قرآن کی آغوش میں پناہ لے لی۔

یہی سبب تھا کہ اس عظیم تاثیر کی توجیہ اور اس آسمانی وحی سے لوگوں کو غافل رکھنے کے لیے' انہوں نے ہر جگہ پیغمبر اکرمؐ کی شعر گوئی کا پروپیگنڈہ کیا اور یہ باطنی طور پر قرآن کی انتہائی تاثیر کا ایک اعتراف تھا۔

لیکن شاعر ہونا پیغمبرؐ کی شان کے لائق کیوں نہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ "وحی" کا راستہ شعر کے راستے سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ:

۱۔ عام طور پر شعر کا سرچشمہ تخیلات و تصورات ہوتے ہیں۔ شاعر زیادہ تر خیال کے دوش پر سفر کرتا ہے جبکہ "وحی" کا سرچشمہ مبداء ہستی ہے اور یہ حقیقتوں کے گرد گردش کرتی ہے۔

۲۔ شعر انسانی تغیر پذیر حالت سے وقوع میں آتا ہے اور ہمیشہ تغیر کی حالت میں ہوتا ہے جبکہ وحی آسمانی ثابت شدہ حقائق کو بیان کرتی ہے۔

۳۔ شعر کا لطف اکثر موقعوں پر مبالغہ آرائی میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہا گیا ہے کہ:

احسن الشعر اکذبہ

"سب سے بہتر شعر وہ ہے کہ جس میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو"

جبکہ وحی میں صداقت اور سچائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

۴۔ شاعر بہت سے موقعوں پر لفظ کی زیبائیوں کی خاطر مجبور ہو جاتا ہے کہ خود کو الفاظ کے سپرد کر دے اور اس کے پیچھے پیچھے چلے اور کتنے ہی حقائق ایسے ہوتے ہیں کہ جو ایسی باتوں میں پامال ہو جاتے ہیں۔

۵۔ ایک مفسر کے خوبصورت خیال میں "شعر" ان آرزوؤں کا مجموعہ ہے کہ جو زمین سے آسمان کی طرف پرواز کرتی ہیں لیکن وحی ایسے حقائق کا مجموعہ ہے جو آسمان سے زمین کی طرف نازل ہوتے ہیں اور یہ دونوں راستے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔

اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان شعراء کا حساب جدا سمجھیں کہ جو مقدس مقاصد کے لیے قدم اٹھاتے ہیں اور اپنے شعر کو غیر مطلوب عوارض سے دور رکھتے ہیں۔ چاہیئے کہ ایسے شعراء کے مقام اور فن کی قدر و قیمت کو فراموش نہ کریں۔ لیکن بہرحال عام طور پر شعر کا مزاج اور طبیعت یہی ہے کہ جو بیان ہوا ہے۔

Marfat.com

اسی بنا پر قرآن مجید سورۂ شعراء کے آخر میں کہتا ہے :

والشعراء یتبعھم الغاوون

"شعراء تو وہ ہیں جن کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں"۔ (شعراء - ۲۲۴)

اس کے بعد مختصر اور پُر معنی عبارت میں اس کی دلیل پیش کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے :

الم تر انھم فی کل واد یھیمون ۝ وانھم یقولون مالا یفعلون ۝

"کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں (ہمیشہ خیالات و تصورات کی دنیا اور اپنی شاعرانہ تشبیہات میں ڈوبے رہتے ہیں) اور ہیجانات کی موجوں اور خیالی تحرکات کے سامنے جھکے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھتے نہیں ہو کہ جو باتیں وہ کہتے ہیں ان پر عمل نہیں کرتے"۔ (شعراء - ۲۲۵-۲۲۶)

البتہ انہی آیات کے آخر میں ان شعراء کو جو صاحبِ ایمان اور نیک و صالح ہیں اور جن کا فن ان کے اہداف و مقاصد کے کام آتا ہے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور ان کی قدر افزائی کی گئی ہے اور ان کا معاملہ دوسروں سے جدا رکھا گیا ہے۔

لیکن ہر حال پیغمبر شاعر نہیں ہو سکتا اور جس وقت قرآن یہ کہتا ہے کہ "خدا نے اُسے شعر کی تعلیم نہیں دی" تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا پیغام شعر کی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کی تمام تعلیمات کا منبع خدا ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ تواریخ و روایات میں بارہا نقل ہوا ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرمؐ چاہتے تھے کہ کسی شعر کو بطور مثال پیش کریں اور اُسے اپنے قول کا شاہد قرار دیں تو اسے توڑ کر پیش کرتے تھے تاکہ دشمن کے ہاتھ کوئی بہانہ نہ آجائے، چنانچہ ایک دن پیغمبرؐ چاہتے تھے کہ عربوں کا یہ مشہور شعر پڑھیں :

ستبدی لک الایام ماکنت جاھلا ویاتیک بالاخبار من لم تزود

"عنقریب زمانہ تیرے لیے ایسے حقائق آشکار کر دے گا جن سے تُو آگاہ نہیں تھا اور ایسے افراد تیرے لیے خبریں لے کر آئیں گے جن کے لیے تُو نے زاد و توشہ مہیا نہیں کیا تھا"۔

تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا :

یاتیک من لم تزود بالاخبار، اور جملے کو آگے پیچھے کر دیا[1]

قرآن پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں شعر کی نفی کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ : "یہ آیات سوائے بیداری کے وسیلہ اور آشکار قرآن کے اور کچھ نہیں ہیں" (ان ھو الا ذکر و قراٰن مبین)۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

"اس سے مقصد یہ ہے کہ تُو ان لوگوں کو ڈرائے جو زندہ ہیں اور کافروں پر اتمامِ حجت ہو جائے اور حکمِ عذاب ان کے لیے مسلّم ہو جائے" (لینذر من کان حیًّا و یحق القول علی الکافرین) [1]

ہاں! یہ آیات "ذکر" ہیں اور نصیحت و بیداری کا وسیلہ ہیں۔ یہ قرآن مبین کی آیات ہیں کہ جو کسی قسم کی پردہ پوشی کے بغیر بڑی صراحت کے ساتھ حق کو بیان کرتی ہیں اور اسی بنا پر بیداری اور حیات کا موجب ہیں۔

ایک مرتبہ پھر ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ قرآن "ایمان" کو "حیات" اور مومنین کو "زندہ"، اور بے ایمان افراد کو "مُردہ" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ایک طرف تو "حیّ" (زندہ) ہے اور اس کے مقابل میں "کافرین" ہے۔ یہ وہی معنوی حیات و موت ہے جو ظاہری موت و حیات سے کئی درجے بڑھ کر ہے اور اس کے آثار زیادہ وسیع ہیں۔ اگر حیات سانس لینے، کھانا کھانے اور چلنے پھرنے کا نام ہو تو یہ ایسی چیز ہے کہ جس میں تمام جانور شریک ہیں۔ یہ انسانی حیات نہیں ہے۔ حیاتِ انسانی تو، روحِ انسانی میں، عقل و خرد اور اعلیٰ ملکات کے پھول کھلنے، تقویٰ، ایثار، فداکاری، نفس پر قابو رکھنے اور فضیلت و اخلاق کا نام ہے اور قرآن انسانوں کے وجود میں اس حیات کی پرورش کرتا ہے۔

بہرحال انسان قرآن کی دعوت کے مقابلے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ زندہ و بیدار افراد کا ہے کہ جو اس کی ہر دعوت پر لبیک کہتا ہے اور اس کی تنبیہوں پر توجہ دیتا ہے۔ دوسرا گروہ مردہ دل کفار کا ہے کہ جو اس کے جواب میں مثبت ردِعمل کا اظہار نہیں کرتا لیکن یہ انذار ان پر اتمامِ حجت اور حکمِ عذاب کے مسلّم ہونے کا باعث ہے۔

٭ ٭ ٭

دلوں کی موت اور زندگی:

انسان چند قسموں کی موت و حیات کا حامل ہے۔

پہلی تو "نباتی" موت و حیات ہے جو نشو و نما، غذا کھانے اور تولیدِ نسل کی مظہر ہے۔ اس لحاظ سے انسان تمام نباتات کے مانند ہے۔

دوسری موت و حیات "حیوانی" ہے کہ جس کی واضح نشانی حس و حرکت ہے اور ان دونوں خصوصیات میں انسان تمام حیوانات کے ساتھ شریک ہے۔

البتہ تیسری قسم حیات کی وہ ہے جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے، جو انہیں نباتات اور دوسرے

---

[1] "لینذر"، "ذکر" سے متعلق ہے کہ جو اس سے پہلے کی آیت میں ہے اور بعض نے اسے "علمنا" یا "نزلنا" سے متعلق سمجھا ہے کہ جو مقدر ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

Marfat.com

حیوانات سے جدا کرتی ہے اور وہ ہے حیاتِ انسانی و روحانی۔ یہ وہی چیز ہے جسے اسلامی روایات میں حیات القلوب قرار دیا گیا ہے۔ یہاں پر "قلب" سے مراد وہی روح، عقل اور احساساتِ انسانی ہیں۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام کے ارشادات میں نہج البلاغہ کے خطبات اور کلمات قصار میں اس مسئلے کا ذکر بہت کیا گیا ہے۔ ایک خطبے میں آپؑ قرآن کے بارے میں فرماتے ہیں:

تفقهوا فیه فانه ربیع القلوب

"قرآن کے بارے میں غور و فکر کرو، کیونکہ اس میں دلوں کو حیات بخشنے والی بہار ہے[1]"

دوسری جگہ حکمت و دانش کے متعلق فرماتے ہیں:

هی حیاة للقلب المیت

"حکمت و دانائی مردہ دلوں کے لیے سبب حیات ہے[2]"

کبھی دل کی بیماری کا بدن کی بیماری سے تقابل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

واشد من مرض البدن مرض القلب

"بدن کی بیماری سے دل کی بیماری بدتر ہے[3]"

کبھی فرماتے ہیں:

ومن قل ورعه مات قلبه

"جس میں پرہیزگاری کی روح کم ہو جائے اس کا دل مرجاتا ہے[4]"

دوسری طرف قرآن مجید نے انسان کے لیے ظاہری بینائی و شنوائی اور شعور و ادراک کے علاوہ ایک خاص قسم کی بینائی و شنوائی اور شعور و ادراک کا ذکر کیا ہے جیسا کہ کفار کے بارے میں ہے:

صم بکم عمی فهم لا یعقلون

"وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں اور اسی بنا پر عقل و شعور نہیں رکھتے"۔ (بقرہ - ۱۷۱)

دوسری جگہ منافقین کو دل کے بیماروں کا نام دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فی قلوبهم مرض فزادهم الله مرضًا

"خدا ان کی بیماری میں اضافہ کر دیتا ہے"۔ (بقرہ - ۱۰)

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۰۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۳۳۔

[3] نہج البلاغہ، کلمات قصار کلمہ ۳۸۸۔

[4] نہج البلاغہ، کلمات قصار کلمہ ۳۴۹۔

Marfat.com

نیز جن لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہے انہیں قرآن سنگدل قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ثم قست قلوبکم من بعد ذالک فھی کالحجارة او اشد قسوة

"ان کا دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے"۔ (بقرہ - ۷۴)

اور کافروں کو "ناپاک دل والے افراد" کے ساتھ تعارف کراتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

اولئك الذين لم يرد الله ان يطهّر قلوبهم

"وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کو پاک نہیں کرنا چاہتا"۔ (مائدہ - ۴۱)

ایک اور جگہ کہتا ہے:

"تیری دعوت کو صرف وہ زندہ لوگ ہی قبول کریں گے کہ جو سننے والے کان رکھتے ہیں، نہ کہ مُردہ لوگ"۔

انما یستجیب الذین یسمعون والموتی یبعثھم اللہ ثم الیہ یرجعون

ایک اور جگہ ہے:

"صرف وہ لوگ ہی کہ جو سننے والے کان رکھتے ہیں تیری دعوت قبول کریں گے۔ باقی رہے مُردے تو انہیں خدا قیامت میں اٹھائے گا پھر وہ اس کی طرف پلٹ کر جائیں گے"۔ (انعام - ۳۶)

ان تعبیرات کے مجموعے اور ان سے مشابہ بہت سی دوسری تعبیروں سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن موت و حیات کا محور اسی عقل والے انسانی محور کو شمار کرتا ہے کیونکہ انسان کی تمام قدر و قیمت اسی حصے میں چھپی ہوئی ہے۔

حقیقت میں حیات و ادراک، دیکھنا اور سننا وغیرہ انسانی وجود کے اسی حصے میں مجتمع ہوتا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے ان تعبیرات کو مجاز سمجھا ہے لیکن وہ اس مقام پر روحِ قرآنی سے ہم آہنگ نہیں ہیں کیونکہ قرآن کی نگاہ میں حقیقت یہی ہے اور حیوانی موت و حیات ایک مجاز سے زیادہ نہیں ہے۔

روحانی موت و حیات کے عوامل و اسباب بہت زیادہ ہیں لیکن قدرِ مسلّم یہ ہے کہ نفاق، تکبر، غرور، تعصب، جہالت اور گناہانِ کبیرہ دل کو مردہ کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ امام زین العابدین علی بن الحسین علیہ السلام کی پندرہ مناجاتوں میں سے تائبین کی مناجات میں بیان ہے:

و امات قلبی عظیم جنایتی

"میرے بڑے بڑے جرائم نے میرے دل کو مُردہ کر دیا ہے [۱]"

زیر بحث آیات بھی اسی حقیقت پر ایک تاکید ہیں۔

---

[۱] امام علی بن الحسینؑ کی پندرہ مناجاتوں میں سے پہلی مناجات (مناجات تائبین)۔

Marfat.com

کیا وہ لوگ زندہ ہیں کہ جو زندگی میں صرف اس بات پر قانع ہوگئے ہیں کہ وہ بے خبری کی حالت میں ہمیشہ عیش و نوش میں زندگی بسر کریں، نہ کسی مظلوم کی فریاد سنیں، نہ منادیان حق کی ندا پر لبیک کہیں، نہ ظالم کے ظلم سے ناراحت اور پریشان ہوں اور نہ مظلومین کی محرومیت پر ان میں جنبش و حرکت پیدا ہو، صرف اپنے بارے میں سوچیں اور اپنے غیر بلکہ خود اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہوں۔

کیا زندگی یہی ہے کہ جس کا ماحصل صرف کچھ غذا کا کھا لینا، کچھ کپڑے بوسیدہ کر لینا اور سونے اور جاگنے کی تکرار کرتے رہنا؟

اگر زندگی یہی ہے تو پھر حیوان اور عالم انسانی میں کیا فرق ہے؟

پس یہ بات قبول کرنی ہی پڑے گی کہ اس ظاہری زندگی کے ماورا۔ اور پس پردہ، ایک حقیقت ہے کہ جس کا قرآن ذکر کرتا ہے اور اس کے بارے میں بات کرتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایسے مرنے والے کہ جن کی موت میں بھی حیاتِ انسانی کے آثار پائے جاتے ہیں قرآن کی نگاہ میں مر کر بھی زندہ ہیں لیکن وہ زندہ کہ جن میں حیاتِ انسانی کے آثار میں سے کوئی نظر نہیں آتا، قرآن کی منطق میں مُردہ ہیں۔ ایک جانکاہ و رقت بار موت۔

Marfat.com

۷۱ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَآ
اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ○
۷۲ وَ ذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا یَاْكُلُوْنَ ○
۷۳ وَلَهُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ○
۷۴ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ یُنْصَرُوْنَ ؕ ○
۷۵ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ
مُّحْضَرُوْنَ ○
۷۶ فَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ
وَمَا یُعْلِنُوْنَ ○

ترجمہ

۷۱ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جو چیزیں ہم اپنی قدرت سے روبہ عمل لائے ہیں ان میں ہم نے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے ہیں کہ جن کے وہ مالک ہیں ۔

۷۲ ہم نے انہیں ان کے لیے یوں رام کر دیا ہے کہ انہی میں سے سواری کا کام بھی لیتے ہیں اور انہیں میں سے غذا بھی حاصل کرتے ہیں ۔

۷۳ نیز ان (حیوانات) میں ان کے لیے دوسرے منافع بھی ہیں اور پینے کی اچھی چیزیں ہیں، کیا وہ اس حالت میں شکر نہیں کرتے ۔

Marfat.com

(۷۴) انہوں نے اپنے لیے خدا کے علاوہ کچھ معبود بنا لیے ہیں۔ اس امید پر کہ شاید ان کی مدد کی جائے۔

(۷۵) لیکن وہ ان کی مدد پر قادر نہیں ہیں اور یہ (عبادت کرنے والے قیامت میں، آتش جہنم میں حاضر ہونے والا اُن کا لشکر ہوں گے۔

(۷۶) لہٰذا ان کی باتیں تمہیں غمگین نہ کریں، ہم اُن تمام باتوں کو جانتے ہیں کہ جنہیں وہ پنہاں رکھتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں۔

تفسیر

چوپایوں کے عظیم فائدے

ان آیات میں قرآن مجید ایک بار پھر توحید و شرک کے مسئلے کی طرف لوٹتا ہے اور انسانوں کی زندگی میں عظمتِ خدا کی کچھ نشانیوں کا ذکر کرتا ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ خدا ہی اپنے بندوں کی حاجات کو پورا کرتا ہے اور بُت اس سلسلے میں بے بس اور ناتواں ہیں۔ اس طرح ایک واضح موازنہ کرتے ہوئے راہِ توحید کی حقانیت اور راہِ شرک کے بطلان کو واضح کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جو چیزیں، ہم اپنی قدرت سے رو بہ عمل لائے ہیں ان میں ہم نے ان کے لیے چوپائے بھی پیدا کیے ہیں کہ جن کے وہ مالک ہیں" (اولم یروا انّا خلقنا لھم ممّا عملت ایدینا انعامًا فھم لھا مالکون)[1]

٭ ٭ ٭

اس غرض سے کہ وہ ان چوپایوں سے اچھی طرح فائدہ اٹھا سکیں "ہم نے انہیں ان کے لیے رام کر دیا ہے" (و ذللناھا لھم)۔

"یہ ان میں سے اپنے لیے سواریاں بھی فراہم کرتے ہیں اور ان سے غذا بھی حاصل کرتے ہیں" (فمنھا رکوبھم و منھا یأکلون)۔

---

[1] "اولم یروا ....." ایک ایسا جملہ ہے کہ جو واو عطف کے ساتھ اپنے سے پہلے جملہ پر عطف ہوا ہے البتہ چونکہ ہمزہ استفہام ہمیشہ صدر نشین ہوتا ہے اس لیے واوٴ عاطفہ سے پہلے آیا ہے اور یہاں ممکن ہے کہ رویت جاننے یا دیکھنے کے معنی میں ہو۔

Marfat.com

ان چوپایوں کے فائدے صرف یہی نہیں ہیں بلکہ "ان کے لیے ان حیوانات میں دوسرے فائدے بھی ہیں اور اچھے مشروبات بھی ہیں" (ولھم فیھا منافع و مشارب)۔

"کیا ان حالات میں بھی وہ ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے" وہ شکر کہ جو اللہ کی معرفت کا وسیلہ اور ولی نعمت کی شناخت کا ذریعہ ہے (افلا یشکرون)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ مختلف نعمتیں کہ جن میں انسان سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا ہے، ان میں سے یہاں چوپایوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کیونکہ وہ انسان کی روزمرہ کی زندگی میں ہمیشہ حاضر رہتے ہیں۔ انسانی زندگی ان کے ساتھ اس حد تک وابستہ ہے کہ اگر وہ انسانی زندگی سے حذف ہو جائیں تو واقعاً انسان کی زندگی مشکل اور پیچیدہ ہو جائے۔

۲۔ "عملت ایدینا" (ہمارے ہاتھوں نے انہیں انجام دیا)۔ یہ جملہ پروردگار کی مستقیم DIRECT قدرت کے اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ انسان کا اہم ترین عضو کہ جس کے ساتھ وہ اپنی قدرت کو عمل میں لاتا ہے، اس کے ہاتھ ہیں۔ اسی وجہ سے "ید" (ہاتھ) قدرت کے لیے کنایہ ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

یداللہ فوق ایدیھم

"خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے"۔ (فتح - ۱۰)

بہرحال "ایدی" کا ذکر جمع کی شکل میں پروردگار کی قدرت کے گوناں گوں مظاہر کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ "فھم لھا مالکون" (فاء تفریع کے ساتھ) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے چوپایوں کو اپنی قدرت کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن اس کی مالکیت انسانوں کو بخش دی ہے اور اس سے لطفِ پروردگار کی انتہا ظاہر ہوتی ہے۔ اس بنا پر وہ اشکال کہ جو بعض مفسرین کے لیے یہاں "فاء تفریع" میں پیدا ہوگیا ہے ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ہم کسی سے کہیں کہ یہ باغ ہم نے آباد کیا ہے لیکن تم اس سے فائدہ اٹھاؤ گے اور یہ انتہائی محبت و ایثار کی نشانی ہے۔

۴۔ "ذللناھا لھم" انسانوں کے لیے چوپائے رام ہونے کے اہم مسئلے کی طرف اشارہ ہے یہ طاقتور حیوانات کہ جو کبھی کبھی نادر طور پر خدا کے "ذللناھا" کے فرمان کو فراموش کرتے ہوئے عصیان و طغیان پر اتر آتے ہیں تو اس قدر خطرناک ہو جاتے ہیں کہ دسیوں افراد ان کے مقابلہ میں عاجز آجاتے ہیں لیکن عام حالات میں اونٹوں کی ایک قطار کو ایک رسی سے باندھ کر ایک چند سالہ بچے کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے تو وہ انہیں جہاں اس کا دل چاہے لے جاتا ہے۔

واقعاً عجیب بات ہے، نہ تو انسان اس بات پر قادر ہیں کہ ایک مکھی ہی پیدا کر سکیں اور نہ ہی وہ

Marfat.com

ایک مکھی کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا سکتے ہیں لیکن خدائے قادر و منان نے لاکھوں قسم کے چوپائے پیدا کیے ہیں اور انہیں انسان کے لیے رام اور مطیع کر دیا ہے اور وہ ہمیشہ انسان کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔

۵۔ "فمنہا رکوبھم و منہا یأکلون" میں "رکوب" صفت مشبہ ہے اور "مرکوب" یعنی وہ جانور کہ جس پر سوار ہوتے ہیں کے معنی میں ہے۔ یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کچھ حیوانات کو تو مرکب اور سواری کے طور پر استعمال کرتا ہے اور کچھ کو کھانے کے لیے۔

اگرچہ تمام عام جانوروں کا گوشت اسلام کی نظر میں حلال ہے لیکن عملی طور پر ان میں سے کچھ ہی جانور کھانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، مثلاً گدھے کا گوشت سوائے مجبوری کی حالت کے کوئی نہیں کھاتا۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ "منہا" کو دونوں جملوں میں "تبعیض" کے معنی میں لیا جائے لیکن اگر پہلا "منہا" تبعیض حیوانات اور دوسرا "تبعیض" اجزار کے لیے ہو، تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ بعض جانوروں کو تم اپنی سواری بناتے ہو اور بعض کے اجزائے بدن سے غذا حاصل کرتے ہو (کیونکہ ہڈیاں وغیرہ غذا کے قابل نہیں ہیں)۔

۶۔ "لھم فیہا منافع" کا جملہ ان دوسرے بہت سے فوائد کی طرف اشارہ ہے کہ جو چوپایوں سے انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی اون سے طرح طرح کے لباس اور خیمے بنتے ہیں اور ان کا چمڑا لباس، جوتا، ٹوپی اور زندگی کی دوسری مختلف ضروریات کے کام آتا ہے۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں بھی جبکہ مصنوعات نے انسانی زندگی کا چہرہ ہی بدل کے رکھ دیا ہے، پھر بھی انسانوں کی یقینی ضرورت لباس کے لحاظ سے بھی اور باقی وسائل زندگی کے لحاظ سے بھی چوپایوں سے اپنی پوری شد و مد کے ساتھ باقی ہے۔

یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں انواع واقسام کے سیرم (EXTRACT) اور ویکسین (VACCINE) کہ جو بیماریوں کا مقابلہ کرنے یا حفظ ماتقدم کے لیے مؤثر ترین ذریعہ ہیں چوپایوں سے ہی حاصل ہوتی ہیں کہ جو ان کے خون سے مہیا کیا جاتا ہے۔

یہاں تک کہ چوپایوں کی زندگی کی بے قدر وقیمت چیزیں گوبر اور پیشاب سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے اور اسے زمینوں اور درختوں کے لیے کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

۷۔ "مشارب" کی تعبیر اس دودھ کی طرف اشارہ ہے کہ جو مختلف جانوروں سے حاصل کیا جاتا ہے اور انسان کی غذا کا ایک اہم حصہ اس سے اور اس سے بنائی ہوئی چیزوں سے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ آج دنیا میں دودھ کی پیداوار اور دودھ سے بنی ہوئی صنعتیں مختلف ممالک کی درآمد و برآمد کا ایک اہم حصہ ہیں۔ وہی دودھ کہ جو انسان کے لیے ایک مکمل غذا ہے اور یہ خوش گوار دودھ گوبر اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے کہ جو پینے والے کے لیے باعث لذت اور ناتوانوں

Marfat.com

کے لیے توانائی بخش ہے [1]

۸۔ "افلا یشکرون" استفہام انکاری کی صورت میں آیا ہے۔ یہ جملہ خدا کی بے پایاں نعمتوں پر احساس تشکر ابھارنے کی غرض سے ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں "شکر منعم کا لزوم" "معرفت خدا" کے لیے ایک بنیادی چیز ہے۔ کیونکہ شکر، نعمت بخشنے والے کی پہچان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ان نعمتوں کا مطالعہ اور اس بات کا شعور کہ بتوں کا ان میں ہرگز کوئی عمل دخل نہیں، شرک کو باطل کرنے کا ایک وسیلہ ہوگا۔

٭ ٭ ٭

اس لیے بعد والی آیات میں مشرکین کی حالت بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "انہوں نے خدا کے علاوہ اپنے لیے کچھ معبود بنا لیے ہیں، اس امید پر کہ وہ ان کی مدد کریں گے" (اور انہیں بتوں کی حمایت حاصل ہوگی) (واتخذوا من دون الله اٰلهة لعلهم ینصرون)۔

کیا خیال خام اور باطل نظریہ ہے کہ ان کمزور موجودات کو جو خود اپنے دفاع پر بھی قادر نہیں ہیں، زمین و آسمان کے خالق اور ان تمام نعمتوں کے بخشنے والے کے برابر قرار دے دیا جائے اور زندگی کے مشکل امور میں ان سے مدد طلب کی جائے۔

واتخذوا من دون الله اٰلهة لیکونوا لهم عزًّا

"ہاں! وہ کبھی اس بنا پر بتوں کے پیچھے جاتے تھے کہ وہ ان کے لیے سرمایۂ عزت ہوں گے۔" (مریم - ۸۱)

اور کبھی انہیں خدا کی بارگاہ میں شفیع خیال کرتے۔

ویعبدون من دون الله مالا یضرهم ولا ینفعهم ویقولون هٰؤلاء شفعاؤنا عند الله

"وہ خدا کے علاوہ کچھ ایسی موجودات کی پرستش کرتے ہیں کہ جو نہ انہیں کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نفع، وہ کہتے ہیں کہ یہ بارگاہِ خدا میں ہمارے شفیع ہیں۔" (یونس - ۱۸)

بہرحال یہ تمام خیالات نقش بر آب ہیں اور جیسا کہ قرآن سورۂ اعراف کی آیہ ۱۹۲ میں فرماتا ہے:

ولا یستطیعون لهم نصرًا ولا انفسهم ینصرون

"یہ بت نہ تو اپنے عبادت گزاروں کی کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی خود اپنی کوئی مدد کر سکتے ہیں۔"

---

[1] جانوروں کے پستانوں سے نکلنے والے دودھ میں خدا کی قدرت نمائی اور دودھ کی خوبیوں کے بارے میں ہم تفصیلی بحث جلد ۱۱ میں سورہ نحل کی آیہ ۶۶ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

Marfat.com

بعد والی آیت میں قرآن مزید کہتا ہے: "وہ اپنے عبادت گزاروں کی مدد کرنے پر قادر نہیں ہیں اور یہ عبادت کرنے والے قیامت کے دن ان کا لشکر ہوں گے اور سب کے سب دوزخ میں حاضر ہوں گے" (لا یستطیعون نصرھم وھم لھم جند محضرون)۔

کتنی دردناک صورتِ حال ہے کہ یہ پیروکار اس دن سپاہیوں کی صورت میں بُتوں کے پیچھے کھڑے ہوں گے اور سب کے سب خدا کی عدالت میں حاضر ہوں گے۔ اس کے بعد سب کے سب دوزخ میں بھیج دیے جائیں گے بغیر اس کے کہ وہ اپنے لشکر کی کوئی مشکل حل کر سکیں۔

اصولی طور پر "محضرون" کی تعبیر ہر جگہ تحقیر و تذلیل کی علامت ہوتی ہے اور لوگوں کو ان کے مائل ہوتے بغیر حاضر کرنا ان کی حقارت کی نشانی ہے۔

اس تفسیر کے مطابق "وھم لھم جند محضرون" میں پہلی ضمیر "ھم" عابدوں کی طرف اور دوسری ضمیر معبودوں کی طرف لوٹتی ہے۔ جبکہ بعض مفسرین نے اس کے برخلاف بھی خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ یہ کہ معبود اور بُت اس دن عبادت کرنے والوں کا لشکر ہوں گے اور لشکر ہونے کے باوجود معمولی سی مدد بھی ان سے نہ ہو سکے گی۔

البتہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

بہرحال یہ تعبیریں صرف صاحب شعور شیاطین اور سرکش جن و انس جیسے معبودوں کے بارے میں صادق آتی ہیں لیکن یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس دن خدا ان بتوں میں عقل و شعور پیدا کر دے گا جو انہوں نے پتھر اور لکڑی سے بنائے ہوں گے۔ تاکہ وہ اپنے عبادت کرنے والوں کی سرزنش کریں ضمنی طور پر یہی پتھر اور لکڑیاں جہنم کے ایندھن کے طور پر ان کے ساتھ ہوں گی۔ جیسا کہ قرآن مجید سورہ انبیاء کی آیہ ۹۸ میں کہتا ہے:

انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم انتم لھا واردون

"تم بھی اور جن جن کی تم خدا کے سوا عبادت کیا کرتے تھے، جہنم کا ایندھن ہوں گے اور سب کے سب اس میں داخل ہوں گے۔"

آخرکار زیرِ بحث آخری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کی تسلی اور ان مخالفتوں، فتنہ انگیزیوں اور خرافاتی اعمال و افکار کے مقابلے میں انکی رُوحانی تقویت کے لیے فرمایا گیا ہے: اب جبکہ ایسا ہے تو اُن کی باتیں تجھے غمگین نہ کریں کہ کبھی وہ تجھے شاعر کہتے ہیں اور کبھی جادوگر اور کبھی دوسری تہمتیں باندھتے ہیں کیونکہ جس چیز کو وہ دلوں میں مخفی رکھتے ہیں یا زبان کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں ہم وہ سب کچھ جانتے ہیں" (فلا یحزنک قولھم انّا نعلم ما یسرّون وما یعلنون)۔

نہ تو ان کی نیتیں ہم سے پوشیدہ ہیں اور نہ ہی ان کی خفیہ سازشیں اور نہ ہی ان کی آشکارا تکذیبیں

Marfat.com

اور شیطنتیں ۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں اور ان کا حساب روزِ حساب کے لیے محفوظ رکھتے ہیں اور تجھے ہم اس جہان میں بھی ان کے شر سے محفوظ رکھیں گے ۔

نہ صرف پیغمبرؐ بلکہ ہر مومن اس الٰہی گفتار سے مطمئن ہو سکتا ہے ۔ کیونکہ اس عالم کی ہر چیز خدا کے حضور میں ہے اور دشمنوں کے مکر و فریب میں سے کوئی چیز اس پر مخفی نہیں ۔ وہ اپنے دوستوں کو سختی کے لمحات میں اکیلا نہیں چھوڑتا اور ہمیشہ ان کا حامی و محافظ رہتا ہے ۔

ایک اہم نکتہ

خدا پرستوں کے لیے توحید کی بصیرت ، زندگی میں ایک خاص راستہ پیدا کر دیتی ہے کہ جو انہیں شرک آلود راستوں سے جُدا کر دیتی ہے کہ جو بُتوں اور اپنے ہی جیسے کمزور انسانوں کی پناہ لینے کی بنیاد بنتے ہیں

ہم اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔ آج کی دنیا میں جبکہ سارا عالم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے اور مشرق و مغرب کی دو سُپر طاقتیں ان پر حکومت کر رہی ہیں تو عام طور پر بہت سے چھوٹے اور درمیانے ممالک یہ سوچتے ہیں کہ اپنی حفاظت کے لیے ان دو طاقتوں یعنی ان دو بُتوں میں سے کسی ایک کی پناہ لینی چاہیئے اور اس کی حمایت حاصل کرنی چاہیئے ۔ حالانکہ تجربات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ سخت حالات ، مشکلات اور بحرانوں میں ، یہ بظاہر بڑی طاقتیں نہ تو اپنی کوئی مشکل حل کر سکتی ہیں اور نہ ہی اپنے مُہروں اور پیروکاروں کی ۔ قرآن نے کیا خوب کہا ہے :

ولا یستطیعون لھم نصرًا ولا انفسھم ینصرون

"نہ تو اپنے عبادت کرنے والوں کی مدد و حمایت کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی خود کو بچا کر رکھ سکتے ہیں ۔" (الاعراف - ۱۹۲)

یہ تمام مسلمانوں اور توحیدِ خالص کے حامیوں کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ ان تمام بتوں سے الگ ہو جائیں اور لطفِ الٰہی کے سائے میں پناہ لیں ۔ صرف اپنے آپ پر اور قوتِ ایمانی اور مسلمانوں کی روحانی قوت پر تکیہ کریں اور ان شرک آلود افکار کو ہرگز ذہن میں جگہ نہ دیں کہ مشکل کے دن ان طاقتوں سے مدد لینا چاہیئے اور اصولی طور پر اسلامی معاشروں کو اس قسم کے افکار سے پاک کرنا چاہیئے اور جان لینا چاہیئے کہ انہوں نے اب تک اس طریقے سے کس قدر مصیبتیں اٹھائی ہیں ۔ خواہ غاصب اسرائیل سے مقابلہ ہو یا دوسرے دشمنوں سے حالانکہ قرآن کا اگر یہ بنیادی قانون ان کے درمیان حاکم ہوتا تو کبھی بھی ایسی المناک شکستوں کا سامنا نہ کرتے اس دن کی امید میں کہ جب ہم سب اس قرآنی تعلیم کے سائے میں اپنے افکار کو نئے سرے سے درست کریں اپنے اوپر بھروسہ کریں اور اللہ کے لطف و کرم کے سائے میں پناہ لیں اور سربلند اور آزاد زندگی بسر کریں ۔

Marfat.com

(۷۷) اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ○

(۷۸) وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ○

(۷۹) قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُنِ ۙ ○

ترجمہ

(۷۷) کیا انسان نے دیکھا نہیں (وہ جانتا نہیں) کہ ہم نے اُسے ایک بے وقعت نطفے سے پیدا کیا ہے اور (جب اُسے قدرت و شعور اور نطق حاصل ہوا تو) وہ کھلم کھلا جھگڑنے لگا۔

(۷۸) اور ہمارے لیے مثال دینے لگا اور اپنی خلقت کو بھول گیا اور کہنے لگا کہ جب یہ ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہوں گی تو ان کو کون زندہ کرے گا۔

(۷۹) کہیے! اسے وہی زندہ کرے گا جس نے اُسے پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق سے خوب آگاہ ہے۔

شانِ نزول

اکثر تفاسیر میں نقل ہوا ہے کہ مشرکین میں سے ایک شخص جس کا نام ابی بن خلف یا امیہ بن خلف یا عاص بن وائل تھا بوسیدہ ہڈی کا ایک ٹکڑا تلاش کر کے لایا اور کہا کہ میں اس محکم دلیل کے ساتھ

Marfat.com

محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے جھگڑا کروں گا اور معاد کے بارے میں اس کی بات کو باطل کر دوں گا۔ وہ اُسے لے کر پیغمبر اسلامؐ کے پاس آیا (اور شاید اس میں سے کچھ حصہ میں کر ریزہ ریزہ کیا اور زمین پر پھینک دیا) اور کہا کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو از سرِ نو کون زندہ کر سکتا ہے (اور کونسی عقل اسے مان سکتی ہے) اس کے جواب میں مذکورہ بالا آیات اور ان سے بعد کی چار آیتیں نازل ہوئیں جو مجموعی طور پر سات آیتیں بنتی ہیں۔ ان آیات میں اسے اور اس کے ہم فکر لوگوں کو ایک منطقی اور دندان شکن جواب دیا گیا ہے۔

تفسیر

خلقتِ اوّل معاد پر ایک دلیلِ قاطع ہے

ہم نے بیان کیا تھا کہ سورۂ یٰسین میں کہ جو قلبِ قرآن ہے مبداء، معاد اور نبوت سے مربوط گفتگو مختلف حصّوں میں آئی ہے یہ سورہ قرآن مجید اور مسئلہ نبوت سے شروع ہوئی تھی اور سات ایسی منظم آیات پر ختم ہو رہی ہے کہ جو معاد کے بارے میں قوی ترین بیانات کی حامل ہیں۔

پہلے تو انسان کو خود اس کی زندگی کے آغاز کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جبکہ وہ ایک حقیر نطفے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ بات انسان کو سوچنے پر آمادہ کرتی ہے اور کہتی ہے: "کیا انسان نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اُسے نطفے سے پیدا کیا ہے اور بڑھتے بڑھتے وہ ایسا جری، باشعور اور ذی نطق ہوا کہ خدا ہی کے ساتھ جھگڑنے کھڑا ہو گیا اور کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا ہو گیا" (اولم یر الانسان انا خلقناہ من نطفة فاذا ھو خصیم مبین) [1]

کیسی عمدہ اور منہ بولتی تعبیر ہے! پہلے انسان کا ذکر کرتا ہے، یعنی ہر انسان ۔ چاہے جس اعتقاد اور مکتب سے تعلق رکھتا ہو، جتنی بھی عقل کا مالک ہو، اس حقیقت کو پا سکتا ہے۔

پھر قرآن "نطفہ" کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ لغت میں "نطفہ" دراصل ناچیز اور بے قدر و قیمت پانی کے معنی میں ہے۔ یہ ذکر اس لیے ہے کہ مغرور و خود پسند انسان تھوڑا بہت غور و فکر کر کے یہ جان لے کہ پہلے روز وہ کیا تھا؟ دوسری بات یہ ہے کہ پانی کا یہ ناچیز قطرہ بھی مکمل طور پر اس کی نشو و نما کا مبدا نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی چھوٹا سا زندہ خلیہ LIFE CELL کہ جو آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ وہ ہزاروں خلیے کہ جو پانی کے قطرے میں تیر رہے تھے یہ ان میں سے ایک تھا۔ ایک بہت ہی چھوٹے سے زندہ خلیے کے ساتھ کہ جو عورت کے رحم میں تھا مل کر یہ ایک مرکب بنا اور انسان نے اس خوردبینی موجود سے عالم ہستی میں قدم رکھا۔

---

[1] "خصیم" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو خصومت اور جھگڑے کے درپے ہو اور "رؤیت" یہاں جاننے کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

پھر اس نے تکامل و ارتقاء کے مراحل یکے بعد دیگرے طے کیے۔ جن میں سے قرآن کی سورۂ مومنون کے اوائل کے مطابق چھ مرحلے رحم کے اندر تھے (نطفہ، پھر علقہ، اس کے بعد مضغہ، اس کے بعد ہڈیوں کا ظاہر ہونا، پھر ہڈیوں پر گوشت کا چڑھنا اور آخر میں روح یعنی حس و حرکت کا پیدا ہونا)۔

تولد کے موقع پر وہ ایک بہت ہی ضعیف و ناتواں بچہ تھا۔ اس کے بعد تکامل و ارتقاء کے مراحل تیزی کے ساتھ طے کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جسمانی اور عقلی بلوغ و رشد کی حد تک پہنچ گیا۔

ہاں! یہ ضعیف و ناتواں موجود اتنا قوی ہو گیا کہ "اللہ" کی دعوت کے مقابلے میں لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو گیا اور اس نے اپنے ماضی و مستقبل کو بالکل ہی فراموش کر دیا اور "خصیم مبین" کا واضح مصداق بن گیا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "خصیم مبین" (واضح طور پر جھگڑنے والا) کی تعبیر، ایک تو قوت کے جنبہ کی حامل ہے اور ایک ضعف و کمزوری کے جنبہ کی۔ یہاں پر ظاہراً قرآن کے پیش نظر دونوں جہات ہیں۔

ایک طرف تو یہ کام انسان کے سوا کسی اور سے نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ صاحب عقل و شعور ہے اور استقلال، ارادہ، اختیار اور قدرت رکھتا ہے (اور ہم جانتے ہیں کہ انسانی زندگی کا اہم ترین امتیاز یہ ہے کہ وہ صاحب نطق ہے) بات کرتا ہے اور ان باتوں کے مضامین و مطالب اس کے دماغ میں پہلے پیدا ہوتے ہیں، پھر جملوں کے قالب میں ڈھلتے ہیں اور پھر یہ باتیں دہن سے یوں نکلتی ہیں جیسے کسی خودکار ہتھیار سے گولیاں کسی ہدف کی طرف مسلسل پھینکی جاتی ہیں اور یہ ایسا کام ہے کہ جو انسان کے علاوہ کسی بھی جاندار سے ممکن نہیں ہے۔

اس طرح سے قرآن خدا کی قدرت نمائی کو اس عظیم قوت میں مجسم کرتا ہے کہ جو اس نے پانی کے اس ناچیز قطرے کو دی ہے۔

لیکن دوسری طرف سے انسان ایک فراموش کار اور مغرور ذات ہے۔ ان نعمتوں کو کہ جو اس کے ولیٔ نعمت نے اُسے بخشی ہیں اسی کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے اور لڑنے جھگڑنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے اس بے خبری اور خیرہ سری کو کیا کہیے؟

٭ ٭ ٭

اس کی بے خبری کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ "اس نے ہمارے لیے مثال دی اور اپنے خیال میں اس نے ایک دندان شکن دلیل پیدا کر لی۔ حالانکہ وہ اپنی ابتدائی خلقت کو بھول گیا اور اس نے کہہ دیا کہ ان ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے، جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں (وضرب لنا مثلاً ونسی خلقه قال من یحی العظام و ھی رمیم)[1]

---

[1] "رمیم" مادہ "رم" سے ہے۔ مفردات راغب کے مطابق اصل میں "رم" (بروزن "ذم") کہنہ اور بوسیدہ موجود

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

یہاں ضرب المثل سے مراد عام ضرب المثل اور تشبیہ و کنایہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد بیان استدلال ہے اور ایک مطلب کلّی کے اثبات کے لیے مصداق کا ذکر کرنا مراد ہے۔

ہاں! (ابی بن خلف یا امیہ بن خلف یا عاص بن وائل) نے بیابان سے بوسیدہ ہڈی کا ایک ٹکڑا تلاش کیا اور وہ ہڈی جس کے بارے میں یہ معلوم نہیں تھا کہ کس کی ہے، کیا وہ طبیعی موت سے مرا تھا؟ یا زمانۂ جاہلیت کی کسی جنگ میں المناک موت کا شکار ہوا تھا؟ یا بھوک کی وجہ سے مرا تھا؟ بہرصورت وہ یہ سوچتا تھا کہ نفی معاد کے لیے اسے ایک دندان شکن دلیل مل گئی ہے۔ غصے اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ، ہڈی کے ٹکڑے کو اٹھا کر کہتا ہے:

لاخصمن محمدًا

"میں اس دلیل کے ساتھ محمدؐ (ص) سے لڑوں گا"، اس طرح سے کہ وہ کوئی جواب نہ دے سکے گا۔

وہ تیزی سے پیغمبر اسلامؐ کے پاس آیا اور چیخ کر کہنے لگا:

مجھے بتلاؤ کس میں یہ قدرت ہے کہ اس بوسیدہ ہڈی کو دوبارہ زندہ کر دے۔

اس کے بعد اس نے ہڈی کے کچھ حصے کو پیس کر زمین پر چھڑک دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ اس دلیل کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ قرآن مجید نے ایک ہی مختصر سے جملہ "ونسی خلقه" سے اس کا جواب دے دیا۔ اگرچہ اس کے بعد مزید وضاحت اور اضافی دلائل بھی بیان کیے۔

قرآن کہتا ہے: اگر تُو اپنی خلقت کو بھول نہ گیا ہوتا تو ہرگز ایسا بے ہودہ اور کمزور استدلال اختیار نہ کرتا۔ اے فراموش کار انسان! تُو اپنے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھ اور اپنی خلقت پر نگاہ کر۔ تو کس طرح سے ایک ناچیز نطفہ تھا۔ اس خالق مطلق نے ہر روز ایک نیا لباس حیات تیرے بدن پر پہنایا۔ تُو تو ہمیشہ سے موت و معاد کی حالت میں رہا ہے۔ مُردہ جمادات سے تیری بنیاد پڑی پھر مُردہ نباتات سے حیوان نے استفادہ کیا۔ اور مردہ حیوانات سے تیری نشو و نما ہوئی اور تُو انسان ہو گیا۔ لیکن تو ایسا فراموش کار ہے کہ ان تمام چیزوں کو بھول کر اب پوچھتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟

یہ ہڈیاں اگر مکمل طور پر بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو جائیں تو زیادہ سے زیادہ پھر مٹی ہو جائیں گی۔ تو کیا تُو پہلے دن مٹی نہیں تھا؟

بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ :- کی اصلاح و ترمیم کے معنی میں ہے۔ "رمة" (بروزن ہمت) خصوصیت کے ساتھ بوسیدہ ہڈی کے معنی میں آتا ہے اور "رمہ" (بروزن "قبہ") بوسیدہ اور پرانی طناب کو کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

لہٰذا بلافاصلہ پیغمبرِ اسلامؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ اس خیرہ سر، مغرور اور فراموش کار سے "کہیے کہ اسے وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے دن اسے خلق کیا تھا" (قل یحییھا الذی انشأھا اوّل مرۃ)۔

اگر آج اس کی ایک یادگار ہڈی باقی رہ گئی ہے تو ایک دن ایسا بھی تھا کہ یہ بوسیدہ ہڈی بھی نہیں تھی۔ بلکہ مٹی تک بھی موجود نہیں تھی۔ ہاں! وہی ذات کہ جس نے اُسے عدم سے وجود بخشا ہے اس کے لیے بوسیدہ ہڈی کو نئی زندگی عطا کرنا زیادہ آسان ہے۔

اگر تم یہ سوچتے ہو کہ یہ بوسیدہ ہڈیاں جب مٹی بن جاتی ہیں اور اِدھر اُدھر بکھر جاتی ہیں تو ان کے اجزا کو کون پہچان سکتا ہے اور کون انہیں مختلف مقامات سے جمع کر سکتا ہے؟ تو اس کا جواب بھی واضح ہے "وہ ہر مخلوق سے آگاہ ہے" اور ان کی تمام خصوصیات کو جانتا ہے (وھو بکل خلق علیم)۔

جو ہستی اس قسم کا علم اور اس قسم کی قدرت رکھتی ہو اس کے لیے مسئلہ معاد اور مُردوں کو زندہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اگر ہم مٹی کے ڈھیر میں کہ جس میں لوہے کے چھوٹے چھوٹے ذرات بکھرے ہوئے ہیں، مقناطیس کا ایک ٹکڑا گھمائیں تو وہ ان تمام ذرات کو فوراً جمع کر لے گا۔ حالانکہ وہ ایک بے جان موجود سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ خداوند تعالیٰ ہر انسان کے تمام ذراتِ بدن کو خواہ وہ کرۂ زمین کے کسی بھی گوشہ میں ہوں ایک ہی حکم سے آسانی کے ساتھ جمع کر دے گا۔

وہ نہ صرف انسان کی بنیادِ خلقت سے آگاہ ہے بلکہ ان کی نیتوں اور اعمال سے بھی آگاہ ہے اور ان کا حساب وکتاب اس کے سامنے واضح و روشن ہے۔

اس بنا پر اعمال و نیات اور اندرونی اعتقادات کا حساب بھی اس کے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کرے گا۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیہ ۲۸۴ میں ہے:

وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ

"اگر تم اس چیز کو جسے دل میں رکھتے ہو چھپاؤ یا ظاہر کرو، خدا اس کا تم سے حساب لے لے گا۔"

فرعون مسئلہ معاد میں شک کرتا تھا اور گزشتہ لوگوں کے زندہ ہونے اور ان کے حساب وکتاب سے اظہارِ تعجب کرتا تھا۔ حضرت موسٰیؑ کو حکم ہوا کہ اس سے "یہ کہیں کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ایک کتاب میں ثبت ہے اور میرا پروردگار نہ تو اشتباہ کرتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے۔"

قال علمھا عند ربی فی کتٰب لا یضل ربی ولا ینسی (طٰہٰ - ۵۲)

Marfat.com

(۸۰) الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ○

ترجمہ

(۸۰) وہی ذات کہ جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی، اور تم اس کے ذریعے آگ روشن کرتے ہو۔

تفسیر

توانائیوں کی بازگشت

گزشتہ آیات میں معاد کے سلسلے میں بحث تھی اور اس میں مسئلہ معاد کے امکان اور ہر قسم کا شک و شبہ رفع کرنے کے لیے معنی خیز اور زندہ اشارے موجود تھے۔ زیر بحث آیات قلب قرآن یعنی سورہ یٰسین کی آخری آیات ہیں۔ ان میں بھی اسی مسئلے کی مزید تشریح و توضیح پیش کی گئی ہے اور تین چار اچھے طریقوں سے اسے بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "وہ خدا کہ جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی اور تم اسکے ذریعے آگ روشن کرتے ہو"۔ وہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے (الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارًا فاذا انتم منه توقدون)۔

کتنی عجیب اور عمدہ تعبیر ہے۔ ہم اس میں جتنا زیادہ غور و فکر کرتے ہیں اتنے ہی زیادہ عمیق اور گہرے معانی کھلتے چلے جاتے ہیں۔

اصولی طور پر قرآن مجید کی بہت سی آیات کئی کئی معنی دیتی ہیں، بعض تو ہر زمانے اور ہر جگہ کے لوگوں کے سمجھنے کے لیے سادہ اور عام ہیں اور بعض دوسری آیات ذرا عمیق ہیں جو خواص کے سمجھنے کے لائق ہیں اور بعض آیات بہت عمیق اور گہری ہیں جو خواص میں سے بھی منتخب افراد کو، یا دوسرے زمانوں اور مستقبل بعید میں سمجھ میں آنے والی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود یہ معانی آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ایک ہی وقت میں ایک ہی پُر معنی تعبیر میں جمع ہیں۔

Marfat.com

زیر بحث آیت یہی مفہوم بیان کرتی ہے۔

پہلی تفسیر بہت سے گزشتہ مفسرین نے بیان کی ہے اس کا ایک سادہ اور واضح مفہوم ہے کہ جو عام لوگوں کے لیے بھی قابل فہم ہے۔ وہ یہ ہے کہ قدیم زمانوں میں عربوں کے اندر یہ بات رائج تھی کہ وہ آگ جلانے کے لیے درختوں کی لکڑی استعمال کرتے تھے خصوصاً "مرخ" اور "عفار" کے درختوں کی لکڑی کہ جو حجاز کے بیابانوں میں عام اُگتی تھی۔

"مرخ" (بروزن "چرخ") اور "عفار" (بروزن "تبار") دو قسم کی "آگ لگانے والی" لکڑیاں ہیں کہ پہلی کو نیچے رکھ کر دوسری کو اس کے اوپر مارتے تھے اور اس سے آگ لگانے والے پتھر (چقماق) کی طرح شعلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ موجودہ زمانے کی ماچس کے بجائے لوگ اسی سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

قرآن کہتا ہے: وہ خدا کہ جو ان سبز درختوں سے آگ نکال سکتا ہے، وہ مُردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔

"پانی" اور "آگ" دو متضاد چیزیں ہیں۔ جو ہستی ان دونوں کو ایک ساتھ اکٹھا رکھنے پر قادر ہے، وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ "زندگی" کو "موت" کے ساتھ اور "موت" کو "زندگی" کے ساتھ جمع کر دے۔

کیا کہنا ہے اس عالم ہستی کے خالق کا کہ جس نے آگ کو پانی کے اندر اور پانی کو آگ کے اندر محفوظ کر رکھا ہے۔ مسلمہ طور پر اُس کے لیے مُردہ انسانوں کے جسموں پر لباس زندگی پہنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اگر ہم اس معنی سے ذرا اور آگے قدم بڑھائیں تو اس سے زیادہ دقیق تفسیر تک پہنچ جائیں گے۔ وہ یہ ہے کہ آگ جلانے کی خاصیت درختوں کی لکڑیوں کے ذریعہ "مرخ" اور "عفار" کی لکڑیوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ خاصیت تمام درختوں میں اور تمام اجسام عالم میں موجود ہے (اگرچہ مذکورہ دونوں لکڑیاں اپنے مخصوص مواد اور وضع و کیفیت کے لحاظ سے اس کام کے لیے زیادہ کارآمد ہیں)۔

خلاصہ یہ کہ تمام درختوں کی لکڑیاں اگر زور کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو ان سے شعلہ نکلے گا، یہاں تک کہ "سبز درختوں کی لکڑیوں سے بھی"۔

اسی وجہ سے بعض اوقات جنگلوں میں وسیع اور وحشتناک آگ لگ جاتی ہے کہ جس کا عامل کوئی انسان نہیں ہوتا۔ صرف وہ ہوائیں اور طوفان کہ جن کے چلنے سے درختوں کی شاخیں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتی ہیں اور ان کے ٹکرانے سے چنگاری نکل کر خشک پتوں پر جا گرتی ہے، اس کے بعد ہوا کے چلنے سے آگ پھیل جاتی ہے اور یہ سب چیزیں اس کا اصلی عامل ہوتی ہیں۔

یہ وہی بجلی کا شعلہ ہے کہ جو ٹکرانے اور ایک دوسرے کے ساتھ ملنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہی آگ ہے کہ جو تمام موجوداتِ عالم کے ذرات میں چھپی ہوئی ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے اور رگڑنے سے ظاہر ہوتی ہے اور "شجر اخضر" (سبز درخت) سے "نار" (آگ) پیدا کر دیتی ہے۔

Marfat.com

یہ ایک زیادہ وسیع تفسیر ہے کہ جس میں زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماع اضداد نظر آتا ہے اور "فنا میں بقا" کی زیادہ واضح نشاندہی ہوتی ہے ۔

لیکن اس سلسلے میں ایک تیسری تفسیر بھی ہے کہ جو اس سے بھی گہری، عمیق تر ہے اور ہم نے "دورحاضر کے علوم کی مدد سے اس تک دسترس حاصل کی ہے اور اسے ہم نے " توانائیوں کی بازگشت " قرار دیا ہے ۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ نباتات کا ایک اہم کام ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ لینا اور "نباتاتی خلیے" بنانا ہے (یہ سیل کہ جو درختوں کا بنیادی جزو ہیں ان کے بڑے اجزاء کاربن، آکسیجن اور ہائیڈروجن ہیں) ۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خلیے (CELLS) کس طرح بنتے ہیں ؟ درختوں اور نباتات کے اجسام ہوا سے "کاربن ڈائی آکسائیڈ" حاصل کرکے اس کا تجزیہ کرتے ہیں اس کی " آکسیجن" کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور کاربن کو اپنے وجود میں محفوظ کرلیتے ہیں اور اسے پانی کے ساتھ ترکیب دے کر اس سے درختوں کا جسم بناتے ہیں ۔

لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ طبیعی علوم کی گواہی کے مطابق جو بھی کیمیائی ترکیب انجام پاتی ہے وہ یا تو توانائی کو جذب کرکے وجود میں آتی ہے یا اُسے آزاد کرنے سے (غور کیجئے گا) [1]

اس بناء پر جس وقت درخت کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرنے کے عمل میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ اس قانون کے مطابق ایک انرجی کے وجود کے محتاج ہیں اور یہاں وہ سورج کی کچھ گرمی اور روشنی سے ایک توانائی کے طور پر استفادہ کرتے ہیں ۔

اس طرح سے درختوں کا جسم بنتے وقت سورج کی توانائی کی کچھ مقدار بھی ان کے اندر جمع ہوجاتی ہے اور جس وقت ہم لکڑیوں کو جلاتے ہیں تو وہی سورج کی ذخیرہ شدہ توانائی آزاد ہوجاتی ہے کیونکہ کاربن ہوا کی "آکسیجن" کے ساتھ مل کر دوبارہ کاربن ڈائی آکسائیڈ بنا دیتی ہے اور آکسیجن اور ہائیڈروجن (پانی کی کچھ مقدار) آزاد ہوجاتی ہے ۔

ان اصطلاحی تعبیروں کو چھوڑتے ہوئے بہت ہی سادہ اور آسان عبارت میں یہ ایک مطبوع نور اور حرارت کہ جو سردیوں میں کسی دیہاتی کی کُٹیا یا کسی شہری کی انگیٹھی کو گرم اور روشن کرتی ہے سورج کا وہی نور و حرارت ہے کہ جو چند سالوں یا دسویں سالوں میں ان درختوں کی لکڑی میں ذخیرہ ہوئی ہے اور جو کچھ درخت نے اس طویل عمر میں تدریجاً اور آہستہ آہستہ سورج سے لیا ہے اور بے کم وکاست اسے واپس دے رہا ہے ۔

---

[1] توانائی جذب کرنے کے عمل کو ENDOTHERMIC کہتے ہیں اور خارج کرنے کا عمل EXOTHERMIC کہلاتا ہے ۔ (ت ن)

Marfat.com

یہ جو کہتے ہیں کہ کرۂ زمین کی تمام توانائیاں سورج کی توانائی کی طرف لوٹتی ہیں، اس کی ایک صورت یہی ہے۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں ہم توانائیوں کی بازگشت تک پہنچ جاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نور و حرارت کہ جو اس فضا میں بکھر جاتی ہے اور درختوں کے پتوں اور ان کی لکڑیوں پر نوازش کرتی اور ان کی پرورش کرتی ہے وہ کبھی بھی نابود نہیں ہوتی بلکہ اس کا چہرہ بدل جاتا ہے اور ہم انسانوں کی آنکھوں سے دور درختوں کے تنوں، شاخوں اور پتوں کے اندر پنہاں ہو گئی ہے اور جس وقت آگ کا ایک شعلہ خشک لکڑی تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی قیامت شروع ہو جاتی ہے اور سورج کی وہ تمام توانائی جو درخت میں پنہاں تھی، اسی لیے اس کا حشر و نشر ظاہر ہو جاتا ہے، بغیر اس کے کہ ایک شمع کی روشنی کے برابر بھی اس میں کچھ کمی ہو (پھر غور کیجئے گا)۔

اس میں شک نہیں کہ یہ معنی آیت کے نزول کے زمانہ میں عامۃ الناس پر واضح نہیں تھا، لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ قرآنی آیات کے معانی کے کئی مرحلے ہیں اور مختلف سطحوں میں اختلاف استعداد کے لحاظ سے ظاہر ہوتے ہیں۔

ایک دن لوگ اس آیت سے ایک چیز سمجھتے تھے، آج ہم اس سے کہیں زیادہ چیزیں سمجھ رہے ہیں اور شاید آئندہ آنے والے اس سے بھی کچھ آگے بڑھ جائیں اور زیادہ سمجھ سکیں۔ اس کے باوجود یہ تمام معانی صحیح ہیں اور مکمل طور پر قابل قبول اور آیت کے معنی میں جمع ہیں۔

چند نکات

۱۔ **سبز درخت ہی کیوں؟** بعض اوقات ذہن میں آتا ہے کہ قرآن نے یہاں "شجر اخضر" (سبز درخت) کی تعبیر کیوں بیان کی ہے حالانکہ سبز اور گیلی لکڑی سے آگ جلانا بہت ہی مشکل ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کے بجائے "الشجر الیابس" (خشک درخت) کی تعبیر استعمال ہوتی کہ جو زیادہ برمحل تھی۔

لیکن قابل توجہ بات یہی ہے کہ یہ سبز درخت ہی ہیں کہ جو کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرتے ہیں اور سورج کی روشنی ذخیرہ کرنے کا عمل انجام دیتے ہیں۔ خشک درخت اگر سینکڑوں سالوں تک سورج کی حرارت، اور روشنی کے سامنے رکھے رہیں تو ان کی حرارت کی توانائی کے ذخیرے میں ذرہ بھر اضافہ نہ ہوگا۔ وہ اسی وقت تک اس کام پر قادر ہیں جب تک کہ وہ سبز اور زندہ ہیں۔

اس بناء پر صرف "شجر اخضر" (سبز درخت) ہی ہے کہ جو اپنی سبز و مرطوب لکڑی میں حرارت اور روشنی کو پُر اسرار طریقے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

لیکن جس وقت وہ خشک ہو جائے تو کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرنے اور سورج کی توانائی کو ذخیرہ

Marfat.com

کرنے کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ اس اصول کی بنا پر یہ تعبیر توانائیوں کی بازگشت کی خوبصورت تصویر کشی بھی کرتی ہے اور قرآن مجید کے ایک جاودانی علمی معجزے کو بھی پیش کرتی ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہم مذکورہ بالا دیگر تفسیروں کی طرف بھی رجوع کریں تو "شجر اخضر" کی تعبیر پھر بھی مناسب و زیبا ہے کیونکہ سبز درختوں کی لکڑیاں جس وقت ایک دوسرے کے ساتھ زور سے ٹکراتی ہیں تو چنگاری پیدا ہوتی ہے ایسی چنگاری کہ جو آگ جلانے کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں ہم قدرت خدا کی عظمت جان سکتے ہیں کہ جس نے آگ کو پانی کے اندر اور پانی کو آگ کے اندر محفوظ کر دیا ہے۔

۲۔ آتش زنہ اور آتش گیر میں فرق: "توقدون" "وقود" کے مادہ سے (بروزن "قبول") آگ روشن ہونے کے معنی میں ہے اور "ایقاد" آگ لگانے کے معنی میں ہے اور "وقود" (بروزن "شمود") اس ایندھن کے معنی میں ہے کہ جو آگ جلانے کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔

تو اس بنا پر "فاذا انتم منه توقدون" (تم اس سے آگ روشن کرتے ہو) کا جملہ اس ایندھن کی طرف اشارہ ہے کہ جس سے آگ جلاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آگ پکڑنے والے (آتش گیر) کی طرف اشارہ ہے نہ کہ آگ لگانے والے "آتش زنہ" کی طرف۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم فارسی میں ایندھن کو "آتش گیرہ" (آگ پکڑنے والا) اور ماچس یا لائٹر کو "آتش زنہ" (آگ لگانے والا) کہتے ہیں اور عربی میں ایندھن کو "وقود" اور ماچس یا لائٹر کو "زند" یا "زناد" کہتے ہیں [1]

اس بنا پر قرآن کہتا ہے کہ وہ خدا کہ جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ فراہم کی ہے اور تم اس سے ایندھن تیار کرتے ہو (آتش زنہ "آگ لگانے والا" نہیں فرماتا)، وہ اس پر بھی قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کر دے۔ اور یہ تعبیر کاملاً توانائیوں کی بازگشت پر منطبق ہے (غور کیجئے گا) [2]

بہرحال درختوں کی لکڑیوں کے ساتھ آگ روشن کرنے کا مسئلہ اگرچہ ہماری نظر میں ایک سادہ مسئلہ ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عجیب ترین مسائل میں سے ہے کیونکہ وہ مواد کہ جس سے درخت بنتے ہیں اس کا ایک اہم حصہ پانی اور کچھ مقدار زمین کے اجزاء ہیں اور ان میں سے کوئی بھی جل اٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ تو یہ کونسی قدرت ہے کہ جس نے پانی، مٹی اور ہوا سے توانائی پیدا کرنے والا یہ مادہ پیدا کیا ہے کہ انسانوں کی زندگی ہزارہا سال سے اس سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔

---

[1] "زند" (بروزن "بند") اصل میں اوپر والی لکڑی کے معنی میں ہے کہ جس سے آگ جلاتے ہیں اور نچلی لکڑی کو "زندہ" اور دونوں کو "زندان" کہتے ہیں اور "زند" کی جمع "زناد" ہے۔

[2] مگر یہ کہ ہم "منه توقدون" کے جملے میں "من" کو "با" کے معنی میں لیں تاکہ دوسری تفسیروں سے ہم آہنگ ہو جائے۔

Marfat.com

(۸۱) اَوَلَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی
اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ؕ بَلٰی ٭ وَهُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ ○
(۸۲) اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ
کُنۡ فَیَکُوۡنُ ○
(۸۳) فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِهٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ
اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ○

ترجمہ

(۸۱) کیا وہ ذات کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کے مانند (خاک شدہ انسانوں) کو پیدا کر دے۔ ہاں وہ خلّاقِ علیم ہے۔

(۸۲) اس کا امر تو صرف یہ ہے کہ جس وقت وہ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے کہتا ہے "ہو جا" تو وہ بلا فاصلہ ہو جاتی ہے۔

(۸۳) پس منزہ ہے وہ خدا کہ جس کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز کی مالکیت و حاکمیت ہے اور (سب کے سب) اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

تفسیر

وہ ہر چیز کا مالک و حاکم ہے

گزشتہ آیات میں خلقتِ اوّل اور سبز درخت سے آگ پیدا کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے معاد

Marfat.com

کے دلائل کا ذکر ہے۔ اب پہلی زیر بحث آیت میں ایک اور حوالے سے اس مسئلے کو بیان کیا گیا ہے اور وہ خدا کی بے پایاں قدرت کا بیان ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "کیا وہ ہستی کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اس تمام عظمت، عجائبات اور حیرت انگیز نظاموں کے ساتھ پیدا کیا ہے، اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان خاک شدہ انسانوں کے مانند نئی تخلیق کرے (اور انہیں ایک نئی زندگی کی طرف لوٹا دے) ہاں! وہ ایسا کر سکتا ہے اور وہ آگاہ و دانا خلاق ہے" (اولیس الذی خلق السماوات والارض بقادر علیٰ ان یخلق مثلھم بلیٰ وھو الخلاق العلیم)۔

یہ جملہ کہ جو استفہام انکاری سے شروع ہوا ہے، حقیقت میں بیدار عقل و وجدان کے سامنے ایک سوال پیش کرتا ہے کہ کیا تم اس عظیم آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ جو عجیب و غریب ثوابت و سیارات اور منظومات اور کہکشاؤں کا حامل ہے۔ جس کا ہر گوشہ ایک وسیع دنیا ہے۔ تو وہ ذات کہ جو ان عظیم اور منظم عوالم کی خلقت پر قادر ہے، کیسے ممکن ہے کہ مُردوں کے زندہ کرنے پر قادر نہ ہو؟

اس سوال کا جواب چونکہ ہر بیدار انسان کے قلب و روح میں موجود ہے، لہٰذا وہ جواب کا انتظار نہیں کرتا بلکہ بلا فاصلہ کہتا ہے: ہاں! وہ اس قسم کی قدرت رکھتا ہے۔ اس کے بعد خدا کی دو عظیم صفات کا ذکر ہے کہ جو اس مسئلے میں قابلِ توجہ ہیں، یعنی صفتِ خلاقیت اور اس کا بے پایاں علم۔ یہ حقیقت میں گزشتہ بات کی ایک دلیل ہے کہ اگر تمہارا شک و شبہ خلقت کے بارے میں اس کی قدرت کی وجہ سے ہے تو وہ خلاق ہے (توجہ رہے کہ خلاق مبالغے کا صیغہ ہے)۔

نیز اگر ان ذرات کو جمع کرنا علم و دانش کا محتاج ہے تو وہ ہر لحاظ سے عالم و آگاہ ہے۔

"مثلھم" کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ یہ ضمیر انسانوں کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمین کا خالق اس بات پر قادر ہے کہ وہ انسانوں کی مثل پیدا کر دے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے یہ کیوں نہ فرمایا کہ وہ خود از سرِ نو پیدا کرنے پر قادر ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ "ان کی مثل" پیدا کر سکتا ہے۔

اس سوال کے بہت سے جواب دیئے گئے ہیں لیکن جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ جب انسان کا بدن مٹی میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کی اپنی شکل و صورت باقی نہیں رہتی اور قیامت کے دن جو کچھ لوٹے گا وہ اس کا پہلا مواد ہی ہوگا کہ جو وہی پہلے کی سی صورت اختیار کر لے گا۔ یعنی مادہ تو وہی ہوگا لیکن شکل و صورت گزشتہ صورت کی مثل ہوگی۔ کیونکہ عین اسی صورت کا خصوصاً قیدِ زمانی کے ساتھ لوٹنا ممکن نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ ہم جانتے ہیں کہ قیامت میں تمام انسان اپنی تمام گزشتہ کیفیات کے ساتھ محشور نہیں

Marfat.com

ہوں گے۔ مثلاً بوڑھے جوان کی شکل میں اور معلول صحیح و سالم صورت میں ہوں گے۔

دوسرے لفظوں میں انسانوں کا بدن اس اینٹ کے مانند ہے جو ریزہ ریزہ ہو کر پراگندہ ہو جائے اور اس کی مٹی کو جمع کر لیا جائے اور دوبارہ اس کا گارا بنا کر سانچے میں ڈال لیا جائے اور اس سے نئی اینٹ بنا لی جائے۔

یہ نئی اینٹ ایک حیثیت سے بعینہٖ وہی ہے اور ایک لحاظ سے اس کی مثل ہے (اس کا مادہ تو وہی ہے لیکن اس کی شکل و صورت پہلی صورت کی مثل و مانند ہے) (غور کیجئے گا) [1]

بعد والی آیت اس حقیقت پر ایک تاکید ہے کہ اس کے ارادہ اور قدرت کے سامنے ہر قسم کی ایجاد سہل و آسان ہے، اس کے لیے عظیم آسمانوں اور کرۂ خاکی کا ایجاد کرنا اور ایک چھوٹے سے کیڑے کی ایجاد برابر و یکساں ہے، فرماتا ہے: "اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز (کے پیدا کرنے) کا ارادہ کرتا ہے تو اُسے کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ فوراً ہو جاتی ہے"، جیسا کہ خدا نے چاہا ہے (انما امرہ اذا اراد شیئًا ان یقول لہ کن فیکون)۔

تمام چیزیں اس کے ایک اشارے اور فرمان کے ساتھ وابستہ ہیں تو جو اس قسم کی قدرت کا مالک ہو کیا اس کے بارے میں اس بات کی کوئی گنجائش ہے کہ اس کے مُردوں کو زندہ کرنے کے متعلق اس کی قدرت میں شک کیا جائے؟

یہ بات واضح ہے کہ یہاں امر الٰہی لفظی امر کے معنی میں نہیں ہے اسی طرح لفظ "کُن" (ہو جا) بھی ایسا نہیں کہ جسے خدا لفظ کی صورت میں ادا کرے کیونکہ نہ وہ کوئی لفظ بولتا ہے اور نہ ہی وہ الفاظ کا محتاج ہے بلکہ اس سے مراد اس کا کوئی چیز کے ایجاد و تخلیق کرنے کا ارادہ کرنا ہے۔ نیز لفظ "کُن" اس بنا پر ہے کہ اس سے زیادہ مختصر، زیادہ چھوٹی اور زیادہ سریع تعبیر کا تصور نہیں ہو سکتا۔

---

[1] بعض مفسرین نے "مثلھم" کی ضمیر کو آسمانوں اور زمین کی طرف پلٹایا ہے اور کہا ہے کہ ذوی العقول کی ضمیر جمع کا انتخاب اس بنا پر ہے کہ زمین و آسمان میں بہت سے ذوی العقول موجود ہیں۔ بعض دوسرے مفسرین نے "مثل" کی تعبیر کو اس بات پر شاہد بنایا ہے کہ عین اسی جسم اور اسی مواد کا لوٹنا کہ جو دنیا میں تھا، ضروری نہیں ہے کیونکہ انسان کی شخصیت اس کی روح کے ساتھ ہے اور یہ روح جس مادہ کے ساتھ بھی تعلق اختیار کرے گی وہ انسان کی مثل ہو گی، لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیئے کہ یہ بات آیاتِ قرآنی حتیٰ کہ زیر بحث آیات کے ساتھ بھی بالکل ہم آہنگ نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن صراحت کے ساتھ انہیں آیات میں کہتا ہے کہ خدا انہی بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے گا اور انہیں لباسِ حیات پہنائے گا نہ کہ دوسرے مواد کو۔ (غور کیجئے گا)۔

Marfat.com

ہاں! جونہی وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے وہ فوراً موجود ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں جس وقت خدا کسی چیز کا ارادہ کرے، تو وہ بلا فاصلہ وجود پا جاتی ہے اس طرح سے کہ اس کے "ارادہ" اور "اشیاء کے وجود" کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ اس بنا پر "امر"، "قول اور "کن" کے الفاظ سب کے سب خلق و ایجاد کے مسئلے کی ایک توضیح ہیں اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے یہاں امر لفظی اور "کاف و نون" کا کوئی لفظ، بات یا قول بیان نہیں ہوا۔ یہ سب کے سب ارادۂ الٰہی کے بعد اشیاء کے تیزی اور سرعت کے ساتھ وجود پانے کو بیان کرتے ہیں۔ اُسے الفاظ و کلمات کی کیا حاجت ہے۔ اصولی طور پر کسی چیز کو ایجاد کرنے کے لیے اس کی مشیت کے بعد الفاظ کی وساطت بے معنی ہے۔

زیادہ واضح تعبیر میں، خدا کے افعال میں دو مرحلوں سے زیادہ کا وجود نہیں ہے۔ مرحلۂ ارادہ اور مرحلۂ ایجاد مذکورہ بالا آیت میں دوسرا مرحلہ امر و قول اور لفظ "کن" کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔

بعض قدیم مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں قول اور ایک بات ضرور ہے اور اُسے وہ ایک ناشناختہ اسرار میں سے سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ حقیقت میں الفاظ کے پیچ و خم میں الجھ گئے ہیں اور ان کے مفہوم و مطلب سے بے خبر رہے ہیں اور انہوں نے خدائی کاموں کو اپنے اوپر قیاس کر لیا ہے۔

امیرالمؤمنین علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں کیا خوب فرمایا ہے:

یقول لما اراد کونه کن فیکون[1] لا بصوت یقرع ولا بنداء یسمع و انما کلامه سبحانه فعل منه انشأه و مثله لم یکن من قبل ذالک کائنا، ولو کان قدیما لکان ثانیا۔

"وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس سے کہتا ہے، ہو جا تو وہ بلا تاخیر ہو جاتی ہے لیکن اس کا کلام نہ تو ایسی ندا ہے کہ جو کانوں سے ٹکرائے اور نہ ہی ایسی ندا کہ جو سنی جائے بلکہ خدا کی بات وہی اس کا فعل ہے کہ جسے وہ ایجاد کرتا ہے اور اس سے پہلے کوئی بھی چیز موجود نہیں تھی اور اگر ہوتی تو وہ دوسرا خدا شمار ہوتی"[2]

اس سے قطع نظر اگر کوئی لفظ درمیان میں ہو تو اس کی دو صورتیں ہوں گی:

پہلی صورت یہ ہے کہ یہ لفظ خود مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے اور اس کو ایجاد کرنے کے لیے

---

[1] نہج البلاغہ کے بعض نسخوں میں مثلاً "منہاج البراعۃ" میں "لما اراد" کی تعبیر ہے۔ تفسیر نور الثقلین میں بھی نہج البلاغہ سے اسی طرح نقل ہوا ہے لیکن دوسرے نسخوں میں مثلاً ابن ابی الحدید، ابن میثم اور صبحی صالح کے نسخہ میں "لمن اراد" آیا ہے لیکن مناسب وہی پہلا نسخہ ہے۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۶۔

Marfat.com

ایک دوسرے "کُن" کی ضرورت ہوگی اور اس بات کی اس دوسرے "کُن" کے بارے میں بھی تکرار ہوگی اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ہر خطاب کے لیے ایک مخاطب کی ضرورت ہوتی ہے اور جب ابھی تک کوئی چیز موجود ہی نہیں تو خدا "کُن" کہہ کر اُسے کس طرح مخاطب کرے گا۔ کیا معدوم سے خطاب ہو سکتا ہے؟

قرآن کی دوسری آیات میں یہی معنی دوسرے الفاظ میں آیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۱۷ میں ہے:

واذا قضٰی امرًا فانّما یقول له کن فیکون

"جس وقت اس کی قضا اور حکم کسی چیز کے بارے میں ہوتا ہے تو وہ اُسے صرف یہ کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ بلا فاصلہ ہو جاتی ہے۔"

اسی کی مانند سورہ نحل کی آیہ ۴۰ میں ہے:

انما قولنا لشیء اذا اردناه ان نقول له کن فیکون

"جو چیز ہم ایجاد کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ہمارا قول یہی ہے کہ ہم اُسے کہتے ہیں ہو جا تو وہ بلا فاصلہ ہو جاتی ہے۔"[1]

زیر بحث آخری آیت کہ جو سورہ یٰسین کی آخری آیت ہے مبداء و معاد کے بارے میں ایک کلی نتیجہ نکالنے کے لیے اس بحث کو ایک خوبصورت طریقے سے ختم کرتی ہے ارشاد ہوتا ہے: "پس منزہ ہے وہ خدا کہ جس کے قبضۂ قدرت میں تمام چیزیں ہیں اور تم سب کے سب اُسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے" (فسبحٰن الذی بیده ملکوت کل شیء والیه ترجعون)۔

"ملکوت" "ملك" (بروزن "حکم") کے مادہ سے حکومت و مالکیت کے معنی میں ہے اور اس کے ساتھ "واؤ" اور "ت" کا اضافہ تاکید و مبالغہ کے لیے ہے۔ اس لیے آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ ہر چیز کی مالکیت و حاکمیت بلا شرط خدا کے دستِ قدرت میں ہے اور اس قسم کا خدا ہر طرح کے عجز و ناتوانی سے منزہ و مبرا ہے، تو اس صورت میں مُردوں کو زندہ کرنا اور بوسیدہ ہڈیوں اور پراگندہ مٹی کو لباس حیات پہنانا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے، جب یہ بات ہے تو یقینی طور پر تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے اور معاد حق ہے۔

چند نکات

اس تفسیر میں ہم نے متعدد بار وعدہ کیا ہے کہ سورۂ یٰسین کے اختتام پر ہم معاد کے مختلف پہلوؤں پر

---

[1] "کن فیکون" کے بارے میں جلد اوّل سورہ بقرہ کی آیہ ۱۱۷ کے ذیل میں بھی بحث کی گئی ہے۔

Marfat.com

کچھ تفصیلی گفتگو کریں گے۔ اس وقت ہم اس عہد کو پورا کرتے ہوئے قارئین محترم کی توجہ ذیل کی چھ بحثوں کی طرف دلانا چاہیں گے۔

۱۔ معاد کا اعتقاد ایک فطری امر ہے: اگر انسان فنا کے لیے پیدا کیا گیا ہوتا تو پھر اُسے "فنا" کا عاشق ہونا چاہیئے اور موت سے لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ چاہے موت برمحل اور عمر کے آخری حصّہ میں ہو۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ موت (بمعنی نیستی) کا خیال انسان کے لیے کسی زمانے میں بھی خوش آئند نہیں رہا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ موت سے بھاگ رہا ہے۔

مومیا کر مُردوں کے جسموں کو باقی رکھنے کی کوشش کرنا اور اہرام مصر جیسے دائمی مقبرے بنانا اور آبِ حیات، اکسیرِ جوانی اور عمر بڑھانے والی چیزوں کے پیچھے بھاگنا ۔ بقا کے ساتھ انسان کے عشق کی ایک واضح دلیل ہے۔

اگر ہم فنا کے لیے پیدا ہوئے ہیں، تو بقا سے اس لگاؤ کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے؟ اس صورت میں تو یہ ایک فضول اور بے مصرف لگاؤ ہوگا۔

یہ مت بھولیے کہ ہم حکیم و دانا خدا کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد معاد کی بحث کر رہے ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اُس نے جو کچھ ہمارے وجود میں پیدا کیا ہے وہ کسی حساب کے ماتحت ہی ہوگا اور وہ اس عالم بقاء کے ساتھ عشق بھی کسی حساب کے ماتحت ہی ہوگا اور وہ اس عالم کے بعد کی خلقت اور جہانِ آخر سے ہم آہنگی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اگر دستگاہِ خلقت نے ہمارے اندر پیاس پیدا کی ہے، تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ خارج میں پانی کا وجود ہے۔ اسی طرح اگر جنسی خواہش اور جنسِ مخالف سے انسانوں میں لگاؤ موجود ہے تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ خارج میں جنسِ مخالف کا وجود ہے۔ ورنہ کسی چیز کی عدم موجودگی کی صورت میں اس کی خواہش کا ہونا حکمتِ آفرینش سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

دوسری طرف جب ہم تاریخ بشر کا قدیم ترین ایام سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں موت کے بعد زندگی کے بارے میں انسان کے راسخ عقیدے کی بہت سی نشانیاں ملتی ہیں۔

وہ آثار کہ جو گزشتہ انسانوں ۔ یہاں تک کہ تاریخ سے پہلے کے انسانوں ۔ کے آج ہماری دسترس میں ہیں اُن سے اس اعتقاد کی شہادت ملتی ہے، خصوصاً مُردوں کے دفن کرنے کا طریقہ، قبریں بنانے کی کیفیت، حتیٰ کہ مُردوں کے ساتھ کچھ چیزیں دفن کرنا، اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کے ناآگاہ وجدان میں موت کے بعد کی زندگی کا اعتقاد چھپا ہوا تھا۔

ایک مشہور ماہرِ نفسیات کہتا ہے:

دقیق تحقیقات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ پہلے نوع بشر کے قبائل ایک قسم کے

Marfat.com

مذہب کے حامل تھے۔ کیونکہ وہ اپنے مُردوں کو ایک خاص طریقے سے سپردِ خاک کرتے تھے اور ان کے کام کاج کے آلات ان کے ساتھ رکھ دیا کرتے تھے اور اس طریقے سے دوسری دنیا کے لوگوں کو اپنے عقیدے کا ثبوت مہیا کرتے تھے[1]

یہ تمام باتیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ قومیں حیات بعد از موت کو قبول کرتی تھیں۔ اگرچہ اس کی تفسیر میں غلط راستے پر چلتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ زندگی بعینہٖ اس زندگی کی طرح ہے۔

بہر حال اس قدیمی بنیادی اعتقاد کو ایک معمولی اور عام خیال یا صرف ایک رواج اور عادت کا نتیجہ نہیں سمجھا جا سکتا۔

تیسری طرف ایک اندرونی عدالت کا وجود جسے "وجدان" کہتے ہیں، معاد کے فطری ہونے کا ایک اور گواہ ہے۔

ہر انسان نیک کام انجام دے کر اپنے وجدان کے اندر ایک سکون و اطمینان محسوس کرتا ہے ایسا سکون کہ جسے قلم بیان کرنے سے قاصر ہے۔

اس کے برعکس انسان گناہوں خصوصاً بڑے بڑے جرائم کرنے کے بعد پریشانی اور بے سکونی محسوس کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ خودکشی پر تیار ہو جاتا ہے یا خود کو سزا اور سولی کے حوالے کر دیتا ہے اور اسے وجدان کے شکنجے سے رہائی کا سبب سمجھتا ہے۔

اس حالت میں انسان خود سے پوچھتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھ جیسا ایک چھوٹا سا وجود تو اس قسم کی عدالت کا حامل ہو لیکن یہ عظیم عالم اس قسم کے وجدان اور عدالت سے خالی ہو۔

اس طرح مختلف طریقوں سے مرنے کے بعد کی زندگی اور مسئلہ معاد کا فطری ہونا ہم پر واضح ہو جاتا ہے:

- ★ انسانوں کے بقاء سے عمومی عشق کے حوالے سے۔
- ★ پوری انسانی تاریخ میں اس ایمان کے وجود کے حوالے سے اور
- ★ انسان کی روح کے اندر اس کے ایک چھوٹے سے نمونے کی موجودگی کے حوالے سے۔

۲۔ **ایمان بالقیامت کا اثر انسانی زندگی پر:** مرنے کے بعد کے عالم، انسان کے اعمال کے آثار کی بقا اور اس کے اچھے بُرے کاموں کی ہمیشگی کا اعتقاد انسانوں کی فکر و نظر اور اعصاب اعمال پر بہت ہی گہرا اثر ڈالتا ہے اور نیکیوں کا شوق پیدا کرنے اور برائیوں سے مبارزہ کرنے کے لیے ایک عامل مؤثر ہو سکتا ہے۔

فاسد و منحرف افراد کی اصلاح اور فداکار و مجاہد اور ایثار کرنے والوں کو شوق دلانے میں حیات

[1] جامعہ شناسی سامویل کینگ ص ۱۹۲ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)۔

Marfat.com

بعد از موت پر ایمان جو اثرات ڈال سکتا ہے وہ عام عدالتوں اور سزاؤں کے اثرات سے کہیں زیادہ ہیں۔ چونکہ قیامت و معاد کی عدالت عام عدالتوں سے بہت ہی مختلف ہے، اس عدالت میں نہ تو تجدید نظر کا کوئی وجود ہے اور نہ ہی اس کے ارکان پر زر و مال اور زور و قوت اثر ڈال سکتے ہیں، نہ وہاں جھوٹی باتوں سے کوئی فائدہ ہوگا اور نہ فیصلے کے لیے طویل مدت درکار ہو گی۔

قرآن مجید کہتا ہے:

واتقوا یومًا لا تجزی نفس عن نفس شیئًا ولا یقبل منها شفاعة ولا یؤخذ منها عدل ولا هم ینصرون

"اس دن سے ڈرو کہ جس میں کسی شخص کو کسی دوسرے کی جگہ بدلہ نہیں دیا جائے گا، اور نہ ہی اس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ ہی کوئی فدیہ یا تاوان ہوگا اور نہ ہی کوئی شخص اس کی مدد کے لیے آئے گا۔" (بقرہ - ۴۸)

اس کے علاوہ قرآن حکیم میں ہے:

ولو ان لکل نفس ظلمت ما فی الارض لافتدت به واسرّوا الندامة لما رأوا العذاب وقضی بینهم بالقسط وهم لا یظلمون

"ان میں سے جو ظالم ہیں، اگر تمام روئے زمین بھی ان کے اختیار میں ہو اور اس دن اپنی نجات کے لیے وہ سب کچھ قربان کر ڈالیں (تو بھی ان کی نجات نہیں ہو گی) اور جس وقت وہ عذاب الٰہی کو دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے (کہ کہیں زیادہ رسوا نہ ہوں) اور ان کے درمیان عدالت کے ساتھ فیصلہ ہوگا اور ان پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔" (یونس - ۵۴)

اس کے علاوہ قرآن مجید میں یہ بھی بیان ہوا ہے:

لیجزی الله کل نفس ما کسبت ان الله سریع الحساب

"مقصد یہ ہے کہ خدا ہر شخص کو جو کچھ اُس نے انجام دیا ہے اس کی جزا دے کیونکہ خدا سریع الحساب ہے۔" (ابراہیم - ۵۱)

اس کا حساب اتنا قطعی اور تیزی کے ساتھ ہو گا کہ بعض روایات کے مطابق:

ان الله تعالیٰ یحاسب الخلائق کلها فی مقدار لمح البصر

خدا چشم زدن میں سب مخلوق کا حساب چکا دے گا۔[1]

---

[1] مجمع البیان، سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۰۲ کے ذیل میں۔

Marfat.com

اسی بنا پر قرآن مجید میں بہت سے گناہوں کا سرچشمہ روزِ جزا کو بھول جانا قرار دیا گیا ہے۔
سورہ الٓمٓ سجدہ کی آیہ ۱۴ میں ہے:

فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم هٰذا

"جہنم کی آگ کا مزہ چکھو کیونکہ تم نے آج کے دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا"
کچھ تعبیرات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسان قیامت کے بارے میں کچھ گمان ہی رکھتا ہو تب بھی بہت سے غلط کاموں کو انجام دینے سے رُک جائے گا۔ جیسا کہ کم فروشوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

الا یظن اولٰئك انهم مبعوثون لیوم عظیم

"کیا وہ یہ گمان نہیں کرتے کہ ایک عظیم دن وہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے"۔ (مطففین ۔ ۴ - ۵)
گزشتہ زمانے میں بھی اور آج بھی مجاہدینِ اسلام میدانِ جہاد میں رجز خوانی کرتے ہوئے دادِ شجاعت دیتے ہیں اور بہت سے لوگ اسلامی ممالک کے دفاع اور محرومین و مستضعفین کی حمایت کے لیے جو عظیم ایثار و فداکاری دکھاتے ہیں یہ سب دوسرے جاودانی گھر پر اعتقاد کا نتیجہ ہے۔ علماء کے مطالعات اور مختلف تجربات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس قسم کے وسیع مظاہر اس عقیدے کے سوا ممکن نہیں۔
وہ مجاہد کہ جس کی منطق یہ ہو کہ:

قل هل تربصون بنا الا احدی الحسنیین

"کہہ دو کہ اے دشمنو! تم ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہو؟ سوائے دو سعادتوں میں سے کسی ایک تک پہنچنے کے (یا تم پر کامیابی یا افتخارِ شہادت)"۔ (توبہ ۔ ۵۲)

یہ مجاہد یقیناً شکست ناپذیر ہے۔
موت کا چہرہ اس جہان کے بہت سے لوگوں کے لیے وحشت انگیز ہے، یہاں تک کہ اس کے نام اور ہر اس چیز سے کہ جو اس کی داعی ہے، اگریز کرتے ہیں۔ لیکن موت کے بعد زندگی کا عقیدہ رکھنے والوں کے لیے نہ صرف یہ کہ وہ ناپسندیدہ نہیں ہے بلکہ ایک عظیم جہان کے لیے ایک دریچہ ہے، قفس کا ٹوٹ جانا ہے، انسانی روح کا آزاد ہونا ہے، زندانِ بدن کے دروازوں کا کھلنا ہے اور آزادیٔ مطلق تک پہنچنا ہے۔
اصولی طور پر مبدا کے بعد مسئلہ معاد خدا پرستوں اور مادہ پرستوں کے علم کی حدِ فاصل ہے کیونکہ اس مقام پر دو مختلف نظریے پائے جاتے ہیں۔
ایک نظریہ تو وہ ہے کہ موت کو جس میں فنا اور نابودیٔ مطلق سمجھا جاتا ہے اور اپنے پورے وجود کے ساتھ اس سے گریز کرتا ہے کیونکہ اس نظریے کے مطابق سب چیزیں اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔
دوسرا نظریہ یہ ہے کہ موت ایک خلقت جدید ہے اس سے انسان ایک کشادہ تر اور روشن عالم میں

Marfat.com

قدم رکھتا ہے۔ اس پر وسیع و عریض آسمان کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں۔

یہ فطری بات ہے کہ اس مکتب کے طرفدار، نہ صرف یہ کہ ہدف و مقصد کی راہ میں موت و شہادت سے خوف نہیں کھاتے بلکہ امیرالمؤمنین علی علیہ السلام کے مکتب سے ہدایت حاصل کرکے انہی کی طرح کہتے ہیں:

"واللہ لابن ابی طالب انس بالموت من الطفل بثدی امہ"

"خدا کی قسم! ابوطالب کے بیٹے کی موت سے محبت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ جو ایک شیرخوار بچے کو اپنی ماں کے پستان سے ہوتی ہے[1]"

ایسے لوگ مقصد کی راہ میں موت کا استقبال کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے جب زمانے کے مجرم عبدالرحمٰن ابن ملجم کی تلوار کی ضرب آپؑ کے سر مبارک پر لگی توآپؑ نے فرمایا:

"فزت برب الکعبہ"

"کعبہ کے رب کی قسم! مَیں کامیاب ہوگیا اور مجھے راحت و سکون مل گیا"

مختصر بات یہ ہے کہ معاد و قیامت پر ایمان، ڈرپوک اور بے مقصد انسان کو شجاع، بہادر اور بامقصد انسان میں تبدیل کر دیتا ہے کہ جس کی زندگی رجز خوانیوں، قربانیوں، پاکیزگی اور تقویٰ سے معمور ہو جاتی ہے۔

۳۔ معاد کے عقلی دلائل: قرآن مجید میں معاد کے بارے میں بہت دلیلیں بیان ہوئی ہیں اور اس سلسلے میں سینکڑوں آیات موجود ہیں۔ ان سے قطع نظر اس امر پر واضح عقلی دلائل بھی موجود ہیں کہ جن میں سے بعض اختصار کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ برھانِ حکمت: اگر ہم اس جہان کی زندگی کو دوسرے جہان کے بغیر تصور کریں، تو یہ لغو اور بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہو گی جیسے ہم جنین کی زندگی کو اس دنیا کی زندگی کے بغیر فرض کرلیں۔

اگر قانونِ خلقت یہ ہوتا کہ تمام جنین پیدائش کے وقت گلا گھٹ کر مر جاتے تو جنینی دَور کس قدر بے مفہوم ہو جاتا؟ اسی طرح اگر اس جہان کی زندگی کو دوسرے جہان کی زندگی سے الگ تصور کر لیا جائے تو اس کا وجود بھی مہمل ہو جائے گا کیونکہ کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم ستر سال یا اس سے کم و بیش اس دنیا میں مشکلات میں گھرے رہیں، ایک مدت تک خام اور بے تجربہ رہیں اور جب ناپختگی دور ہو تو عمر تمام ہو جائے۔ ایک مدت تک ہم علم کے حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں اور جس وقت معلومات کے لحاظ سے ہم کسی مقام

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۵۔

Marfat.com

تک پہنچتے ہیں تو بڑھاپے کی برف ہمارے سروں پر بیٹھ چکی ہوتی ہے۔

آخر ہم یہ زندگی کس لیے بسر کر رہے ہیں؟ کچھ مقدار غذا کھانے، چند گز کپڑے پہننے، بار بار سونے اور بیدار ہونے اور اس تھکا دینے والے طرزِ عمل کو سالہا سال تک دہرانے اور جاری رکھنے کے لیے؟

کیا واقعاً یہ وسیع آسمان، یہ پھیلی ہوئی زمین اور یہ تمام آغاز و انجام، یہ تمام استاد و مربی، یہ تمام عظیم کتب خانے اور یہ تمام باریک بینیاں کہ جو ہماری اور تمام موجودات کی خلقت میں کام میں لائی گئی ہیں، کھانے، پینے، پہننے اور مادی زندگی کے لیے ہیں؟

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر وہ لوگ کہ جو معاد کو قبول نہیں کرتے، اس زندگی کی لغویت اور بیہودگی کا اعتراف کرتے ہیں اور ان میں سے ایک گروہ خودکشی کرنے اور اس فضول اور بے معنی زندگی سے نجات کو جائز یا باعثِ افتخار سمجھتا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ شخص جو خدا اور اس کی بے پایاں حکمت پر ایمان رکھتا ہے، اس جہان کی زندگی کو — دوسرے جہان کی دائمی زندگی کے لیے مقدمہ سمجھے بغیر قابلِ توجہ شمار کرے۔

قرآن کہتا ہے:

افحسبتم انّما خلقناکم عبثًا و انّکم الینا لا ترجعون

"کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ تم فضول اور بے کار پیدا ہوئے ہو اور تم ہماری طرف پلٹ کر نہیں آؤ گے۔" (مومنون - ۱۱۵)

یعنی اگر خدا کی طرف بازگشت نہ ہوتی تو پھر اس جہان کی زندگی عبث اور بیہودہ ہوتی۔

ہاں اس دنیا کی زندگی اسی صورت میں مفہوم رکھتی ہے اور خدا کی حکمت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے جب اس جہان کو دوسرے جہان کے لیے ایک کھیتی (الدنیا مزرعة الاٰخرة) اور اُس وسیع عالم کے لیے ایک گزرگاہ (الدنیا قنطرة) اور تیاری کی ایک کلاس اور دوسرے جہان کے لیے ایک یونیورسٹی اور اُس گھر کے لیے ایک تجارت خانہ سمجھیں۔ جیسا کہ امیرالمومنین علی علیہ السلام نے اپنے پُر معنی کلمات میں فرمایا ہے:

ان الدنیا دار صدق لمن صدقها، و دار عافیة لمن فهم عنها، و دار غنی لمن تزود منها، و دار موعظة لمن اتعظ بها، مسجد احباء الله و مصلی ملائکة الله، و مهبط وحی الله، و متجر اولیاء الله۔

"یہ دنیا اس شخص کے لیے کہ جو سچائی کے ساتھ اس سے پیش آئے سچائی کی جگہ ہے اور اُس شخص کے لیے کہ جو اس سے کچھ فہم حاصل کرے عافیت کا گھر ہے اور اس شخص کے لیے کہ جو اس سے زادِ راہ حاصل کرے بے نیازی کا گھر ہے اور اس شخص کے لیے کہ جو اس سے

Marfat.com

پند و نصیحت حاصل کرے وعظ و نصیحت کا گھر ہے یہ خدا کے دوستوں کی مسجد ہے، پروردگار کے فرشتوں کی جائے نماز ہے، وحیِ الٰہی کے نزول کا مقام ہے اور اولیاء حق کا تجارت خانہ ہے[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس جہان کی کیفیت کا مطالعہ خوب اچھی طرح سے اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس عالم کے بعد ایک اور عالم بھی ہے:

ولقد علمتم النشأۃ الاولیٰ فلولا تذکرون

"تم اس دنیا میں نشأۃ اولیٰ اور خود اپنی پیدائش کو دیکھ چکے ہو تو پھر تم متوجہ کیوں نہیں ہوتے کہ اس کے بعد ایک اور جہان بھی ہے؟" (واقعہ - ۶۲)

(ب) **برھانِ عدالت**: نظامِ ہستی اور قوانینِ خلقت میں غور سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اس کی تمام چیزیں حساب شدہ اور جچی تلی ہیں۔

ہمارے بدن کی ساخت میں اس قسم کا عادلانہ نظام حکم فرما ہے کہ جب بھی کوئی معمولی سی تبدیلی یا غیر موزوں نیت اس میں ظاہر ہوتی ہے تو وہ بیماری یا موت کا سبب بن جاتی ہے۔ ہمارے دل کی حرکت، ہمارے خون کی گردش، ہماری آنکھ کے پردے، ہمارے بدن کے سیل اسی دقیق نظام میں شامل ہیں کہ جو سارے جہان پر حکومت کر رہا ہے:

وبالعدل قامت السماوات والارض

"تمام آسمان اور زمین عدالت ہی کی وجہ سے قائم ہیں[2]"

تو کیا انسان اس وسیع عالم میں ایک نامطلوب چیز ہو سکتا ہے؟

یہ ٹھیک ہے کہ خدا نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی دی ہے تاکہ وہ اسے آزمائے اور وہ اس کے سائے میں ارتقائی منزلوں کو طے کرے لیکن اگر انسان آزادی سے غلط فائدہ اٹھائے تو پھر کیا ہو گا؟ اگر ظالم اور ستمگر لوگ، گمراہ اور گمراہ کرنے والے اس خدائی انعام سے سوئے استفادہ کرتے ہوئے گمراہی کا راستہ اختیار کیے رہیں تو پھر عدلِ الٰہی کا تقاضا کیا ہو گا؟

یہ ٹھیک ہے کہ بدکاروں کے ایک گروہ کو اس دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے اور وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جاتے ہیں یا کم از کم اُس کا ایک حصہ بھگت لیتے ہیں لیکن مسلمہ طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ تمام کے تمام مجرم اپنی ساری کی ساری سزا بھگت لیتے ہوں اور کے سب پاک اور نیک لوگ اپنے اعمال کا

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۱۳۱۔

[2] تفسیر صافی، سورہ رحمٰن کی آیہ ، کے ذیل میں۔

Marfat.com

بدلہ پورے کا پورا اسی جہان میں پا لیتے ہوں۔ کیا یہ بات ممکن ہے کہ یہ دونوں گروہ پروردگار کی عدالت کے پلڑے میں برابر ہو جائیں؟ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق:

افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون

"کیا ان لوگوں کو کہ جو قانونِ خدا کے پیش نظر حق و عدالت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوتے ہیں ہم مجرمین کی طرح قرار دے دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے یہ کس طرح کا فیصلہ کرتے ہو؟" (قلم - ۳۵، ۳۶)

دوسری جگہ قرآن فرماتا ہے:

ام نجعل المتقین کالفجّار

"کیا یہ ممکن ہے کہ ہم پرہیزگاروں کو فاجروں کے مانند قرار دے دیں؟" (ص - ۲۸)

بہرحال فرمانِ حق کی اطاعت میں انسانوں کے درمیان تفاوت ہونا کوئی شک کی بات نہیں ہے کیونکہ اس جہان کی مکافات اور عدالتِ وجدان اور گناہوں کے نتائج کا کافی نہ ہونا، عدالت کے قیام کے لیے تنہا کافی نظر نہیں آتا۔ اس بنا پر یہ بات قبول کرنی پڑے گی کہ اجرِ الٰہی کے اجراء کے لیے کوئی عدلِ عام کی عدالت ہو کہ جہاں پر سوئی کی نوک کے برابر نیک اور بد کاموں کا حساب ہو۔ ورنہ حقیقی عدالت قائم نہ ہو گی۔

لہٰذا یہ بات قبول کر لینی چاہیئے کہ عدلِ الٰہی کو قبول کرنا وجود معاد و قیامت کے قبول کرنے کے مترادف ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ

"ہم قیامت کے دن عدل کے ترازو قائم کریں گے۔" (انبیاء - ۴۷)

اس کے علاوہ یہ بھی فرماتا ہے:

وقضی بینھم بالقسط وھم لا یظلمون

"قیامت کے دن ان کے درمیان عدالت کے مطابق فیصلہ ہو گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہو گا۔" (یونس - ۵۴)

(ج) **برہانِ ہدف**: مادہ پرستوں کے نظریے کے برخلاف الٰہی نظریۂ کائنات کے مطابق انسان کی خلقت میں ایک ہدف اور مقصد کار فرما ہے کہ جسے فلسفی تعبیر میں "تکامل وارتقاء" کہتے ہیں قرآن و حدیث کی زبان میں کبھی "قربِ خداوندی" اور کبھی "عبادت و بندگی" کہتے ہیں:

وما خلقت الجن والانس الّا لیعبدون

"میں نے جن و انس کو پیدا نہیں کیا ہے مگر اس مقصد کے لیے کہ وہ میری عبادت

Marfat.com

کریں" (اور عبادت و بندگی کے سائے میں کامل ہوں اور میرے حریم قرب کی طرف راہ پائیں)۔ (ذاریات - ۵۶)

اگر موت ہر چیز کا اختتام ہو تو کیا یہ عظیم مقصد پورا ہو گا؟ بلاشک و شبہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ ضروری ہے کہ اس جہان کے بعد ایک اور جہان ہو اور انسان کا سفر کمال اس میں جاری رہے اور وہ اس (جہان کی) کھیتی کی فصل وہاں کاٹے اور یہاں تک کہ ــ جیسے ہم کہہ چکے ہیں دوسرے جہان میں بھی یہ سیر تکامل جاری رہنی چاہیئے تاکہ اصلی اور آخری ہدف پورا ہو جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مقصدِ خلقت کی تکمیل معاد کو قبول کیے بغیر ممکن نہیں ہے اور اگر ہم اس زندگی کو موت کے بعد والے جہان سے منقطع کر لیں تو ہر چیز معمہ کی شکل اختیار کر لے اور کئی طرح کے "کیوں" کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ رہے۔

(د)۔ **برهان نفی اختلاف:** بے شک ہمیں ان اختلافات سے ــ کہ جو اس جہان کے مختلف مکاتب و مذاہب کے درمیان موجود ہیں دُکھ ہوتا ہے، اور ہم سب یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ایک دن یہ تمام اختلافات ختم ہو جائیں جبکہ تمام قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ اختلافات اس دنیا کے مزاج میں پوری طرح اُتر چکے ہیں۔ یہاں تک کچھ دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کہ جو ایک عالمی حکومت قائم کرنے والے ہیں ــ ان کے قیام کے بعد بھی اگرچہ بہت سے اختلافات ختم ہو جائیں گے، لیکن پھر بھی کچھ مکاتب کا اختلاف کلی طور پر ختم نہیں ہو گا اور قرآن کے ارشاد کے مطابق یہود و نصاریٰ دامن قیامت تک اپنے اختلاف پر باقی رہیں گے:

فاغرينا بينهم العداوة والبغضاء الى يوم القيامة (مائدہ - ۱۴)

لیکن وہ خدا کہ جو ہر چیز کو وحدت کی طرف لے جاتا ہے آخر میں اختلافات کو ختم کرائے گا اور چونکہ عالم مادہ کے گہرے پردوں کی موجودگی میں یہ بات اس دنیا میں کلی طور پر امکان پذیر نہیں ہے لہٰذا ہم جانتے ہیں کہ دوسرے جہان میں ــ کہ جو عالم بروز و ظہور ہے ــ آخرکار یہ مسئلہ عملی شکل اختیار کر لے گا اور حقائق اس طرح سے روشن ہو جائیں گے کہ مکتب و عقیدہ کا اختلاف بالکل ختم ہو جائے گا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس مسئلے کا ذکر ہوا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے:

فالله يحكم بينهم يوم القيامة فيما كانوا فيه يختلفون

"خدا ان چیزوں کے بارے میں قیامت کے دن ــ کہ جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا"۔ (بقرہ - ۱۱۳)

دوسری جگہ فرماتا ہے:

Marfat.com

واقسموا باللّٰہ جھد ایمانھم لا یبعث اللّٰہ من یموت بلٰی وعدًا علیہ حقًّا ولٰکن اکثر الناس لا یعلمون ۝ لیبین لھم الذی یختلفون فیہ ولیعلم الذین کفروا انھم کانوا کاذبین

"انہوں نے زور دار قسم کھا کر کہا کہ خدا ان لوگوں کو کہ جو مرجائیں گے کبھی زندہ نہیں کرے گا لیکن ایسا نہیں ہے ۔ یہ خدا کا حتمی وعدہ ہے (کہ ان سب کو زندہ کرے گا) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس چیز میں وہ اختلاف رکھتے تھے اُسے اُن کے لیے واضح کردے تاکہ جو لوگ منکر ہوگئے تھے وہ یہ جان لیں کہ وہ جھوٹ بولتے تھے ۔" (نحل - ۳۸ و ۳۹)

۴ ۔ **قرآن اور مسئلہ معاد :** مسئلہ توحید کہ جو انبیاء کی تعلیمات میں سب سے زیادہ بنیادی مسئلہ ہے اس کے بعد معاد کا مسئلہ اپنی خصوصیات اور اپنے تربیتی و تعلیمی آثار کے ساتھ پہلے درجہ میں قرار پاتا ہے ۔ لہٰذا قرآنی مباحث میں توحید و خدا شناسی کے بعد بہت سی آیات کو اس نے اپنے ساتھ مخصوص کر دیا ہے ۔

معاد کے قرآنی مباحث کبھی تو منطقی استدلال کی صورت میں بیان ہوئے ہیں اور کبھی خطابی مباحث اور مؤثر اور زور دار تلقین کی صورت میں بعض اوقات تو انہیں سُن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کلام کا صادقانہ لب و لہجہ ایسا ہے کہ وہ استدلال کی طرح انسان کی روح اور جان کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں ۔

منطقی استدلال میں قرآن زیادہ تر امکانِ معاد کے موضوع پر بات کرتا ہے ۔ کیونکہ منکرین زیادہ تر اُسے محال خیال کرتے تھے ۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ معاد وہ بھی معادِ جسمانی کی صورت میں ۔ کہ جس میں بوسیدہ اور خاک شدہ اجسام کا نئی حیات کی طرف لوٹنا ضروری ہے ۔ امکان پذیر نہیں ۔

اس حصے میں قرآن مختلف طریقوں سے بات کرتا ہے اور یہ سب استدلال جس ایک جگہ جاکر ختم ہو جاتے ہیں وہ "معاد کے امکانِ عقلی" کا مسئلہ ہے ۔

کبھی تو وہ پہلی زندگی کو انسان کی نظر میں مجسم کرتا ہے اور ایک مختصر، منہ بولتی اور واضح عبارت میں کہتا ہے :

کما بدأکم تعودون

"جس طرح سے کہ اس نے تمہیں ابتداء میں پیدا کیا ہے اسی طرح سے تم واپس لوٹو گے ۔" (اعراف - ۲۹)

کبھی نباتات کی زندگی اور موت اور ان کی بازگشت کی تصویر کشی کرتا ہے کہ جسے ہم ہر سال

Marfat.com

اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ اور اس کے آخر میں کہتا ہے۔ کہ تمہاری بازگشت بھی اسی طرح ہوگی:

ونزلنا من السماء ماءً مبارکًا فانبتنا به جنّات وحب الحصید...
واحیینا به بلدة میتًا کذالک الخروج

"ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے سرسبز باغات اُگائے اور کٹے ہوئے دانے .... اور اس کے ذریعے ہم نے مُردہ زمین کو زندہ کیا (تمہاری) بازگشت بھی اسی طرح ہوگی۔" (ق - ۹ تا ۱۱)

دوسری جگہ کہتا ہے:

والله الذی ارسل الریاح فتثیر سحابًا فسقناه الٰی بلد میت فاحیینا به الارض بعد موتها کذالک النشور

"خدا ہی ہے کہ جس نے ہواؤں کو بھیجا تاکہ وہ بادلوں کو چلائیں اور ہم نے انہیں مُردہ زمین کی طرف دھکیل دیا اور اس کے ذریعے ہم نے زمین کو اس کی موت کے بعد حیات بخشی۔ قبروں سے اٹھنا بھی اسی طرح ہے۔" (فاطر - ۹)

کبھی آسمانوں اور زمین کی خلقت میں خدا کی قدرت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

اولم یروا ان الله الذی خلق السّماوات والارض ولم یعی بخلقهن بقادر علٰی ان یحیی الموتٰی بلٰی انه علٰی کل شیء قدیر

"کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اس تخلیق نے اسے تھکا نہیں دیا، وہ مُردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ ہاں! وہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (احقاف - ۳۳)

اور کبھی توانائیوں کی بازگشت اور سبز درخت سے آگ نکلنے کو اس کی قدرت کے نمونے کے طور پر اور آگ کو پانی کے اندر قرار دینے کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارًا

"وہ خدا مُردوں کو لباس حیات پہناتا ہے کہ جس نے سبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کی۔" (یٰسین - ۸۰)

کبھی جنین کی زندگی کو انسان کی نظر میں مجسم کرتا ہے اور کہتا ہے:

یا ایها الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانّا خلقناکم من تراب ثم من نطفة ثم من علقة ثم من مضغة مخلقة وغیر مخلقة لنبین لکم ونقر فی الارحام مانشاء الٰی اجل مسمًّی ثم نخرجکم

Marfat.com

طفلاً۔

"اے لوگو! اگر تم قیامت کے بارے میں شک رکھتے ہو تو یہ بات مت بھولو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفہ سے، پھر جمے ہوئے خون سے پھر مضغہ سے (کہ گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو چبائے ہوئے گوشت کی طرح کا ہے)۔ اس حالت میں پہنچ کر بعض تو شکل و صورت کے حامل ہوتے ہیں اور بعض بے شکل وصورت۔ مقصد یہ ہے کہ ہم تم پر یہ واضح کردیں (کہ ہم ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں) اور جن "جنینوں" کو ہم چاہتے ہیں ایک معین مدت تک ماؤں کے رحم میں روک رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بچے کی شکل میں تمہیں عالم دنیا میں بھیجتے ہیں" (حج۔ ۵)۔

وہ نیند کہ جو موت کی بہن ہے بلکہ کئی جہات سے خود موت ہے۔ اُس کے لیے اصحاب کہف کی تین سو سالہ نیند کی مثال پیش کرتا ہے اور ان کی نیند اور بیداری کے سلسلے میں ایک عمدہ اور مناسب تشریح کرنے کے بعد فرماتا ہے:

وکذالک اعثرنا علیھم لیعلموا انّ وعد اللہ حقّ و انّ السّاعۃ لاریب فیھا

"اس طرح سے ہم نے لوگوں کو ان کی حالت کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ جان لیں کہ خدا کا قیامت کا وعدہ حق ہے اور قیام قیامت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے" (کہف۔ ۲۱)

یہ چھ استدلال ہیں کہ جو قرآن کی آیات میں امکان معاد کے سلسلہ میں بیان ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ ابراہیمؑ کے چار پرندوں کی داستان (بقرہ۔ ۲۶۰)، عزیرؑ کی سرگزشت (بقرہ۔ ۲۵۹)، بنی اسرائیل کے مقتول کا واقعہ (بقرہ۔ ۷۳) بھی بیان کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک ایک تاریخی نمونہ ہے یہ سب اس مسئلے کے لیے دوسرے شواہد و دلائل ہیں کہ جو قرآن نے اس سلسلے میں بیان کیے ہیں۔

مختصر بات یہ ہے کہ وہ تصویر جو قرآن مجید نے معاد، اس کے مختلف پہلوؤں، مقدمات اور نتائج کی کھینچی ہے اور وہ بولتے ہوئے دلائل کہ جو اس نے اس سلسلے میں بیان کیے ہیں، اس قدر زندہ اور اطمینان بخش ہیں کہ جو شخص تھوڑا سا بھی بیدار وجدان رکھتا ہے وہ ان کی گہری تاثیر سے ضرور متاثر ہوگا۔

بعض کے قول کے مطابق قرآن کی ایک ہزار دو سو آیات معاد کے سلسلے میں بحث کرتی ہیں کہ اگر انہیں جمع کیا جائے اور ان کی تفسیر کی جائے تو وہ خود ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ اس تفسیر کی تالیف کے اختتام کے بعد، جس وقت ہم انشاء اللہ تفسیر موضوعی شروع کریں گے تو (معاد کے سلسلہ کی آیات کا) یہ مجموعہ بھی خواہش مندوں کی دسترس میں ہوگا۔

۵۔ معاد جسمانی: معاد جسمانی سے مراد یہ نہیں ہے کہ صرف جسم دوسرے جہان میں لوٹ آئے گا

Marfat.com

بلکہ مقصد یہ ہے کہ روح اور جسم اکٹھے مبعوث ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں روح کی بازگشت تو مسلّم ہے بحث جسم کی بازگشت کے بارے میں ہے۔

گزشتہ فلاسفہ کی ایک جماعت صرف معاد روحانی کی معتقد تھی وہ جسم کو ایک سواری سمجھتے تھے کہ جو صرف اسی جہان میں انسان کے ساتھ ہے اور موت کے بعد وہ اس سے بے نیاز ہو جائے گا اور اسے چھوڑ کر عالم ارواح میں چلا جائے گا۔

لیکن اسلام کے بزرگ علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ معاد روحانی اور جسمانی دونوں صورتوں میں ہوگی یہاں پر بعض علماء خصوصیت کے ساتھ سابق جسم کو ضروری نہیں سمجھتے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کسی بھی جسم کو روح کے اختیار میں دے دے گا اور چونکہ انسان کی شخصیت اس کی روح کے ساتھ ہے تو یہ جسم اسی کا جسم شمار ہوگا۔ جبکہ صاحبانِ تحقیق کا عقیدہ یہ ہے کہ وہی جسم کہ جو خاک ہو کر بکھر گیا تھا، خدا کے حکم سے اسی کو جمع کیا جائے گا اور اسی کو نئی زندگی عطا ہوگی اور یہ وہ عقیدہ ہے کہ جو قرآن مجید کی آیات سے لیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں معادِ جسمانی کے شواہد اس قدر زیادہ ہیں کہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو معاد کو صرف روحانی سمجھتے ہیں انہوں نے معاد والی فراواں آیات کا تھوڑا سا بھی مطالعہ نہیں کیا ہے، ورنہ معاد کا جسمانی ہونا آیاتِ قرآنی میں اس قدر واضح ہے کہ کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے، یہی آیات کہ جو سورۂ یٰسین کے آخر میں بیان ہوئی ہیں اس حقیقت کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ کیونکہ عرب کے بیابانی لوگوں کو تعجب اسی بات کا تھا کہ یہ بوسیدہ ہڈی جو اُن کے ہاتھ میں ہے اُسے کون زندہ کر سکتا ہے؟

قرآن صراحت کے ساتھ اس کے جواب میں کہتا ہے:

قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ

"کہیے کہ وہی خدا اس بوسیدہ ہڈی کو زندہ کرے گا کہ جس نے پہلی دفعہ اسے پیدا کیا تھا"

معاد کے مسئلے میں مشرکین کا سارا تعجب اور اُن کی مخالفت اسی امر پر تھی کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے اور ہماری خاک زمین میں مل جائے گی تو پھر دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے؟

وقالوا ءاذا ضللنا فی الارض ءانا لفی خلق جدید (الم سجدہ - ۱۰)

وہ کہتے تھے کہ یہ شخص تم سے کیسے وعدہ کرتا ہے کہ جس وقت تم مر جاؤ گے اور خاک ہو جاؤ گے تو دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے،

ایعدکم انکم اذا متم وکنتم ترابًا وعظامًا انکم مخرجون (مومنون - ۳۵)

وہ اس امر پر اس قدر تعجب کرتے تھے کہ اس کے اظہار کو جنون یا خدا پر جھوٹ خیال کرتے تھے:

Marfat.com

وقال الذین کفروا ھل ندلکم علیٰ رجل ینبئکم اذا مزقتم کل ممزق انکم لفی خلق جدید

"کافروں نے کہا کہ ہم تمہیں ایسا شخص دکھاتے ہیں کہ جو تمہیں یہ خبر دیتا ہے کہ جس وقت تم پوری طرح خاک ہو کر بکھر جاؤ گے تو دوبارہ زندگی پاؤ گے"۔ (سبا ۔ ۷)

یہی وجہ ہے کہ عام طور پر امکان معاد کے بارے میں قرآنی استدلال معادِ جسمانی کے گرد ہی گھومتے ہیں اور وہ چھ بیانات کہ جو گزشتہ حصے میں گزرے ہیں سب کے سب اسی مدعا کے گواہ ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن بار بار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ تم قیامت میں قبروں سے نکلو گے (یٰسین ۔ ۵۱، قمر ۔ ۷) تو قبریں معادِ جسمانی کے ساتھ مربوط ہیں۔

ابراہیم کے چاروں پرندوں کی داستان، اسی طرح عُزیرؑ کا واقعہ اور موت کے بعد ان کا زندہ ہونا اور بنی اسرائیل کے مقتول کا قصہ کہ جس کی طرف ہم نے گزشتہ مباحث میں اشارہ کیا ہے، سب کے سب صراحت کے ساتھ معادِ جسمانی کی ہی بات کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے جنت کی مادی و روحانی نعمتوں کی جتنی بھی تعریف کی ہے سب کی سب اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ معادِ جسمانی طور پر بھی ہوگا اور روحانی طور پر بھی۔ ورنہ روحانی نعمتوں کے ساتھ ساتھ حور و قصور اور انواع و اقسام کی بہشتی غذاؤں اور مادی لذائذ کے کیا معنی ہیں؟

بہر حال یہ بات ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص قرآنی منطق اور تعلیمات سے تھوڑی سی بھی آگاہی رکھتا ہو اور پھر معادِ جسمانی کا انکار کرے۔ دوسرے لفظوں میں معادِ جسمانی کا انکار قرآن کی نظر میں اصل معاد کے انکار کے مساوی ہے۔

ان دلائل منقولی کے علاوہ اس بارے میں عقلی شواہد بھی موجود ہیں۔ اگر ہم انہیں بیان کرنا شروع کر دیں تو گفتگو لمبی ہو جائے گی۔

البتہ معادِ جسمانی کا اعتقاد چند ایک سوالات و اعتراضات کو ابھارتا ہے مثلاً آکل و ماکول کا شبہ کہ جن کا محققینِ اسلام نے جواب دیا ہے اور ہم اس سلسلے میں ایک مختصر اور جامع تشریح سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۶۰ کے ذیل میں دوسری جلد میں بیان کر آئے ہیں۔

٭ ٭ ٭

۶۔ بہشت و دوزخ: بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد کا عالم مکمل طور پر اسی جہان کے مشابہ ہے البتہ زیادہ کامل اور زیادہ عمدہ شکل میں۔

لیکن ہمارے پاس بہت سے ایسے قرائن موجود ہیں کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس جہان اور اُس جہان کے درمیان کیفیت و کمیت کے لحاظ سے بہت زیادہ فاصلہ ہے۔

Marfat.com

یہاں تک کہ اگر ہم اس فاصلے کو چھوٹے سے جنین کے عالم کی اس وسیع دنیا کے درمیانی فاصلے سے تشبیہ دیں تو پھر بھی کامل موازنہ نہیں ہوگا۔

بعض روایات کی صراحت کے مطابق وہاں ایسی چیزیں ہیں کہ جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سُنا ہے۔ یہاں تک کہ کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ لہٰذا قرآن مجید کہتا ہے:

فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین

"کوئی انسان نہیں جانتا کہ کیسی کیسی چیزیں ۔ کہ جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سبب ہیں ۔ اس کے لیے پنہاں رکھی گئی ہیں"۔ (الم سجدہ۔ ۱۷)

اس جہان پر حاکم نظام اُس عالم پر حاکم نظام سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہاں افراد بطور گواہ عدالت میں جاتے ہیں لیکن وہاں ہاتھ اور پاؤں یہاں تک کہ بدن کی جلد بھی گواہی دے گی:

الیوم نختم علٰی افواھھم و تکلمنا ایدیھم و تشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون (یٰسین - ۶۵)

و قالوا لجلودھم لم شھدتم علینا قالوا انطقنا اللہ الذی انطق کل شیء (حٰم سجدہ - ۲۱)

بہرحال دوسرے جہان کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے وہ صرف دور کی ایک بات ہے کہ جس قدر ہماری سمجھ میں آتی ہے اور اصولی طور پر ہماری الف باء اور اس جہان میں ہماری فکری صلاحیت اس کی حقیقی تعریف پر قادر نہیں ہے اور اسی سے جنت و دوزخ اور ان کی نعمتوں اور عذابوں کی کیفیت کے بارے میں بھی جواب دیا جا سکے گا۔

ہم تو اسی قدر جانتے ہیں کہ جنت تو انواع و اقسام کی خدائی نعمتوں کا مرکز ہے چاہے وہ مادی ہوں یا روحانی اور دوزخ دونوں جہات کے شدید ترین عذابوں کا مرکز ہے۔

لیکن ان دونوں کی جزئیات کے بارے میں قرآن مجید نے کچھ اشارے بیان کیے ہیں کہ جن پر ہم ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کی تفصیلات جب تک کوئی نہ دیکھے، نہیں جانتا۔

جنت و دوزخ کے وجود کے بارے میں اور یہ کہ وہ کہاں ہیں، ہم نے نسبتاً تفصیلی بحث سورہ آل عمران کی آیہ ۱۳۳ کے ذیل میں دوسری جلد میں کی ہے۔

اسی طرح عالم قیامت میں جزا و سزا، اور "تجسم اعمال" اور "نامۂ اعمال" کے مسئلے کے بارے میں ہم جلد دوم سورہ آل عمران کی آیہ ۳۰ کے ذیل میں اور جلد ۱۲ سورہ کہف کی آیہ ۴۹ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

Marfat.com

ان تمام باتوں کے علاوہ، دوسری مختلف بحثیں متعلقہ آیات کے ذیل میں خصوصاً قرآن مجید کی آخری سورتوں میں انشاء اللہ قیامت کی خصوصیات کے بارے میں بیان ہوں گی۔

٭ ٭ ٭

پروردگارا! اس پُرخوف وخطر دن میں، اس عظیم قیامت اور عدالت میں ہمیں اپنے لطف وکرم سے امن وسکون بخشنا۔

خداوندا! اگر فیصلہ اعمال کے معیار پر ہو تو ہمارا ہاتھ خالی ہے۔ اپنے فضل وکرم کے ترازو سے ہماری ناچیز نیکیوں کو تولنا اور اپنی رحمت وغفران سے ہماری برائیوں پر پردہ ڈال دینا۔

بارالہا! ایسا کرنا کہ انجام کار تو بھی ہم سے خوش ہو اور ہم بھی تیری بارگاہ میں کامیاب و رستگار ہوں، آمین یارب العالمین۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

تفسیر نمونہ کی جلد ۱۸ کا اختتام
۸ رمضان المبارک ۱۴۰۴ ہجری

تفسیر نمونہ کی اٹھارویں جلد کا ترجمہ از قلم سید صفدر حسین نجفی
فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم
بروز اتوار
بوقت دن کے ۱۲ بج کر ۱۵ منٹ
بتاریخ ۲۲ رشوال ۱۴۰۶ھ
بمطابق ۲۹ رجون ۱۹۸۶ء
بر مکان ولایت خاں صاحب مانچسٹر، یو۔ کے
اختتام پذیر ہوا۔
الحمد للہ اولاً و آخراً والصلوٰۃ علی النبی
وآلہ ابداً دائماً۔

سید صفدر حسین نجفی

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۸)
کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا میں
تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)
مدرس / مہتمم
امامیہ قرأت کالج
اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

Marfat.com